چوتھا حصہ

دیوی



www.pdfbooksfree.pk
PDFBOOKSFREE.PK

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ ی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے



www.pdfbooksfree.pk

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

ہوٹل پنچ کر شانی کی گردن میں سخت اینٹسن ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے پرانی چوٹ پھر سے دکھنے لگی ہے۔ پوٹھوہار میں سون کے قریب رستم اور لالہ کے ڈیرے پر شانی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے آثار تا حال اس کے جسم پر موجود تھے۔ دراڑ کی تاریک گہرائی میں گرتے ہوئے شانی کی گردن پر بھی ضرب آئی تھی اور تین چار دن تک وہ ٹھیک سے گردن گھما نہیں سکی تھی۔ اب جو کچھ چوہدری بشیر کی کوٹھی پر ہوا تھا اس نے ایک بار پھر شانی کی گردن کے مہرے ہلا ڈالے تھے۔ اس نے ڈسپرین کی گولیاں لیں اور چائے منگوائی۔

چائے پیتے ہوئے وہ ان حالات پر غور کرنے لگی جو آج شام کے بعد پیش آئے تھے۔ شانی کو وہ سب کچھ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ ریچھ کا جھپٹنا، شانی کا اس کے منہ پر لکڑی سے وار کرنا اور پھر ''آیا'' کی ادھڑی ہوئی گردن۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ مشتعل ریچھ کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک خیال شانی کے ذہن میں آ گیا۔ بظاہر یہ بالکل غیر متعلق خیال تھا، لیکن کچھ نہ کچھ ناتا ہوتا ہے دو خیالوں میں، جو وہ باہم ملتے ہیں۔ شانی کے ذہن میں فاخر کا خیال آیا۔ اس کا بالوں سے بھرا ہوا جسم شانی کے تصور میں چمکا۔ وہ بھی تو خواب گاہ میں اسی طرح شانی پر جھپٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی سرخی تھی۔ ایسا ہی بھنبھوڑنے اور چیر نے پھاڑنے والا رویہ ہوتا تھا اس کا۔ وہ ایک بار پھر کانپ سی گئی۔

ہوٹل میں آ کر شانی نے مُنے کو خوب پیار کیا۔ اسے بہت کچھ کھلایا پلایا اور اس کی ڈھیروں باتیں سنیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے آنسو بھی پونچھتی رہی۔

ٹیلی فون پر تین چار بار شانی کا رابطہ عارف سے ہوا۔ عارف مسلسل ہسپتال میں تھا۔ یعنی راجو کی تیمارداری کر رہا تھا۔ عارف کے مطابق راجو کی حالت مسلسل بہتر ہو رہی تھی لیکن اس کی ذہنی کیفیت ابتر تھی۔ وہ بار بار ہذیان بکنے لگتا تھا، اپنے مخصوص دیہاتی لب و لہجے میں

ڈاکٹروں کی منت کرتا تھا کہ وہ اسے زہر کا ٹیکہ لگا دیں، وہ مزید جینا نہیں چاہتا ہے۔ عارف زیادہ تر وقت راجو کے سرہانے گزار رہا تھا اور یہ احتیاط کر رہا تھا کہ راجو کسی طرح خود کو نقصان نہ پہنچائے۔ عارف کے مطابق اس نے حاجی حیات کے ماتحت سب انسپکٹر اختر تک راجو کی شدید بیماری کی اطلاع پہنچا دی تھی اور امید تھی کہ اب تک ڈپٹی ریاض کی وساطت سے یہ اطلاع تاؤ حشام تک پہنچ چکی ہوگی۔

مُنا اور شانی رات دیر تک جاگتے رہے۔ اُن دنوں کی باتیں کرتے رہے جب وہ ایک دوسرے سے دور تھے۔ شانی بڑی حکمت کے ساتھ مُنے کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اب اپنی امی کی محبت بھی اپنے ابو میں ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور اسے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

وہ تڑ بولا۔ ''وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں تو پھر میلے واسطے نئی امی کیوں لاتے ہیں۔ تم کو میلی امی کیوں نہیں بناتے؟''

شانی آہ بھر کر رہ گئی۔ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا ابو تو اس کام کے لئے بس ایک اشارے کا منتظر ہے۔ شانی نے آزردہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو منے! میں تمہاری امی نہیں بن سکتی کیونکہ میں تمہاری چاچی ہوں۔ ہاں، میں تمہیں اسی طرح پیار کرتی رہوں گی جیسے امیاں کرتی ہیں۔ میں تمہیں ملتی رہوں گی۔ اسی طرح کبھی کبھی تمہیں اپنے ساتھ لے جاتی رہوں گی۔ ہم اکٹھے گھومے پھریں گے۔ سیر کیا کریں گے۔''

''تم غلط کہتی ہو، تم چلی جاتی ہو، میں تمہیں ڈھونڈتا رہتا ہوں اور لوتا رہتا ہوں۔ ابو کہتے ہیں، تم کسی اور سے شادی کر لو گی۔ تم اچھی نہیں ہو۔ مجھے پتا ہے ابو جھوٹ کہتے ہیں۔ تم بلی اچھی ہو میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ کہیں نہیں۔''

شانی اسے لے کر باہر ٹیرس میں آ گئی۔ وہ بولتا چلا گیا۔ ''تاتی میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ میں شلالت بھی نہیں کلوں گا۔ تم جو کہو گی میں کلوں گا۔''

شانی اسے لے کر گھومتی رہی۔ اسے بہلاتی رہی۔ اگلے روز حسب وعدہ شانی نے مُنے کو واپس چوہدری بشیر کے پاس پہنچانا تھا۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل ثابت ہوا۔ مُنے اور شانی میں جو تعلق تھا جو مقناطیس اور لوہے کے چھوٹے سے ٹکڑے میں ہوتا ہے۔ وہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس کی اشک بار آنکھیں شانی کو دہلا رہی تھیں۔ اسی دوران میں نشتر ہسپتال سے عارف کی کال آ گئی۔ عارف کی آواز سنتے ہی شانی کو اندازہ ہو گیا کہ گڑبڑ ہے۔ عارف نے

کہا۔ ''شانی بہن! تم جلدی آؤ یہاں معاملہ خراب ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''راجو نے شیشے کا گلاس توڑ کر اپنی گردن زخمی کر لی ہے۔ بہت سا خون نکلا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگایا ہے پر وہ واویلا کرتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میانہ سے تاؤ حشام اور چار پانچ بندے بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ ڈاکٹروں سے لڑ رہے ہیں۔ تاؤ کے بندوں نے بڑا ہنگامہ کیا ہے۔ سارے ہسپتال میں تماشا بنا ہوا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' شانی نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ مُنے کو جلد از جلد چوہدری بشیر تک پہنچا کر ہسپتال جائے..... مُنے کے ساتھ وہ ہسپتال جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے ہوٹل کے سامنے سے ایک ٹیکسی لی۔ مُنے کو بہت سی ٹافیاں، چاکلیٹس اور آئس کریم وغیرہ دلائی اور پھر عثمانیہ ٹیکسٹائل پہنچ گئی۔ ایک اچھا اتفاق یہ ہوا کہ چوہدری بشیر اس وقت واش روم میں تھا۔ شانی نے منہ بسورتے مُنے کو فردوس اور زہرا کے سپرد کیا اور واپس آ گئی۔ ابھی وہ چوہدری کی کوٹھی سے بمشکل آدھا کلومیٹر دور ہی آئی ہوگی کہ اس کی نگاہ ایک سرخ ہنڈا کار پر پڑی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ اسے ہنڈا کار میں تاؤ حشام نظر آیا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر سفید مونچھیں بہت نمایاں تھا۔ اس کے عقب میں خطرناک صورتوں والے تین چار ڈشکرے بیٹھے تھے۔ شانی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ ''ڈرائیور گاڑی روکو۔'' شانی نے بے ساختہ کہا۔

ٹیکسی کے بریک چرچرائے اور وہ رک گئی۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ تاؤ کی سرخ کار چوراہے کے سگنل پر ٹھہری ہوئی تھی۔ چوراہے پر رش بہت زیادہ تھا۔ شانی کوشش کرتی تو تاؤ کو روک سکتی تھی۔ اس نے سو کا نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کی جھولی میں پھینکا اور دروازہ کھول کر تیزی سے چوراہے کی سمت گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ تاؤ حشام سارے معاملے سے باخبر ہو چکا ہے اور اب وہ کسی بُرے ارادے سے چوہدری بشیر کی طرف جا رہا ہے۔ شانی کو یہ بھی معلوم تھا کہ بظاہر تاؤ حشام اور چوہدری بشیر میں صلح ہو چکی ہے لیکن اسے معلوم تھا کہ ان دونوں کے دلوں میں کدورت موجود ہے۔ شانی نے بھاگ کر سڑک عبور کی اور اس سے پہلے کہ گاڑی حرکت میں آ جاتی، وہ ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر تاؤ حشام نے بھی اسے دیکھ لیا۔ شانی نے تاؤ حشام کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ بہرحال اس کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی ایک سائیڈ پر لگا دی۔ شانی کو تاؤ کے ساتھ چوہدری بابر بھی بیٹھا نظر آیا۔ وہی لمبا تڑنگا نوجوان چوہدری جس نے ایک جنگل میں ایک

www.pdfbooksfree.pk

طوفانی رات میں جنس کے دیو سے مغلوب ہو کر شانی کو ایک درخت سے باندھا تھا اور اس پر حملہ آور ہوا تھا۔

شانی نے تاؤ حشام کو گاڑی سے باہر آنے کے لئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد شانی سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک سایہ دار درخت تلے کھڑی تاؤ سے بات کر رہی تھی۔ شانی کا اندازہ درست تھا تاؤ اور اس کے بندے چوہدری بشیر کی طرف ہی جا رہے تھے۔ تاؤ پھنکارتے ہوئے بولا۔

''تُو کس خوشی میں بشیر کی حمایت کر رہی ہے۔ اس کُتے کو ہم تجھ سے زیادہ جانتے ہیں اپنے ہاتھوں سے اس سانپ کو دودھ پلایا ہوا ہے۔ اس نے دشمنی کی ہے میرے پُتر سے، ویر کمایا ہے۔ میں کھوتا نہیں ہوں۔ ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے مجھے، اگر میرے پُتر کو کچھ ہوا تو اس کا ذمے دار بشیرا ہوگا۔ کنجر کے تخم کو شرم نہیں آئی۔ اپنے سے اٹھارہ سال چھوٹی کُڑی سے ویاہ رچانے چلا ہے۔ میں دیکھتا ہوں ہمارے ہوتے ہوئے وہ کیسے کرتا ہے یہ رنگ بازی۔''

شانی نے کہا۔ ''چوہدری حشام! میں تمہیں بڑی سے بڑی قسم کھا کر یقین دلا سکتی ہوں۔ چوہدری بشیر کو پتا نہیں تھا کہ یہ لڑکی راجو کی پسند ہے۔ یہ تو پیر قدرت اللہ سے دم کرانے گئی تھی کہیں۔ وہیں پر چوہدری بشیر نے اسے دیکھا۔ میں سچ کہتی ہوں اس میں دشمنی وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا۔''

''پر اب تو اسے پتا چل چکا ہوگا ناں کہ یہ کُڑی کس سے ویاہ کرنا چاہتی ہے۔ اب وہ کیوں اُڑا ہوا ہے اپنی گل پر؟''

شانی نے کہا۔ ''دیکھو چوہدری حشام! تمہیں ذرا تحمل سے کام لینا ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اس بارے میں بات کی ہے بشیر سے۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤں گی اور یہ شادی رک جائے گی۔''

''کیسے رک جائے گی۔ ہمیں تو پتا چلا ہے کہ کارڈ بانٹے جا چکے ہیں۔ تیل مہندی کی تیاری ہو گئی ہے۔ دیگیں کھڑکانے کے لئے نائی آ رہے ہیں۔'' چوہدری حشام کے ساتھ آنے والے ایک دوسرے شخص نے کہا۔

تاؤ حشام کے چہرے کا بدنما داغ سورج کی روشنی میں کچھ اور بھی دمک اٹھا۔ وہ سینہ پھلا کر بولا۔ ''تُو زیادہ چوہدرائن نہ بن اس ماملے میں۔ ہم اپنے ماملے خود نبیڑ سکتے ہیں جب تُو پیدا نہیں ہوئی تھی ہم اس وقت بھی اپنے فیصلے آپ کرتے تھے۔''

چوہدری حشام شانی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ ''خدا کے لئے چوہدری۔'' شانی روہانسی ہو گئی۔ ''بنا بنایا کام خراب نہ کرو۔ میں تم کھاتی ہوں بشیر نے یہ

www.pdfbooksfree.pk

کام دشمنی میں نہیں کیا۔''

شانی کو روہانسا دیکھ کر بابر نے دبے لفظوں میں شانی کی حمایت کی، بولا۔ ''تاؤ! چلو تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ کیا کرتی ہے۔''

''ابویں، ہمیں چکر دے رہی ہے۔ مجھے چنگی طرح پتا ہے بشیر اتنی آسانی سے ٹلنے والا نہیں ہے۔''

بابر تین چار قدم چل کر تاؤ حشام کے پاس چلا گیا اور سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ چوہدری حشام کا چہرہ بدستور تمتما رہا تھا اور گردن اکڑی ہوئی تھی..... شانی نے سوچا..... یہ وہی حشام ہے جو پوٹھوہاری ٹیلوں کے اندر ''وڈے ڈیرے'' میں زنانہ کپڑے پہن کر کوٹھڑی کے فرش پر چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ رستم کی صورت دیکھ کر ہی اس کا رنگ ہلدی ہو جاتا تھا۔ اب رہائی کے بعد چند ہی دنوں کے اندر اس کی ساری اکڑفوں پھر سے عود کر آئی تھی۔ وہی مثال کُتے کی دم کو سو سال بھی حقے کی نالی میں رکھو تو وہ سیدھی نہیں ہوتی۔ بابر اور حشام میں چار پانچ منٹ تک بات ہوئی۔ حشام قدرے ڈھیلا نظر آنے لگا۔ اس سارے معاملے میں حشام کا کردار احمقانہ رہا تھا۔ بلکہ سارا کھیل ہی اس کی وجہ سے خراب ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جب اسے پتا چلا کہ اس کا لاڈلا پُتر ایک کریانہ فروش کی بیٹی سے پیار کر بیٹھا ہے تو اس کی چوہدراہٹ نے فوراً اپنا پھن پھیلا لیا۔ اس نے کریانہ فروش سیف اللہ کو ڈرا دھمکا کر اور ذلیل کر کے پاک پتن چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن اب..... جب وہ اپنے بیٹے کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ رہا تھا، اس کی چوہدراہٹ نے ایک بار پھر پھن پھیلا لیا تھا۔ تاہم اس مرتبہ یہ غیظ و غضب اپنے بیٹے کی حمایت میں تھا۔ بورژوائی طبقے کا وہی اندازِ فکر جو عام لوگوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

کچھ دیر بعد بابر شانی کی طرف آیا۔ اکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم آج انتظار کرتے ہیں۔ اگر بشیرے کی طرف سے معاملہ سیدھا ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو پھر..... کل بازوؤں کے زور پر فیصلہ ہو جائے گا۔ ہم اس کُڑی کو بشیرے کی ڈولی میں نہیں بیٹھنے دیں گے۔''

شانی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''راجو کا اب کیا حال ہے؟''

''بہت بُرا حال ہے۔ ہم اب ہسپتال چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی کچھ دیر میں وہاں آتی ہوں۔'' شانی نے کہا اور کچھ سوچتی ہوئی دوسری طرف مڑ گئی۔ اس کا رخ دوبارہ چوہدری بشیر کی کوٹھی کی طرف ہو گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ

اب وہ پیدل جا رہی تھی۔ ایک مصروف سڑک کے کنارے ہونے والی اس ساری گفت وشنید کو راہ گیر بڑی متجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اب بھی دیکھ رہے تھے۔ شانی نے خود کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ تیز چبھتی ہوئی نظروں کی پرواہ کئے بغیر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک بار پھر عثمانیہ ہاؤس کے مین گیٹ پر کھڑی تھی۔ گارڈز اب اسے اچھی طرح جان گئے تھے۔ غالباً چوہدری بشیر نے بھی انہیں ہدایت کر دی تھی کہ شانی کی آمد ورفت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

شانی نے وسیع وعریض احاطہ پار کیا اور اندرونی حصے میں داخل ہو گئی۔ ایک دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے جواں سال گریس کی آواز سنائی دی وہ شاید فون پر کسی سے بات کر رہی تھی وہ کہہ رہی تھی۔ ''اب اس کام سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں ہے بڑے بھائی! بہتر ہے کہ تم خود آ جاؤ.....'' شانی آگے نکلتی چلی گئی۔ راستے میں ایک دو ملازموں نے اسے سلام کیا۔ پھر اسے زہرا نظر آ گئی۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ''چوہدری جی کہاں ہیں؟''

''وہ اوپر ہیں۔''

''اور مُنا؟''

''وہ فردوس کے پاس ہے جی۔ ابھی ابھی بے چارے کو چوہدری جی سے بڑی ڈانٹ پڑی ہے۔'' شانی نے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ''دوا نہیں کھا رہا تھا۔ روتا چلا جا رہا تھا۔''

''اب کہاں ہے وہ؟''

زہرا نے اسے کمرہ دکھایا۔ شانی سا گوانی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ فردوس فرش پر سے ایک شیشی کی کرچیاں چن رہی تھی۔ تھوڑی سی دوا بھی فرش پر گری ہوئی تھی۔ مُنا بستر پر اوندھا پڑا تھا۔

شانی کو دیکھ کر فردوس چونکی۔ ''یہ کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''دوا والی شیشی توڑ دی ہے مُنے نے۔ چوہدری جی کو پتا چلا تو اسے گالیاں پڑیں گی ہی، میری بھی شامت آئے گی۔'' وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

شانی کی آواز سن کر مُنا تیزی سے اٹھا اور اس کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ ''تائی! تم گئی نہیں ہو؟'' وہ اس کا رخسار چومتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ابھی نہیں لیکن تم نے دوا کیوں نہیں پی۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ابو یا ماسی کو تنگ نہیں کرو گے۔''

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔ شانی نے فردوس سے کہا۔ ''اور دوا ہے؟'' فردوس نے اثبات میں جواب دیا۔ شانی نے دوا لانے کو کہا۔ فردوس دوا لے کر آئی تو شانی نے اپنے ہاتھ سے مُنے کو پلائی۔ وہ واقعی کڑوی کسیلی تھی تاہم شانی کے ہاتھ سے پینے میں مُنے نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ شانی نے فردوس سے کہا۔ ''چوہدری صاحب کو بتاؤ میں آئی ہوں۔ ان سے بات کرنی ہے۔''

فردوس بولی۔ ''میں نے ابھی بتایا ہے انہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مُنے کو دوا پلا کر اوپر آ جاؤ۔''

شانی نے مُنے کو ایک بار پھر فردوس کے سپرد کیا اور اوپر چلی گئی۔ فردوس نے بتایا تھا کہ پہلی راہداری میں چوتھا دروازہ ہے۔ شانی نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ پہلی دستک پر ہی اندر سے چوہدری کی بھاری آواز آئی۔ ''آ جاؤ۔''

شانی دھڑکتے دل کے ساتھ اندر گئی۔ اندر پہنچتے ہی وہ بُری طرح چونکی۔ اس کشادہ کمرے میں شانی کی بہت سی تصویریں آویزاں تھیں۔ کئی تصویریں تو بڑے پوسٹر کے سائز کی تھیں۔ انہیں بڑی نفاست سے دیواروں پر آویزاں کیا گیا تھا۔ کچھ تصویریں قیمتی فریموں میں تھیں۔ ان میں ایک وہی تصویر تھی جو چوہدری نے لاہور والی کوٹھی میں شانی کو بستر پر لٹا کر کھینچی تھی۔ کھڑکی کی طرف سے روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ شانی کی شکل تو پوری طرح نظر نہیں آتی تھی لیکن اس کے جسمانی خدوخال بے حد نمایاں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شانی کی بجائے شانی کے جسم کی تصویر ہے۔ یہ تصویر کھینچنے کے دوران میں چوہدری بشیر کے ہاتھ بڑے تکلیف دہ طریقے سے شانی کے جسم سے ''ہم کلام'' ہوئے تھے اور شانی کو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان تصویروں میں شانی کی وہ تصویر بھی تھی جس میں چوہدری نے اس کے سر پر پھول بکھیرے تھے۔ زیادہ تر تصویریں مُنے کے ساتھ تھیں۔

شانی ان تصویروں کو دیکھ کر خجل سی ہو گئی۔ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ چوہدری نے اسے جان بوجھ کر اس کمرے میں بلایا ہے۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' چوہدری نے ایک قیمتی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ شانی بیٹھ گئی۔ کمرے میں کچھ دیر تک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ چوہدری نے پوچھا۔ ''پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

شانی جانتی تھی کہ چوہدری کی طرف سے پہلا سوال یہی ہو گا اور وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے اسی کا جواب سوچ رہی تھی۔ یہ شانی کی زندگی کا مشکل ترین سوال تھا۔ اس کا جواب دینے کے لئے اسے آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنا تھا۔ جو چیز اس کے کانپتے

www.pdfbooksfree.pk

دل کو تھوڑا سا..... مضبوط کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ رستم شادی کر چکا ہے۔ وہ اور نادیہ ایک ہو چکے ہیں۔

شانی نے اپنے نچلے ہونٹ کو نری سے دانتوں تلے دبایا اور ہولے سے بولی۔

''چوہدری! یہ بہت بڑا فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ میں اکیلے ابھی نہیں کر سکتی ہوں۔ مم..... مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔''

''میں تیار ہوں، لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس شادی کی ساری تیاری مکمل ہو چکی ہے اگر میں یہ شادی روک دیتا ہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا فیصلہ میرے اور منے کے حق میں ہی ہوگا؟''

شانی نے ایک دکھ بھری طویل سانس لی اور بولی۔''میں وعدہ کرتی ہوں کہ میری زندگی میں کوئی اور نہیں آئے گا..... اور نہ اس حوالے سے آپ کسی قسم کی کوئی بات سنیں گے۔''

شانی نے محسوس کیا کہ چوہدری کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی ہے لیکن اس نے بظاہر کسی طرح کے اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔ بدستور اکھڑے لہجے میں بولا۔''شانی، تم اصل سوال سے ہٹ رہی ہو..... مجھے اور منے کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ ضرورت کب پوری ہوگی؟''

شانی کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کی گود میں گر گئے۔''میں نے کہا ہے ناں..... مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔''

شانی کے آنسوؤں نے شاید چوہدری کے دل پر تھوڑا سا اثر کیا۔ وہ بڑے دھیان سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔''ٹھیک ہے، ہم کسی طرح سے اس شادی کو دو ہفتے آگے کر دیتے ہیں۔ اس دوران میں تم بھی اچھی طرح سوچ لو۔ پھر جو بھی فیصلہ ہوگا، اس کے مطابق چلیں گے۔''

''آپ اس شادی کو ہتھیار کے طور پر کیوں استعمال کر رہے ہیں۔'' شانی روہانسی ہوگئی۔''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ کوکب، آپ کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ وہ آپ کو..... وہ آپ کو سچی خوشی نہیں دے سکتی۔''

''سچی خوشی تو شاید میرے نصیب میں ہی نہیں۔'' چوہدری معنی خیز لہجے میں بولا پھر ذرا توقف کر کے اس نے بات جاری رکھی۔''ٹھیک ہے شانی! میں اس شادی کو تین ہفتے آگے کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے کسی بھی فیصلے پر پہنچنے کے لئے یہ کافی وقت ہے۔''

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چوہدری کسی طور بھی اپنے شکنجے کو ڈھیلا کرنے پر تیار

www.pdfbooksfree.pk

نہیں تھا۔ تاہم ایک ذرا سا ریلیف شانی کو ضرور محسوس ہو رہا تھا اور وہ یہ کہ فوری بلا ٹل رہی تھی۔ ورنہ تو دو روز بعد چوہدری کی رسم حنا تھی۔ تین ہفتے خاصا وقت تھا۔ کوئی کرشمہ ہو سکتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شانی بھی کسی حتمی فیصلے تک پہنچ سکتی تھی۔

بڑا انوکھا جبر تھا چوہدری کا۔ اس نے شانی کو کبھی ریپ نہیں کیا تھا۔ بگڑے ہوئے جاگیرداروں کی طرح اس پر ہنٹر نہیں برسائے تھے لیکن وہ جو کچھ کرتا تھا وہ ان مظالم کی طرح ہی تکلیف دہ تھا وہ ایک معصوم بچے کے ساتھ شانی کی دیرینہ وابستگی کو بلیک میلنگ کے لئے استعمال کرتا تھا اور اب چند دن بعد ہونے والی شادی کے حوالے سے ایک اور کارگر ہتھیار اس کے پاس آ گیا تھا۔

شانی عثمانیہ ہاؤس سے سیدھی نشتر ہسپتال پہنچی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ گیا کہ راجو کی گردن پر سفید رنگ کی ایک بڑی پٹی نظر آ رہی تھی۔ یہ پٹی راجو کی دوسری ''خودکشی'' کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ راجو کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر سو رہا تھا۔ اب وہ ''آئی سی یو'' سے باہر آ چکا تھا اور ایک پرائیویٹ کمرے میں تھا۔ کمرے میں عارف اور پیجا گجر کے علاوہ تاؤ حشام اور اس کے مسلح کارندے بھی موجود تھے۔ انہوں نے کمرے میں رش ڈال رکھا تھا۔ اسٹاف جز بز نظر آتا تھا۔ شانی نے بابرے سے کہا کہ مریض کے پاس صرف ایک یا دو بندے رہیں باقی باہر آ جائیں۔

بابرے نے کمرہ خالی کرا لیا۔ تاؤ حشام کی خشمگیں نظریں بار بار شانی کے چہرے کا طواف کرنے لگتی تھیں۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ شانی سے کچھ نہایت تلخ قسم کی باتیں کہنا اور پوچھنا چاہتا ہے۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا۔ بابرے کے روکتے روکتے بھی لمبے ڈگ بھرتا شانی کی طرف آ گیا۔''ہاں کڑیئے! تُو نے کیا کیا ہے؟'' وہ اجڈ لہجے میں بولا۔

''میں نے آپ سے کہا ہے ناں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' شانی نے کہا۔

''اوئے پریشانی کی بات کیوں نہیں۔'' تاؤ کے لہجے میں تیزی آ گئی۔''وہاں کڑی کے گھر میں تیل مہندی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

''اب ختم ہو جائیں گی تیاریاں۔ ہفتے کو کوکب کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔'' شانی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ ہفتے کو نہیں ہوگی تو کب ہوگی؟'' تاؤ نے پوچھا۔

''ابھی آپ اس معاملے کو ختم سمجھیں اور میں ہاتھ باندھ کر آپ سے درخواست کرتی

ہوں کہ اپنے دماغوں کو ٹھنڈا رکھیں۔ ہلڑ بازی سے بنا بنایا کام بگڑے گا۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی۔''

بابرے نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور تاؤ حشام کو ایک طرف لے جا کر اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بابر ااس معاملے میں مثبت کردار ادا کر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ کافی بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ تیز طراری اور اجڈ پنے کی بجائے شانی کو اس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ سا دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد شانی نے بابرے کو سمجھایا کہ ان لوگوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ہسپتال میں ڈیرہ ڈالنے کے بجائے گاؤں واپس چلے جائیں۔ صرف ایک یا دو بندے احتیاطاً یہاں رہ لیں اور اگر واپس جانا ممکن نہیں تو پھر یہاں کے کسی ہوٹل میں ایک دو کمرے لے لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بابرے کو یہ تاکید بھی کی کہ چوہدری بشیر کے ساتھ کسی طرح کے تصادم کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ ورنہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ فوری طور پر کوکب سے شادی کر کے اسے گھر میں ڈال سکتا ہے۔

ہسپتال سے شانی سیدھی حیات کالونی میں سیف اللہ کے گھر پہنچی۔ سیف اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا کھانا لے کر ہسپتال گیا ہوا تھا۔ جونہی شانی اندر داخل ہوئی کوکب کی والدہ اور بڑی بہن امید بھری نظروں سے شانی کی طرف دیکھنے لگیں۔ یہ ایک موہوم سی امید تھی لیکن جب شانی مسکرائی تو ان دونوں کے چہروں کی چمک بڑھ گئی۔ اس دوران میں کوکب کی چاچی ثریا بھی اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی پہنچ گئی۔ کوکب دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ یہ عورتیں عجیب تذبذب میں تھیں۔ شادی کی تیاری کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ یہ امید بھی کر رہی تھیں کہ یہ شادی کسی طرح رک جائے۔ کمرے میں چاروں طرف جہیز کے کپڑے بکھرے تھے۔ دو عورتیں عروسی جوڑے ٹانکنے میں مصروف تھیں۔ دیگر سامان بھی پیک کیا جا رہا تھا۔ شانی نے ثریا کے ہاتھ سے ایک مخملی جوڑا لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ ''ابھی چھوڑ دو سب..... ہفتے کو کوکب کی شادی نہیں ہو رہی..... اور بڑی امید ہے کہ اب یہ معاملہ ویسے ہی ٹل جائے گا۔'' شانی نے کہا۔

''تت..... تم سچ کہہ رہی ہو۔'' آنٹی عطیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں آنٹی جی، میں ابھی کچھ دیر پہلے بات کر کے آ رہی ہوں چوہدری بشیر سے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''کیا کہتا ہے وہ؟'' ثریا نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

www.pdfbooksfree.pk

''میں نے کوکب پر کسی طرح کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ بڑے طریقے سے اسے سب کچھ سمجھایا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بڑی حد تک سمجھ گیا ہے۔''

شانی نے چند ایک باتیں گھر والوں کو بتائیں۔ وہ سن رہے تھے لیکن انہیں بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوران میں شانی نے راجو کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے اس نے گردن پر شیشہ مار کر خود کو زخمی کرلیا ہے اور ڈاکٹروں نے اسے ٹرنکولائزر دے رکھی ہے۔ راجو کی بات شروع ہوئی تو سنبل نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کا اندرونی دروازہ بند کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسرے کمرے میں ان باتوں کی بھنک بھی کوکی کے کانوں تک پہنچے۔ اس کی حالت پہلے ہی ابتر تھی۔ آنٹی عطیہ نے شانی کے دونوں ہاتھ تھامے اور روتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹی! اگر کچھ کر سکتی ہے تو کر، مجھے لگتا ہے کہ میری بچی بے موت ماری جائے گی۔''

شانی نے آنٹی عطیہ کو گلے سے لگایا۔ ''میں ہوں نا آنٹی، آپ حوصلہ رکھیں۔''

آنٹی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بیٹی! اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمارا بال بال بشیر کے قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر اس نے ناراض ہو کر انکار کیا تو پھر ہمارے لئے بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ میرے دیور کے علاج کا سارا خرچا اٹھا رہا ہے۔ خلیل بے روزگار پھر رہا تھا، بشیر نے اسے اچھی نوکری پر لگایا ہوا ہے۔ جس چھت کے نیچے ہم بیٹھے ہیں اس کے لئے بشیر نے رقم دی ہے۔ اگر.....''

''آپ بے فکر رہیں آنٹی جی! میں یہ سب باتیں جانتی ہوں۔ اللہ نے چاہا نے آپ پر بشیر کی ناراضی کا کوئی بوجھ نہیں آئے گا۔''

اسی دوران میں کمرے کا اندرونی دروازہ ہولے سے کھلا اور سامنے سرو قد کوکب کھڑی نظر آئی۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے اور بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ جسم دبلا پتلا ہونے کے باوجود بھرپور نسوانیت رکھتا تھا۔ وہ کانچ کی گڑیا جیسی تھی۔ ''سلام باجی۔'' اس نے کہا اور سوگوار سے انداز میں شانی کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے ہلکا زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ شانی نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا تو نہ جانے کیوں چند آنسو کوکب کی آنکھوں سے گر گئے۔ شانی کو لگا جیسے اس نے یہاں کمرے میں ہونے والی کچھ امید بھری باتیں سن لی ہیں۔ شانی نے اسے اپنے کندھے سے لگایا تو وہ ایک دم سسکنے لگی۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا میری بہن۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شانی نے کہا۔

وہ روتے روتے بولی۔ ''باجی! کیا ہوا تھا اس کو؟''

شانی سمجھ گئی۔ کوکب نے راجو کے زخمی ہونے کے بارے میں سن لیا تھا۔ ''کچھ نہیں کوکی، وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' شانی نے تسلی دی۔ ''بس گردن پر شیشے سے چھوٹا سا کٹ لگا ہے۔ میں ہسپتال سے ہی آرہی ہوں۔ وہ آرام سے سو رہا تھا۔''

''باجی! وہ مرجائے گا۔ وہ زندہ نہیں رہے گا۔'' کوکی کی آواز کرب ناک تھی۔

''ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔'' شانی نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ''کچھ نہیں ہوگا اسے اور نہ ہی تمہیں۔'' شانی نے کوکی کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

دوسرے کمرے سے کسی عورت کی آواز آئی۔ وہ ثریا سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''بڑی باجی! مہندی کے دن کے لئے کتنے چاول صاف کرنے ہیں؟''

ثریا نے دبی دبی خوشی کے ساتھ کہا۔ ''نہیں ابھی نہیں کرنے چاول صاف۔ میں ابھی آکر بتاتی ہوں تجھے۔''

شانی..... سیف اللہ سے بھی ملنا چاہتی تھی۔ وہ کافی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ آخر سیف اللہ موٹر سائیکل پر گھر آیا۔ گھر کی عورتیں کونے کھدروں میں دبک گئیں یا اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آنے لگیں۔ صرف آنٹی عطیہ ہی شانی کے پاس بیٹھی رہ گئیں۔ شانی نے اب تک کی پیش رفت کے بارے میں سیف اللہ کو تفصیل سے بتایا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''انکل! ہمارے لئے ایک اور اچھی خبر بھی ہے۔''

''اچھی خبر اور ہمارے لئے؟'' سیف اللہ کے لہجے میں کرب تھا۔

''ہاں انکل! شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ بیٹے کی حالت کا سن کر چوہدری حشام یہاں آچکا ہے۔ وہ اب ایک بالکل بدلا ہوا شخص ہے۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم نظر آتی ہے۔ وہ اب وہی کرنا چاہتا ہے جو اس کے بیٹے کی خواہش ہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ چوہدری بشیر سمیت کسی بھی بندے سے ٹکر لے سکتا ہے۔''

''لیکن وہ میرے ساتھ جو کر چکا ہے میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اپنے بیٹے کو بیمار دیکھ کر اس کے کلیجے پر ہاتھ پڑا ہے لیکن جب میری غریب بچی بستر سے لگی ہوئی تھی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ یہ راجو جو اب خودکشیوں کے ڈرامے رچا رہا ہے، یہ بھی کہاں تھا اُس وقت۔'' سیف نے کرب کے عالم میں کہا۔

''راجو اس معاملے میں تقریباً بے قصور ہے انکل۔ میں آپ کو اس بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گی۔''

سیف اللہ الجھن کے انداز میں اپنی پیشانی مسلتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ اسے اب

یہ فکر کھا رہی تھی کہ اگر کوکی کی شادی ملتوی ہوتی ہے تو ساتھ میں سنبل کی بھی ہوگی۔ وہ دوسری بیٹی کے سسرالیوں کو کیسے قائل کرے گا۔ شانی نے سیف اللہ سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ یہ کام بھی چوہدری بشیر کے ذریعے ہی ہوگا۔

اگلے روز شانی صبح سویرے ہسپتال چلی گئی اور اس نے عارف کمبوہ کو ہوٹل بھیج دیا..... عارف کچھ تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ پچھلے تین چار دن سے مسلسل راجو کے سرہانے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ تاؤ حشام اور اس کے ساتھی بھی ابھی ملتان میں ہی تھے۔ انہوں نے ایک قریبی ہوٹل میں دو کمرے کرائے پر لے لئے تھے۔ دوپہر کے وقت شانی نے راجو کو بستر پر ہی اٹھا کر بٹھایا۔ گلے کے زخم کے سبب اسے نگلنے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اسے مائع اشیاء دی جائیں۔ شانی نے اسے جوس پلانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ راجو کی آنکھوں کے گوشے مسلسل نم تھے۔ وہ ہر شخص سے ناراض نظر آتا تھا کراہ کر بولا۔

''تم سب لوگ مجھ سے بات چھپاتے ہو۔ کوئی بھی مجھے ٹھیک نہیں بتاتا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ کون سا دن ہے؟ اس کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں؟''

شانی نے اس کا سر دباتھ تھام لیا۔ ''راجو! کیا مجھ پر بھی یقین نہیں کرو گے؟''

شانی نے اتنی محبت اور ایسے جذبے سے کہا تھا کہ راجو انکار میں جواب نہیں دے سکا۔ اس کی خاموشی نے شانی کو حوصلہ دیا۔ اس نے اپنا سارا خلوص اپنے لہجے میں سمیٹا اور اخبار راجو کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھو..... یہ آج کا تازہ اخبار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑکا تمہارے سامنے یہاں رکھ کر گیا ہے۔ یہ دیکھو..... یہاں کیا تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ آج 12 تاریخ اور جمعرات ہے۔ کوکی کی شادی 14 تاریخ ہفتے کو تھی یعنی ابھی بھی تین دن باقی ہیں۔''

راجو نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے اخبار پر نگاہ ڈورائی اور منہ پھیر لیا۔

شانی نے اس کا سر دباتھ دبایا اور کہا۔ ''اگر تم میری بات پر اعتبار کر سکو تو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ شادی اب نہیں ہوگی۔''

راجو نے چونک کر شانی کو دیکھا۔ اس کی زندگی سے خالی آنکھوں میں ایک ساعت کے لئے امید کی کرن نظر آئی اور بجھ گئی۔ وہ منہ پھیر کر بولا۔ ''مجھے خواہ مخواہ کی تسلیاں نہ دو۔ میں سمجھ گیا ہوں اب موت کے سوا میرا کوئی علاج نہیں اور میں دکھاووں گا مر کر۔ سیف کو بھی اور اس کی بیٹی کو بھی۔'' اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رس رہے تھے۔

شانی نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ''میرے ہوتے ہوئے تجھے کچھ نہیں

www.pdfbooksfree.pk

ہوگا راجو.....اور نہ تمہاری کوکی کو۔ میں نے سب ٹھیک کرلیا ہے۔ پرسوں کوکی کی شادی نہیں ہورہی۔ اب اس کی شادی ہوگی تو تمہارے ساتھ ہوگی یہ تم سے وعدہ ہے میرا۔''

شانی کے لہجے میں موجود سچائی نے راجو کو ایک بار پھر چونکا دیا۔ وہ پلٹ کر شانی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ امید، شک، موہوم سی خوشی اور شاید تھوڑی سی ندامت بھی۔ شانی اس ندامت کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اس ندامت کا تعلق اس رات سے تھا جب راجو.....شانی کے سامنے ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے نہیں ایک ''مرد'' کی حیثیت سے آیا تھا اور اس نے اپنے ''نادان جوش'' کے زیر اثر شانی کو اپنے بستر پر گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔ خیر اب یہ پرانی بات تھی۔ شانی سب کچھ بھول چکی تھی اور راجو بھی بالکل بدل چکا تھا۔

شانی بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ سہلاتی رہی اور پورے یقین کے ساتھ اس کی امید بندھاتی رہی۔ دھیرے دھیرے وہ نارمل ہونے لگا۔ وہ شانی کی باتیں دھیان سے سننے لگا۔ شانی نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ جس شخص کے ساتھ کوکی کا بیاہ ہونے جارہا تھا وہ راجو کا اپنا رشتے دار چوہدری بشیر ہے۔ تاہم اس نے راجو کو بتایا کہ وہ اس شخص سے ملی ہے اور اسے اس معاملے کی ساری اونچ نیچ سمجھائی ہے۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ شادی ملتوی ہوگئی ہے۔

راجو کے نوخیز چہرے پر امید کی کرنیں جگمگانے لگیں۔ شانی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی اور سمجھاتی رہی کہ وہ خود کو اور کوکی کو تماشا نہ بنائے۔ صبر سے کام لے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

اسی دوران میں تاؤ حشام، بابر اور دیگر افراد بھی ہسپتال آگئے۔ راجو کے کمرے سے باہر شانی نے تاؤ حشام سے بات کی اور اس سے کہا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ معاملات اس کے بیٹے کے لئے ٹھیک ہوجائیں تو اسے جاکر سیف اللہ سے ملنا چاہیے اور اس کی دلجوئی کرنی چاہیے۔ تاؤ حشام کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ وہ منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ اس کی چوہدراہٹ و ہٹ دھرمی اسے کریانہ فروش سیف اللہ کے پاس جانے کی اجازت نہیں دے گی۔

کچھ دیر بعد شانی نے علیحدگی میں بابر سے بات کی اور اس سے کہا کہ اگر چوہدری حشام یہ ہمت نہیں کررہا تو وہ خود کرلے۔ راجو کے عزیزوں میں سے کسی ایک کا سیف اللہ کے پاس جانا اور اس کی اشک شوئی کرنا ضروری ہے۔ بابر نے یہ بات مان لی اور شانی سے کہا کہ وہ تاؤ

کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا اگر وہ راضی نہ ہوا تو پھر وہ خود چلا جائے گا۔

راجو کی حالت بہتر ہورہی تھی لیکن ابھی چھ سات روز تک اس کا ہسپتال سے فارغ ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اگلے روز شانی نے عارف کو ساتھ لیا اور لاہور چلی گئی۔ یہاں اس کی سیشن کورٹ میں تاریخ تھی۔ تاریخ بھگت کر وہ دوسرے روز پھر واپس ملتان آگئی۔ عارف بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ابھی تک فاران ہوٹل میں مقیم تھے۔ شانی جانتی تھی کہ جوہر آباد میں ڈاکٹر بہروز وغیرہ کے استقبال اور ہسپتال کے افتتاح کے لئے عارف واپس جانا چاہتا ہے مگر یہاں شانی کو تنہا چھوڑ کر جانے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بشیر اور کوکب کی شادی ملتوی ہوچکی تھی۔ بہانہ یہ بنایا گیا تھا کہ چوہدری بشیر کی ہمشیرہ بے حد بیمار ہیں (اس کی ایک دور پار کی رشتے دار واقعی بہت بیمار تھی..... چوہدری نے موقع کی مناسبت سے اسے بہن قرار دے دیا تھا) یہ چھٹے ساتویں روز کی بات ہے شانی ہوٹل میں تھی اور ہسپتال میں راجو کے پاس جانے کی تیاری کررہی تھی..... اسے چوہدری بشیر کا فون موصول ہوا۔ وہ اسے عثمانیہ ہاؤس میں بلا رہا تھا۔ اس نے کوئی ضروری بات کرنا تھی۔

شانی ہسپتال جانے کی بجائے عثمانیہ ہاؤس پہنچ گئی۔ وہ وہاں پہنچی تو سب سے پہلے فردوس سے ہی ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ مُنا کل رات سے ٹھیک نہیں ہے۔ اسے بخار ہوگیا ہے۔ کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں، بے تحاشا ضدیں کررہا ہے۔

شانی مُنے کے پاس پہنچی۔ وہ بیڈروم میں تھا اور بڑی بے دلی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر وہ اٹھا اور بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ شانی نے اسے اٹھا لیا اور چومنے لگی۔ مُنا اس کی گردن میں منہ چھپا کر بولا۔ ''تم کیوں نہیں آتی ہو؟ تم نے کہا تھا اتوار کو آؤں گی تم نہیں آئیں ابو بھی مجھے تمہارے پاس لے کر نہیں گئے۔''

''بس ایک بہت ضروری کام پڑ گیا تھا بیٹا۔ میں نے تمہیں بتانے کے لئے فون بھی کیا تھا ابو نے نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' مُنے نے شدومد سے نفی میں سر ہلایا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی شانی کی گود سے نہیں اترا۔ اس نے شانی کی گردن کو بُری طرح بھینچا ہوا تھا۔ شانی کا سانس رکنے لگا۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا اتوار کو نہ آنے کی سزا دے رہے ہو۔ میرا سانس رک رہا ہے۔''

مُنے نے گردن پر گرفت تھوڑی سی نرم کردی۔ کئی بار بڑی وارفتگی سے شانی کا رخسار چوما۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر گراسی لان میں خوشگوار دھوپ پھیلی تھی۔ ایک چھوٹا سا ہرن

www.pdfbooksfree.pk

قلانچیں بھر رہا تھا۔ کھڑکی کے عین سامنے دو مور گھوم رہے تھے۔ ایک مور نے اپنے پنکھ پھیلائے تو شانی اور مُنا بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ مُنا بدستور شانی کی گود میں تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے کندھوں پر دو ہاتھ ہیں..... وہ تیزی سے مڑی اس کے عقب میں چوہدری بشیر موجود تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ وہی کیفیت جو ایک دو مرتبہ پہلے بھی شانی نے محسوس کی تھی۔ وہ خود کہتا تھا، تم خوب صورت ہو لیکن جب میں مُنے کو تمہارے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ تمہاری خوبصورتی مکمل ہوگئی ہے۔ تب اپنے جذبات پر قابو رکھنا میرے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اب بھی جذباتی نظر آرہا تھا تاہم مُنے کی موجودگی شاید اسے اخلاقی دائرے میں رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ شانی نے اپنے سینے پر دوپٹا درست کیا اور پلو کو گھما کر سر پر لے لیا..... چوہدری کی نہایت گرم نگاہیں شانی کو سر سے پاؤں تک چھونے لگیں۔ چند لمحے بعد وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''منا! تم تھوڑی دیر کے لئے آنٹی گریس کے پاس جاؤ۔ میں تمہاری چاچی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مُنا بے چوں چرا شانی کی بانہوں سے نکلا اور باہر چلا گیا۔ چوہدری نے دروازہ بھیڑ دیا۔ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شانی سے بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' شانی بیٹھ گئی۔

چوہدری نے الماری کی طرف قدم بڑھائے شاید وہاں سے شراب کی بوتل نکالنا چاہتا تھا لیکن پھر جیسے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے فقط امپورٹڈ سگریٹ سلگانے پر اکتفا کیا اور شانی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہاں بھئی، پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

''کیسا..... فیصلہ؟'' شانی نے ذرا سہم کر پوچھا۔

چوہدری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''لو جی، ابھی تک یہی پتا نہیں کہ کیا فیصلہ کرنا ہے۔ بھئی میں تمہاری اور اپنی شادی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نکاح چار پانچ دن کے اندر ہو جائے۔ رخصتی چاہے ایک یا دو ہفتے کے بعد ہو جائے۔''

شانی کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''لیکن..... لیکن میں نے آپ سے کچھ وقت مانگا تھا۔''

''وقت سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ کیا تم دو چار مہینے یا دو چار سالوں کی بات کر رہی ہو۔'' چوہدری کی تیوری چڑھ گئی۔

''میں نے دو چار سال کی بات تو نہیں کی لیکن دو تین مہینے تو..... مم..... میرا مطلب

www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ.....''

چوہدری ایک دم بھڑک گیا۔ شانی کی بات کاٹ کر بولا۔ ''میری بات سنو شانی بیگم! میں نرا اُلو کا پٹھا نہیں ہوں۔ اتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہوں۔ سارا دن ہر رنگ کے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے میرا..... میں تمہارے ہاتھوں دوسری مرتبہ ہرگز بے وقوف نہیں بنوں گا۔ تم نے تھوڑی سی مہلت کی بات کی تھی اور تھوڑی سی مہلت مہینوں کی نہیں ہوتی۔ میں نے یہ شادی تین ہفتوں کے لئے آگے کی تھی تین ہفتے پورے ہونے سے پہلے پہلے تمہارا اور میرا نکاح ہو جانا چاہیے۔ میں اس سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوں۔''

''مگر چوہدری.....''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ میں سیدھا بندہ ہوں، سیدھا سیدھا معاملہ چاہتا ہوں۔ کچھ بھی ہو جمعے کے دن ہمارا نکاح ہو جانا چاہیے۔ رخصتی کا وقت بعد میں طے کر لیں گے۔''

''لیکن..... اتنی جلدی یہ سب کچھ.....'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

وہ بے حد سرد لہجے میں بولا۔ ''دیکھو شانی بیگم! اب تو جو کچھ بھی ہونا ہے اتنی جلدی ہونا ہے اگر تم ڈولے کے ساتھ اتنی جلدی ناصر کے گھر سے غائب ہو سکتی ہو اور اتنی جلدی تاؤ حشام کے گھر سے نکل سکتی ہو..... اور پھر پوٹھوہار پہنچ سکتی ہو، تو پھر اتنی جلدی یہ شادی بھی ہو سکتی ہے اور یہ اتنی جلدی ہی ہوگی اور اگر نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں ہوگا ہم دونوں اپنے اپنے رستے پر چلنے کے لئے آزاد ہیں۔ میں نے تم پر زبردستی پہلے کی ہے نہ اب کروں گا۔''

شانی روہانسی ہوگئی۔ اس کی نگاہوں میں کوکی اور راجو کے امید بھرے چہرے گھوم گئے۔ اس کے کانوں میں آنٹی عطیہ اور سنبل کی سسکیاں گونج گئیں۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''میں ہرگز نہیں جانتی تھی کہ آپ اس طرح کی بات کریں گے..... لیکن..... آپ مجھے کچھ سوچنے کا وقت تو دیں۔''

چوہدری کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا وہ بولا۔ ''سوچ لو۔ ابھی دن چڑھا ہے شام کے بعد تک سوچ لو۔ تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا یہاں کمرے میں ٹیلی فون بھی موجود ہے کسی سے رابطہ کرنا چاہو تو وہ بھی کر سکتی ہو لیکن شام کے بعد تمہارا فیصلہ حتمی ہونا چاہیے۔ تمہارے پاس دو راستے ہوں گے یا تو مجھے اور مُنے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلی جاؤ گی یا مجھے نکاح کا دن بتا دو گی۔''

شانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے سر جھکایا اور بے قراری سے نفی میں ہلانے لگی۔ پتا نہیں کیوں؟ بے وجہ بے سبب، ان لمحوں میں ایک دور افتادہ گیت کی آوازیں

اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو
من جا پیاری من جا

وہ سر جھکائے جھکائے سسکی۔ ''نہیں چوہدری..... اتنی جلدی..... یہ کیسے.....''

الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ چوہدری ایک دم بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی برائے نام شائستگی اور تہذیب بھی ناپید ہوگئی۔ وہ اپنے نارپوری بھائی بندوں کی طرح ایک دم اجڈ اور جھگڑالو نظر آنے لگا۔ پھنکار کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں۔ سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تُو کچھ نہیں کرے گی پرنالہ وہیں کا وہیں رہنا ہے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس سارے معاملے پر۔ لعنت بھیجتا ہوں۔'' وہ بڑے غضب کے عالم میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

شانی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ منّے نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں مور کے دو تین پَر تھے۔ یہ شاید اس نے زمین سے اٹھائے ہوں گے۔ اس نے یہ پَر شانی کے بالوں میں اڑس دیئے..... اور تالی بجاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ کتنا خوش نظر آ رہا تھا وہ۔ غالباً اس نے اپنے ابو کو آتشیں بگولے کی طرح کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بہت سی تصویریں اٹھا لایا اور شانی کو دکھانے لگا، پھر وہ اپنی کتابیں اور ہوم ورک کی کاپیاں لے آیا۔ اس نے ڈرائنگ کی کاپی پر دو تین جگہ شانی کی تصویر بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے کھلونے اٹھا لایا اور شانی کے اردگرد سجا دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو اپنے میں مگن و مصروف رکھنا چاہتا ہے..... اسے ڈر ہے کہ اگر وہ شانی کو مصروف نہ رکھ سکا تو وہ یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنے لگے گی۔

اس کی بے چین کیفیت دیکھ کر شانی نے اسے دلاسا دیا کہ وہ ابھی دو تین گھنٹے یہیں ہے، کہیں نہیں جائے گی۔ وہ ابھی تک ہلکے بخار میں تھا۔ شانی کو ڈر تھا کہ کہیں یہ بخار بڑھ نہ جائے۔ وہ اس کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دماغ گھن چکر بنا رہا۔ آنسو اندر ہی اندر اس کے حلق میں گرتے رہے۔ چوہدری بشیر کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیسے ہینڈل کرے۔ اسے امید تھی کہ شاید دو تین گھنٹے تک اس کا دماغی

ابال کم ہو جائے اور وہ اس سے بہتر حالت میں بات کر سکے۔

چوہدری پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں نظر آ رہا تھا نہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شانی نے فردوس اور زہرا سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر انہیں بھی علم نہیں تھا۔ غالباً وہ اس وسیع کوٹھی ہی کے کسی کمرے میں موجود تھا۔ شام سے ذرا پہلے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے شانی کے سارے اندازے غلط ثابت کر دیئے اور وہ ہکا بکا رہ گئی۔

زہرا نے کہا۔ ''چوہدرانی جی! آپ نے دیکھا ہے، باہر کون آیا ہے؟ دو بڑی گاڑیاں آئی ہیں۔ ایک جیپ بھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ چوہدری صاحب کے ہونے والے وہی رشتے دار ہیں۔''

شانی نے جلدی سے دوسرے کمرے کی کھڑکی میں پہنچ کر باہر جھانکا اور ششدر رہ گئی۔ اس کے پورے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے آنٹی عطیہ اور سنبل کو دیکھا۔ وہ ایک مرسیڈیز گاڑی کے پاس کھڑی تھیں۔ کوئی لڑکی موٹی چادر میں لپٹی لپٹائی مرسیڈیز سے باہر آ رہی تھی۔ شانی بس، اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی۔ وہ کوکی تھی۔ گاڑی سے نکلتے ہوئے اسے ثریا نے سہارا دیا۔ کوکی کے ماموں خلیل اور والد سیف اللہ بھی آنے والوں میں شامل تھے۔ شانی کافی فاصلے سے دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کے چہرے ستے ہوئے ہیں ان کی حیثیت یہاں عثمانیہ ہاؤس میں جبری مہمانوں کی سی ہے۔ سیف اللہ کے چند دیگر عزیز بھی مہمانوں میں شامل تھے۔ تاہم ان میں کوکی کے ماموں خلیل کے سوا کوئی اور خوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آنے والوں میں لمبی داڑھی والا ایک بزرگ بھی شامل تھا۔ ان کے سر پر ڈبی دار صافہ تھا۔

ان لوگوں کو بڑے احترام کے ساتھ عثمانیہ ہاؤس کے مہمان خانے کی طرف لے جایا گیا۔ مہمان خانہ کم و بیش ایک کینال کے رقبے میں واقع تھا اور اصل عمارت سے کم و بیش 50 میٹر کی دوری پر تھا۔ مہمان سُست قدموں سے مہمان خانے میں چلے گئے اور دروازے پر مسلح گارڈز گشت کرنے لگے۔

''یہ سب کیا ہے زہرا؟'' شانی نے از حد حیرانی اور کرب سے پوچھا۔

زہرا کے بجائے سینئر ملازمہ فردوس نے جواب دیا، سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے شک پڑتا ہے چوہدرانی جی! چوہدری جی نے اپنے سسرال والوں کو شادی کے لئے یہاں کوٹھی کے اندر ہی بلا لیا ہے۔ سنا ہے کہ باہر کسی لڑکے کا پھڈا بھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ شادی آج ہی ہونی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے فردوس کا لہجہ بے حد ڈرامائی ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

''تت..... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

فردوس نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کر لی۔ ''بس مجھے شبہ ہو رہا ہے جی۔ ابھی ایک گڈی میں گلاب اور موتیے کے کافی جیادہ پھول کوٹھی میں لائے گئے ہیں۔ ساتھ میں پھول سجانے والے دو لڑکے بھی تھے۔ وہ وڈے کمرے کی طرف گئے ہیں۔ پتا نہیں کیا کر رہے ہیں وہاں۔''

شانی کے اندر ہلچل مچ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ حالات نے ایک سنگین پلٹا کھایا ہے۔ چوہدری طیش میں آ کر ایک ایسا کام کرنے جا رہا تھا جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک دم شانی کے ذہن میں آیا کہ جو باریش شخص دیگر افراد کے ساتھ تھا وہ یقیناً نکاح خواں ہے۔ اس کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ شانی نے جو کچھ دیکھا کافی فاصلے سے دیکھا تھا۔ اس کے باوجود اسے کوکی اور اس کے اہلِ خانہ کے چہروں پر بے حد رنج اور ہراس نظر آیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ چوہدری کے شدید دباؤ کے تحت یہاں پہنچے ہیں۔

کچھ دیر بعد زہرا گھبرائی ہوئی آئی اور اس نے شانی سے کہا۔ ''چوہدری جی! ماسی فردوس کا اندازہ بالکل درست ہے۔''

''کیا ہوا؟'' شانی نے گھبرا کر پوچھا۔

''آج یہاں شادی ہو رہی ہے جی۔ جی ہاں..... میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔ چوہدری جی کے سونے والے کمرے کو سجایا جا رہا ہے۔ مسہری بنائی جا رہی ہے۔''

''اوہ میرے خدا! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔'' شانی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا۔

زہرا بولی۔ ''وہ بنی اور اس کے گھر والے مہمان خانے میں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بنی کو وہیں پر تیار کیا جائے گا۔ چوہدری جی اپنے دوستوں کو لے کر مہمان خانے میں جائیں گے اور وہاں پر نکاح ہوگا۔''

''یہ سب کیا ہے زہرا؟ زہرا میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کیا اس طرح بھی شادیاں ہوتی ہیں؟''

''اس خانوادے میں سب کچھ ہو سکتا ہے چوہدرانی جی۔'' زہرا اپنی آواز کو مزید پست کرتے ہوئے بولی۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی کھلی تھیں۔

شانی کی پریشانی دیکھ کر منا بھی سہم گیا تھا۔ جیسے بچہ اپنی والدہ کے تفکر کو اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ قریباً آدھا گھنٹہ اسی طرح شدید اضطراب اور تذبذب کی کیفیت میں گزر گیا.....

پھر چوہدری بشیر آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اندر آتے ہی منے کو

باہر جانے کا حکم دیا۔ منا سہم کر باہر چلا گیا۔ چوہدری بڑی تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مینک کے پیچھے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

وہ شانی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز کو سمجھتے ہوئے شانی بھی بیٹھ گئی۔

چوہدری نے امپورٹڈ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں اپنی گھنی مونچھوں کے اوپر سے برآمد کیا۔ ایک دھیمی لیکن دھاڑتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''شانی، میں سیف صاحب کی بیٹی کوکب سے شادی کر رہا ہوں۔ یہ شادی آج رات ہی ہو رہی ہے۔ میں نے سارے انتظام مکمل کر لئے ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ تین ہفتے.....''

''ہفتوں کی بات تب تھی جب مجھے کچھ نظر آتا کہ تم کسی فیصلے پر پہنچ رہی ہو۔'' چوہدری نے پھنکار کر شانی کی بات کاٹی۔ ''اور مجھے تو نظر یہ آ رہا ہے کہ تم صرف وقت گزار رہی ہو۔ تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور۔ میں اب تمہارے ہاتھوں اور دھوکا کھانا نہیں چاہتا۔''

''میں کوئی دھوکا نہیں دے رہی۔ میں نے وہی کہا ہے جو میرے دل میں ہے لیکن مجھے اس کے لئے وقت چاہیے۔ یہ کوئی چھوٹا فیصلہ نہیں ہے۔''

''ہاں یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ اس کے لئے صوبائی اور قومی اسمبلیوں کا مشترکہ اجلاس ہونا چاہیے بلکہ اسے اقوامِ متحدہ میں پیش کرنا چاہیے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ پھر اس نے بڑی طاقت سے سگریٹ کو اپنے جوتے تلے مسلا اور کہا۔ ''دیکھو شانی بیگم! میں پریکٹیکل آدمی ہوں۔ خوابوں میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔ میں نے تم سے کسی طرح کی زبردستی کرنا ہوتی تو کئی مہینے پہلے کر سکتا تھا لیکن میں نے تمہیں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے پورا وقت اور پوری آزادی دی ہے۔ اب میں اس گورکھ دھندے میں مزید نہیں پڑ سکتا۔ بہرحال میں نے تمہیں جو پیشکش آج صبح کی تھی، اس پر میں اب بھی قائم ہوں۔ میری بات بالکل صاف اور کلیئر ہے اگر تم نکاح کے لئے تیار ہو تو میں یہ شادی اب بھی روک دیتا ہوں لیکن.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

شانی نے لرز کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو سختی تھی وہ شانی نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بالکل پتھر نظر آ رہا تھا۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ ''لیکن اب تمہیں یہ نکاح آج ہی کرنا ہوگا۔ آج اور اسی جگہ۔ نکاح خواں آ چکا ہے، اسے ایک نکاح پڑھا کر یہاں سے جانا ہے۔ کوکب کا یا پھر تمہارا۔''

www.pdfbooksfree.pk

شانی پسینہ پسینہ ہوگئی۔ چوہدری نے ایک بہت بڑی بات کہہ ڈالی تھی۔ ایک نہایت سنگین دوراہے پر کھڑا کردیا تھا اسے۔

''آپ ایسی بات کیوں کررہے ہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ.....''

''آج میں نے ایسی ہی بات کرنی ہے۔'' چوہدری پھنکارا۔ ''تمہیں آج اور ابھی فیصلہ کرنا ہے کہ تم مجھ سے نکاح کررہی ہو یا نہیں۔''

شانی سناٹے کی کیفیت میں تھی۔ اس نے بمشکل تھوک نگلا اور بولی۔ ''میں یہ فیصلہ اکیلی کیسے کرسکتی ہوں۔ مجھے مشورہ کرنا ہے۔ تایا معصوم ہیں، خالو اعجاز..... اور چچی پروین، پھوپھو آمنہ.....''

''تم سارے کام اپنی ان چچیوں اور پھوپھیوں سے پوچھ کر نہیں کرتی ہو۔'' چوہدری کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔ ''یہ فیصلہ آج ہوگا، یا پھر کبھی نہیں ہوگا اور مجھے جلد باز یا مطلب پرست بھی نہ سمجھنا۔ ایسی بات ہوتی تو میں تمہاری فوری رخصتی کی شرط بھی رکھ سکتا تھا..... لیکن میں ایسا نہیں کررہا۔ میں تم پر کچھ بھی زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتا۔''

بات ختم کرکے چوہدری نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''شام کے چھ بجے ہیں میں نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے انتظار کرنا ہے۔ دس بجے تک میرا اور کوکب کا نکاح ہوجائے گا۔ وہ میری بیوی اور مُنے کی نئی ماں بن کر میری رہائش گاہ میں آجائے گی۔ اس دوران میں اگر تم سوچنا چاہتی ہو تو مزید سوچ لو اور اگر مشورہ کرنا چاہتی ہو تو مشورہ کرلو۔''

اس کے ساتھ ہی وہ مڑا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی بے دم سی ہوکر صوفے پر بیٹھی رہی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ چوہدری جاتے جاتے مُنے کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔ اچانک بغلی دروازہ کھلا اور زہرا اندر آئی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی اور وہ کچھ ڈری ڈری سی بھی تھی۔ شانی کی چھٹی حس نے کہا کہ وہ یہاں دروازے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھی اور شاید اس نے چوہدری کے ساتھ ہونے والے اس کی ساری گفتگو سنی ہے۔ چند سیکنڈ بعد شانی کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ زہرا کے ہونٹ ڈر کی وجہ سے ہلکے نیلے ہورہے تھے۔ وہ بولی۔ ''چوہدری صاحب بڑے غصے میں ہیں۔ میں نے ان کو بہت کم اس طرح سے دیکھا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ ہم..... میں نے ان کی ساری باتیں سنی ہیں۔ وہ آپ سے شادی کرنے کا کہہ رہے تھے ناں؟''

شانی اثباتی انداز میں خاموشی رہی۔ زہرا اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے بولی۔ ''چھوٹی چوہدرانی! وہ آپ سے یہی کہہ رہے تھے ناں؟''

''نہیں، وہ صرف نکاح کی بات کررہا تھا۔''

''ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا جی۔ کیا خبر نکاح کے بعد یہ آپ سے کہیں کہ بس اب تم بیوی ہو۔ اب کہیں نہیں جاؤ گی۔ زبردستی کے نکاح اور رخصتیاں تو یہ لوگ کرتے ہی رہتے ہیں۔ پچھلے مہینے چوہدری قادر کے چھوٹے بھائی نے کیا کیا ہے؟ اپنے کالج کی ایک سہیلی کو کوٹھی دکھانے کے بہانے کوٹھی میں لایا اور شام تک اس کو مار پیٹ کر اس سے نکاح بھی کرلیا۔ کُڑی کے ماں باپ تھے نہیں، بس ایک نانی تھی وہ روتی پیٹتی ہی رہ گئی۔''

شانی بے قراری سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس گھمبیر مشکل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا کہ یہ ساری کوٹھی اپنی چھتوں سمیت دھڑام سے اس پر آگرے گی اور وہ چیخ بھی نہیں سکے گی۔ چوہدری اسے صرف اور صرف چار گھنٹے کا وقت دے کر گیا تھا۔ ان چار گھنٹوں میں وہ کہاں جاسکتی تھی کس سے مشورہ کرسکتی تھی۔

اس کے ذہن میں پہلا نام عارف کا ہی آیا۔ وہ اب تک ایک مخلص اور باتدبیر ساتھی ثابت ہوا تھا۔ شانی نے زہرا سے کہا کہ فردوس کو بلاؤ۔ فردوس کی حیثیت یہاں سینئر ملازمہ کی تھی۔ شانی نے فردوس سے کہا۔ ''چوہدری جی تک میرا پیغام پہنچا دینا۔ میں کسی کام سے جارہی ہوں۔ دو تین گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ میری واپسی تک وہ کسی طرح کا کوئی فیصلہ نہ کریں۔''

فردوس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی نے کہا۔ ''میرے الفاظ دہراؤ۔ میں نے کیا کہا ہے؟''

فردوس نے شانی کے الفاظ دہرا دیئے۔ ''میں کسی کام سے جارہی ہوں۔ دو تین گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ میری واپسی تک وہ کسی طرح کا کوئی فیصلہ نہ کریں۔''

شانی عثمانیہ ہاؤس سے نکلی اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھا ہسپتال پہنچی۔ عارف کمبوہ یہاں موجود تھا۔ تاؤ حشام تو دکھائی نہیں دیا تاہم اس کے ایک دو کارندے راجو کے پاس تھے۔ شانی، عارف سے مشورے کے لئے یہاں آئی تھی لیکن یہاں آکر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے اور اس سنگین ترین مسئلے کے حوالے سے عارف اسے کیا تجاویز دے سکتا ہے۔

شانی آدھے گھنٹے تک عارف کے پاس رہی لیکن اپنے اندر کی طوفانی ہلچل کے حوالے سے ایک لفظ بھی عارف سے نہ کہہ سکی۔ راجو کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ وہ خود چل کر باتھ روم تک گیا اور پھر شانی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے سارے سوالات کو کی اور اس کے گھر

www.pdfbooksfree.pk

والوں کے بارے میں ہی تھے۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ کوکی کیا سوچ رہی ہے؟ کوکی کے سسرالی اب کیا کہتے ہیں؟

شانی نے راجو کے ان سوالوں کے مناسب جواب دیئے۔ وہ راجو کے سامنے مسکرانے اور مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اپنے دل کی حالت کا اسے ہی پتا تھا، راجو اسے بے حد بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ ایک عجیب سا دھیما پن آگیا تھا اس کے برتاؤ میں۔ عارف نے شانی کو یہ بتا کر حیران کیا کہ پرسوں راجو نے اپنا سونے کا کنٹھا (ہار) جو بارہ ہزار سے کم کا نہیں تھا ایک فقیر کو خیرات کر دیا ہے۔ جلد ہی وہ راجو کے پاس سے اٹھ کر باہر آگئی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ شہر کے در و بام برقی روشنی سے جگمگا اٹھے تھے۔ وہ چلتی ہوئی ہسپتال سے باہر کھلی سڑک پر نکل آئی۔ فٹ پاتھ صاف ستھرا تھا۔ دو رویہ درخت نیم گرم ہوا میں جھوم رہے تھے۔ شہر کے باسی اپنی مصروفیات میں مگن تھے کچھ تیز رفتار قدموں کے ساتھ اور کچھ تیز رفتار گاڑیوں میں اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے درمیان فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی ایک تنہا لڑکی کرب کے کتنے بڑے سمندر سے گزر رہی ہے۔ وہ ہنستے بستے ملتان کے باسیوں کے درمیان تھی لیکن ان سے بہت بہت دور تھی۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کوئی مشورہ دینے والا نہیں تھا۔ وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر رو نہیں سکتی تھی۔

پتا نہیں کیوں اسے بار بار رستم یاد آرہا تھا۔ آج کل وہ اسے جس طرح یاد آرہا تھا پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلے شاید وہ صرف ایک خیال تھا، اب وہ ایک ٹھوس حقیقت بن گیا تھا۔ پوٹھوہار کے رنگین ٹیلوں میں ایک گہری دراڑ کے اندر شانی نے اس حقیقت کو جسم اور روح کی تمام شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی ان لمحوں کو، شاید مر کر بھی نہیں۔ ان لمحوں نے اسے محبت اور زندگی کے نئے معنوں سے آشنا کیا تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ مرد و زن کا تعلق کتنا حسین اور کتنا خوشبو دار ہوتا ہے۔ وہ جادوئی لمحے شانی کی رگ رگ میں سما گئے تھے اور ان لمحوں نے شانی کو رستم کے اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر لمس میں رستم کا لمس محسوس کرتی تھی، اس کو ہواؤں میں رستم کے پسینے کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ وہ مانتی نہیں تھی لیکن جانتی اچھی طرح تھی کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں یہ خواہش پیدا ہو چکی ہے کہ وہ کسی موقع پر پھر سے اس لمس کو محسوس کرے پھر سے ان مہربان ہونٹوں کے لمس سے آگاہ ہو، ایک بار پھر اس پسینے کی مہک اس کی سانسوں میں داخل ہو۔ چاہے ایک بار ہو لیکن ہو۔ رستم سے منہ موڑنا، پہلے کبھی اتنا مشکل نہ تھا۔ اس کی ہر ہر رگ میں کھچاؤ پیدا

ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔ یوں تو اس کی زندگی کا کوئی راستہ رستم کی طرف نہیں جاتا تھا۔ وہ دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے لیکن پھر بھی ایک بے نام ڈور تو تھی..... ایک نامعلوم آس تو تھی لیکن اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس میں یہ بے نام ڈور اور نامعلوم آس بھی ناپید ہو جانا تھی۔

''میں کیا کروں..... کدھر جاؤں؟'' اس کے اندر سے یہ سوال ایک کرب ناک پکار بن کر ابھرا۔

اس کے اندر کی عورت نے کہا۔ ''شانی! تجھے اب تسلیم کر لینا چاہیے کہ تُو اس سے محبت کرتی ہے۔ تیری روح اور تیرے جسم میں اس کی چاہ ہے اور شاید جتنی محبت وہ شخص تجھے دے سکتا ہے، دنیا میں کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اگر زندگی نے کسی موڑ پر کسی انہونی کے سبب تجھے اس شخص کا ساتھ مل گیا تو پھر یہ زندگی..... زندگی نہیں رہے گی ایک حسین ترین سپنے کی تعبیر بن جائے گی۔ ایک ایسا سپنا جو اس رُوئے زمین پر شاید ہی کسی آنکھ نے دیکھا ہو۔ تیری زندگی تجھے دیئے گئے سارے دکھوں اور زخموں کے قرض یوں اُتارے گی کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔ تُو اس شخص کی طرف جانے والے راستوں کو ہمیشہ کے لئے بند نہ کر۔ تُو یہ راستے بند کر کے اپنے جینے کا راستہ بند کر دے گی۔''

رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا ہیولا شانی کے سامنے آگیا۔ یہ اس کا اپنا ہی ہیولا تھا لیکن یہ بھاری بھرکم لباس اور سونے چاندی کے وزنی زیورات سے سجا ہوا تھا۔ اس ہیولے کے پس منظر میں پُرکھوں کی وہ حویلی تھی جس نے نسل در نسل اس علاقے میں اپنی شان قائم رکھی تھی اور خاندانی روایات کی پاسداری کی تھی۔ یہ ہیولا گویا ہوا۔ ''شانی! کیوں رہی سہی عزت بھی اب خاک میں ملا رہی ہو۔ تُو کچھ بھی کہے لیکن رستم ایک بدنام ڈاکو ہے۔ تُو اس ڈاکو کا ہاتھ تھامے گی تو تیرے خاندان کی آنے والی نسلیں تجھے کبھی معاف نہیں کریں گی اور آنے والی نسلوں کی بات تو بعد کی ہے۔ تیرے جو بچے کھچے رشتے رہ گئے ہیں ان پر کیا گزرے گی۔ وہ اپنا منہ چھپاتے پھریں گے۔ لوگ ان کا جینا حرام کر دیں گے۔''

شانی کے اندر کی آواز نے رستم کا دفاع کیا۔ ''لیکن وہ ڈاکو نہیں ہے۔ اسے حالات نے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ بے شمار لوگ ایسے بھی تو ہیں جو اس کا نام لے لے کر جیتے ہیں۔ جن کے نزدیک اس کا مقام عام لوگوں سے بہت اونچا ہے۔''

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔'' چھوٹی چوہدرانی کے ہیولے نے تاویل پیش کی۔ ''ہر ڈاکو یہی کہتا ہے کہ اسے حالات نے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ

www.pdfbooksfree.pk

ڈاکو ہے۔ درجنوں افراد کا قتل اس کے ہاتھوں سے ہو چکا ہے۔ کیا تُو ایسے شخص کا ہاتھ تھامنے کی تمنا دل میں پال رہی ہے، جو کسی بھی وقت پوٹھوہار کے ٹیلوں میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن سکتا ہے۔''

''یہ دلیل بہت کمزور ہے۔'' شانی کے اندر سے آواز ابھری۔ ''محبت کی چند گھڑیاں بھی مل جائیں تو یہ ''بے محبت'' کی سو سالہ زندگی پر بھاری ہوتی ہیں.....''

''لیکن تُو یہ کیوں نہیں سوچتی۔ وہ اپنا رخ بدل چکا ہے۔ وہ نادیہ سے شادی کر چکا ہے۔ اب اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے۔ اس کو خدا حافظ کہنے کے لئے اس سے بہتر وقت اور کون سا ہوگا..... ہاں شانی خدا حافظ کہہ دے۔ دل کی گہرائیوں سے الوداع کر دے..... اور وہ سب کچھ حاصل کر لے جو اس کے بدلے تجھے اور تیرے ذریعے دوسرے لوگوں کو مل رہا ہے۔ چوہدری بشیر کے پاس چلی جا۔ اپنے روتے سسکتے مُنے کو گلے سے لگا کر بھینچ لے۔ کوکی کو بچا لے۔ راجو کو موت کے منہ سے کھینچ کر زندگی کی طرف لے آ۔ ایک بااثر چوہدرانی بن کر علاقے کے لوگوں کے لئے وہ سب کچھ کر گزر جو کرنا چاہتی ہے..... قربانی اور ایثار تیرے خاندان کی روایت ہے اور یہ سب کچھ تجھے خاص طور سے اپنی ماں کے ذریعے ملا ہے۔ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس روایت کی امین بن جا.....''

شانی نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی۔ اسے لگا کہ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں۔ کوئی نادیدہ ہاتھ کلیجے کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہے۔ اس نے سوچا، کاش رستم کا لمس پانے سے پہلے یہ گھڑی آ گئی ہوتی۔ فیصلہ کرنا اتنا کٹھن اور جان لیوا نہ ہوتا۔

اس نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھی۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اسے دس بجے تک ہر صورت عثمانیہ ہاؤس میں پہنچنا تھا۔ تقریباً آدھ پون گھنٹہ تو اسے راستے میں ہی لگ جانا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، آج چوہدری بشیر نے ہر صورت اپنے الٹی میٹم پر عمل کرنا ہے۔ اگر وہ مقررہ وقت تک اپنی ''رضامندی'' لے کر اس کے پاس نہ پہنچی تو وہ کوکی سے نکاح کر لے گا۔

فیصلے کے بے پناہ بوجھ سے اس کا جسم لرزنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی تو وہ یہ بھی ٹھیک سے نہیں جانتی تھی کہ عثمانیہ ہاؤس پہنچنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ چوہدری نے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ نکاح کرے گا لیکن زہرانے اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا..... کیا خبر جی کہ نکاح کے بعد چوہدری صاحب کہیں کہ بس اب تم بیوی ہو، اب کہیں نہیں جاؤ گی..... شانی کی نگاہ میں جلیہ عروسی گھوم گیا جو عثمانیہ ہاؤس کے ایک کمرے میں بڑی جلدی

www.pdfbooksfree.pk

میں آراستہ کیا گیا تھا۔

اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا لیکن فیصلہ تو کرنا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا..... اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ یہ ایثار اور قربانی کا فیصلہ تھا۔ وہ اٹھی اور تن تنہا عثمانیہ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رستے چلے جا رہے تھے۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے ٹیکسی مل گئی۔ وہ عثمانیہ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ سڑکیں جگمگا رہی تھیں۔ گاڑیوں کا رش تھا۔ ضلع کچہری کے قریب سڑک زیر تعمیر تھی اور ٹریفک بلاک ہو رہی تھی۔ شانی کی نگاہ بار بار گھڑی کی طرف اٹھتی تھی..... سوئیاں حرکت میں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ زیادہ تیزی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

شانی نے بچپن میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر اباجی سے ایک کہانی سنی تھی۔ بادشاہ ایک شخص کو پھانسی کی سزا دیتا ہے۔ اس شخص کو چند بہت ضروری کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ اس شخص کا ایک دوست بادشاہ کو ضمانت دیتا ہے کہ میرے دوست کو اپنے ناگزیر کاموں کے لئے جانے دیا جائے اگر یہ مقررہ وقت پر نہ آ سکا تو اس کی جگہ میں تختۂ دار پر لٹک جاؤں گا۔ کہانی کے آخر میں اسی طرح سفر کی طوالت اور وقت کی کمی سامنے آتی ہے۔ اپنے ضامن دوست کو پھانسی سے بچانے کے لئے وہ شخص تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پھانسی گھاٹ تک پہنچتا ہے اور خود کو سزا کے لئے پیش کر دیتا ہے۔

''ڈرائیور! مجھے جلدی پہنچنا ہے کسی طرح یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

''میڈم! آگے پیچھے سے بلاک ہے ٹریفک، اب کیا کروں۔ تھوڑی دور ایک کٹ ہے لیکن وہاں تک پہنچیں گے تو پھر ہے ناں۔''

شانی نے مزید دس منٹ تک بے صبری سے انتظار کیا۔ اب بمشکل اتنا ہی وقت تھا کہ وہ آگے جا کر کوئی اور ٹیکسی لیتی اور منزل تک پہنچتی۔ اس نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے باہر نکل آئی۔ وہ رش سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ وہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے لگا جیسے عثمانیہ ہاؤس کے ایک بند کمرے میں عروسی جوڑا پہنے کوکی اپنے ہی آنسوؤں میں ڈوب رہی ہے اور منتظر نگاہوں سے شانی کا راستہ دیکھ رہی ہے۔ شانی کو دوسری طرف کی سڑک پر ایک ٹیکسی کھڑی نظر آئی۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ یہی وقت تھا جب اسے اپنی دائیں جانب تیز چمک محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے پہیوں سے چرچراہٹ کی طویل احتجاجی آواز بلند

ہوئی۔ شانی کو لگا کہ کوئی سخت چیز اس کے گھٹنوں سے ٹکرائی ہے، وہ ہوا میں لہرائی اور کئی میٹر پیچھے گری۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

شانی کو ہوش آیا تو اس کی نگاہوں کے سامنے سب سے پہلے ایک سفید چھت آئی۔ اُسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ایک نرس اس سے چند فٹ کی دوری پر موجود تھی۔ وہ اس کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ شانی کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کہاں اور کیوں ہے؟

پھر جیسے کوئی رکی ہوئی مشین برقی رَو بحال ہونے سے ایک دم چل پڑتی ہے، اس کا ذہن بھی کام کرنے لگا۔ نوخیز کوکی کا آنسوؤں سے تر چہرہ اس کی نگاہوں میں آیا..... اسے یاد آیا کہ وہ کوکی تک پہنچنے کے لئے سڑک عبور کر رہی تھی..... ''اوہ میرے خدا۔'' وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یوں اٹھنے سے اس کے سر میں ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ بے ساختہ اپنے سر پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک بڑی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نرس نے ناراض ہو کر کہا۔ ''کیا کرتی ہیں آپ؟ سوئی نکل گئی ہے۔''

نرس نے شانی کو دوبارہ لٹانے کی کوشش کی لیکن شانی نے لیٹنے سے انکار کر دیا۔ ''کیا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے بتاؤ..... پلیز مجھے بتاؤ، مجھے جانا ہے۔''

اس نے وقت دیکھنے کے لئے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ سائیڈ کی دیوار پر وال کلاک موجود تھا۔ سوئیاں ساڑھے پانچ کا وقت بتا رہی تھیں۔ ساڑھے پانچ؟ اسے تو دس بجے عثمانیہ ہاؤس پہنچنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے سات گھنٹے اوپر ہو چکے ہیں۔ وہ سرتاپا لرز گئی۔

اس نے ڈرپ کو کھینچ کر اپنے بازو سے علیحدہ کیا اور بستر سے نیچے اُتر گئی۔ ایک نوجوان ڈاکٹر تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ''آپ یہ کیا کر رہی ہیں بی بی۔ آپ کو چوٹ لگی ہے۔ ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''نہیں..... مجھے جانا ہے۔ آپ کو پتا نہیں، مم میرا جانا کتنا ضروری تھا۔ اوہ میرے خدا۔ میں کیا کروں۔ میں کہاں ہوں اور کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

جواب میں نوجوان ڈاکٹر نے اسے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ یہ ایک نجی پرائیویٹ ہسپتال کا وارڈ ہے۔ گل فشاں ٹاؤن کے قریب سڑک پار کرتے ہوئے وہ ایک کار سے ٹکرائی تھی۔ کار والا دو افراد کے ساتھ اسے یہاں لایا ہے۔ وہ رات بھر یہاں رہا تھا۔ صبح چلا گیا تھا، اب پھر آ گیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے چونک کر پوچھا۔ ''رات بھر سے کیا مطلب؟ اب کیا وقت ہوا ہے؟''

''اب شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

شانی نے ایک بار پھر سر تھام لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے سات گھنٹے نہیں، ساڑھے اُنیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ کوکی کا حسین لیکن غم زدہ چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا..... ڈاکٹر کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اسے بتا رہا تھا۔ ''آپ کار سے ٹکرانے کے بعد بجلی کے ایک پول سے ٹکرائی تھیں۔ دو ڈھائی گھنٹے تک بالکل بے ہوش رہی تھیں۔ بعد میں آپ کو سکون بخش دوا دی گئی۔ آپ کے دائیں گھٹنے اور کندھے پر بھی چوٹ آئی ہے لیکن یہ چوٹیں زیادہ سنگین نہیں ہیں۔

''مجھے جانے دیں۔'' شانی کراہ کر بولی۔ ''میری..... چھوٹی بہن سخت مصیبت میں ہے۔ پلیز مجھے جانے دیں۔''

ڈاکٹر نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن شانی نے دھکیل کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ بیڈ کے قریب ہی اس کی جوتی پڑی تھی اس نے جوتی پہنی اور ننگے سر وارڈ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ وارڈ کے دیگر مریض اور اسٹاف اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں بڑی عمر کا ایک کلین شیو شخص سامنے نظر آیا۔ وہ شانی کو دیکھ کر چونکا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی گاڑی سے وہ ٹکرائی تھی۔

وہ شانی کو دیکھ کر ہکلایا۔ ''آ..... آپ کدھر جا رہی ہیں؟ ابھی آپ کو.....''

''آپ پیچھے ہٹ جائیں۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میری بہن مشکل میں ہے۔''

وہ باہر نکلی تو وہ پیچھے پیچھے آیا۔ ''دیکھیں..... آپ اس طرح نہ جائیں..... اور اگر جانا ہے تو پھر میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔''

شانی نے ایک لمحہ تامل کے بعد کہا۔ ''کدھر ہے آپ کی گاڑی؟''

''آیئے میرے ساتھ۔'' وہ آگے بڑھا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''آپ کی شال اور شولڈر بیگ بھی گاڑی میں ہی ہے۔''

شانی تھوڑا سا لنگڑا رہی تھی اور اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس مہربان چہرے اور مہربان لہجے والے شخص کے ساتھ اس کی ہونڈا گاڑی میں بڑی سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ شانی کی شال اور بیگ وغیرہ اسے واپس مل گئے۔ ادھیڑ عمر شخص نے

کہا۔ ''میں کل ساری رات آپ کا اتا پتا جاننے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہوا مجھے بڑا افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی شدید چوٹ آئی۔''

''نہیں جی..... مجھے یقین ہے کہ اس میں قصور میرا ہی تھا۔ میں ہی بدحواس ہوگئی تھی۔''

وہ شخص ذرا تذبذب سے بولا۔ ''میرا نام سعید کرمانی ہے۔ میں گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا ہوں۔ ابھی آپ نے کہا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ اگر میں کسی طرح آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں تو بتائیں۔''

''نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔'' شانی نے قطعیت سے کہا۔ ''آپ مجھے بس ''ہری کوٹھی سٹاپ'' تک پہنچا دیں۔''

عثمانیہ ہاؤس ''ہری کوٹھی سٹاپ'' سے بس تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ شانی کا سینہ بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ عثمانیہ ہاؤس میں کیا صورتِ حال ہے۔ امید تو نہیں تھی کہ کوئی ابھی تک محفوظ ہوگی لیکن چند فیصد چانس ضرور تھا۔ شاید..... شاید کچھ ایسا ہوگیا ہو کہ کل شادی نہ ہوسکی ہو۔

مطلوبہ سٹاپ کے سامنے اُتر کر شانی نے سعید کرمانی کا شکریہ ادا کیا اور مزید کچھ کہے بغیر عثمانیہ ہاؤس کی طرف بڑھ گئی۔ اب شام ہوگئی تھی۔ اسے دور ہی سے عثمانیہ ہاؤس کا وسیع آہنی گیٹ نظر آگیا۔ گیٹ پر فٹ بال کے سائز کے بڑے بڑے دودھیا بلب روشن تھے۔ شانی گیٹ پر پہنچی۔ اسے اندر چہل پہل نظر آئی۔ مسلح گارڈز نے شانی کو پہچاننے کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اندر کا منظر دیکھ کر شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے احاطے کے وسط میں کوکی اور چوہدری بشیر کو دیکھا۔ کوکی زرق برق عروسی لباس میں تھی اور چوہدری کے پہلو میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ سر جھکائے بالکل خاموش چوہدری اور کچھ دیگر افراد ہیڈ منشن کا ایک میچ دیکھ رہے تھے۔ یہ میچ چوہدری کے غیر ملکی مہمانوں کے درمیان ہو رہا تھا..... ایک طرف خوش اندام گریس تھی، دوسری طرف سنہری بالوں والی ایک اور لڑکی۔ گریس نے ہلکی سی شرٹ اور نیکر پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں اس کا جواں جسم مچل رہا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھے تماشائیوں میں کوکی کے والد سیف اللہ، ماموں خلیل، بہن سنبل اور دیگر رشتے دار شامل تھے۔ وہ شکلوں سے ہی مرعوب اور دبے دبے دکھائی دیتے تھے۔

شانی دھیرے دھیرے چلتی ہیڈ منشن کورٹ کے قریب پہنچ گئی۔ سب کھیل میں گم تھے۔ شانی کی نگاہ کوکی کے چہرے پر پڑی۔ اس ایک نگاہ نے ہی جیسے ہر بات شانی کے سامنے

کھول کر رکھ دی۔ کوکی ایک خوبصورت موم گڑیا کی طرح پتھریلے چوہدری بشیر کے پہلو میں غم زدہ اور خاموش بیٹھی تھی۔ بکھری بکھری اور زرد زرد سی۔ اس کی صبح اس کی رات کا فسانہ کہہ رہی تھی۔ وہ ایک نوخیز کلی نہیں رہی تھی۔ کل رات سہاگ کی سیج نے اس کی دوشیزگی لے کر اسے لڑکی سے عورت بنا دیا تھا اور اسے عورت بنانے والا، گردن اکڑائے اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ ہاں، وہ ہار چکی تھی پیار کی بازی اور اس کے ساتھ ساتھ راجو بھی ہار چکا تھا۔ شانی کے سینے سے ایک گہری ٹیس اٹھی اور وہ بے حال سی ہوگئی۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ یہیں سے واپس مڑ جائے اور روتی ہوئی کہیں دور نکل جائے لیکن اسی دوران میں چوہدری بشیر کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ واضح طور پر چونکا اور پھر ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ دونوں کی نگاہ ملی۔ پھر چوہدری، تماشائیوں میں سے نکل کر سیدھا اس کی طرف آیا۔

شانی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ شال اس کے سر پر تھی لیکن پیشانی پر بندھی ہوئی پٹی نظر آرہی تھی۔ چوہدری سفید لٹھے کے کلف لگے کھڑکھڑ کرتے سوٹ میں تھا۔ چمک دار کھسے کی نوک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بے حد تیز نظروں سے شانی کو سر تا پا گھورا..... غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اب کیا لینے آئی ہو؟''

''شش..... شادی ہوگئی ہے؟'' شانی نے ایک بے معنی سوال کیا۔ جو کچھ وہ دیکھ چکی تھی اس کے بعد یہ سوال بے معنی ہی تھا لیکن شاید دل میں اب بھی امید کی کوئی موہوم کرن موجود تھی۔

چوہدری زہر بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں دس بجے تک تمہارا انتظار کروں گا لیکن میں نے دو گھنٹے مزید تمہاری راہ دیکھی تھی یہاں موجود لوگ اس بات کے گواہ ہیں..... اور اب تم مجھے کوئی کہانی گھڑ کر مت سنانا۔ میں تمہاری فطرت اچھی طرح جان چکا ہوں۔''

''میں سچ کہتی ہوں۔ میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ میں رات بھر ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی ہوں۔''

''کیا ہوا تھا؟''

''سڑک پار کرتے ہوئے ایک کار سے ٹکرائی تھی۔ سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔''

چوہدری نے شانی کے تاثرات کا جائزہ لے کر ایک لمبی سانس لی اور پہلو بدل کر بولا۔ ''خیر! یہ ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو کچھ اور ہو جاتا لیکن یہ بات تو طے تھی کہ تمہارا جواب بالآخر انکار میں ہی ہونا تھا اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''ایسا نہیں ہے۔ میں یہاں ہی آ رہی تھی۔'' شانی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پتا نہیں کہ اسے یہ بات کہنی چاہیے تھی یا نہیں۔

چوہدری کی گھنی مونچھوں کے نیچے ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک ایسی بات کہی جس کی توقع شانی کو ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم فی الوقت تو نہیں تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''ٹھیک ہے، اگر ایسی بات ہے تو..... اب کیا بگڑ گیا ہے۔ ہم اپنی اپنی جگہ واپس آ جاتے ہیں۔ تم کہتی ہو تو میں چھوڑ دیتا ہوں سب کچھ۔'' وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے یہ حقیقی زندگی کا نہیں، گڈی گڈے کے کھیل کا ذکر ہو رہا ہے۔

شانی لرز کر رہ گئی۔ ''سب کچھ'' سے چوہدری کی مراد کوکی ہی تھی۔ کوکی جس کی دوشیزگی وہ سہاگ کی سیج پر چھین چکا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس نے کتنی بڑی متاع لے لی ہے کوکی سے۔ جو کچھ وہ حاصل کر چکا تھا اس کی قدر و قیمت کوئی عورت ہی جان سکتی تھی اور وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے بازار میں فروخت ہونے والی کسی پروڈکٹ کا ذکر کر رہا ہو۔

شانی کا دل چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر ایک تھپڑ چوہدری بشیر کے رخسار پر دے مارے اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل جائے لیکن وہ کہاں کر سکتی تھی یہ سب کچھ؟ وہ تو شاید کوکی ہی کی طرح حالات کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ایک بے بس ہستی تھی، جسے ایک سانس لینے کے بعد دوسرا سانس لینے کے لئے بھی معاشرے کی اجازت درکار تھی۔

اسی دوران میں چوہدری کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے پہلے نمبر چیک کیا پھر شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم بیٹھو، مُنے سے ملنا ہے تو اس سے مل لو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔'' اس نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا اور کہا۔ ''بیگم صاحبہ کو اُدھر کرسی پر بٹھاؤ۔''

چوہدری نے کال ریسیو کی اور باتیں کرتا ہوا عمارت کے داخلی دروازے کی طرف چلا گیا۔ شانی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اب کوکی اور اس کے گھر والوں کا سامنا کرتی۔ کتنی امیدیں دلائی تھیں اس نے انہیں۔ کتنا حوصلہ دیا تھا لیکن وہ ہونی کو ٹال نہیں سکی تھی۔

اچانک شانی کو عمارت کی چھت کی طرف سے ایک باریک چہکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ چھت پر مُنا موجود تھا۔ اس نے منڈیر کے اوپر سے شانی کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ یقیناً زینے سے اُتر کر نیچے آ رہا تھا شانی کے پاس۔

لیکن شانی کے دل و دماغ میں تو زلزلہ برپا تھا۔ وہ سرتاپا آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے مُنے کی آواز سن کر جھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ مُنے سے ملے بغیر ہی واپس جانے کے لئے مڑ

www.pdfbooksfree.pk

گئی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ بیرونی گیٹ پر تھی جب اسے اپنے عقب میں مُنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکارتا ہوا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ جیسے لوہے کا ننھا سا ذرہ مقناطیس کی طرف لپکتا ہے۔ شانی اسے نظر انداز کرتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئی۔ ایک گارڈ نے شانی کو متوجہ کیا۔ ''میڈم! ننھے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

شانی سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ہسپتال میں راجو کے پاس موجود تھی۔ عارف کمبوہ شانی کی وجہ سے پریشان تھا اور ہوٹل کے علاوہ کئی جگہ شانی کے لئے فون کر چکا تھا۔ شانی کے سر پر پٹی اور چال میں لنگڑاہٹ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہوا۔ شانی نے اسے مختصر الفاظ میں کل رات پیش آنے والے سارے واقعات بتائے۔ عارف کو مکمل رازداری کا پابند کرنے کے بعد شانی نے اس پر یہ انکشاف بھی کر دیا کہ کل رات عثمانیہ ہاؤس میں ہی کوکب اور بشیر کی شادی ہو گئی ہے۔

عارف بے حد آزردہ خاطر نظر آنے لگا، پھر وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ''لیکن شانی بہن! اس مُنڈے کا کیا ہو گا؟ یہ تو جھلا کملا ہو رہا ہے اس لڑکی کے لئے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''آپ کو پتا ہے آج سویرے کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس نے کھڑکی میں سے ایک لڑکی کو دیکھا۔ اسے شک گزرا کہ وہ شاید کوکی ہے۔ میں باہر ناشتہ کرنے گیا ہوا تھا۔ یہ اٹھ کر اس لڑکی کے پیچھے چل دیا۔ نرسیں روکتی رہ گئیں لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ اس سامنے والے چھوٹے برآمدے تک یہ اس گُڑی کے پیچھے گیا جب تسلی ہوئی کہ یہ کوئی اور ہے تب واپس آیا۔ رات کو نیند میں بھی بڑبڑا کر اسی کا نام لیتا ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے اس کی حالت دیکھ کر۔''

شانی ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ اسی دوران میں راجو کی نگاہ شانی پر پڑ گئی۔ اس نے آواز دے کر شانی کو اندر بلا لیا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ شانی اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ بولا۔ ''تم نے کہا تھا، شادی تین ہفتے کے لئے رکی ہے۔ اب کافی دن باقی نہیں، اب کیا کرنا ہے؟''

شانی کے دل پر گھونسا لگا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ کھیل پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ وہ جس کوکی کے نام پر سانس لے رہا ہے وہ کسی کی منکوحہ بن چکی ہے۔ شانی کو چپ دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ ''کل ابا کہہ رہا تھا کہ میں تم سے ساری بات کھول کر پوچھ لوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم دیکھتے

رہ جائیں اور چپ چپیتے کوئی کام ہو جائے۔''

شانی نے کہا۔''حوصلہ رکھو راجو۔ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے۔''

''کل بھائی بابر پھر کوکی کے ابا جی سے ملنے ان کے گھر گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب کہیں گئے ہوئے ہیں۔ گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔''

''کہیں کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔'' شانی نے کہا۔ اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود اسے بھی بڑی شدت سے محسوس ہوا۔

''تم کل ملی ہو اس سے؟'' راجو نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں..... کل تو نہیں ملی۔ شش شاید آج ملوں گی۔''

راجو کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تکیے کے غلاف میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور شانی سے کہنے لگا۔''میرا یہ خط اسے دے دینا..... اور اگر..... اگر وہ کوئی خط دے تو مجھے لا دینا۔''

شانی نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر خط راجو سے لیا اور اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔ شانی کے لئے اپنے آنسو روکنے مشکل ہو رہے تھے۔ راجو نے شانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''بدھ کے روز بھائی بابر جا کر کوکی کے ابا جی سے ملے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے ابا جی ناراض تو ہیں پر لگتا ہے کہ دوتن دار کوشش کی جائے تو من جائیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ من جائیں گے ناں؟''

''ہاں۔'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے آنسو چھپانے کے لئے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ایک خوش لباس اور سنجیدہ صورت عورت نے اس کا راستہ روک لیا۔

''کیا آپ راجو کی عزیز ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ ہی کا نام شانی تو نہیں؟'' عورت نے شانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شانی نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے گرم جوشی کے ساتھ شانی سے ہاتھ ملایا۔

''میرا نام راحت ہے۔ میں یہاں پر سائیکاٹرسٹ کے طور پر کام کر رہی ہوں۔ راجو کا کیس بھی مجھے ریفر کیا گیا ہے۔ میں نے کل اور پرسوں راجو سے بات کی تھی۔ اس کی باتوں سے ہی مجھے آپ کا نام بھی معلوم ہوا۔ میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس پندرہ بیس منٹ کا وقت ہوگا؟''

www.pdfbooksfree.pk

''کیوں نہیں..... آپ فرمائیں۔''

''آیئے میرے ساتھ۔'' عورت نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور شانی ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جواں سال عورت کے چہرے پر گہری سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بولی۔''راجو جس خطرناک کیفیت سے گزر رہا ہے ہم اسے سائیکالوجی کی زبان میں Suicidal Behavior کہتے ہیں۔ جب ایسا رویہ ٹین ایجرز میں ظاہر ہوتا ہے تو زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ محبت کا شکار ہونے والے نوعمر لڑکے لڑکیاں بے حد جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی محبت کو ایک چیلنج کے طور پر لیتے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنی محبت کی شدت ثابت کرنے کے لئے جان تک گنوا دیتے ہیں۔ میں راجو میں جو علامات دیکھ رہی ہوں وہ سب کی سب تشویش ناک ہیں۔''

''میں آپ سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں ڈاکٹر۔'' شانی نے کہا۔

''میں محسوس کرتی ہوں مس شانی کہ ماضی میں یہ لڑکا تنہائی کا شکار رہا ہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد نے اس کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ نشے کا سہارا لینے پر بھی مجبور ہوا۔ اب صورت حال ایسی ہے کہ یہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اسے ذرا سی ٹھیس بھی مزید گہری تو یہ بالکل ختم ہو سکتا ہے۔ اس کی بحالی کی واحد امید یہی ہے کہ اسے مزید کوئی ٹھیس نہ لگے اور ہم مسلسل Counceling کر کے اسے شدید ڈپریشن میں سے باہر نکالیں۔''

راحت نامی اس سائیکاٹرسٹ نے پندرہ بیس منٹ تک شانی سے سیر حاصل گفتگو کی۔

شانی باہر نکلی تو اس کے دل پر بوجھ پہلے سے زیادہ تھا۔ راحت نے جو باتیں بتائی تھیں ان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ شانی راجو کو دیکھتی تھی تو اس کی چھٹی حس کہتی تھی یہ لڑکا اپنے دیوانے پن میں کچھ بھی کر گزرے گا۔ شانی کو اس کی آنکھوں میں بے پناہ غم کے ساتھ ساتھ جنون کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔

وہ باہر نکلی اور ہسپتال کے وسیع گراسی لان میں ایک بنچ پر جا بیٹھی۔ وہ ایک بار راجو کا سامنا کر چکی تھی اب دوبارہ سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے شولڈر بیگ کھولا اور وہ خط نکال کر پڑھنے لگی جو راجو نے کوکی کے نام لکھا تھا۔ راجو چند ابتدائی جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔ وہ بمشکل لکھ سکتا تھا۔ املاء اور ہینڈ رائٹنگ وغیرہ ابتر تھے۔ فقرے بھی شکستہ اور نوٹے چوٹے تھے لیکن اصل چیز تو لفظوں میں چھپا ہوا نفس مضمون ہوتا ہے اور وہ متاثر کن تھا۔ اس میں نوعمری کی محبت کی بے پناہ تڑپ نظر آتی تھی..... خط کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''کوکی! میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اگر ہمارے بڑوں نے ہمیں ملنے نہ دیا تو میں اپنی جان لے لوں گا اور میں نے سچ مچ گولیاں کھالی تھیں۔ پتا نہیں کیسے بچ گیا ہوں۔ ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں شاید اوپر والے کو ہم پر رحم آ گیا ہے۔ شانی باجی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری شادی رک گئی ہے۔ شانی باجی کو پوری امید ہے کہ اب یہ شادی نہیں ہوگی۔ وہ ہم دونوں کے میل کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہیں۔ تم بھی حوصلہ رکھو۔ ہوسکتا ہے کہ اوپر والا ہمارے لئے کوئی رستہ نکال دے اور اگر نہ بھی ہوا..... تو پھر میرے لئے آخری رستہ تو ہے ہی۔ میں اپنے وعدے پر پکا ہوں کوکی۔ میں تمہیں کسی کی دوہٹی بنتے ہوئے نہیں دیکھوں گا۔ اس سے پہلے ہی اپنی قبر میں پہنچ جاؤں گا۔ چاچا سیف مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے چاچے سیف پر کوئی غصہ نہیں ہے۔ وہ تمہارے ابا جی ہیں تو میرے لئے بھی عزت کی جگہ پر ہیں۔ تم جانتی ہو کہ اس سے پہلے پاک پتن میں جو کچھ ہوا تھا اس میں میرا قصور تھا نہ تمہارا۔''

خط کے آخر میں دو تین بے ڈھنگے شعر لکھے تھے۔ ویسے ہی شعر جو ٹرکوں اور رکشاؤں کے پیچھے لکھے نظر آتے ہیں۔

دل درد کرتا ہے، صنم کوئی دوا بھیج
کاغذ کے ایک پرزے پر تصویرِ اپنی بنا بھیج

لیکن بات ان شعروں کی نہیں تھی۔ بات اس جذبے کی تھی جو ان شعروں اور اس ٹوٹے پھوٹے خط کے پیچھے تھا۔ اگر اعلیٰ وارفع الفاظ کے پیچھے منافقت اور ہوس ہو تو وہ تحریر کو بھسم کر دیتی ہے لیکن اگر ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے پیچھے سچائی کی طاقت ہو تو وہ ایک بے ڈھنگے سے محبت نامے کو بھی شاہکار بنا دیتی ہے۔ شانی کو یہ محبت نامہ بھی کسی شاہکار سے کم نہیں لگا۔ اس کے ساتھ ہی شانی کے اندر دبے ہوئے اندیشے بھی ایک بار پھر ابھر کر شور مچانے لگے۔ راجو نے اپنے خط میں یہ بات وضاحت سے دہرائی تھی کہ وہ کوکی سے جدائی کی صورت میں اپنی جان دے دے گا۔

شانی اپنی عجیب فطرت سے مجبور تھی۔ وہ راجو اور کوکی کے مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا چکی تھی۔ وہ ان دونوں کے لئے ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اب کیا کرے۔ راجو کو اس کی زندگی کی سب سے اندوہناک خبر پہنچانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری طرف حقیقت کو جھٹلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اچانک وہ چونک گئی۔ اس نے تاؤ حشام، بابر، قادرے اور چند دیگر افراد کو دیکھا۔ وہ ہسپتال کی پارکنگ سے عمارت کی طرف آ رہے تھے۔ تاؤ حشام

www.pdfbooksfree.pk

وغیرہ ایک قریبی ہوٹل میں ہی قیام پذیر تھے۔ وہ دن کے وقت زیادہ تر ہسپتال میں ہی رہتے تھے۔ شانی کو جس چیز نے چونکایا وہ تاؤ حشام اور قادرے وغیرہ کے تاثرات تھے۔ تاؤ حشام کے چہرے پر چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت قادرے کی بھی تھی۔ ان کے پیچھے لمبے چوڑے ڈشکرے ہاتھوں میں اسلحہ لئے دہشت کی فضا پیدا کرتے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے آ رہے تھے۔

شانی کی چھٹی حس نے پکار کر کہا..... تاؤ حشام اس بات سے آگاہ ہو چکا ہے کہ چوہدری بشیر نے چالاکی کے ساتھ کوکب سے شادی رچالی ہے۔ اب شاید وہ شانی یا عارف کمبوہ کا گریبان پکڑنے راجو کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ بہت بڑی غلطی کر رہا تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ راجو کی زندگی کے لئے بہت خطرناک تھا..... اور شاید اور بھی بہت سی زندگیوں کے لئے۔ شانی ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ تاؤ اور اس کے ساتھیوں کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی..... وہ تیزی سے اپنے راستے پر بڑھے چلے جا رہے تھے۔ شانی ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھی اور چند قدم بھاگ کر تاؤ حشام کے سامنے آ گئی۔

''کہاں جا رہے ہو چوہدری؟'' اس نے پوچھا۔

شانی کا اندازہ درست نکلا۔ شانی کو دیکھ کر چوہدری کی سرخ آنکھیں کچھ اور بھی دہک گئیں۔ وہ بڑے قہر سے بولا۔ ''رکو الی تم نے شادی؟ سنبھال لیا سارا معاملہ؟''

''مم..... میری بات آرام سے سنو چوہدری! یہ بلڑ بازی کا موقع نہیں ہے۔''

''اوئے، اب باقی کیا رہ گیا ہے کہ ہم آرام سے تمہاری بات سنیں۔ بشیرے نے جو کچھ کرنا تھا اس نے کر لیا ہے اور تُو نے بھی جو کروانا تھا کروا لیا ہے۔'' قادرے نے کڑک کر کہا۔

''ابھی بہت کچھ باقی ہے چوہدری! ابھی راجو باقی ہے۔ اسے یہ سب کچھ معلوم ہو گیا تو وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی جان چلی جائے گی۔ ہمیں اب بھی جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے۔'' شانی نے دلیری سے چوہدری حشام اور قادرے کا راستہ روک لیا۔

تاؤ حشام پھنکارا۔ ''تُو منصف اور پنچ نہ بن..... بس بستر گرم کرنے والی زنانی رہ اور یہی تیری اوقات ہے۔ یہ ہم مردوں کے معاملے ہیں اور ہم اپنے معاملے نمٹانا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''یہ معاملہ نمٹانے کی بات نہیں ہے چوہدری، تمہارا بیٹا بستر سے لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر بتا رہے ہیں کہ اس کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے پہلے اسے سنبھل لینے دو، پھر جو چاہے کرتے رہنا۔''

قادرے نے کہا۔ ''تُو زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ ہمیں پتا ہے تُو نے اندر خانے بشیرے کو بھی خصم بنایا ہوا ہے۔ پہلے ہمارے سینے میں بھانبھڑ جلائے ہیں تُو نے۔ اب صبر کرنے کے مشورے دے رہی ہے۔''

شانی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی تلخ زبان میں کچھ کہتی۔ جواں سال چوہدری بارآگے آیا اور ماتھے پر تیوری ڈال کر بولا۔ ''اب کیا چاہتی ہے تُو؟ ہم جا کر بشیرے کا گریبان بھی نہ پکڑیں۔ ہمارے بچے کی زندگی تباہ کردی ہے اس نے..... ہم ہسپتالوں میں خجل ہوتے رہیں اور وہ سولہ سال کی کُڑی کے ساتھ عیش کرتا رہے..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

شانی نے اپنے لہجے کو دھیما کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھنڈے دل سے سوچو تو میں بشیر کی نہیں تمہاری طرف داری کررہی ہوں۔ راجو کی طرف داری کررہی ہوں۔ اگر مجھ پر یقین نہیں تو ڈاکٹروں سے پوچھ لو۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ ابھی وہ اس شادی والے معاملے سے بالکل بے خبر رہے۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

قادرا گرجا۔ ''وہ بے خبر ہی رہے گا۔ پر آج ہم نے بشیرے کے ہتھ پیر توڑے بغیر اسے چھوڑنا نہیں ہے۔''

''چوہدری سمجھنے کی کوشش کرو۔ راجو کا اب کوکی کے بغیر زندہ رہنا بڑا مشکل ہے اسے کوکی چاہیے کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں۔ میں چوہدری بشیر سے بات کررہی ہوں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں۔ ابھی تو امید کی کرن نظر نہیں آتی، لیکن کیا پتا کچھ دنوں میں آجائے۔ کیا پتا چوہدری کوکی کو چھوڑنے پر تیار ہوجائے۔''

''واہ..... واہ کیا بات ہے۔'' قادرا زہریلے انداز میں بولا۔ ''ایک جوٹھی کُڑی کو ہمارے گھر کی نوں (بہو) بنانے کا سوچ رہی ہو۔ ہم تھوکتے بھی نہیں ایسی کُڑی پر اور تمہارا بھی دُر فٹے منہ۔'' قادرے نے باقاعدہ ہاتھ لہرا کر شانی پر لعنت ڈالی۔

شانی نے تیزی سے کہا۔ ''بات جوٹھی اور کنواری لڑکی کی نہیں چوہدری..... بات راجو کی زندگی بچانے کی ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ کوکی اسے نہ ملی تو وہ بے موت مرے گا اور اس کی موت کے ذمے دار تم لوگ ہوگے۔'' شانی نے اپنی انگلی چوہدری کے چہرے کی طرف اٹھا کر کہا۔

قادرے کا چہرہ ایک بار پھر انگارہ ہوگیا۔ نتھنے پھول گئے۔ تاہم اس کے بولنے سے پہلے ہی بابر بول اٹھا۔ تاؤ حشام سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ایک دو باتیں واقعی

غور کرنے کی ہیں۔ اس طرح کھڑے ہوکر بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ سامنے کینٹین میں جا کر بیٹھتے ہیں۔''

چوہدریوں کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے۔ اسی اثناء میں عارف کمبوہ بھی آگیا۔ وہ سب لوگ کینٹین کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی وہ کینٹین سے کچھ دور ہی تھے کہ شانی کو مین گیٹ کے پاس ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ یہ سب انسپکٹر اختر تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ تاہم اپنے قد کاٹھ کے سبب دور ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ اس نے بھی دور سے شانی کو دیکھ لیا تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ حاجی حیات خان کا کوئی اہم پیغام لے کر یہاں آیا ہے۔ اس سے فوری طور پر بات کرنا ضروری تھا لیکن یہاں چوہدریوں والی مصیبت نے بھی اسے گھیر رکھا تھا۔

جب تاؤ حشام اور قادرا وغیرہ کینٹین میں بیٹھ گئے تو شانی، راجو کو ایک نظر دیکھنے کے بہانے واپس ہسپتال کی عمارت کی طرف آگئی۔ ہسپتال کے ایک نسبتاً سنسان گوشے میں اسے سب انسپکٹر اختر کھڑا نظر آگیا۔ شانی اس کے ساتھ تیسری منزل پر چلی گئی۔ یہاں بالکل خاموشی تھی۔ اختر نے کہا۔ ''بی بی، آپ کے لئے ایس پی کی طرف سے ایک خاص پیغام ہے۔''

''خیریت کا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن حالات یہ ہیں شانی بی بی! کہ قانون ناٹفذ کرنے والی ایجنسیاں پٹھوہار میں ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں پر بھرپور ریڈ کرنے کا فیصلہ کرچکی ہیں۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر اب بھی لالہ، رستم، جسنے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف طاقت سے کارروائی نہ کی گئی تو پھر معاملات مزید خراب ہوجائیں گے۔''

شانی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تاہم وہ اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات تو کافی دنوں سے گردش کررہی ہے۔ خاص طور سے ڈیک نالے کے کنارے پولیس اہلکاروں کے مرنے کے بعد سے۔''

''لیکن اب حالات میں کچھ زیادہ ہی تیزی آگئی ہے۔ ڈپٹی ریاض کا کہنا ہے کہ گرینڈ آپریشن میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ کامیابی مزید مشکل ہوجائے گی۔ دوسری طرف پولیس کو کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں جن سے پتا چلا ہے کہ رستم ایک بار پھر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر کوئی خاص کارروائی کرنا چاہ رہا ہے۔ اب خبر نہیں کہ اس کا نشانہ کون ہوگا، لیکن اگر

www.pdfbooksfree.pk

کارروائی کے بعد حالات اور سنگین ہو جائیں گے۔ اخبار پہلے ہی پوٹھوہار کی خبروں سے بھرے پڑے ہیں۔ پولیس اور انتظامیہ پر اس مطالبے کا بے حد دباؤ ہے کہ رستم کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اب یہ پولیس اور انتظامیہ کی آن بان کا مسئلہ بن چکا ہے۔

حاجی حیات صاحب نے کہا ہے کہ آپ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لئے رستم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ایک بیان دیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کی پوری مذمت کریں۔

حاجی حیات صاحب کو پتا چلا ہے کہ ایک معروف اخبار کا نمائندہ آپ کا انٹرویو لینے کے لئے خاص طور سے لاہور سے جوہر آباد پہنچنے والا ہے۔ اخبار والے آپ کی تفصیلی سٹوری چھاپنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ سے پوٹھوہار کے سفر کے بارے میں پوچھیں گے اور یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ میانہ کے چوہدری اور اس کے بیٹے کو ڈاکوؤں سے چھڑانے میں کیسے کامیاب ہوئیں۔''

''لیکن یہ باتیں تو اخبار والے پہلے پوچھ چکے ہیں اور ڈپٹی ریاض سے بھی بیان لے چکے ہیں۔''

''مگر اب وہ سب کچھ تفصیل سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی اجازت سے آپ کی ذاتی زندگی اور حالات کے بارے میں بھی سوالات پوچھیں۔ آپ اس کے لئے ذہنی طور پر تیار رہیں۔ اس کے علاوہ یہ آپ کے لئے بہت اچھا موقع ہے کہ آپ رستم اور اس کے ساتھیوں کی غیر قانونی کارروائیوں کے بارے میں بھی اپنا موقف بیان کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔ آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہو لیکن آپ کی زبان سے رستم اور اس کے ساتھیوں کی مذمت ہونی چاہیے۔''

شانی نے مرے ہوئے سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر جیسے کراہ کر بولی۔ ''لیکن رستم! اب کیا کر رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ساری افواہ بازی ہے۔ وہ تو پولیس سے چھپ کر وہاں بیٹھا ہے۔ وہ بار بار کیوں نکلے گا اپنی پناہ گاہ سے باہر۔''

''بی بی شانی! آپ کی طرح ہمیں بھی رستم سے ہمدردی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس شخص کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ نہ ہی اس کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ گرفت میں نہیں آ سکا۔ یہ شخص ایک ہی وقت میں رحم دل اور سفاک..... بہت زیادہ محتاط اور بہت زیادہ بے پرواہ..... بہت ٹھنڈا اور بہت گرم دماغ بھی ہے۔''

''وہ جانتا ہے کہ تاؤ اور اس کے بیٹے کے اغوا کے بعد پولیس چوکس ہے۔ انہوں نے

www.pdfbooksfree.pk

راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہوگی۔ یہ تو جان بوجھ کر مصیبت کو گلے لگانے والی بات ہے۔''

شانی کے لہجے میں گہری مایوسی تھی۔

سب انسپکٹر اختر نے کہا۔ ''شانی بی بی! میں پھر اپنی بات دہرا دیتا ہوں۔ حاجی حیات خان کا کہنا ہے کہ آپ کے اپنے ذاتی خیالات جو بھی ہیں لیکن دو چار دن کے اندر اندر رستم اور اس کی کارروائیوں کے خلاف آپ کا ایک بیان ضرور ریکارڈ پر آ جانا چاہیے۔''

شانی کا بجھا ہوا دل مزید بجھنے لگا۔ وہ رستم کے لئے شدید خطروں کی بُو محسوس کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

رستم ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ذرا نشیب میں پوٹھوہار کا ویرانہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر شام کی سرخی تھی۔ نیم گرم ہوا میں رستم کے لمبے بال ہولے ہولے اس کی فراخ پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں تھیں۔ اس کی نگاہوں کا رخ جنوب کی طرف تھا..... ہاں جنوب..... جہاں کوئی رہتا تھا۔ جہاں اس کے سانسوں کی مہک پھیلتی تھی، جہاں اس کا تبسم چمکتا تھا۔ جہاں کسی گھر کی چار دیواری میں اس کی آواز گونجتی تھی اور نرم گرم راتوں میں اس کی زلفیں تکیے پر پریشان ہوتی تھیں۔ وہ کون تھا؟ یہ وہی تھی جس کا پیار رستم کے جسم کے ہر گوشے میں رَچ بس چکا تھا۔ وہ سانس لیتا تھا تو وہ سانس کے ساتھ اس کے جسم میں داخل ہوتی جاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تھا تو وہ مجسم تصویر بن کر نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ اسے تو اب اپنے جسم سے بھی اسی کی خوشبو آتی تھی۔ دراڑ والے واقعے سے پہلے بھی اس کا پیار بے مثال تھا لیکن اب ''دیوی'' کو چھونے کے بعد اس کی پرستش کرنے کے بعد یہ پیار اور بھی بیکراں ہو گیا تھا۔ اسے اس پیار کے سوا کچھ نظر آتا تھا نہ سنائی دیتا تھا اور نہ ہی شاید کچھ محسوس ہوتا تھا۔

اچانک آہٹ ہوئی اور رستم اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، اس کا بے تکلف دوست حسنا گھبراتی دبے پاؤں آیا تھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ حسبِ معمول ایک سیون ایم ایم رائفل اس کے گلے میں تھی..... وہ بجھتے ہوئے چہرے چبا رہا تھا۔ رستم کو دیکھ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

دو چیلے دیاں کلیاں نوں
پردیسی چلے گئے وطناں نوں
خالی رہ گیاں گلیاں نے

''تم بس ہر وقت اپنی ہی لائن پر رہا کرو۔'' رستم نے قدرے بے زاری سے کہا۔

''تم بھی تو اپنی ہی لائن پر ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ شاید دوسروں کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہیں یار جی! تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں اور پھر تمہارے تو چہرے پر ہی سب کچھ لکھا مل جاتا ہے۔''

''کیا لکھا مل جاتا ہے؟''

''جب سے بی بی جی واپس گئی ہیں، تمہارے چہرے پر لکھا ہے میں دنیا کا سب سے اداس بندہ ہوں۔ پوٹھوہار کی ویرانی میں دس گنا ویرانی روز ڈال لی جائے تو میرے دل کی ویرانی پھر بھی زیادہ ہوگی۔''

''یار! تیری یہ بکواس میں پہلے بھی بہت دفعہ سن چکا ہوں، اب کوئی کام کی بات کر۔''

''یہ بکواس ہی کام کی بات ہے رستم! میں جانتا ہوں تم بی بی جی سے بہت پیار کرتے ہو بلکہ اس کو عشق کہنا چاہیے لیکن یہ سب کچھ تم نے اپنے تک رکھا ہوا ہے بی بی کو کچھ بتاتے نہیں ہو۔ جب تک تم کچھ بتاؤ گے نہیں ان کو تمہاری حالت کا کیسے پتا چلے گا۔ یہ سب کچھ اپنے دل میں لے کر ہی شاید تم، ہم سب کے ساتھ اگلے جہان میں کوچ کر جاؤ گے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اب ہماری زندگیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ کسی بھی وقت چل چلاؤ والی گھنٹی کھڑک سکتی ہے۔ اس گھنٹی سے پہلے کم از کم اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لو۔''

''تم اس بات کو نہیں سمجھتے حسنے! یہ بھڑاس نہیں ہے، یہ تو برفانی کالی راتوں میں زندہ رکھنے والی آگ ہے۔ شاید اس آگ کی گرمی نے ہی مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔''

''چلو یار آگ ہی سہی۔ پر تم بی بی جی کو کچھ بتاؤ گے تو انہیں پتا چلے گا ناں۔''

''حسنے! ساری باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں کچھ باتیں کہے سنے بغیر جانی جاتی ہیں۔''

حسنے نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس دوران میں لالہ فرید آتا دکھائی دیا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس کی سیاہ ایل ایم جی اور گولیوں والی بیلٹ چمک رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا آیا اور ان دونوں کے قریب ہی پتھروں پر بیٹھ گیا۔ لالہ فرید ''کالا چیتا رینج'' کی طرف گیا ہوا تھا اور چار پانچ روز بعد واپس آیا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں ڈیرے پر رستم نے ہی قائم مقام سردار کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ علیک سلیک اور حال احوال پوچھنے کے بعد تینوں دوستوں نے سگریٹ سلگائے اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔

لالے فرید نے پوچھا۔ ''رستم، یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تُو پھر رنگ والی اور نارپور کی طرف جانا چاہ رہا ہے.....''

''ہاں فرید، میرا جانا ضروری ہوگیا ہے۔ چار دن پہلے نظام نے سیٹ (وائرلیس) پر جو

اطلاع دی ہے، وہ شاید ابھی تم تک نہیں پہنچی۔''

''کیا اطلاع ہے؟'' فرید نے چونک کر پوچھا۔

''بی بی جی نے حشام اور اس کے بیٹے کے بدلے جو دو ڈاکٹر چوہدریوں سے رہا کرائے تھے، ان میں سے ایک کا نام ڈاکٹر بہروز ہے.....ڈاکٹر بہروز کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔''

''کس وجہ سے؟'' فرید نے پوچھا۔

''اسی حرامی پیر قدرت اللہ کی وجہ سے۔ پیر قدرت اللہ جان گیا ہے کہ اس کا سب سے بڑا حریف نہ صرف آزاد ہوگیا ہے بلکہ خم ٹھونک کر میدان میں بھی آرہا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میدان میں آنے سے پہلے ہی ڈاکٹر بہروز والا قصہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے لئے ڈاکٹر کو روڈ ایکسیڈنٹ میں مارنے کی سازش تیار کی گئی ہے۔ یہ سارا منصوبہ لاہور میں تیار ہوا ہے اور لاہور میں ہی اس پر عمل بھی ہونا تھا۔''

''نظام کو یہ سب کیسے پتا چلا؟''

''نظام کو میں نے ہی کہا تھا۔ بی بی کے جانے کے بعد میرے دل میں ڈر تھا کہ پیر قدرت اللہ اپنے طور پر کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کرے گا۔ اس خبیث کی جڑیں گہری اور ہاتھ لمبے ہیں۔ میں نے نظام سے کہا تھا کہ وہ اپنے ایک ہوشیار بندے کو پکا پکا قدرت اللہ کے پیچھے لگا کر رکھے۔ بس اسی احتیاط کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ لاہور والی سازش کا پتا چل گیا ہے۔''

''کیا پروگرام تھا ڈاکٹر کے خلاف؟''

''ڈاکٹر آج کل روزانہ لاہور میو ہسپتال میں آرہا ہے، اس کے پاس چھوٹی سوزوکی کار ہے۔ وہ ملتان روڈ کی طرف سے آتا ہے اور رات دس گیارہ بجے واپس جاتا ہے۔ محصول چونگی کے قریب اس کی کار کو بجری سے بھرے ہوئے ٹرک کے ساتھ ٹکر مارنے کا پروگرام تھا۔ ٹرک ڈرائیور کے ایک ساتھی کی وجہ سے یہ ساری بات سامنے آئی ہے۔ نظام کے بندے نے ٹرک ڈرائیور کو بڑی عقل مندی سے شیشے میں اُتارا ہے اور اس سے ساری بات پوچھی ہے۔''

''تم نے ڈاکٹر بہروز کو ہوشیار کر دیا ہے؟'' فرید نے رستم سے پوچھا۔

''ہاں، نظام ہی کے ہاتھ اسے پیغام بھجوا دیا ہے۔ وہ اب گھر سے باہر نہیں نکل رہا ہے۔ نظام کے اصرار پر اس نے فی الحال میانہ آنے کا پروگرام بھی کینسل کر دیا ہے۔''

''لیکن نظام نے جو روڈ ایکسیڈنٹ والی بات بتائی ہے، اس کی تصدیق بھی کسی طرح

www.pdfbooksfree.pk

ہونی چاہیے۔'' فرید نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آج تصدیق ہو جائے گی۔ نظام نے پرسوں کہا تھا کہ وہ اس شخص کو ''سیٹ'' پر لانے کی کوشش کرے گا جس سے یہ ساری باتیں پتا چلی ہیں۔''

فرید نے پتھر سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے چند گہرے کش لئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ ٹیلے تاریکی میں مدغم ہو رہے تھے۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''تو تم قدرت اللہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں..... یہ بندوز مین پر ایک گندے بوجھ کی طرح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے پہلے میں اس کا قصہ پاک کر دوں۔''

''کیا کرو گے؟''

''میں قدرت اللہ کے آستانے میں گھس جاؤں گا۔ قدرت اللہ سمیت اس کے جتنے بندوں کو قتل کر سکا، کر دوں گا۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد مارا گیا تو میری غائبانہ نماز جنازہ یہاں پڑھ لینا۔ اگر واپس آ گیا تو اکٹھے مریں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، پولیس اب تمہیں یہاں سے نکل کر کسی شہر یا بستی تک پہنچنے دے گی؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟ اگر تم کالا چیتا ریچ سے ہو کر واپس آ سکتے ہو تو میں بھی نار پور سے ہو کر آ سکتا ہوں۔''

''تم نے مجھ سے پوچھا ہی کب ہے۔ میں نہیں جا سکا کالا چیتا۔ تم جانتے ہو علاقے میں جانے کے دو تین ہی تو راستے ہیں۔ ان راستوں پر بھی پولیس پہنچ چکی ہے اور اگر وہاں پولیس پہنچ چکی ہے تو پھر اگلے ڈیرے کی طرف بھی ضرور ہو گی۔''

پولیس کے پہنچنے کی اطلاع سنسنی خیز تھی۔ چند لمحوں کے لئے رستم اور حسنا دونوں چپ ہو گئے۔ رستم نے فرید کے ہاتھوں سے سگریٹ لیا اور کش لے کر بولا۔ ''اگر تم کالا چیتا نہیں گئے تو کہاں رہے اب تک؟''

''بس موقع کی تلاش میں رہا کہ شاید نگرانی ختم ہو اور راستہ مل جائے، مگر پھر یہی نتیجہ نکلا کہ یہ نگرانی نہیں ہے وہاں پولیس والوں نے پکا پکا ڈیرہ لگایا ہوا ہے۔ وہاں مجھے ایک بڑے سائز کی دوربین اور ایک بھاری رائفل بھی نظر آئی۔ یقینی بات ہے کہ اور رائفلیں بھی ہوں

www.pdfbooksfree.pk

گی۔ خواہ مخواہ خود کو شدید خطروں میں ڈالنا عقل مندی نہیں تھی اور بات صرف یہاں سے نکلنے ہی کی نہیں، واپس آنے کی بھی تو تھی۔''

''لیکن مجھے تو واپس آنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے چھپیاں ڈال کر اور کہا سنا معاف کروا کر جاؤں گا۔'' رستم کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ ابھری۔

''اور وہ تمہاری بیوی..... میرا مطلب ہے چھوٹی بھرجائی؟'' حسنا نے پوچھا۔

''اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رستم سنگ دلی سے بولا۔ ''اگر میں واپس نہ آ سکا تو اس کا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔''

ماحول پر ایک دم اداسی چھا گئی۔ اپنی طرف بڑھنے والی موت کی چاپ تو وہ سارے ہی سن رہے تھے۔ خصوصاً جب سے ڈپٹی ریاض کا نام ان کے کانوں میں پڑا تھا، وہ جان گئے تھے کہ اب ٹیلوں میں فیصلہ کن مرحلہ آنے والا ہے لیکن رستم کی طرف سے اتنی جلدی جدائی کی باتیں ہونے لگیں گی، انہیں علم نہیں تھا۔

رستم نے اپنے بازو اوپر اٹھائے اور ایک شاندار انگڑائی لی۔ پھر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''یارو! پریشان ہونے والی بات نہیں۔ پریشانی تو تب ہو کہ ہم یہاں سکون آرام سے رہ رہے ہوں اور یہاں سے باہر جانے میں میرے لئے موت کا خطرہ ہو۔ موت کا خطرہ تو یہاں بھی ہر وقت منڈلا رہا ہے۔ میں یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کروں گا تو کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ میں تم سے دو چار ہفتے پہلے مر جاؤں گا لیکن اگر میں نکل گیا اور میں نے قدرت اللہ کی گردن ادھیڑ دی تو یہ بہت بڑی بات ہو گی۔ اس سے بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا۔''

لالہ فرید مسلسل نفی میں سر ہلاتا چلا گیا۔ ''نہیں رستم! میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں ایسا کرنے سے زبردستی روکتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمارے لئے یہاں سے نکلنے کا وقت تقریباً گزر گیا ہے۔ پولیس نے ناکہ بندی کر لی ہے اور گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ یہ ناکہ بندی مضبوط ہوتی جائے گی۔ اب یہ لوگ بالکل نہیں چاہتے کہ چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کے اغوا جیسا کوئی اور واقعہ ہو..... مجھے لگتا ہے کہ تم ڈیرے سے نکل کر خود کو سخت خطرے میں ڈالو گے۔''

''میں اس خطرے کا سامنا کر لوں گا فرید..... مجھے مت روکو۔'' رستم نے بڑے کرب سے کہا۔ ''اور میرا یہ وعدہ بھی ہے تم دونوں سے کہ اگر بچ گیا تو یہاں واپس آؤں گا۔''

فرید نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تو اس سے بھی بڑی بے وقوفی ہو گی بلکہ دیوانہ پن

ہوگا۔''

''یار، یہی دیوانہ پن تو ہماری شان ہے۔ ہم سر پھرے نہ ہوں تو ان پہاڑوں میں کیوں پہنچیں۔'' رستم نے پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں ڈیرے کی روشنیوں کی طرف سے کاٹھیا کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ وہ رستم کو بتا رہا تھا کہ ''سیٹ'' پر نظام موجود ہے۔ وہ بات کرنا چاہتا ہے۔

وہ تینوں اٹھ کر چھجے کی طرف چلے گئے۔ یہاں ایک کمرے میں وائرلیس سیٹ موجود تھا اور اس پر سگنل موصول ہو رہے تھے۔ ایک سرخ بلب روشن تھا اور مائیک سے نکلنے والی شائیں شائیں کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ رستم نے وائرلیس سیٹ پر جھکتے ہوئے کہا۔

''میں رستم ہوں، کہو کیا بات ہے؟''

''رستم بھائی، وہ ٹرک ڈرائیور میرے ساتھ ہے جس نے مجھے ڈاکٹر صاحب والی بات بتائی ہے۔ آپ چاہیں تو خود اس سے بات کر سکتے ہیں۔''

''ہاں کراؤ بات۔''

چند سیکنڈ بعد ایک بھاری اور قدرے پریشان آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ ''میرا نام عبداللہ ہے جی، میں ٹرک چلاتا ہوں اور پنڈی سے بجری لے کر لاہور آتا ہوں۔ لاہور سے فرنیچر وغیرہ لاد کر پنڈی پہنچاتا ہوں۔ اقبال بالا میرے جاننے والوں میں سے ہے جی۔ وہ بھی ٹرک ڈرائیور ہے پر وہ نشہ وغیرہ کرتا ہے۔ لالچی بھی ہے اور لالچی اس لئے ہے کہ اسے ایک عورت کو پیسے کھلانے پڑتے ہیں۔ لاہور میں ایک عورت سے اس کا یارانہ ہے۔ بہت کچھ اس پر لٹاتا رہتا ہے پر اس عورت اور اس کی ماں کا پیٹ بھرنے میں نہیں آتا۔ پچھلے سال بالے نے چار پانچ مہینوں کی جیل بھی کاٹی ہے۔ سات آٹھ مہینے پہلے بھی اس پر کیس بنا تھا۔ ٹرک میں سے چرس نکلی تھی۔ وہ خود بھی نکا کر چرس پیتا ہے۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ بالے نے ایک بندے سے لمبی رقم پکڑی ہے۔ اس رقم کے بدلے اس نے ایک ڈاکٹر کی گاڑی کو ٹکر مارنی ہے۔ اس معاملے کی پوری پوری سیٹنگ ہو چکی ہے۔ میں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا ہے۔ پر میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں نے پہلے بھی ہاتھ باندھے تھے اب پھر باندھتا ہوں۔ اس معاملے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔ باقی میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بتایا ہے سچ ہے۔ آپ، بس اس ڈاکٹر صاحب کی جان بچانے کی کوشش کریں۔''

''تمہیں کیسے پتا ہے کہ بالے کو رقم دینے والا پیر قدرت اللہ کا بندہ ہے۔'' فرید نے

www.pdfbooksfree.pk

پوچھا۔

''بالے نے نشے کی حالت میں مجھے خود بتایا ہے۔ اس کا پورا نام پتا بتایا ہے۔ آپ خود بھی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

رستم اور فرید نے اس شخص سے دو چار باتیں مزید پوچھیں، پھر نظام خود لائن پر آ گیا۔ اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پھر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ڈیرے پر ایک دو دغا باز ضرور موجود ہیں۔ یہ لوگ مخبری کر رہے ہیں۔ ڈیرے کی خبریں باہر نکل رہی ہیں۔ اب بھی یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ رستم اور اس کے ساتھی کوئی کارروائی کرنے والے ہیں۔ شاید چوہدری حشام کی طرح پھر کسی کو اغوا کرنا ہے۔ پولیس والے کافی چوکس نظر آ رہے ہیں۔ پرسوں ٹھیکر اتھانے میں ڈپٹی ریاض نے علاقے کے چار پانچ ایس ایچ اوز بلا رکھے تھے۔ ان سے لمبی میٹنگ ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم اس معاملے کو دیکھتے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

''میں ایک مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں جی۔ اگر آپ کو اچھا لگے تو مان لیں ورنہ کوئی ناراضگی نہیں ہے۔'' نظام نے کہا۔

''ہاں..... ہاں، بولو۔''

''چوہدری حشام اور اس کے بیٹے والے معاملے پر پولیس بڑی چوکس ہے۔ سنا ہے کہ وڈے ڈیرے کو جانے والے راستوں کی ناکہ بندی بھی کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کچھ دیر کے لئے خاموشی کی جائے تو شاید بہتر ہو۔''

''تمہارے مشورے میں ناراضگی والی کوئی بات نہیں۔ اس بارے میں سوچتے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد رستم نے فرید سے کہا۔ ''ابھی تم نے نظام کی بات سنی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہاں مخبر موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا شک درست ہے۔ آؤ، میں تمہیں کچھ دکھاؤں۔''

رستم نے فرید اور حسنے کو ساتھ لیا اور دوسرے مورچے کی طرف آ گیا۔ یہاں گیس لیمپ روشن تھے اور سپرٹ کی ہلکی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے سلاخ دار کوٹھڑیوں کے سامنے پہنچے یہ وہی کوٹھڑیاں تھیں جہاں چند دن پہلے چوہدری حشام اور راجو بند تھے۔ حشام اور راجو والی کوٹھی میں اب ایک بندہ نظر آ رہا تھا۔ یہ عظمت نامی وہی بہروپیا عامل تھا جسے کچھ دن پہلے رستم نے ٹیلوں سے پکڑا تھا۔ یہ وہاں ایک کھوہ میں نادیہ کی عریاں پشت پر کچھ اوٹ

پٹانگ لکھ رہا تھا بعد ازاں کھوہ میں سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی تھی اور عظمت کے دیگر سامان میں سے جادو ٹونے کی اشیاء کے علاوہ اخلاق سوز تصویریں بھی ملی تھیں۔

میلا کچیلا عظمت کوٹھڑی کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں میں تھا۔ شاید اونگھ رہا تھا۔ رستم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو عظمت بدک کر انھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ بُری طرح سوجا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں پر بھی چوٹوں کے گہرے نشان تھے۔ ایک آنکھ کے اوپر پیشانی پر گہرا زخم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ رستم کو دیکھ کر عظمت پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ وہ کرب ناک چیخیں مارنے لگا۔ پہلے اس نے کوٹھڑی کے ایک گوشے میں سمٹنے کی کوشش کی پھر تھوڑا سا اشتعال دکھایا اور ادھ کھلے دروازے سے باہر نکلنے کے لئے بھاگا مگر رستم نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے دوبارہ فرش پر پٹخ دیا۔

وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ اس نے رستم کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑانے لگا۔ ''مجھے معاف کردو..... میں توبہ کرتا ہوں..... میں اب کچھ نہیں کروں گا۔''

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا، اس نے رستم کے پاؤں چھوڑے اور فرید کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ ''میں آپ کا مجرم ہوں۔ میں مانتا ہوں، مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ میں معافی مانگتا ہوں۔''

رستم نے اسے سیدھا کر کے بٹھایا اور اسے واویلا ختم کرنے کو کہا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور اپنے ہیجان پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رستم نے فرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ حرام زادہ مخبری کرتا ہے ہماری..... اس کے ایک ساتھی کا بھی پتا چلا ہے لیکن وہ اس وقت ڈیرے پر نہیں ہے۔'' پھر رستم نے عظمت سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اس گنے کا؟''

''راشد..... راشد ٹیڈی۔'' عظمت نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

رستم بولا۔ ''دوسرا انکشاف یہ ہے کہ یہ صرف پیر قدرت اللہ کا چیلا ہی نہیں ہے اس کا سگا بھتیجا بھی ہے۔ ڈیڑھ دو سال پہلے اس نے اپنے ایک شاگرد کی بیوی پر بُری نظر ڈالی اور شاگرد کو زہریلا کشتہ کھلا کر مار ڈالا۔ بعد میں اس پر قتل کا کیس بنا اور یہ بھاگ کر پہلے گجرات اور پھر جہلم آ گیا۔ بعد میں کاٹھیا کے ایک دوست کے ذریعے یہ لعنتی یہاں پہنچ گیا اور اس کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ یہ عامل شاہی کا شاگرد تھا۔ یہ خبیث براہِ راست پیر قدرت اللہ کا شاگرد تھا اور اب بھی ہے۔ آج سے کوئی چار مہینے پہلے گوجر خان کے ایک ہوٹل میں قدرت اللہ نے اس سے ملاقات کی اور اسے آمادہ کیا کہ یہ اگلے ڈیرے اور وڈے ڈیرے کے حالات کے بارے

www.pdfbooksfree.pk

میں اسے بتاتا رہے۔ تمہیں پتا ہی ہے یہ راشد ٹیڈی خود کو حکیم بھی بتاتا ہے۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔ آج کل بھی کہیں نکلا ہوا ہے۔ یہ خبیث اسی چکر میں مخبری بھی کرتا ہے۔''

عظمت کا سر مسلسل جھکا ہوا تھا۔ وہ جیسے بے زبان خاموشی ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ حسنے نے آگے بڑھ کر ایک زوردار ٹھوکر عظمت کی پسلیوں میں رسید کی اور دانت پیس کر بولا۔ ''اوئے تُو کہاں کا ''عظمت'' ہے تُو تو ذلالت ہے نری۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے عظمت پر گالیوں کی بارش کر دی۔

وہ ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ فرید نے کہا۔ ''اس خنزیر کی سزا تو یہی ہے کہ اسی جگہ اس کی کھوپڑی میں تین چار سوراخ کر دیئے جائیں لیکن چلو، آ لینے دو اس کے حرامی یار کو بھی واپس۔''

☆======☆======☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رستم بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کے پروگرام کے مطابق ڈیرے پر اس کی یہ آخری رات تھی اور شاید یہ اس کی زندگی کی بھی آخری رات ہوتی۔ وہ جانتا تھا اب یہاں سے نکل کر کسی بستی تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ کسی بھی جگہ باوردی یا سادہ لباس والی پولیس سے اس کا ٹکراؤ ہوسکتا تھا۔ وہ ایک نہایت خطرناک کام جان بوجھ کر کرنے جا رہا تھا۔ بی بی کو چھوڑنے کے بعد اس کے دل کی حالت کچھ عجیب ہوچکی تھی۔ پہلے پانچ چھ دن تو اسے یہی لگا تھا کہ وہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک سیراب ہوگیا ہے۔ اب اسے کسی چیز کی حسرت نہیں۔ وہ باقی کی مختصر زندگی ان یادوں کے سہارے بہ آسانی گزار سکتا ہے لیکن پھر بتدریج اس پر ایک اور احساس غالب ہوتا چلا گیا۔ بی بی سے ملنے کی خوشی اور سیرابی اپنی جگہ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک مہیب خلا بھی پیدا ہوا تھا۔ بے حد مہیب اور اذیت ناک۔ اسے لگتا تھا کہ وہ بی بی کے بغیر جتنے ماہ، جتنے دن اور گھنٹے زندہ رہے گا، ایک خوفناک سولی پر لٹکتا رہے گا۔ اب موت اسے پہلے سے زیادہ پیاری لگنے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب جلدی سے مرجائے..... اور اگر مرنے سے پہلے وہ بی بی کے رستے کے ایک دو کانٹے صاف کردیتا تو اس سے اچھی بات اور کیا تھی۔ پھر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کسی تاریک گوشے کے اندر یہ موہوم سی امید بھی موجود تھی کہ شاید وہ ایک بار پھر اپنی بی بی کو دیکھ سکے، ان کی مہربان موجودگی کو محسوس کرسکے۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر تاریکی سے آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا۔ اس ٹکڑے پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ بی بی کے جانے کے بعد یہ ستارے بھی جیسے اداس ہوگئے تھے۔ متلاشی نظروں سے ان ٹیلوں کو تکتے رہتے تھے۔ کہاں تھی وہ؟ جس کے دم قدم سے یہ ڈیرہ چند دن تک جگمگایا تھا، مسکرایا تھا اور گل وگلزار ہوا تھا۔ وہ جیسے سب کو ہی اداس کرگئی تھی۔ مہناز،

شاہدہ، حنیفاں، ٹیپو سب ہی اس کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ کچھ ایسی بات تھی اُس میں کہ وہ دلوں کو تسخیر کرلیتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد یہاں کی ہر شے رستم کو کاٹنے کے لئے دوڑنے لگی تھی۔ کسی وقت رستم بالکل ایک نوخیز عاشق کی طرح سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ ایک دن اس کا دل چاہا کہ وہ رات کے وقت خاموشی سے تیسری سرنگ میں چلا جائے۔ وہ چرخی اور رسّی ابھی تک وہیں لٹک رہی تھیں جنہوں نے رستم اور بی بی کو اندھی دراڑ سے نکالا تھا۔ رستم کا دل چاہا کہ وہ ٹارچ لے کر دراڑ میں اُتر جائے۔ اس جگہ کو پھر سے دیکھے جہاں اس نے بی بی کے ساتھ رات گزاری تھی۔ اس ہموار پتھر کو دیکھے جس پر وہ بی بی کے ساتھ دراز ہوا تھا، ان کے بہت قریب چلا گیا تھا۔ وہاں لیٹ جائے اور آنکھیں بند کرکے اس وقت کی کیفیت کو محسوس کرے لیکن پھر اسے لگا کہ شاید دراڑ میں اُترنے کے بعد وہ مزید دکھی ہوجائے گا۔

اچانک اسے اپنے پہلو سے چندفٹ کی دوری پر ایک مدھم آواز سنائی دی۔ یہ نادیہ کی آواز تھی۔ وہ رستم کی ہدایت کے مطابق پاؤں سے گردن تک کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ رستم سمجھا تھا کہ شاید وہ سوچکی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بڑی دبی ہوئی آواز میں بولی۔ ”رستم! صبح تم جارہے ہو؟“

رستم بُری طرح چونک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید نادیہ اس کی روانگی سے آگاہ نہیں..... پہلے تو اسے نادیہ کی باخبری پر غصہ آیا لیکن پھر اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... ایک ضروری کام ہے۔“

”کیا یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ یہ ضروری کام کیا ہے؟“

”نہیں۔“ رستم نے دوٹوک جواب دیا۔

”لیکن رستم! یہ تو بتا دو کہ تم اتنا شدید خطرہ مول کیوں لے رہے ہو۔ گوہر اتبار بتا رہا تھا کہ باہر جانے والے راستوں پر پولیس آگئی ہے اور یہ لوگ ٹیلی اسکوپس کے ذریعے دور دور تک نظر رکھ رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟“ رستم کے لہجے میں کاٹ تھی۔

”میں نہیں جانتی، لیکن فی الحال یہاں سے نکلنے کی کوشش ٹھیک نہیں ہے۔ گوہر اتبار بتا رہا تھا کہ اس سے پچھلے سال بھی اسی موسم میں پولیس اور رینجرز نے اگلے ڈیرے کی طرف ٹیلوں پر مورچے بنائے تھے مگر پھر ایک دو مہینے بعد واپس چلے گئے تھے۔“

”لیکن اس بار شاید وہ واپس جانے کے لئے نہیں آئے۔“

www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ بس ایک کونے میں رکھی لالٹین کی مدھم لو تھرتھراتی رہی۔ اطراف کے سنسان ٹیلوں سے گیدڑوں اور کتوں کی مدھم آوازیں ابھرتی رہیں۔

آخر نادیہ کی آواز ابھری۔ ''کب تک واپس آؤ گے؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ایسی بات ہے تو..... پھر مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔''

ایک دم رستم کا پارہ چڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس پر پھٹ پڑے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے خود پر ضبط کرلیا۔ نہ صرف ضبط کرلیا بلکہ جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی بہت نرم تھا۔ ''نہیں نادیہ! تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا لیکن جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ شاید آٹھ دس دن کے اندر۔ باقی یہاں تمہیں کسی طرح کی تکلیف پہلے ہوئی ہے نہ اب ہوگی۔ تم یہاں چھوٹی بھرجائی ہو۔ فرید تمہیں بہن کی طرح سمجھتا ہے۔''

''پپ..... پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے رستم۔''

''ڈر کہاں نہیں ہے۔ یہ تو ساری وادی ہی ڈر ہے اور اس ڈر کو تم نے اپنی مرضی سے اپنایا ہے۔'' رستم کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

جب سے وہ دونوں یہاں آئے تھے، پہلا موقع تھا کہ رستم نے ایسے نرم لب و لہجے میں نادیہ سے بات کی تھی۔

وہ بولی۔ ''تمہارا ساتھ ہو تو کوئی ڈر..... ڈر نہیں ہے رستم لیکن تمہارے بغیر ہر زندہ اور بے جان شے بھی ڈراتی ہے۔''

ایسے جملوں پر اکثر نادیہ کو ڈانٹ سننا پڑتی تھی لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ رستم نے کہا۔ ''اچھا اب سو جاؤ۔ صبح مجھے جلدی جاگنا ہوگا۔''

''لک..... کہو تو میں..... تمہارے پاؤں دبا دوں؟''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سو جاؤ تم۔''

''نہیں..... میرا..... دل چاہ رہا ہے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔ اس لہجے میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ رستم دوٹوک انداز میں انکار نہیں کرسکا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تو رستم نے کہا۔ ''پاؤں نہیں، بس سر دبا دو۔''

وہ کھسک کر اس کے سر کی طرف آگئی اور دبانے لگی۔ رستم کے سر میں واقعی ہلکا درد تھا۔ وہ اپنے نرم و نیم گرم ہاتھوں سے دباتی رہی۔ رستم کو نیند آگئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا جب

رستم کی آنکھ کھلی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج نادیہ اپنی جگہ پر نہیں بلکہ اس کے قریب لیٹی ہوئی ہے۔ اس کی طرف رستم کی پشت تھی۔ نادیہ کا ایک ہاتھ رستم کے شانے پر تھا وہ گاہے بگاہے اس ہاتھ کو ہولے سے حرکت دیتی تھی جیسے رستم کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی ہو اور یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ وہ جاگ رہی ہے۔

رستم کا دل چاہا کہ پلٹ کر یہ ہاتھ اپنے کندھے پر سے جھٹک دے اور نادیہ کو بھی دور پٹخ دے لیکن پھر وہ اپنی جگہ بے سدھ پڑا رہا۔ کھڑکی سے باہر آسمان کا رنگ بتا رہا تھا کہ اب جلد صبح ہونے والی ہے۔ وہ صبح، جو رستم کو ایک اَن دیکھے سفر پر روانہ کرتی۔ شاید نادیہ سے آخری ملاقات تھی۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے بے حد تحمل سے کام لے رہا تھا۔ اب ان آخری گھڑیوں میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا..... اگر وہ اس طرح بدمزگی سے بچتا تھا تو یہ بھی ایک طرح سے بی بی کی خواہش کا احترام ہی تھا۔ وہ لیٹا رہا۔ سکرین کی حسین ساحرہ، فلم ایکٹریس نادیہ اس کی پشت پر اس کے بالکل قریب موجود رہی۔ اس کا ہاتھ بدستور رستم کے شانے پر تھا۔ گاہے بگاہے اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی رستم سے ٹکرا جاتا تھا۔ پھر کسی وقت لگتا تھا کہ وہ سو گئی ہے لیکن وہ سو نہیں رہی تھی۔ وہ ہر وقت سراپا دعوت رہتی تھی۔ اپنے ہیجان خیز جسم کو رستم کی وحشتوں کے سپرد کرنے کے لئے بے تاب لیکن یہ ''وحشی'' تو کسی اور دنیا کا باسی تھا۔ اس کے دل و دماغ میں تو پیار محبت کے پیمانے کچھ اور تھے۔ یہ بالکل متضاد کیفیت تھی۔

کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے میں صبح کَو کے اُجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ مرغوں کی بانگیں سنائی دینے لگیں۔ حجروں کے سامنے موجود پٹھان چوکیدار نے اپنا آخری آواز بلند کیا اور سونے کے لئے چلا گیا۔ رستم اٹھ بیٹھا۔ اس نے لالٹین کی لَو اونچی کی تو ایک دم کھڑکی بند کرنے پر مجبور ہوگیا۔ نادیہ اس کے قریب عجیب حالت میں تھی۔ وہ ایک طرح سے رات کو رستم کے کمبل کے اندر ہی گھس آئی تھی..... اور وہ مادرزاد برہنہ تھی۔ لباس کا ایک تار نہیں تھا اس کے جسم پر۔ وہ خود کو سویا ہوا ظاہر کررہی تھی لیکن رستم جانتا تھا کہ یہ ایک اداکارہ کی اداکاری ہے۔ رستم کو اس کی پشت پر اُن آڑھی ترچھی لکیروں کے مدھم نشان نظر آئے جو عامل عظمت نے کھینچی تھیں۔ ایسی ہی چند لکیریں اس کی شفاف پنڈلیوں پر بھی تھیں۔ یہ وہی بے معنی الفاظ تھے جنہیں لکھوانے کا مقصد رستم کی جسمانی قربت حاصل کرنا تھا پھر اس نے یوں کروٹ بدلی جیسے واقعی بے خبری کی نیند سو رہی ہو۔ اب وہ سرتاپا رستم کے سامنے تھی۔ ایک لمحے کے لئے صرف ایک لمحے کے لئے رستم کی نگاہ اس کے خیرہ کن بلوری جسم پر پڑی، پھر اس نے رخ پھیر لیا۔ نادیہ کی یہی حرکتیں اسے رستم کی نظر سے گراتی تھیں۔ وہ اپنے تباہ کن جسم کو رستم کے

www.pdfbooksfree.pk

لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ آج رستم کی ذرا سی شہ پا کر وہ کپڑوں سے باہر ہوگئی تھی۔

ایک سیکنڈ کے لئے رستم کا دل چاہا کہ ایسی زوردار ٹھوکر نادیہ کے چہرے پر مارے کہ اس کی شکل بگڑ جائے یا پھر ویسے ہی شوٹ کردے اسے لیکن ایک بار پھر بی بی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اپنی پوری شان، دبدبے اور محبت کے ساتھ۔ رستم نے زور سے جبڑے بھینچے، اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہوگیا تھا۔ نادیہ کی طرف دیکھے بغیر اس نے کمبل نادیہ پر پھینک دیا۔ یہ کمبل اس نے جیسے نادیہ پر نہیں ''گناہ کی کھلی دعوت'' پر پھینکا تھا۔ پھر وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ فرید، حسنے اور مراد سے رخصت ہوکر جا رہا تھا۔ اس کی روانگی کا علم بس چار پانچ بندوں کے سوا کسی اور کو نہیں تھا۔ اب نادیہ بھی ان میں شامل تھی۔ فرید نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ یا حسنا اس کے ساتھ چلے جائیں گے لیکن رستم نے ایک نہیں مانی۔ تاہم ان کے بہت مجبور کرنے پر اس نے گوہرا کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ گوہرا اب بالکل صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ دونوں پوری طرح مسلح تھے۔ رستم کی چرمی جیکٹ کے نیچے کولٹ پسٹل تھا اور پچاس کے قریب راؤنڈ تھے۔ اس کے علاوہ وہ بڑے پھل کا چھرا بھی اس کے ساتھ تھا جو وہ چند ماہ پہلے مہتم بستی سے لے کر چلا تھا۔ یہی وہ چھرا تھا جس سے رستم نے ڈیک نالے کے کنارے پولیس اہلکاروں کو ذبح کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سیون ایم ایم رائفل اور اس کے تقریباً 200 راؤنڈ بھی رستم کے پاس تھے۔ یہ راؤنڈ کینوس کے ایک شولڈر بیگ میں تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے سفری بیگ رستم اور گوہرا کی پشت پر موجود تھے۔ ان میں پانی، کھانے کا سامان اور ٹارچیں وغیرہ تھیں۔

ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ڈیرے کے بیشتر افراد سو رہے تھے۔ رستم نے فرید اور حسنے سے دیر تک معانقہ کیا۔ ایک دروازے کی اوٹ سے نادیہ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ فرید کی بیوی مہناز باورچی خانے کی طرف سے آئی۔ ''رستم بھائی! کہاں کی تیاری ہے؟'' وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔ اس کی آواز میں حیرت کا عنصر تھا۔ غالباً اس نے رستم کو فرید اور حسنے سے معانقہ وغیرہ کرتے دیکھا تھا اور چونک گئی تھی۔

''نہیں، کوئی زیادہ لمبا پروگرام نہیں۔ ایک دو دن میں لوٹ آؤں گا۔'' رستم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار جنوب کی سمت روانہ تھے۔ کافی فاصلے پر پہنچ کر

رستم نے مڑ کر دیکھا۔ فرید اور حسنا اسی جگہ ساکت و جامد کھڑے تھے اور رستم کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ رستم نے ایک بار پھر ہاتھ لہرایا۔ انہوں نے جواب دیا۔ رستم اور گوہرا ایک نشیب میں اُترے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ وڈاڈیرہ اپنی سرگوں، ججروں، درختوں اور ٹیلوں سمیت نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ بس پانی کی بلند و بالا ٹینکی نظر آتی رہی، کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہوگئی۔

رستم اور گوہرا نے تقریباً آٹھ گھنٹے گھوڑوں پر سفر کیا۔ پھر ایک جگہ گھوڑے چھوڑ دیئے۔ یہ گھوڑے ایک گشتی پارٹی ڈیرے پر واپس لے گئی۔ یہ گشتی پارٹی دلاور اور اس کے دو ساتھیوں پر مشتمل تھی۔ رات ایک کھوہ میں بسر کرنے کے بعد اگلے روز رستم اور گوہرا کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ سفر کا مشکل ترین مرحلہ اگلے روز دوپہر بارہ بجے کے بعد آیا۔ ان کی معلومات کے مطابق وہ اب ایسے علاقے میں تھے جہاں پولیس سے مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ رستم اور گوہرا کے لئے یہ علاقہ اپنی ہتھیلی کی طرح جانا پہچانا تھا۔ ہر نشیب و فراز سے آگاہی تھی انہیں لیکن اب حالات ایسے تھے کہ انہیں ہر قدم پھونک کر رکھنا تھا۔

وہ ستانے کے لئے ایک محفوظ آڑ میں بیٹھ گئے اور صورت حال پر غور کرنے لگے۔ ابھی تک انہیں کہیں بھی کوئی مشکوک نقل و حرکت نظر نہیں آئی تھی تاہم وہ جانتے تھے کہ یہاں لوگ موجود ہوں گے ابھی کچھ دیر پہلے ایک موڑ کاٹتے ہوئے انہیں بلندی پر شیشے کی چمک نظر آئی تھی۔ یہ دوربین یا چھوٹی ٹیلی اسکوپ کے عدسے کی بھی ہوسکتی تھی۔

رستم نے ایک پتھر سے ٹیک لگائی اور اطراف میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمارے سامنے دو رستے ہیں گوہرا۔ ایک یہ کہ ہم زیادہ دشوار رستہ استعمال کریں جہاں پلیسوں سے سامنا ہونے کا چانس کم سے کم ہو لیکن تم جانتے ہی ہو اس رستے پر ہم رات کے وقت سفر نہیں کرسکیں گے اور اگر کریں گے تو ٹارچ ضروری ہوگی اور روشنی خطرناک ہوسکتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رات کے پچھلے پہر عام رستے سے ہی نکلیں۔''

گوہرا نے ایک اطمینان بھری انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''لالے دی جان! میں نے سوچنے کا کام تم پر چھوڑ دیا ہے۔ جس رستے پر ڈالو گے، چل پڑوں گا۔ بس جس وقت ٹھاہ ٹھاہ کرنے کا وقت آئے، مجھے بتا دینا اور پھر دیکھنا جو ہرا پنے گوہرا کے۔''

رستم کی پیشانی پر مسلسل سوچ کی لکیریں تھیں۔ ''ایک بات اور بھی غور کرنے کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جس طرح ہم سوچ رہے ہیں اسی طرح پلیسے بھی سوچ رہے ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

www.pdfbooksfree.pk

''یار! ہم اوکھے راستے (مشکل راستے) سے نکلنے کا سوچ رہے ہیں ناں، ہوسکتا ہے کہ انہیں بھی شک ہو کہ ہم ایسا کریں گے۔ جب ہم مشکل چڑھائی پر گوڈے گٹے چھلا کراوپر پہنچیں تو وہاں ٹھاہ ٹھاہ شروع ہوجائے۔''

''بات تو ٹھیک ہے۔ پچھلے سال بھی چتواڑ والی چڑھائی کی طرف ایک ایسی ہی جھڑپ ہوئی تھی۔''

''تو پھر..... عام رستہ اور رات کا وقت۔ ڈھائی تین بجے کے بعد۔''

''بالکل ٹھیک۔''

اچانک رستم بات کرتے کرتے چونک گیا۔ اس کی نظر نشیب میں بکریوں کے ایک چھوٹے سے ریوڑ پر پڑی ایک مرد اور دو عورتیں بکریوں کو ہانکتے ہوئے لے جارہے تھے۔ یہ تینوں مقامی تھے۔ عورتوں کے کولہوں سے ایک ایک بچہ چمٹا ہوا تھا۔ ایک عورت کے سر پر دودھ یا پانی کا برتن بھی تھا۔ وہ قریباً 100 میٹر کی دوری سے گزرے۔ یہ ریوڑ آگے نکل گیا تو ایسے ہی ایک اور چھوٹے سے ریوڑ کے آثار نظر آئے اس میں بکریوں کے علاوہ چند بھیڑیں بھی شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ایک بھوری بھینس تھی۔ دو پوٹھوہاری انہیں ہانکتے ہوئے لے جارہے تھے گرد اور دھوپ سے بچنے کے لئے انہوں نے حسب رواج اپنے چہرے اور سر صافوں سے ڈھانپ رکھے تھے۔

رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آؤ گوہرا۔''

گوہر انے دھیان سے رستم کا چہرہ دیکھا اور وہ بھی سمجھ گیا۔

ان دونوں نے ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے قریباً نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا۔ ایک چھوٹا سا کلاواکاٹ کر وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے پیچھے والے ریوڑ کو ابھی گزرنا تھا۔ انہیں دو تین منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بکریوں کی ممیاہٹ اور چرواہوں کی نخ نخ سنائی دی۔ وہ دونوں گھات لگائے بیٹھے رہے۔ پہلے ریوڑ گزرا اور پھر دونوں لمبے چوڑے چرواہے دکھائی دیئے۔ ایک کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی اور دوسرے کے ہاتھ میں دس بارہ فٹ لمبی دستے والی کلہاڑی تھی جسے ''چھوی'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اونچے درختوں سے پتے وغیرہ اُتارنے کے کام آتی ہے۔

رستم اور گوہرا کے لئے دونوں افراد پر قابو پانا چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ بے چارے آواز تک نہیں نکال پائے تھے۔ ایک شخص کا سر بڑے زور سے ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔ دوسرا گوہرا کی گرفت میں تھا۔ گوہرا کا مضبوط ہاتھ اس کے

www.pdfbooksfree.pk

ہونٹوں پر جما ہوا تھا لیکن ریوڑ کی چند بکریوں کو نہ جانے کیا ہوا تھا وہ اس واقعے کے بعد بُری طرح ممیائی اور اچھلی کودی تھیں۔ رستم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں آگے جانے والے چرواہوں کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ بہرحال دونوں ریوڑوں کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ یہ اندیشہ باطل ثابت ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد دونوں بکروال ایک سرمئی ٹیلے کے غار نما خلا میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے کپڑے رستم اور گوہرا کے جسم پر تھے۔ بکروالوں کو مجبوراً برہنہ کرنا پڑا تھا۔ رستم اور گوہرا نے اپنے کپڑے اُتار کر سنری تھیلوں میں ٹھونس لئے تھے۔ آگے جاکر اس لباس نے پھر کام دینا تھا۔ دونوں بکروالوں کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی گئی تھیں اور منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے تھے۔ ان کی برہنگی چھپانے کے لئے رستم نے ایک ایک گرم چادر ان پر ڈال دی۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھوکے پیاسے اللہ کو پیارے نہ ہوجائیں۔ گوہرا نے ایک تیز دھار چاقو دونوں افراد کو دکھایا اور اسے کھوہ کے اندر تیں چالیس گز کی دوری پر پھینک دیا اب وہ کوشش کرکے اس چاقو تک پہنچ سکتے تھے اور اپنی بندشیں کاٹ سکتے تھے۔ تاہم اس کام کے لئے انہیں کم و بیش سات آٹھ گھنٹے لگنے تھے۔

رستم نے سو سو کے چند نوٹ ان دونوں کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ''پریشان نہ ہونا تمہاری بکریاں صحیح سلامت مل جائیں گی اور تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ اس بارے میں کسی کو بتانا نہیں۔''

دونوں خوف زادہ افراد نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ رستم اور گوہرا کھوہ نما خلا سے باہر نکل آئے۔

سورج ڈوبنے میں ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا، جب وہ بکریاں ہانکتے ہوئے خطرناک ترین جگہ سے گزرے۔ پولیس کے حوالے سے ان کے اندیشے بالکل درست تھے۔ لالہ فرید نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لمبے چوڑے پروگرام کے تحت اس علاقے کی ناکہ بندی کی جارہی ہے۔ پہاڑی گزرگاہ کی دونوں جانب پولیس کی نفری نظر آئی۔ ایک دو چھولداریاں بھی دکھائی دیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر بڑے سائز کی ''ٹیلی سکوپ'' سٹینڈ پر فٹ تھی اور اس کے عقب میں ایک سفید پوش پولیس اہلکار موجود تھا۔ یقیناً وہ اس ریوڑ کو دیکھ رہا تھا جو پہاڑی گزرگاہ کے درمیان ہلکی پھلکی دھول اُڑاتا آگے بڑھ رہا تھا۔

''لالے دی جان! ذرا دائیں طرف دیکھو۔'' گوہرے نے گردن گھمائے بغیر کہا۔

ایک بھربھرے پتھر کی اوٹ میں جرمن ساختہ MG42 گن، گولیوں کی بیلٹ سمیت چھوٹے سٹینڈ پر لگی ہوئی تھی۔ اسے بارش وغیرہ سے بچانے کے لئے اس پر پولی تھین کی ایک

بڑی شیٹ ڈال دی گئی تھی۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی یہاں بھاری اسلحہ موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چرواہوں کے انداز میں ہی بکریاں ہانکتے اور منہ سے لخ لخ کی آواز نکالتے "پل صراط" پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کے سر اور چہرے صافوں میں پوشیدہ تھے۔ کسی بھی وقت انہیں روک کر ان کی شناخت کی جاسکتی تھی۔ دونوں اس صورتِ حال کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ایسے موقعوں پر رستم کی کیفیت عجیب ہوجاتی تھی، ایک درندگی سی اس کے رگ و پے میں اُتر جاتی تھی اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور یہ دھڑکن جنگ کے نقارے کی طرح تھی۔

انہیں ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہوجائے گا۔ تین چار مسلح اہلکار ستانے والے انداز میں ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ رستم اور گوہر ان سے فقط تیس چالیس میٹر کی دوری سے گزرے۔ ایک پولیس اہلکار نے دور کھڑے اپنے کسی بے تکلف دوست کو مخاطب کرتے ہوئے ہانک لگائی۔ "اوئے اسحاقے! دیکھ تجھ سے تو یہ بکرا ہی اچھا ہے۔ چار پانچ بکریوں کے ساتھ اس جنگل میں اکیلا عیش کررہا ہے۔ ایک تُو ہے کہ جنگل میں چھڑا اور شہر میں بھی چھڑا۔"

"اتنا ہی درد ہے تو تُو دیکھ دے نہ اپنی فیملی میں سے کوئی۔ امیر علی کہتا تھا، تیری ایک سالی بڑی سوہنی ہے۔ مکھن ملائی کی طرح۔"

"اوئے حرامی! کھوتے دے پُتر! سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ اب تجھے آدھی گھر والی چاہیے کہ پوری۔"

"جس کے ساتھ تُو نے سہاگ رات منائی تھی وہ بھی تو تیرے تائے کے وڈے پُتر کی سالی تھی ناں۔" اسحاقے نے معنی خیز انداز میں چوٹ کی۔

پہلے شخص نے تلملا کر دوسرے کو ماں کی گالی دی۔ پھر اس کی بہن کا رشتہ پنجابی فلموں کے ایک مشہور ولن سے جوڑ دیا۔

اس گالم گلوچ کے درمیان ہی رستم اور گوہر بکریوں اور بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے درہ نما جگہ سے آگے نکل آئے۔ اگلا ریوڑ خاصی آگے نکل چکا تھا۔ اب اس کی اُڑائی ہوئی دھول بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ "لالے، کیا خیال ہے بچ بچا ہوگیا ہے؟" رستم نے گوہر سے پوچھا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے لالے دی جان، پر ابھی دو تین میل آگے نکلیں گے تو پھر تسلی ہوگی۔" گوہر نے اپنی "چھوی" سے ایک اڑیل بھیڑ کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"راستہ تھوڑا سا بدل نہ لیں؟" رستم نے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" گوہر نے تائید کی۔ "اگلے اسجڑ (ریوڑ) سے میل نہیں ہوگا۔"

انہوں نے کچھ آگے جاکر رخ تھوڑا سا تبدیل کرلیا۔ ان کے لباس کے نیچے وزنی ہتھیار موجود تھے۔ اپنے سفری تھیلے انہوں نے چارے کی ایک بڑی گٹھڑی میں رکھ دیئے تھے۔ رستم کی پسندیدہ سیون ایم ایم بھی اسی گٹھڑی میں تھی۔ اس گٹھڑی کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ یہ بہ آسانی بھینس کی پشت پہ لدگئی تھی۔

وہ چلتے رہے شام گہری ہونے سے پہلے وہ پہاڑی گزرگاہ سے تین چار میل آگے آچکے تھے۔ اب وہ واقعی محسوس کررہے تھے کہ خطرے سے باہر ہیں۔ ٹیلوں میں ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ مغربی افق ابھی تک سرخ تھا، جیسے دور کہیں ٹیلوں کے پیچھے آگ بھڑک رہی ہو۔ بائیں طرف جنتر، بیری، گوندنی اور جنگلی انجیر کے درختوں کے پیچھے لامتناہی ٹیلوں سے آگے جنوب میں..... جہاں بی بی رہتی تھی۔ کسی ہنستی بستی آبادی کے روشن روشن گھر میں ان کی آواز گونجتی تھی۔ رستم نے تصور کی نگاہ سے بی بی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہاں ہوگی؟ کیا کررہی ہوں گی؟ عین اس وقت، ان لمحوں میں وہ کیا سوچ رہی ہوں گی؟

دن کے وقت سرخی مائل رنگ کے یہ کم بلندی والے ٹیلے بے آباد ہی نظر آتے تھے لیکن رات ہوتے ہی کہیں کہیں روشن نقطے نمودار ہوجاتے تھے، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان ویرانیوں میں بھی جگہ جگہ زندگی موجود ہے۔ کسی کسی جگہ کوئی کھیت یا کنواں بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ خچر یا گھوڑے گدھے پر سواری کرتے ہوئے افراد دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرح سے یہ نیم آباد علاقے کی شروعات تھی۔ وہ ایک بڑے جھونپڑے کے قریب سے گزرے۔ یہ غالباً درختوں کی کٹائی کرنے والے کسی ٹھیکیدار کا جھونپڑا تھا۔ درجنوں مزدور دن بھر کی تھکاوٹ اُتارنے کے لئے چائے یا قہوہ پی رہے تھے اور ڈھولک پر گیت گارہے تھے۔ ان کے سامنے الاؤ بھڑک رہا تھا۔ باجرے کی گرم روٹی کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ چار پانچ مزدور مستی میں آکر الاؤ کے گرد لڈی رقص کررہے تھے۔ رقص کے دوران میں وہ دو دفعہ تالی بجاتے تھے اور تالی کی آواز ڈھول کی آواز سے ہم آہنگ ہوکر عجیب سماں پیدا کرتی تھی۔ ان کی آوازیں قریب و جوار میں گونج رہی تھیں۔

بھئی بھنا چھولے
اج مینڈے ماہی آؤنا کو ٹھے تے کاں بولے
کو ٹھے تے آکاواں
سد پٹواری نوں جنڈ ڈھولے دے ناں لاواں

www.pdfbooksfree.pk

ایک شخص نے رستم اور گوہرا کو مخاطب کر کے بلند آواز سے کہا۔ ''ہاں بھئی سجنو! کوئی دودھ شودھ بھی ہے تمہارے پاس؟''

گوہرا نے کہا۔ ''نہیں لالے! رستے میں دے دیا ہے ایک اللہ والے کو۔''

''ایک اللہ والا یہاں ہمارے پاس بھی بیٹھا ہوا ہے۔ تھوڑا بہت بھی نہیں ہے دودھ؟''

''نہیں لالے ہوتا تو آپ سے دودھ اچھا تھا۔''

دائیں طرف اونچے نیچے راستے سے ایک چھکڑا گزر رہا تھا۔ اس پر جلانے کی خشک لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ تھوڑا آگے گئے تو کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ ایک نہیں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک تو پولیس کی جیپ لگتی تھی، اس کے پیچھے ایک سفید کار تھی۔ رستم اور گوہرا ذرا چونک گئے۔ دونوں گاڑیاں دھیمی رفتار سے ان کے پاس سے گزر گئیں۔ تاہم آگے جا کر دونوں رک گئیں۔ پھر دونوں گاڑیاں ریورس ہوئیں اور رستم اور گوہرا کے سامنے آ کر ٹھہر گئیں۔ جیپ کے پچھلے دروازے سے ایک باوردی پولیس والے نے سر باہر نکالا۔ پوٹھوہاری لہجے میں بولا۔ ''ہاں بھئی کون ہو؟ اس وقت کدھر کو جل رہے ہو؟''

''اپنے گراں (گاؤں) کی طرف جا رہے ہیں جی۔ رستے میں ایک بھیڑ گم ہو گئی تھی، اس لئے دیر ہو گئی۔''

جیپ سے دو افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی ٹارچیں تھیں۔ ان میں سے ایک سیدھا چارے والی بڑی گٹھڑی کی طرف گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا، دوسرے نے پلک جھپکتے میں رستم اور گوہرا کے صافے چہروں سے اُتار دیئے۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا..... رستم اور گوہرا دونوں مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ وہ آخر تک ساکت جامد کھڑے رہے۔ وہ آخری چانس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور آخری چانس یہ تھا کہ پولیس والے ان دونوں کو شناخت کرنے میں ناکام رہتے۔ حالانکہ اس کی امید بہت کم تھی۔ خاص طور سے رستم کی شناخت اس کے لمبے بالوں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کی وجہ سے بہت آسان تھی۔

''کون ہو تم؟'' ٹارچ والے نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی دو اور رائفل بردار چھلانگیں لگا کر جیپ سے اُترے لیکن اس سے کہیں تیزی کے ساتھ ایک اور چیز رستم کی طرف آئی۔ رستم جیسا شخص بھی ایسی تیزی اور پھرتی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ سیاہ جیپ کے اگلے بائیں دروازے سے کوئی اچھل کر باہر نکلا اور ایک ہی ساعت میں رستم نے اپنی گردن پر سرد لوہے کا بے رحم لمس محسوس کیا۔ یہ پسٹل تھا۔ یہ کسی کا

www.pdfbooksfree.pk

پسٹل تھا؟ رستم کا اپنی قمیص کے نیچے بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی رگوں میں خون کی گردش انتہا کو چھو گئی۔ اس کے سامنے ایک جانا پہچانا سا چہرہ تھا۔ اس نے باوردی افسر کے کندھے دیکھے۔ پھولوں کی تعداد اس امر کی تصدیق کر رہی تھی کہ اس کے سامنے اس راستے پر اس تاریک ویرانے میں مشہور و معروف ڈی ایس پی ریاض کھڑا ہے۔ ڈپٹی ریاض ہٹلر جس کی دہشت کے سبب زوار کے دوست نے اونچی عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی..... اور ایسے نہ جانے کتنے واقعات اس شخص سے وابستہ تھے..... یہ ڈپٹی ریاض سے رستم کا پہلا سامنا تھا اور یہ بڑے غلط وقت میں ہوا تھا..... ہاں یہ وقت ڈپٹی ریاض کے لئے بڑا غلط تھا۔ رستم ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رکھتا تھا لیکن آج تو اس کی جان ہی ہتھیلی پر تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے زندگی اور موت اس کے لئے ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں اور آج ڈپٹی ریاض اس کے سامنے تھا۔

جیسے شعلہ لپکتا ہے..... جیسے بجلی چمکتی ہے..... جیسے بارود دھماکے سے پھٹ پڑتا ہے اسی طرح رستم سیال کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس کی کلائی کی طوفانی ضرب ڈپٹی ریاض کے پسٹل والے ہاتھ پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی رستم کی ایسی زوردار ٹانگ ڈپٹی ریاض کے پیٹ میں لگی کہ وہ اُڑ کر اپنی جیپ کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ اس کی کیپ اُتر کر دور جا گری۔ ڈپٹی کے ماتحت سکتہ زدہ تھے۔ شاید ان کے سان گمان میں بھی ایسا منظر نہیں تھا۔ پھر جیسے سامنے والا پوٹھوہاری رائفل بردار ہوش میں آیا۔ اس نے رستم کی طرف رائفل سیدھی کی لیکن تب تک رستم کا کولٹ پسٹل اس کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ پسٹل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور پوٹھوہاری رائفل بردار سینے پر گولی کھا کر پیچھے الٹ گیا۔

دوسری طرف گوہرا بھی رستم کو دیکھ کر شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اس نے چھوی کی شدید ضرب سے ایک مسلح ہیڈ کانسٹیبل کو دور پھینک دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا پسٹل قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔ دوسری طرف ڈپٹی ریاض ایک بار پھر رستم پر حملہ آور ہوا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اس کے منہ سے ایک گندی گالی نکلی اور اس نے رستم کے جبڑے پر ایک فولادی مکہ رسید کیا۔ ''تیری میں.....'' اس کا یہ فقرہ غلیظ ترین تھا اور لہجہ خطرناک ترین۔

اس مکے کے لمس نے رستم کو مدمقابل کی زبردست جسمانی توانائی کا احساس تو دلایا مگر رستم کو وار کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ رستم کی ٹانگ ایک بار پھر گھوم کر ڈپٹی ریاض کی پسلیوں پر لگی تھی۔ وہ مکہ مارنے کا عمل پورا کر کے فالتو قہر میں تھا۔ ضرب نے اسے نشیب میں لڑھکا دیا۔

''بھاگو گوہر ے!'' رستم نے کہا۔

گوہر اور وہ ایک ساتھ بھاگے.....اور ایک ساتھ ہی نیچے جھکے۔ یہ جھکنا ان دونوں کی زندگیوں کا ضامن بن گیا۔ سفید کار سے نکلنے والے ایک سادہ پوش اہلکار نے اپنی خودکار رائفل سے برسٹ چلایا۔ شعلے ان دونوں کے سروں کے اوپر چمکے۔ ریوڑ کی کئی بکریاں زمین پر گریں۔ دوسرا برسٹ چلنے سے پہلے وہ دونوں نشیب میں چھلانگ لگا چکے تھے۔ وہ ڈھلوان زمین پر پندرہ بیس فٹ تک پشت کے بل پھسلے اور جنتر کی گھنی جھاڑیوں میں گرے۔ ان کے آگے ٹیلوں کی بھول بھلیاں تھیں اور دشوار گھاٹیاں تھیں.....اور یہ پوٹھوہار تھا۔ تاریکی میں لپٹا ہوا، اسرار میں چھپا ہوا۔ وہ ایک ایسا پشت پناہ تھا جس کا سینہ دیوار اور بازو فصیل تھے۔ وہ زمانوں سے پناہ دینے والوں کو پناہ دیتا رہا تھا اور پناہ کا حق ادا کرتا رہا تھا اور یہ پوٹھوہار اپنی اس روایت پر اتنا مستحکم تھا کہ اکثر اچھے اور بُرے اور دوست دشمن کی تمیز بھی بھول جاتا تھا۔ اس کا کام بھاگنے والوں کو برستے تیروں اور سنسناتی گولیوں سے بچانا تھا اور حتی الامکان ان کی زندگیوں کی حفاظت کرنا تھا۔ انگریزی دور میں ریاستی جبر وستم اور ناانصافی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے ''سرپھرے'' سون کے اسی ویرانے میں پناہ گزین ہوتے رہتے تھے۔ امیر.....علی اکبر اور جہان خان کو کون بھول سکتا ہے جن کے کریڈٹ پر درجنوں نہیں سینکڑوں وارداتیں تھیں اور جو انہی ٹیلوں میں فرنگیوں کو تگنی کا ناچ نچاتے رہے تھے اور پھر چراغ بالی جو مجبوروں اور بے کسوں کے لئے امید کی علامت تھا اور مصری خان اعوان جس نے کسی معمولی شخص سے نہیں اکبر اعظم سے ٹکر لی تھی اور طورہ خان جو انگریز کے لئے دہشت بن کر زندہ رہا اور تختہ دار پر جھولنے تک ان ہی ویرانوں کی پناہ حاصل کرتا رہا.....اور پھر ملک محمد خان جو اسی سرزمین سے اٹھا، انہی نشیب وفراز میں بھٹکا اور بے شمار لوگوں کے لئے ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اس ویرانے کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ یہاں ہمیشہ کچھ لوگ بھاگتے رہے تھے اور کچھ ان کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ یہاں زندگی بچانے اور زندگی لینے کا کھیل صدیوں سے جاری تھا.....اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج اس تاریک رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے جنتر، بیری، انجیر اور جھلیکھڑی کے درختوں کے درمیان رستم اور گوہر بھاگ رہے تھے۔ ان کے عقب میں پنجاب پولیس کا ایک نہایت خوفناک افسر ڈپٹی ریاض تھا۔

رستم اور گوہر کو کچھ گرج دار للکارے کافی دور سے سنائی دے رہے تھے۔ غالباً امکان یہی تھا کہ یہ ڈپٹی ریاض کی گھن گھرج ہے۔ وہ اپنی نفری کو نیم دائرے کی شکل میں پھیلا کر رستم

کے پیچھے آ رہا تھا۔ ٹارچوں کی روشنیاں تیز رفتار پولیس والوں کی متحرک پوزیشن کو ظاہر کر رہی تھیں۔ گاہے بگاہے سیون ایم ایم اور سیمی آٹومیٹک رائفلوں کے فائر بھی ہوتے تھے اور گولیاں سنسناتی ہوئی اور شاخوں کو توڑتی ہوئی ان کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔

رستم بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ فائرنگ کی یہ مسلسل آوازیں آس پاس موجود پولیس کی نفری کو ان ٹیلوں کی طرف کھینچ لائیں گی اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو ایک اور امکان موجود تھا۔ ڈپٹی ریاض کی جیپ میں وائرلیس سیٹ ہو سکتا تھا۔ اس سیٹ کو استعمال کر کے منٹوں میں اردگرد موجود اہلکاروں کو یہاں اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ رستم جانتا تھا کہ اس معاملے میں ڈپٹی ریاض جیسا شخص کسی قسم کی سستی نہیں کرے گا۔ جو شخص اس کی زد میں آیا تھا وہ کوئی اور نہیں رستم تھا۔ کئی پولیس اہلکاروں کا قاتل، درجنوں ڈکیتیوں اور خونریزیوں کا ملزم، وہ اس وقت پنجاب پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب افراد میں سے تھا۔

رستم نے بھاگتے بھاگتے گوہر اسے پوچھا۔ ''پسٹل کے کتنے راؤنڈ ہوں گے تمہارے پاس؟''

''پندرہ بیس سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی ایمونیشن تو بھینس پر رکھا تھا.....اور تمہارے پاس؟''

''میرے پاس تو ساٹھ کے قریب ہیں۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' گوہر نے ہانپتی آواز میں کہا۔ ''یہ تو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہو گئی ہے۔ سید ھا ڈپٹی ریاض سے آ ٹکرائے ہیں۔''

''دیکھ لیتے ہیں اس ڈپٹی کو بھی۔'' رستم کے لہجے میں آگ تھی اور زہر تھا۔ اس آگ کو محسوس کر کے گوہر جیسا بندہ بھی کانپ گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر رستم رک گیا۔ وہ نیم تاریکی میں گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو رستم بھائی؟'' گوہر نے ہانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہم غلط رخ پر جا رہے ہیں۔ آگے نالے والی کھائی ہے۔ ہم پکڑے جائیں گے۔''

''تو پھر؟''

''دائیں طرف چلو۔'' رستم نے کہا۔

وہ تاریکی میں چھپی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں پھلانگنے، دائیں رخ پر چل دیئے۔ رستم کے ہاتھ میں 38 بور کا کولٹ پسٹل تھا جب کہ گوہر کے ہاتھ میں چھوٹے بیرل والی ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ پولیس کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ان کی ٹارچوں کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہ تین

www.pdfbooksfree.pk

طرف سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جلد ہی وہ اتنے قریب آگئے کہ ان کی چلائی ہوئی گولیاں رستم اور گوہرا کے لئے شدید خطرہ بن گئیں۔ اب ان دونوں کے لئے پوزیشن لینا ضروری ہوگیا تھا۔ پوٹھوہار میں وادی سون کے نواح کے ٹیلے عجیب وغریب ساخت رکھتے تھے۔ ان ٹیلوں کے درمیان چلتے چلتے بندہ خود کو اچانک ایک کشادہ میدان، ایک تنگ گھاٹی یا گہری کھائی کے کنارے پا سکتا ہے۔ کہیں کہیں ٹیلوں کے درمیان راستے بھول بھلیوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ مشرق کے رخ پر چلنے والا تھوڑی ہی دیر میں خود کو جنوب یا شمال کی طرف جاتے ہوئے پاتا ہے اور جسے وہ جنوب یا شمال سمجھ رہا ہوتا ہے، بعد ازاں وہ مغرب نکلتا ہے۔ رستم اور گوہر ابھی کھائی سے بچتے بچتے ایک مسدود گزرگاہ پر آگئے۔

دائیں طرف سے نمودار ہونے والے پولیس اہلکار رستم اور گوہرا کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ رستم اور گوہر انے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لی اور جوابی فائر کرنے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے جوابی فائر کئے تھے۔ کولٹ پسٹل اور ٹرپل ٹو رائفل کے شعلے فضا میں چمکے تو پولیس اہلکاروں کی پیش قدمی رک گئی۔ رات کے سناٹے میں دھماکوں کی آوازیں ٹیلوں کے درمیان دور دور تک گونجنے لگیں۔

چند گولیاں رستم اور گوہرا کے بہت نزدیک بھربھرے پتھروں سے ٹکرائیں اور بہت سی پتھریلی مٹی ان دونوں کے سروں پر گری۔ گوہرا نے ''مٹی گرانے والوں'' کو کئی کلاسیکل گالیاں دیں اور دانت پیس کر یکے بعد دیگرے کوئی ایک درجن فائر کئے۔

''سنبھل کے گوہرے، راشن پانی کے حساب سے فیر نکالو۔'' رستم نے تنبیہہ کی۔

وہ ایک ہموار جگہ پر تھے۔ ان کے عقب میں اونچے مخروطی ٹیلے تھے۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ کر ان ٹیلوں پر چڑھتے تو لازمی گولیوں کا نشانہ بنتے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے۔

گاہے بگاہے دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی پھر دائیں طرف کھبا ڑی اور بیری کے درختوں کے پیچھے سے ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔ کوئی شخص میگافون پر بولا۔ ''رستم! تُو بھاگ نہیں سکتا یہاں سے۔ تیرے لئے اچھا ہے کہ ہاتھ کھڑے کر کے سامنے آجا۔''

''کون ہوتم؟'' رستم نے زہر آلود لہجے میں پکار کر پوچھا۔

''میں ڈپٹی ریاض ہوں اور وارننگ دے رہا ہوں تجھے۔ جان بچانی ہے تو ہتھیار پھینک دے۔''

رستم خاموش رہا۔ فضا میں بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ فائرنگ کی وجہ سے ہونے والے زبردست شور کے سبب درختوں سے اُڑ جانے والے پرندے اوپر بلندی پر بول رہے تھے۔

رات کے وقت انہیں ان کے گھونسلوں میں بے آرام کردیا گیا تھا۔ شاید اسی لئے ان کی آوازوں میں احتجاج کی جھلک تھی۔

ڈپٹی ریاض پھر پھنکارا۔ ''رستے! ان پتھروں میں گھٹ کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ تُو قانون کا سامنا کرلے۔ تُو اور تیرا ساتھی ہاتھ کھڑے کر کے سامنے آجاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ ہم گولی نہیں چلائیں گے۔''

''کتے کی موت کے آئے گی، اس تما فیصلہ ابھی تھوڑی دیر میں ہوجائے گا۔ میں بھی تجھے وارننگ دیتا ہوں۔ آگے آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ایسی جگہ گولیاں ماروں گا کہ تیری لاش بھی منہ چھپائے گی۔'' رستم جوابی طور پر پھنکارا۔ اس کی آواز میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''میں نے صحیح سنا تھا تیرے بارے میں۔ تیری کھوپڑی میں خنزیر کا دماغ فٹ ہے۔'' ریاض نے میگافون کے بغیر اپنی آواز رستم کے کانوں تک پہنچائی۔

''اور میں نے بھی صحیح سنا تھا۔ تیری ماں کو تیرے پیو کے نام کا پتا نہیں۔'' رستم نے بے باکی سے کہا۔

ایک ساتھ کئی فائر ہوئے اور بہت سی مٹی اُڑ کر دوبارہ رستم اور گوہرا کے کپڑوں پر گری۔ گوہرا نے ایک بار پھر زیر لب گالیاں دیں۔ جوابی طور پر رستم اور گوہرا نے بھی کئی فائر کئے۔ ٹرپل ٹو کی آواز خوفناک تھی اور یہ آواز پولیس والوں کو ان سے دور رکھے ہوئے تھی۔ اگلے پانچ منٹ میں دونوں طرف سے گاہے بگاہے فائر ہوتے رہے۔ رستم نے کھردری زمین پر اوندھے لیٹے گوہرا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''مجھے لگتا ہے یہ حرامی ریاض ٹائم پاس کررہا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اور نفری موقع پر پہنچ جائے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' گوہرا کی آواز میں ہلکی سی تشویش تھی۔

''اگر ہمیں یہاں سے نکلنا ہے تو پھر اس کے لئے یہی وقت اچھا ہے۔ بعد میں کچھ نہیں ہوسکے گا۔''

''تو ٹھیک ہے لالے دی جان۔ فائر کرتے ہوئے چڑھائی چڑھ جاتے ہیں۔''

''نہیں، یہ زیادہ خطرناک ہے۔ ہمیں سامنے سے ہی نکلنا ہوگا۔'' رستم نے کہا۔ گوہرا سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ رستم کا ہاتھ اپنی قمیص کے نیچے کچھ ٹٹول بھی رہا تھا۔ اس موقع پر یہ بڑی قیمتی شے تھی۔ یہ ایک ہینڈ گرینیڈ تھا۔ ایسے چند ہینڈ گرینیڈ کافی عرصے سے ڈیرے پر موجود تھے۔ یہ بہت پرانے تھے، دوسری جنگ عظیم کے دور کے تھے شاید، لیکن قابل استعمال

www.pdfbooksfree.pk

حالت میں تھے۔ ان میں سے چند کو ٹیلوں میں چلا کر دیکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر ناصر نے بتایا تھا کہ ان کو اسٹک بم بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی ساخت آئس کریم کون سے مشابہ تھی۔ اسٹک کی طرف سے پکڑ کر انہیں خاصے فاصلے تک پھینکا جا سکتا تھا۔ ان کا ٹی این ٹی بے حد طاقت ور تھا۔ سابقہ سردار کو یہ بم اور کچھ دیگر اسلحہ فاضلکا کے انڈین سمگلر سے ملا تھا۔

رستم نے ڈیرے سے چلتے ہوئے ایک ہینڈ گرینیڈ احتیاطاً اپنے لباس میں رکھ لیا تھا۔ تب اسے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ اس کے استعمال کی نوبت اتنی جلدی آ جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس کی زد سے نکلنے کے بعد وہ یہ ہینڈ گرینیڈ اور اپنی سیون ایم ایم رائفل کہیں پتھروں میں چھپا دے گا اور آگے کے سفر میں صرف کولٹ پسٹل اپنے پاس رکھے گا لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ رستم کی پسندیدہ سیون ایم ایم چارے کے گٹھے سمیت پولیس کے قبضے میں جا چکی تھی اور ہینڈ گرینیڈ کی پن کھینچنے کا وقت بھی آ گیا تھا۔ رستم نے گوہرا کو دکھانے کے لیے گرینیڈ اس کی طرف بڑھایا۔ گوہرا نے ایک پُرجوش آواز نکالی۔ اس نے گرینیڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور رستم کو واپس کر دیا۔ رستم کو گرینیڈ کے کھردرے لوہے پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ خون تھا۔

''تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔'' رستم نے گوہرا سے پوچھا۔

''کچھ زیادہ نہیں لالے۔ انگوٹھے کی طرف گولی لگی ہے۔'' گوہرا نے یوں کہا جیسے کانٹا چبھنے کی بات کر رہا ہو۔

رستم نے اس کا ہاتھ دیکھا۔ رائفل کی گولی آر پار ہو گئی تھی، نہ جانے کس وقت گوہرے نے زخم پر رومال بھی باندھ لیا تھا۔ وہ ایک بے جگر شخص تھا۔

رستم اور گوہرا نے اپنی طرف سے فائرنگ بند کی تو پولیس اہلکار دھیرے دھیرے ان کی طرف کھسکنے لگے۔ گاہے بگاہے بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھرتی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس والے اپنی پوزیشن تبدیل کر رہے ہیں۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ رستم اور گوہرا پسپا ہو کر ٹیلوں پر چڑھیں گے اور وہ انہیں آسانی سے نشانہ بنا لیں گے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ رستم اور گوہرا راہِ فرار تو اختیار کریں گے لیکن مختلف انداز سے۔

رستم نے بڑے صبر اور ہمت سے انتظار کیا۔ اس نے پولیس کے رائفل برداروں کو نزدیک آنے دیا۔ گرینیڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنے پسٹل کے ساتھ وہ نیا میگزین انچ کر چکا تھا اور دو میگزین بھر کر اس نے کرتے کی جیب میں رکھ لئے تھے۔ دوسری طرف گوہرا بھی اپنی ٹرپل ٹو کے ساتھ پوری طرح تیار تھا۔ وہ دونوں یکسر دم سادھے بیٹھے رہے۔ ان کے یوں

www.pdfbooksfree.pk

بیٹھنے سے ریاض ہٹلر یقیناً یہ اندیشہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کسی طرف کھسک نہ جائیں۔ رستم کی عقابی نظریں دو ٹیلوں کے درمیان اس تنگ راستے پر تھیں جو انہیں اس مسدود گزرگاہ سے نکلنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا اور پھر وہ موقع آ گیا۔ رستم نے گوہرا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میں یہ دستی بم پھینکوں گا۔ اگر یہ پھٹا تو ٹھیک ہے، نہ پھٹا تو بھی ٹھیک ہے۔ ہم یہاں سے بھاگیں گے۔''

''فکر ہی نہ کرو لالے دی جان۔ بم نہ بھی پھٹے گا تو میری یہ رائفل بم بن جائے گی۔''

اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ رائفل کو تھپکی دی۔

''تیار ہو؟''

''سولہ آنے تیار۔'' گوہرا نے کہا۔

میگافون پر پھر آواز گونجی۔ ''رستے! لگتا ہے تیری موت.....''

ڈپٹی ریاض کے فقرے کو رستم اور گوہرے کی ہم آہنگ للکار نے کاٹ دیا۔ رستم نے بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر اسے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ بم کا لوہا پتھروں سے ٹکرایا۔ ٹن ٹن کی آواز دو تین مرتبہ پیدا ہوئی..... پھر ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے کے ساتھ پیدا ہونے والی چمک نے ایک ساعت کے لئے قرب و جوار کو روشن کر دیا۔ یہ روشنی ختم ہوتے ہی کئی کراہیں اور دردناک چیخیں گونجیں۔ رستم اور گوہرا اپنی جگہوں سے اٹھے اور برق کی رفتار سے دھماکے والی جگہ کی طرف بڑھے۔ کم از کم چار پولیس اہلکار زمین پر گرے ہوئے تھے۔ یہاں دھواں تھا اور بارود کی نہایت تیز بُو تھی۔

ایک سایہ رستم کے سامنے آیا۔ رستم نے بھاگتے بھاگتے پسٹل والا ہاتھ پورے زور سے مدمقابل کے منہ پر مارا، وہ ڈکراتا ہوا ایک نشیب میں اوجھل ہو گیا۔ چند قدم آگے ایک اور شخص نے رستم اور گوہرے کی طرف رائفل سیدھی کرنا چاہی اس مرتبہ گوہرے کی ٹرپل ٹو نے تین شعلے اگلے، وہ دونوں پتھروں کو پھلانگتے ہوئے ایک نشیب میں اُترتے چلے گئے۔ انہیں اپنے عقب میں کافی فاصلے پر ڈپٹی ریاض کی شعلہ بار آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے تاہم اس کی آواز میں موجود شدید پریشانی اور ہزیمت رستم کے لئے بہت پُرلطف تھی۔

ہاں یہ پھوٹو ہار تھا اور یہ وادی سون تھی اور تاریخ خود کو دہرا چکی تھی اور یہ تاریخ اب تک خود کو نہ جانے کتنی بار دہرا چکی تھی۔ ایسی ہی تاروں بھری راتوں میں، ایسے ہی تاریکی پوش ٹیلوں میں قانون کے اور معاشرے کے بے شمار باغی یہاں بھاگتے رہے تھے اور پیچھا کرنے

والے ان کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ پولیس اتنی آسانی سے رستم اور گوہرا کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی، تاہم وقتی طور پر وہ دونوں پولیس کو اپنے عقب سے جھنگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

وہ دونوں کبھی بھاگتے اور کبھی تیز چلتے ہوئے تقریباً دو میل آگے نکل آئے۔ اپنے پیچھے کافی فاصلے پر انہیں ٹارچوں کے روشن نقطے دکھائی دے رہے تھے۔ گاہے بگاہے فائر کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز ان دونوں کے لئے بڑی فرحت بخش تھی۔ یہ فائرنگ اس بات کا ثبوت تھی کہ پولیس والے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ وہ رستم اور گوہرا کے حقیقی رخ سے بے خبر ہیں۔ ''رستم بھائی اُدھر دیکھو۔'' گوہرا نے اپنے زخمی ہاتھ کی انگلی سے ایک وسیع نشیب کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں چند مدھم روشنیاں نظر آئیں۔ یہ غالباً دس پندرہ گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ایسی چھوٹی بستیاں جنہیں مقامی زبان میں ڈھوک کہا جاتا ہے، اس علاقے میں کہیں کہیں نظر آ جاتی تھیں۔ رستم اور گوہرا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنا رخ ان ٹمٹماتی روشنیوں کی طرف کر لیا۔ گوہرا کے ہاتھ سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا اور ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھیک سے مرہم پٹی ہو سکے۔ رستم کے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا۔ وہ ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھیوں کو نفسیاتی چکمہ دینا چاہتا تھا۔ لق ودق ٹیلوں اور بھول بھلیوں میں پولیس سے بھاگنے والے کسی چھوٹی بستی کا رخ کم ہی کرتے ہیں۔

اونچے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ دس پندرہ منٹ میں اس بستی تک پہنچ گئے۔ یہاں نیچی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ یہ بستی یعنی ڈھوک ان کے اندازے سے بڑی تھی۔ کم وبیش پچاس مکان تو ہوں گے یہاں۔ یہاں ایک کنواں تھا اور اس کے اردگرد بہت سے درخت نظر آ رہے تھے۔ کہیں سے بکریوں کے ممیانے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ایک ڈھلوان پر چند کھیتوں کے آثار تھے۔ یوں لگا جیسے بستی کے کسی گھر میں شادی یا مہندی وغیرہ کی رسم ہے۔ ڈھولک بجنے کی آواز آ رہی تھی اور ایک گلی میں آرائشی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ رستم اور گوہرا بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوئے۔ اچانک ایک شخص تیزی سے ان کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور ایک بھاری چادر نے اس کا سر اور چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو رستم کو اس کے دوسرے ہاتھ میں رائفل نظر آئی۔

رستم اور گوہرا کے عین سامنے پہنچ کر نووارد نے لالٹین سر سے اونچی کی اور غور سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تساں کون او بھئی؟''

www.pdfbooksfree.pk

نووارد کا لہجہ سخت تھا۔ رستم کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور اس کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ یقیناً گوہرا کی کیفیت بھی یہی ہوئی ہوگی۔ اس شخص کا دوتہائی چہرہ جلا ہوا تھا۔ ماضی کے کسی آتشیں حادثے کے سبب اس کی ناک چومر ہو گئی تھی۔ ایک بھوں غائب تھی اور پیشانی کی کھال بڑے کریہہ انداز میں سکڑی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی کی وجہ سے یہ جلا ہوا چہرہ اور بھی بھیانک نظر آتا تھا۔

''اوئے میں پوچھتا ہوں کون ہوتساں؟'' چوکیدار نما شخص نے اس مرتبہ زیادہ کرخت آواز میں اپنا سوال دہرایا۔

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا گلی کے موڑ پر تین چار گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ یوں محسوس ہوا گھڑسوار آ رہے ہیں۔ رستم اور گوہرا اس موقع پر کسی پھڈے میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ رستم نے ایک نہایت زوردار جھاپڑ نووارد کے چہرے پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر ایک پختہ دیوار سے ٹکرایا اور گر گیا۔ اس کی رائفل بھی ایک طرف لڑھک گئی تھی اور رائفل کا میگزین علیحدہ ہو کر دور جا گرا تھا۔ اس سے پہلے کہ نووارد سنبھل کر شور مچاتا یا گھڑسوار گلی کے موڑ پر نمودار ہوتے، رستم اور گوہرا تیزی سے ایک دوسری گلی میں مڑ گئے۔ انہیں اپنے عقب میں نووارد کا واویلا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور آوازیں بھی ابھریں۔ یقیناً یہ گھڑسواروں کی آوازیں تھیں۔

رستم اور گوہرا نے تیزی سے دو تین گلیاں پار کیں۔ انہیں اپنے عقب میں چند للکارے سنائی دیئے۔ رستم نے ایک دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ دونوں جلدی سے اندر چلے گئے۔ یہ ایک کشادہ صحن والا پہاڑی گھر تھا۔ اسے پتھریلی مٹی کے گارے سے پوتا گیا تھا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے گائے بندھی تھی۔ اندر دو کمروں میں لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک قدرے فربہ جسم کی عورت چمکیلے کپڑے پہنے اندرونی کمرے سے نکلی۔ رستم اور گوہرا برآمدے کے ایک تاریک گوشے میں چلے گئے۔ عورت نے گائے کے سامنے کھانے کی کوئی شے پھینکی اور جس تیزی سے آئی تھی اسی عجلت سے واپس چلی گئی۔ اندر کسی بچے کے رونے کی صدا ابھری۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

گلی میں بھی سکون تھا۔ شاید مسخ چہرے والا چوکیدار اور گھڑسوار کسی دوسری طرف نکل گئے تھے۔ گوہرا نے رستم کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اب کیا کرنا ہے لالے دی جان؟''

''کہیں چھپنے کی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔''

''ہاں، آج کی رات تو چھپ کر ہی گزار لیں تو اچھا ہے۔ پلیسے ذرا ٹھنڈے پڑ جائیں

گے تو نکلنا آسان ہوگا۔''

''تو پھر جیسے تم کہو لا لے دی جان۔ میں تو تیار ہوں۔''

رستم نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود بھی الجھن میں تھا۔ اس نے ایک کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ لکڑی کے تختوں میں قریباً آدھ انچ کی درز موجود تھی۔ اندر کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ ایک بنی ٹھنی جوان لڑکی شیشے کے سامنے کھڑی جھمکے پہن رہی تھی۔ اس کے اونچے لمبے بھرپور جسم پر مورا کین کا کڑھائی دار کرتہ تھا اور گلابی رنگ کی چکیلی تہمد بند (مچھلی) تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شوخ رنگ کی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کے ڈورے تھے۔ دیوار پر لگے ہوئے گول آئینے کے سامنے وہ گھومی تو اس کی دلکش ناک میں برجیاں والا کوکا چمکنے لگا۔ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے آویزاں کرنے کے بعد لڑکی نے سر پر ہلکا رنگ دوپٹہ لیا اور ایک بار پھر خود کو گھما کر آئینے کے سامنے دیکھا۔ اس کے انگ انگ سے سرمستی پھوٹ رہی تھی۔ سامنے تپائی پر چاندی کے تین چار چوڑے اور کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اگلے دو چار منٹ میں یہ زیور بھی اس دہقانی لڑکی کے جسم پر سج گیا۔

تب رستم کی نگاہ ایک جانب بچھی چارپائی پر پڑی۔ ایک پچیس تیس سالہ مدقوق اور نشئی سا شخص گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اور آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا ہے۔ تیار ہو کر لڑکی اس کے پاس پہنچی۔ اس نے ذرا شوخی کے انداز میں اپنی چوڑیاں زور سے اس کے کان کے پاس چھنکائیں۔ پہلے ایک کان کے پاس پھر دوسرے کان کے پاس۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ تب لڑکی نے اسے آواز دی۔ ''ظفری..... او ظفری۔''

ظفری نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں کھول کر لڑکی کی طرف دیکھا اور ایک نگاہ ڈال کر اپنا سر پھر گھٹنوں پر ڈال دیا۔ اسی دوران میں اندر سے بچے کے رونے کی آواز پھر آئی۔ کسی بڑی عمر کی عورت نے لڑکی کو پکارا۔ ''مہراں..... او مہراں، کدھر دفع ہوگئی ہے؟''

''آئی بے بے۔'' لڑکی نے پکار کر کہا اور تیزی سے چلی گئی۔

چند سیکنڈ بعد وہ واپس آئی تو اس کی چھاتی سے ڈیڑھ دو سال کی ایک بچی لگی ہوئی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر بچی کو دودھ پلاتی رہی اور ساتھ ساتھ اپنا ہار سنگھار بھی دیکھتی رہی۔ وہ درمیانی صورت کی لیکن پُرشباب تھی۔ نشئی شخص جو یقیناً مہراں کا مرد تھا اب پہلو کے بل چارپائی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ چارپائی کے نیچے سگریٹ کے اَن گنت ٹوٹے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد لڑکی نے دودھ پیتی بچی کو ذرا کھینچ کر خود سے جدا کیا، مورا کین کا کرتہ سینے پر برابر کرنے کے بعد بچی کو چھوٹی چارپائی پر ڈال دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

اسی دوران میں گوہرا کا پاؤں تاریکی میں کسی برتن سے ٹکرایا اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ گوہرا گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا تو دیوار کے قریب کھڑی ایک بائیسکل الٹ گئی۔ اندر کمرے میں مہراں بری طرح چونک گئی۔ وہ سیدھی کھڑکی کی طرف آئی اور کھڑکی کھول کر پوچھا۔ ''کون؟'' اس کی آواز میں خوف کے ساتھ ساتھ ایک عجیب دہقانی دلیری بھی تھی۔

رستم اور گوہرا دیوار کے ساتھ لگے، دم سادھے کھڑے رہے۔

لڑکی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ چند ہی لمحے بعد وہ برآمدے میں نظر آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ اس کا دلیرانہ انداز متاثر کن تھا۔ جونہی لالٹین کی روشنی رستم اور گوہرا کے پاؤں تک پہنچی اور مہراں نامی لڑکی نے چلانے کے لئے اپنا منہ کھولا، رستم تیزی سے آگے گیا اور اس نے لڑکی کا کھلا ہوا منہ دبوچ لیا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکی کلہاڑی سے وار بھی کرے گی۔ اس کا یہ یقین درست ثابت ہوا۔ لڑکی کا کلہاڑی والا ہاتھ بے باک انداز میں بلند ہوا، تاہم رستم نے اسے تھام لیا۔ کانچ کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ رستم نے لڑکی کو گھما کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب اس کی پشت رستم سے لگی ہوئی تھی اور اس کے بے قرار ہونٹوں پر رستم کی چوڑی ہتھیلی کا دباؤ تھا۔

وہ جنگلی گھوڑی کی طرح کڑیل اور زوردار تھی۔ رستم کو اسے سنبھالنے میں دقت پیش آئی، تاہم وہ ناکام نہیں ہوا۔ گوہرا نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لالٹین لڑکی کے ہاتھ سے جھپٹ لی تھی ورنہ وہ گر کر ٹوٹ جاتی۔ رستم نے لڑکی کو کھلونے کی طرح اٹھایا اور ایک چھوٹے کمرے میں لے آیا۔ گوہرا نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کمرے میں رنگین پایوں والی تین چارپائیاں ''ملٹی اسٹوری عمارت'' کی طرح اوپر نیچے پڑی تھیں اور لکڑی کی پرچھتیوں پر پیتل اور کانچ کے برتن سجے ہوئے تھے۔ گوہرا نے کلہاڑی بھی لڑکی کے ہاتھ سے چھین لی۔

رستم نے کمرے میں پہنچ کر لڑکی کو بُری طرح جھنجھوڑا اور دانت پیس کر کہا۔ ''آواز نکالی تو اسی کلہاڑی سے تیری گردن اُتار دوں گا۔''

مہراں نامی یہ لڑکی اب سہم گئی تھی لیکن پھر بھی پوری طرح حواس میں تھی۔ چونکہ وہ حواس میں تھی اس لئے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہسٹریائی انداز میں چلانا شروع کر دے گی۔ رستم نے تھوڑا سا وقفہ دے کر اس کے سرخی لگے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی خوف زدہ آنکھوں سے رستم اور گوہرا کے چہرے دیکھنے لگی۔ وہ دونوں چرواہوں کے مقامی لباس میں تھے۔ چہروں پر طویل مسافت کی گرد تھی۔

رستم کا چہرہ دھیان سے دیکھنے کے بعد لڑکی کچھ چونک سی گئی۔ وہ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی دوران میں اتفاقاً گوہر انے بھی رستم کو نام لے کر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔

''لالے دی جان! رستم بھائی، مجھے لگتا ہے کہ باہر کھڑاک شڑاک شروع ہو گیا ہے۔''

کھڑاک شڑاک سے گوہرا کی مراد پولیس کی آمد تھی۔ کسی بھاری رائفل سے چند گولیاں چلائی گئیں۔ پھر دو تین للکارتی ہوئی سی آوازیں سنائی دیں۔ اگر صرف فائر ہوتے تو سوچا جا سکتا تھا کہ شادی والے گھر میں خوشی منائی جا رہی ہے لیکن للکارتی ہوئی آوازیں اس امکان کو رد کر رہی تھیں۔ اب دو امکان تھے۔ یا تو پولیس ان کا پیچھا کرتے ہوئے اس ڈھوک میں پہنچ گئی تھی یا پھر یہ وہی چوکیدار اور گھڑ سواروں والا معاملہ تھا۔

مہراں نامی لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب خوف کی جگہ حیرانی نے لے لی تھی۔ رستم اور گوہرا کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی سے اپنے حواس پر قابو پا لے گی۔ اس کا شباب موراکین کے کرتے میں سے پھٹا پڑ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ رستم نے اسے چھوڑا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گئی۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر رستم کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''کون ہو تساں؟'' اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تیرا کیا خیال ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''کدھرے تم رستم.....سیال تو نہیں ہو؟'' اس نے رستم کے چہرے کی طرف انگلی اٹھائی۔

''کون رستم سیال؟''

''مم.....میں نے کئی واری اخبار میں تیڈا فوٹو دیکھا ہے۔'' اس کا لہجہ بدستور کانپ رہا تھا۔ نگاہ رستم کے چہرے سے پیوست تھی۔

''اگر میں رستم سیال ہوں تو پھر؟''

مہراں کی آنکھوں میں کاجل کی لکیر کے ساتھ ساتھ ایک لہر سی نظر آئی۔ یوں لگا جیسے وہ تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول گئی ہے۔ اپنے خاوند کو، اپنے بچے کو، اپنی ساس کو جو اب بھی گھر کے کسی کمرے میں بلند آواز سے بول رہی تھی.....اور یہ بھی بھول گئی ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں دو اجنبی مردوں کے درمیان موجود ہے۔

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''مینڈا دل کہتا ہے کہ تم رستم سیال ہو اور اگر تم رستم سیال ہو تو

www.pdfbooksfree.pk

پھر مینوں اور میرے گھر والوں کو تم سے کوئی ڈر کھتر انہیں۔ میں تم کو بڑی چنگی طرح جانڈی ہوں۔'' وہ کسی پروانے کی طرح رستم سیال کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ رستم یا گوہرا جواب میں کچھ کہتے۔ وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے بیلے کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں تھی (آ) رہی تھیں.....کدھرے او.....مم مینڈا مطلب ہے.....'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مطلب واضح تھا۔ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ کہیں بیلے کی طرف سے ہونے والی فائرنگ کا تعلق ان دونوں سے تو نہیں ہے۔

اسی دوران میں گھر کا بیرونی دروازہ زور سے بجایا جانے لگا۔ وہ چونک گئی۔ چند سیکنڈ تک آواز پر غور کرتی رہی پھر بولی۔ ''تساں دونوں اِدھر ہی ٹھہرو، میں دیکھ کے آندی پئی آں۔'' (میں دیکھ کے آتی ہوں)

وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے دروازے کی طرف مڑی۔ گوہرے نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے روک لیا۔ جھٹکا لگنے سے اس کے بڑے بڑے جھمکے زور سے ہلے اور وہ گوہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ گوہرے نے اپنی چادر کے نیچے رائفل کی خوفناک نال برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھائی تو سارے گھر والوں کو تیرے سمیت بھون کر رکھ دوں گا۔''

وہ جواب دینے کے بجائے تعجب سے رستم کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہی ہو۔ ''رستم سیال! یہ تیرا ساتھی کیا کہہ رہا ہے؟ کیا یہ جانتا نہیں کہ میں تجھے جانتی ہوں۔ میں اس علاقے کے ان سینکڑوں ہزاروں لوگوں میں سے ایک ہوں، جو تجھے بن دیکھے چاہتے ہیں۔ جنہوں نے بن ملے، تجھے اپنے دل میں بسا رکھا ہے۔ جو تیری دلیری اور ہمت کی باتیں سنتے اور سناتے ہیں۔ جن کے ہونٹوں پر تیری سلامتی کی دعائیں رہتی ہیں.....''

رستم نے گہری نظر سے اس زور آور دہقان لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ لڑکی اسے نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اس نے ابرو سے اشارہ کیا۔ گوہرا نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

رستم اور گوہرا اس نیچی چھت والے نیم تاریک کمرے میں ساکت کھڑے رہے۔ باہر جاتے ہوئے مہراں لالٹین اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

مہراں نامی اس لڑکی کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی۔ لالٹین کی حرکت کرتی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ برآمدے سے گزر کر چھوٹے کمرے میں آ رہی ہے۔ وہ کھنکارتی

ہوئی آ رہی تھی تا کہ رستم اور گوہرا کو پتا چل جائے کہ وہ ہی آ رہی ہے۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں مرہم پٹی کا سامان بھی تھا۔

''کون تھا؟'' رستم نے پوچھا۔

''مینڈا سوہرا۔'' (میرا سسر) مہراں نے جواب دیا۔ ''وہ کہتا ہے ڈھوک میں کوئی غیر بندے تھی (آ) گئے نے۔ سراج نے اس کو دیکھیا ہے۔ پولیس بھی ڈھوک کے آلے دوالے چکرا رہی ہے۔ ماملہ بڑا گڑبڑ ہے۔ اگر پولیس ڈھوک دے اندر تھی گئی تو پھر گھر گھر تلاشی لے گی۔'' وہ بڑی دلیری سے بات کر رہی تھی۔ اس کا لب ولہجہ گواہ تھا کہ وہ ساری صورتِ حال کو سمجھ چکی ہے۔ وہ جان گئی ہے کہ ڈھوک کے اندر نظر آنے والے دونوں اجنبی یہی ہیں جو اس کے گھر میں گھسے بیٹھے ہیں اور پولیس بھی ان دونوں کے پیچھے ہی بھاگی پھر رہی ہے اور یہ دونوں کوئی معمولی افراد نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک رستم سیال کا ساتھی ہے اور دوسرا خود رستم سیال ہے۔ وہی رستم سیال جس کے دوبارہ وادی سون میں آنے کے چرچے ہیں اور جس کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے کے لئے آج کل پولیس کے جتھے ٹیلوں میں چکراتے رہتے ہیں۔

اس نے رستم اور گوہرا کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا کہ وہ دونوں بڑی احتیاط سے اس کے پیچھے آئیں، وہ انہیں چھپنے کے لئے ایک خاص جگہ فراہم کرتی ہے۔

گوہرا سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ وہ نگاہ کی زبان میں پوچھ رہا تھا کہ انہیں مہراں نامی اس لڑکی پر اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں۔ رستم نے ایک بار پھر مثبت جواب دیا۔ مہراں نے لالٹین اٹھائی اور دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے میں اینٹوں کی ایک چھوٹی سی سیڑھی تھی۔ اس سیڑھی نے ان تینوں کو اوپر ایک چوبارے تک پہنچا دیا۔ مہراں نے اپنے ریشمی تہہ بند کے سرے سے بندھی ہوئی چابی کے ساتھ چوبارے کا مقفل دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی انہیں بادام کی خوشبو آئی۔ یہ قریباً بارہ فٹ ضرب اٹھارہ فٹ کا ایک نیم پختہ کمرہ تھا۔ یہاں فرش سے چھت تک خشک میوے کی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ مہراں نے بتایا کہ یہ بادام اور سوکھی ہوئی خوبانی ہے۔ ان بوریوں کے درمیان ایک جگہ تھوڑا سا خلا تھا۔ اس خلا میں سے بس ایک شخص پھنس پھنسا کر گزر سکتا تھا۔ اس راستے میں سے گزرنے کے لئے مہراں رکوع کے بل جھک گئی۔ رستم اور گوہرا کو بھی جھکنا پڑا۔ لالٹین کی روشنی میں وہ بوریوں کے عقب میں موجود ایک تھوڑی سی خالی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں فرش پر کھجور کی چھال کی ایک چٹائی بچھی تھی۔ مہراں نے جلدی جلدی اپنے دوپٹے کے پلو سے چٹائی کی گرد صاف کی اور

www.pdfbooksfree.pk

رستم سے کہا کہ وہ دونوں آج کی رات یہاں ان بوریوں کے درمیان گزار لیں۔ یہ ان کے لئے محفوظ ترین جگہ ثابت ہوگی۔

مہراں کے لہجے میں بے پناہ یقین اور خلوص کی جھلک تھی۔ اس کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ اس امر کو اپنی بہت بڑی خوش بختی سمجھ رہی ہے کہ آج رستم سیال اس کے گھر میں مہمان ہے اور وہ اپنی بساط کے مطابق اس کی مدد کر رہی ہے۔ وہ اس بات کو یکسر بھولی ہوئی تھی کہ اس طرح رستم کی مدد کر کے وہ اپنے اور اپنی فیملی کے لئے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی نگاہ گاہے بگاہے رستم کے چہرے کی طرف اٹھتی تھی اور اٹک کر رہ جاتی تھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اس گھر میں اپنے شوہر ظفری، اپنے ساس سسر اور بچی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا سسر بوڑھا ہے اور بہت کم گھر پر رہتا ہے۔ اس نے یہاں پاس ہی ایک چھوٹا سا باغ ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ وہ اپنے سسر کے ساتھ باغ میں کام کرتی ہے اور گھر کا چولہا جلاتی ہے۔ اس کے خاوند کی تھوڑی سی کھیتی بھی ہے لیکن جب سے وہ نشے کا شکار ہو کر چارپائی سے لگا ہے، کھیتی اجاڑ پڑی ہے۔ اب وہ خود اس کھیتی کو آباد کرنے کا سوچ رہی ہے۔

وہ پاؤڈر اور عطر کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی ناک کا طلائی کوکا اور کانوں کے نقرئی جھمکے چمک رہے تھے۔ ''تم کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتی ہو؟'' گوہرا نے کہا۔

''ہاں، میں نے ویاہ والے گھر جانا ہے۔ وہاں اج ''ورتاوے'' کی رسم ہے۔ میری سس بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ پر میں جلدی آ جاؤں گی۔ تساں دونوں بالکل فکر نہیں کرنا۔ یہاں کوئی نہیں آسکدا۔''

رستم نے لالٹین کی لَو مدھم کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اندازہ ہے کہ ہم دونوں کو یہاں اپنے گھر میں رکھ کر تم کتنا خطرناک کام کر رہی ہو؟''

اس نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور ہولے سے سر ہلا کر باہر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ دونوں دروازے کے باہر تالا لگنے کی آواز سن رہے تھے۔

بوریوں کا درمیانی خلا بہت مختصر تھا۔ گوہرا اور رستم بمشکل پہلو بہ پہلو لیٹ سکتے تھے۔ مہراں جاتے جاتے لالٹین اور مرہم پٹی کا سامان کمرے میں ہی چھوڑ گئی تھی۔ رستم نے گوہرا کے ہاتھ کا زخم دیکھا۔ آٹھ ایم ایم کی گولی ہتھیلی پھاڑ کر نکل گئی تھی تاہم انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہڈیاں غالباً سلامت ہی رہی ہیں۔ مرہم پٹی کے سامان میں کھدر

کی ایک لمبی پٹی تھی۔ تھوڑی سی روئی تھی۔ اس کے علاوہ سنفتا نامی بوٹی سے بنایا گیا مرہم تھا۔ مقامی طور پر بنائے گئے اس مرہم کو سون کے باشندے اکسیر جانتے تھے۔ رستم نے اپنے ہاتھ سے گوہرا کی پٹی کی۔ گوہرا کو درد سے افاقہ محسوس ہونے لگا تھا اور نیند آ رہی تھی۔ تاہم اس خلا میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ دونوں اطمینان سے سو سکتے یا لیٹ سکتے تھے۔ خاص طور سے گوہرا کے لئے خطرہ تھا کہ اس کا زخمی ہاتھ دکھ جائے گا۔

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ گوہرا نے کہا۔ ”لالے دی جان! پتا نہیں تیرے دستی بم نے کتنے بندے پار کیے ہیں؟“

”دو تین سے زیادہ کیا ہوں گے؟“ رستم نے کہا۔ ”اس طرح کے ہتھیار کھلی جگہ پر زیادہ تباہی نہیں کرتے۔“

”پھر بھی ایک دفعہ تو تڑتھلی مچ جاسی۔ مجھے لگتا ہے کہ اب تک بہت سی پولیس علاقے میں جمع ہو چکی ہوگی۔ کیا پتا کہ پورے علاقے کو گھیر لیا گیا ہو۔“

”ہاں، اب گھیرا تو ضرور ڈالا ہے ان لوگوں نے۔“ رستم نے تائید کی۔

”لالے دی جان، پتا ہے میرا دل کیا چاہ رہا ہے؟ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرے پاس ایسے ہی چار پانچ دستی بم اور ہوں۔ یہ بم میں اپنے پنڈے پر باندھوں اور سیدھا سیدھا جا کر اس خبیث ریاض ہٹلر کو نبھی ڈال لوں۔ میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی ہزار دو ہزار ٹکڑا ہو جائے۔“

”میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“ رستم نے گہری سانس لے کر کہا۔

”بی بی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔“

”نہیں، ان بکر والوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ جنہیں باندھ کر کھوہ میں چھوڑ آئے ہیں۔ آج سردی ہے۔ اللہ کرے انہوں نے اپنی رسیاں کھول لی ہوں۔“

”ہاں ان کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔ تم نے ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ بھی پورا نہیں ہو سکا۔“

”کون سا وعدہ؟“ رستم نے پوچھا۔

”تم نے ان سے کہا تھا کہ ان کی بکریاں صحیح سلامت مل جائیں گی۔“

”ہاں یہ وعدہ واقعی پورا نہیں ہو سکا۔ پولیس والوں کے برسٹ سے چار چھ بکریاں تو ضرور جان سے گئی ہوں گی۔“

”اوپر والے نے بچا لیا ورنہ بکریوں کے ساتھ ہی لیٹ جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ

www.pdfbooksfree.pk

گئی تھی۔“

”خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب آگے کی سوچو۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم اگلے ایک دو دن تک یہاں سے نکل سکیں گے۔ بلکہ شاید زیادہ دن لگ جائیں۔“ رستم نے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ ہم نے کون سا گڈی چڑھنا ہے۔ سونے کے لئے جگہ مل گئی ہے۔ ایک دو بوریاں پھاڑ کر خشک میوہ کھاتے ہیں اور جان بناتے ہیں۔ ریاض ہٹلر جیسے بندے سے ٹکر لینے کے لئے پنڈے میں گرمی تو پوری ہونی چاہیے نا؟“

”گرمی تو پوری سے بھی زیادہ ہے لیکن گرمی دکھانے کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں۔“

”چلو جب تک حالات سازگار نہیں ہوتے، میں سولوں۔“ گوہرا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ایسے مخدوش حالات میں نیند کا آ جانا گوہرا کی لاپرواہی اور بے جگری کا مظہر تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ بوریوں کے درمیان اس مختصر خلا میں رستم کے ساتھ سونا اس کے لئے آسان نہیں۔ ایک طرف بوریوں کے اوپر چڑھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ موجود تھی۔ گوہرا اوپر چڑھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں رستم اس کی بوجھل سانسوں کی آواز تسلسل سے سن رہا تھا۔

رستم بھی بادام کی بوریوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پیش آمدہ حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس وقت وہ اور گوہرا پولیس کے ایک وسیع گھیرے کے اندر ہیں۔ ان سے لڑے بھڑے بغیر یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

پتا نہیں کب اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس کی پلکیں بوجھل ہو گئیں اور وہ سو گیا۔ بھرا ہوا کولٹ پسٹل اس کی جھولی میں تھا۔ اس کی آنکھ کسی کی آمد کے سبب کھلی۔ یہ مہراں تھی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک تیز جھونکا اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہ لالٹین تھامے رکوع کے بل جھک کر آ رہی تھی۔ کھلے گلے کے ریشمی کرتے میں اس کا غیر معمولی جسم نمایاں تھا۔ وہ کھیت میں مزدوری کرنے والی ایک سخت جان لڑکی تھی۔ پُرکشش لیکن جفاکش جسم کی مالک۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ وہ رستم کے قریب آ بیٹھی۔ رستم کو تنہا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ ”تساں کا ساتھی کدھر ہے؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ بوریوں پر چڑھ کر سو گیا ہے۔“ رستم نے جواب دیا۔

”میں تو یاہ والے گھر سے تساں دونوں کے لئے روٹی لے کر آئی تھی۔“ اس نے کہا اور کھانے کی مہکار دیتی ہوئی پوٹلی کھول دی۔ یہ تین شاپر بیگ تھے۔ ایک میں نمکین چاول، دوسرے میں گوشت کا سالن اور تیسرے میں حلوہ تھا۔ حلوے کی خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ

''سیوڑیں حلوہ'' ہے۔ میدے اور گوند سے تیار کیا گیا یہ حلوہ مقامی لوگوں کی پسندیدہ ترین ڈش تھا..... پوٹلی میں اسٹیل کی دو پلیٹیں اور چمچ بھی تھا۔

مہراں نے کانپتے ہاتھوں سے یہ چیزیں رستم کے سامنے پروسیں اور اس سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی کو بھی کھانے کے لئے جگا لے۔

رستم جانتا تھا کہ گوہر اشراب کا پوا پی کر سویا ہے۔ وہ اب آسانی سے جاگنے والا نہیں تھا۔ اس نے گوہر کے حصے کا کھانا ایک طرف نکال دیا۔ ''یہ کس کی شادی ہے؟'' رستم نے مہراں سے پوچھا۔

''شادی تو تین دن بعد ہے جی۔ یہ تو ''چھک ورتانے'' کی رستم تھی۔ چاچا جعفر اپنے پُتر دا ویاہ بڑی دھوم دھام سے کر رہا ہے جی اور چاچے جعفر کو تساں بھی تھوڑا بہت جاندے ہو۔''

''میں جانتا ہوں؟''

''ہاں جی، تساں کو شاید یاد نہ ہو ڈھائی تین سال پہلے تساں نے چاچے جعفر کی دھی کی شادی میں بڑی مدد کی تھی۔ شادی سے چار دن پہلے چوراس وچاری کے داج (جہیز) کا سارا سامان لے گئے تھے۔ چاچا جعفر روتا کرلاتا رہ گیا تھا۔ تساں کی کوشش سے گجرات کے نای چور کالو جہانے نے راتوں رات سارا سامان واپس چاچے جعفر کے گھر پہنچایا تھا اور چاچے کے پیروں کو بھی ہتھ لگایا تھا۔ مجھ کو چنگی طرح یاد ہے ساری ڈھوک نے تساں کی واہ واہ کی تھی.....''

رستم جواب میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے مہراں کے انداز سے کوفت ہو رہی تھی۔ وہ عجیب نظروں سے رستم کو دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی آسمانی مخلوق ہو۔ رستم سے بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹ سوکھ سوکھ جاتے تھے۔ رستم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''باہر کا کیا حال ہے۔ کوئی پولیس کا بندہ تو نہیں آیا ڈھوک میں؟''

جواب میں مہراں نے جو کچھ کہا اس سے پتا چلا کہ باہر حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ پولیس نہ صرف ڈھوک کے اندر آئی ہے بلکہ آس پاس بھی گھوم رہی ہے۔ چھ سات گھروں کی تلاشی بھی ہوئی ہے۔ (یہ گھر اسی گلی میں تھے جہاں چوکیدار سراج نے رستم اور گوہر کو دیکھا تھا اور رستم نے سراج کے چہرے پر زوردار جھانپڑ مار کر اسے گرایا تھا) مہراں نے بتایا کہ ایک وڈا تھانیدار اور دس پندرہ سپاہی اس وقت بھی ڈھوک میں موجود ہیں اور سراج وغیرہ سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر بڑے دھیان سے اور بے حد ستائشی نظروں سے رستم کو دیکھنے لگی۔ رستم نے جھنجھلا کر کہا۔ ''کیا میرے منہ پر کچھ لکھا ہوا ہے؟''

وہ پہلے گھبرائی پھر شرما گئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی ناک کا کوکا اور بڑے بڑے جھمکے چمکے اور اس نے نگاہ جھکالی، وہ ہانپے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تساں مانو یا نہ مانو پر میں جان گئی ہاں کہ تساں رستم سیال ہو۔ میں نے کبھی سوچیا بھی ناں تھا کہ اک دیہارے رستم سیال مینڈے گھر وچ مینڈا مہمان بن کے تھیوے گا۔''

''تُو کیسے کہہ سکتی ہے کہ میں ہی رستم ہوں۔''

''میں نے بڑی جلدی تساں کو پہچان لیا تھا۔ اب ڈھوک میں پولیس والے بھی یہی بات کر رہے ہیں۔ اونہاں نے بتایا ہے کہ بیلے کے پار تساں دونوں کا پولیس کے ساتھ زور کا مقابلہ ہوا ہے۔ وہ تساں کے ساتھی کا نام گوہر اتا رہے ہیں۔''

''مہراں تُو جو کچھ ہمارے لئے کر رہی ہے، اس کے لئے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے لیکن ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ بس کل کا دن کسی طرح گزر جائے، پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''نہیں جی نہیں، یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ ابھی تہاڈا باہر نکلنا بہت خطرناک ہے۔ ابھی تساں دوناں سکون سے یہاں رہو۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے جھمکے لہرانے لگے۔

رستم نے کہا۔ ''تیرے گھر والوں کو پتا ہے کہ تُو نے ہمیں یہاں چھپایا ہے؟''

''نہیں جی۔ میں نے کسی کو شک نہیں پڑنے دیا۔ ویسے بھی میری سس تو آندے ساتھ ہی سوں ونجی اے (ساس تو آتے ساتھ ہی سو گئی ہے) سوہرا جی شادی والے گھر میں ہیں۔ باقی رہا مینڈا خاوند تو وہ ہویا نہ ہویا ایک جیسا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے تنومند مہراں کے تنومند چہرے پر عجیب سی اداسی نظر آئی۔

''کیوں؟ تمہارے خاوند کو کیا ہوا ہے؟''

جواب میں مہراں نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ اس کا خاوند ظفری پیدائشی نکھٹو تھا۔ یہ مہراں کا دور کا رشتے دار بھی تھا۔ مہراں نے اپنا آٹھ تولے طلائی زیور بیچ کر ایک کھیتی ظفری کو لے کر دی تھی۔ اس زمین پر ذرا سی محنت کی جاتی تو وہ خوشحال ہو جاتے لیکن ظفری نے آباد زمین کو برباد کر دیا۔ اب وہ خود بھی برباد ہو رہا تھا۔ اسے بُرے یاروں کی صحبت میں ہیروئن کا نشہ لگ گیا تھا۔ اب وہ کسی کام کاج کا نہیں تھا۔ ڈھوک کے سرپنچ دوسا کے ڈیرے پر بیٹھا رہتا تھا۔ سرپنچ کے ڈیرے سے ہی اسے ہیروئن بھی ملتی تھی۔ کبھی کبھی وہ نشے میں ڈیرے پر ہی

مدہوش پڑا رہتا تھا۔ مہراں اسے گھر لانے کے لئے ڈیرے پر جاتی تھی تو سرپنچ کا چھوٹا بھائی اسے للچائی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ایک دو بار اس نے ظفری کے سامنے ہی اس سے فحش مذاق بھی کیا لیکن ظفری کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اب مہراں نے ظفری کے پیچھے ڈیرے پر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

وہ کافی دیر تک رستم کے پاس بیٹھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی۔ شاید وہ کچھ دیر مزید بیٹھتی لیکن اسی دوران میں گھر کے زیریں کمرے سے بچی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کہیں مینڈی سس نہ جاگ جائے۔ میں جاتی ہوں۔ موقع ملا تو پھر آؤں گی۔''

اس نے لالٹین تھامی اور رکوع کی حالت میں چلتی ہوئی واپس چلی گئی۔

اس کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ''موقع ملا تو پھر آؤں گی۔'' اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اب دوبارہ رستم کے پاس آنے کا کیا تک تھا۔ کیا وہ کل صبح کے حوالے سے بات کر رہی تھی.....

رستم نے لالٹین کی لَو بالکل مدھم کر دی اور مختصر خلا میں پاؤں ذرا سکیڑ کر لیٹ گیا۔ ڈھوک کی تاریک گلیوں میں آوارہ کتوں کی آوازیں تھیں.....اور کبھی کبھی گھوڑوں کی ٹاپیں بھی گونجنے لگتی تھیں۔ قرب و جوار میں سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

نیند رستم کی آنکھوں سے دور تھی، وہ جاگتا رہا اور سات آٹھ فٹ اوپر خشک میوے کی بوریوں پر سوئے ہوئے گوہرا کے مدھم خراٹے سنتا رہا۔ اس کے سینے میں ایک نیلی آگ روشن تھی۔ وہ جلد از جلد پولیس کے گھیرے سے نکلنا اور پیر قدرت اللہ کی اکڑی ہوئی گردن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ سرکاری گولیوں کا شکار ہو بھی جاتا تو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ قریباً ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا، پھر اس گودام نما کمرے سے باہر چند آہٹیں سنائی دیں۔ رستم کچھ کھٹک گیا۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ مہراں ہوگی لیکن وہ کس ارادے سے آ رہی تھی۔ کہیں وہ کوئی چال تو نہیں چل رہی؟ کئی سوالات اس کے ذہن میں لپک گئے۔ وہ آنکھیں بند کئے سیدھا لیٹا رہا۔ دروازے کا تالا کھلا، پھر لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ رستم نے آنکھوں کی جھری سے دیکھا وہ نوے کے زاویے سے جھکی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے میں بھی کچھ تھا۔ خلا کے اندر آ کر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا انداز تو پُرسکون تھا۔ وہ منہ زور جسم کی مالک تھی لیکن فی الوقت کچھ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس نے لالٹین نیچے رکھ دی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پیتل کا لمبا گلاس تھا۔ رستم

نے اندازہ لگایا کہ اس میں دودھ ہوگا۔ اس نے آہستگی سے گلاس رستم کے قریب رکھ دیا۔ وہ ابھی تک زرق برق لباس میں تھی۔ جھمکے، کوکا، کانٹھی، جوڑا، لپ اسٹک اور کاجل سب کچھ اس کے جسم کا حصہ تھا۔ رستم کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پُرتپش اور خود فراموش کیفیت نظر آئی۔ وہ آنکھیں موندے بے حرکت لیٹا رہا۔

وہ رستم کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد وہ کانپتی ہوئی جھکی۔ اس نے رستم کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہولے سے ہلایا۔ ایک بار.....دو بار۔ رستم نے خود کو سویا ہوا ظاہر کیا۔ وہ اس کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ رستم کو آواز دے کر جگائے یا واپس چلی جائے۔ اس کی چور نظریں اس کی سانسوں کی چڑھی ہوئی لے اور اس کے تاثرات.....یہ سب کچھ مل کر اس کے اندر کی ''خاص کیفیت'' کی چغلی کھا رہے تھے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کمرے کے مختصر خلا میں مہراں کے جسم اور اس کی لپ اسٹک کی خوشبو صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ آخر دیر تک ہچکچانے کے بعد وہ دبی دبی لرزاں آواز میں بولی۔ ''تساں سو گئے او؟''

رستم بے حرکت لیٹا رہا۔ وہ چند سیکنڈ مزید بیٹھی رہی۔ تب اس نے لالٹین اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد رستم دروازے کو قفل چڑھنے کی مدھم آواز سن رہا تھا۔

اگلے روز وہ صبح سویرے چلی آئی۔ گوہرا ہنوز سو رہا تھا۔ رستم ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ وہ ناشتہ لے کر آئی تھی۔ ایک چنگیر میں مکئی کی سوندھی سوندھی خوشبو والی بڑے گھیرے کی روٹی تھی۔ ساتھ میں دہی تھا اور انڈوں کا آملیٹ تھا جس میں پیاز ڈالا گیا تھا۔ آم کا روایتی اچار بھی ناشتے کا حصہ تھا۔

رستم نے کہا۔ ''تم بڑی جلدی آ گئی ہو۔ میرے ساتھی نے تو ابھی رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''کیوں؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''وہ بہت زیادہ سوتا ہے۔''

''پر تساں تو نہیں سوتے، تساں ناشتہ کر لو۔''

''نہیں، ابھی مجھے بھوک نہیں۔'' رستم نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''باہر کا کیا حال ہے؟''

وہ ایک دم گم صم ہوگئی۔ رستم نے دوبارہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ باہر معاملہ ٹھیک نہیں

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ ڈھوک کے اندر بھی تھوڑی بہت پولیس ہے لیکن باہر بہت زیادہ ہے۔ آس پاس کے ٹیلوں اور دروں پر یہ لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس بُو گیر کتے بھی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اس پورے علاقے کو گھیرا ہوا ہے۔

رستم کے اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا کہ ٹائم جتنا زیادہ گزرے گا، ڈپٹی ریاض اتنی ہی زیادہ نفری یہاں جمع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

وہ خاموشی سے سوچتا رہا۔ مہراں بھی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ اوپر بوریوں پر گوہرا کے مدھم خراٹے سنائی دیتے رہے۔ اچانک رستم نے دیکھا کہ مہراں رو رہی ہے۔ آنسو اس کے صحت مند چکنے رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔ ''کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

''کچ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر ایک دم زار و قطار رونے لگی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور اس کی ہچکیاں اس کے پورے جسم کو دہلانے لگیں۔ وہ اب ایک سادہ سے لباس میں تھی۔ ایک پتلی سی اوڑھنی اس کے بھاری بھرکم بالوں کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا مہراں؟'' رستم نے پوچھا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت بُری ہوں۔ بہت بُری ہوں۔ تسی مجھ کو ماف کر دو۔''

''اوہو کیا ہوا ہے؟''

''مینڈے دل میں تساں کے بارے میں بڑا بُرا خیال آیا تھا۔ میں نے کیوں سوچیا ایسا؟ کیوں مینڈی مت ماری گئی؟'' وہ ہچکیوں سے روتی چلی جا رہی تھی۔

رستم سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ اسے رات کے وہ خمار آلود لمحات یاد آئے جب مہراں کسی عجیب لہر کے ساتھ ساتھ بہتی اس نیم روشن خلا میں آ گئی تھی۔ تب وہ سو رہی تھی نہ جاگ رہی تھی۔ نہ ہوش میں تھی نہ بے ہوش۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھا ریلہ تھا اور اس کے چہرے پر ایک انجانی کیفیت تھی۔ ہاتھوں میں دودھ کا گلاس لئے اپنے زرق برق کپڑے اور گہنے چمکاتی وہ نہ جانے کس خیال کے تحت یہاں آئی تھی اور پھر جیسے آئی تھی ویسے چلی بھی گئی تھی۔

اب جو کچھ وہ بتا رہی تھی وہ اس کے اندر کی صاف گوئی اور سچائی کا غماز تھا وہ یہ سب کچھ نہ بھی بتاتی تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا لیکن وہ اتنی سادہ اور شفاف تھی کہ یہ بات بے ساختہ اس کی زبان پر چلی آئی تھی۔ رستم نے اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ گھٹنوں پر سر جھکائے تھوڑی دیر سسکتی رہی پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اچانک آگے جھک کر رستم کے دونوں پاؤں کو ہاتھ لگائے اور مڑ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔ رستم اپنے پاؤں کو سمیٹنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔

اوپر سے گوہرا کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''لالے دی جان، کیا وقت ہو گیا ہے؟''

''تیرے مرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ بہت ساری پولیس نے گھیرا ڈالا ہوا ہے علاقے کو۔''

''اوتو پھر کیا۔ مرنے مارنے کا سواد تو آئے گا ناں!'' گوہر نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس کا ہاتھ شاید کسی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ پھر وہ بوریوں سے پھسلتا ہوا نیچے آ گیا۔

اس کا ہاتھ سوجا ہوا تھا لیکن اسے مطلق پرواہ نہیں تھی۔ وہ ندیدوں کی طرح رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ساتھ وہ کھوجی نظروں سے رستم کو دیکھتا بھی چلا جا رہا تھا۔ ''رستم بھائی! یہاں تو بڑی خدمتیں ہو رہی ہیں تمہاری اور تمہارے ساتھ میری بھی۔''

''کیوں ان خدمتوں سے تجھے کیوں تکلیف ہے؟''

''لالے دی جان، مجھے لگتا ہے کہ یہ مُکری تیری بڑی مداح ہے۔ شاید اس نے تیرے بارے میں بہت کچھ جان رکھا ہے۔ رات کو نیند میں بھی ایسے لگ رہا تھا کہ یہ تیرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ ہنس رہی ہے۔ چوڑیاں چھنکا رہی ہے۔ کیا یہ رات کو یہیں پر رہی ہے؟''

''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' رستم نے اسے ڈانٹا۔

''دماغ تو ٹھیک ہے لیکن ہاتھ ٹھیک نہیں ہے لالے دی جان۔ پورے بازو میں ٹراٹیں پڑ رہی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب جو کچھ ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔ ہم آٹھ دس پولیس والوں کو مار کر یہاں سے نکل جائیں یا پھر یہ پولیس والے ہمارا کام تمام کر دیں۔''

گوہرا کھاتا رہا اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتا رہا۔ باداموں کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ رستم اور گوہر نے اپنے ہتھیار صاف کئے۔ خالی میگزین گولیوں سے بھرے اور پھر اپنے آپ کو آنے والی صورتِ حال کے لئے تیار کرنے لگے۔ انہیں ہرگز یہ گوارہ نہیں تھا کہ خشک میوے سے بھرا ہوا یہ کمرہ ان کے لئے چوہے دان ثابت ہو جائے۔ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا اور پولیس کا گھیراؤ توڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے تھے۔

دوپہر سے ذرا پہلے کسی قریبی گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کمرے میں

www.pdfbooksfree.pk

ایک روزن موجود تھی۔ رستم نے تین چار بوریوں پر چڑھ کر روزن میں جھانکا تو اسے کچھ ہی فاصلے پر ایک گھر کا صحن نظر آیا۔ یہ شادی والا گھر ہی تھا۔ وہاں رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ کچھ لڑکیاں اور عورتیں ناچ رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے لڑکے کا بھیس بدل رکھا تھا۔ سر پر پگڑی، مردانہ لباس، مصنوعی مونچھیں اور ہاتھ میں لاٹھی۔ وہ ایک لڑکی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ناچ رہی تھی۔ پھر اس نے لڑکی کو بانہوں میں بھرا اور اس کا منہ چومنے کی کوشش کی۔ لڑکی نے شرما کر چہرہ گھونگھٹ میں چھپا لیا۔ عورتیں اور لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ نقلی ''لڑکا'' کچھ دیر تک اصلی لڑکی سے دست درازی کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں ایک طرف ہٹ گئے۔

ٹیپ ریکارڈر پر انڑین گانا گونج رہا تھا۔ ''میرے ہاتھوں میں نو نو چوڑیاں ہیں، تھوڑا ٹھہر و سجن مجبوریاں ہیں۔'' ایک درمیانی عمر کی موٹی عورت گانے پر رقص کرنے لگی اور دیگر خواتین تالیاں بجانے کے ساتھ ساتھ قہقہے برسانے لگیں۔

پھر کچھ لڑکیوں نے ایک اور لڑکی کو دھکیل کر ناچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ مہراں تھی۔ اونچی لمبی دھریک جیسی مضبوط لیکن لچک دار۔ وہ پہلے تو شرماتی رہی پھر اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ بیشک اس میں ایک دہقانی کشش تھی۔ رستم کو اس کے مدقوق نشئی شوہر کا خیال آیا اور زندگی کی شدید ناہمواری کا احساس ہوا۔ اب ٹیپ پر گانا چل رہا تھا۔

ہائے ہائے مجبوری
یہ موسم اور یہ دوری
مجھے رہ رہ کے تڑپائے
وے تیری دو نکیاں دی نوکری، میرا لاکھوں کا ساون جائے۔

مہراں اپنے مہندی لگے پاؤں کے ساتھ ریتلی زمین پر ناچتی رہی اور اس کے بالوں کا جُوڑا ڈھیلا ہوتا رہا۔ سہ پہر کے وقت مہراں ایک بار پھر خاموشی سے بالائی کمرے میں آئی۔ اس مرتبہ چھوٹی بچی اس کی گود میں تھی۔ وہ پیاری سی ہمکتی ہوئی بچی تھی اور کسی ننھی پنچھڑی کی طرح بار بار مہراں کے توانا سینے پر منہ مار رہی تھی۔ مہراں ایک بار پھر کھانا لے کر آئی تھی۔ اب کھانے میں باجرے اور گندم کو ملا کر پکائی گئی خستہ روٹی تھی۔ ساتھ میں ساگ تھا۔ دودھ کی موٹی ملائی تھی جس میں شکر ڈالی گئی تھی۔ ساتھ میں ڈھوڈا تھا جسے وادی سون کی مرغوب سوئٹ ڈش کہا جا سکتا ہے۔

مہراں کی مٹھی میں کسی پرانے اخبار کا چھوٹا سا تراشا دبا ہوا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں

سے تراشا رستم کے سامنے کھولا اور بولی۔ ''یہ دیکھیں، یہ تساں کی تصویر ہی ہے ناں؟''

رستم نے دیکھا۔ یہ تین چار سال پرانی تصویر تھی۔ مہراں نے پتا نہیں کہاں سے لی تھی اور کینچی سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ رستم نے تصویر پھاڑ کر پھینک دی۔ مہراں کا چہرہ اُتر گیا۔

''ایسی چیزیں پاس نہیں رکھتے۔ مصیبت گلے پڑتی ہے۔'' وہ بے زار لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''شاید تساں کو پتا نہ ہو۔ تہاڈی ایسی تصویریں یہاں کئی لوگوں کے پاس موجود ہوں گی۔ لوگ تساں سے پیار کرتے ہیں۔''

گوہرا نے ذرا آنکھیں نچا کر کہا۔ ''لالے دی جان، میں نے کہا تھا ناں کہ لوگ تساں سے بڑا پیار کرتے ہیں۔''

رستم نے اپنی چھوٹی چھوٹی خوش نما داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ذرا گھور کر گوہرا کو دیکھا۔

مہراں اپنی بچی کو کندھے سے لگا کر ہلکورے دیتے ہوئے بولی۔ ''تساں دونوں سے ایک بات کرنی تھی۔''

''ہاں کہو۔'' رستم نے جواب دیا۔

''میں نے ایک بندے سے بات کی ہے۔ وہ تساں دونوں کو حفاظت کے ساتھ پولیس کے گھیرے سے نکال سکتا ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''بس ہے ایک۔ تساں اس کو نہیں جانتے۔ وہ اس علاقے کا کیڑا ہے۔ ایسے ایسے چور رستے جانتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

اس سے پہلے کہ مہراں کچھ کہتی سیڑھیوں کی طرف سے اس کے نشئی خاوند ظفری کی بیمار آواز سنائی دی۔ ''مہراں کدھر مرگئی ہے۔ او مہراں۔''

مہراں جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ظفری آوازیں دیتا اِدھر کو تھی رہا ہے (آ رہا ہے) میں چلتی ہوں۔ بس تساں دونوں اج رات کے لئے تیار رہنا۔'' وہ یہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف نکل گئی۔

''یہ کیا کہہ گئی ہے؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''وقت آنے پر ہی پتا چلے گا۔'' رستم نے کہا۔

''رستم بھائی، کوئی چال نہ ہو ہمارے لئے۔''

''چالیں چلنے والی لگتی تو نہیں۔'' رستم نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

شام کے سائے ڈھل گئے اور وادی سون کی طویل سنسان رات سر پر پہنچ گئی لیکن یہ بظاہر جتنی سنسان اور خاموش دکھائی دیتی تھی اتنی تھی نہیں۔ اس کے سینے میں ہلچل تھی اور واقعات تھے۔ واقعات جن کے اسباب ٹیلوں پر بکھرے ہوئے تھے اور جھاڑیوں میں گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ ایک چھوٹی چمگادڑ نہ جانے کہاں سے کمرے میں گھس آئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر سر پٹختی رہی پھر باہر نکل گئی۔ شادی والے گھر سے برتنوں کے ٹکرانے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وقت دھیرے دھیرے آگے کو سرکتا رہا۔ کمرے کے ایک روزن میں سے دور کچھ ٹیلوں کا ہالائی کنارہ نظر آتا تھا۔ تاریکی اور سردی میں ڈوبا ہوا کنارہ۔ اس کنارے پر رستم اور گوہرا کو کبھی کبھار جگنو سے چمکتے نظر آتے تھے۔ یہ جگنو دراصل موت کے وہ ہرکارے تھے جو اس ویرانے میں رستم اور گوہرا کے لئے گھوم رہے تھے۔ پولیس مقابلہ کیا گیا تھا۔ پولیس پارٹی پر دستی بم پھینکا گیا تھا اور ڈپٹی ریاض جیسے پولیس افسر سے براہِ راست مار ماری کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ معمولی نہیں تھا۔

اچانک رستم کو آہٹ محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ کمرے کے دروازے کے بالکل پاس کوئی موجود ہے اور وہ جو کوئی بھی تھا بہت دبے پاؤں چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ یہ کون ہو سکتا تھا۔ مہراں کا شوہر، سسر یا پھر اس کی ساس۔ ان دور دراز علاقوں میں لوگ رات کو بہت جلد سو جاتے ہیں۔ اب قریباً سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ روشنیاں بجھتی جا رہی تھیں۔ گلیوں اور راستوں سے آنے والی آوازیں کم ہو گئی تھیں۔

رستم کو عجیب سا شبہ ہونے لگا۔ اس کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ اس کمرے کے دروازے سے باہر کوئی پُراسرار سرگرمی جاری ہے۔ اپنے کولٹ پسٹل پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ گوہرا بھی اس صورتِ حال کو محسوس کر چکا تھا۔ اپنی ٹرپل ٹو اس نے گود میں رکھ کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا تھا۔ چند منٹ مزید گزر گئے۔ رستم کے حساس نتھنوں نے محسوس کیا کہ دروازے کے آس پاس جو شخص موجود ہے وہ سگریٹ پھونک رہا ہے۔ وہ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے اور ''تیل کی دھار'' دیکھتے رہے۔ قریباً دس منٹ بعد یوں لگا کہ وہ شخص دروازے پر سے ہٹ گیا ہے اور ارد گرد خاموشی چھا گئی ہے۔

رستم نے لالٹین بجھا دی تھی۔ اب کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ رستم نے گوہرا کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''پر دروازہ تو بند ہو گا؟''

''نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مہراں جلدی میں تالا لگانا بھول گئی ہے۔''

دراصل جب سہ پہر کے وقت وہ یہاں آئی تھی تو اس کے آنے کے ذرا دیر بعد اس کے شوہر نے اسے آوازیں دینا شروع کر دیں تھیں۔ وہ گھبراہٹ میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر نیچے چلی گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند ضرور کیا تھا مگر تالا لگنے کی آواز نہیں آئی تھی۔

رستم نے پسٹل اپنے ہاتھ میں رکھا اور رکوع میں چلتا ہوا بوریوں کے درمیان سے گزر کر دروازے کی طرف آیا۔ دروازے کے ارد گرد مکمل خاموشی تھی۔ سن گن لینے کے بعد اس نے ہولے سے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ اس کے پٹ وا ہو گئے۔ دونوں پٹوں کے درمیان قریباً چار انچ کا خلا پیدا ہوا تو چھت کا باقی حصہ بھی نظر آنے لگا۔ پہلی راتوں کے چاند کی مدھم روشنی میں ''اپلوں کے ڈھیر'' یوں نظر آتے تھے جیسے برقعہ پوش عورتیں چھت پر اکڑوں بیٹھی ہوں۔ ایک طرف چارپائی پر چادر ڈال کر کوئی سبزی سوکھنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس سے آگے پرالی کا ڈھیر تھا..... یہ ڈھیر، گھر کی نچلی چھت پر تھا اور رستم سے کم و بیش 15 میٹر کی دوری پر تھا۔ رستم کو شک ہوا کہ اس پرالی میں کوئی موجود ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس موقع پر درست اندازہ لگانا دشوار تھا۔ وہ کوئی کتا یا بلی ہو سکتی تھی یا اس کے علاوہ کوئی اور جانور..... یا پھر حیوانِ ناطق یعنی انسان۔

گھر کی دیگر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ مکین سو چکے ہیں یا سونے والے ہیں۔ دفعتاً رستم نے ایک سایہ دیکھا جو دبے پاؤں سیڑھیوں کی طرف آ رہا تھا۔ رستم ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ مہراں تھی۔ وہ بچوں پر چلتی ہوئی آئی۔ اس کا انداز اس کے خوف کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ پرالی کے ڈھیر کے پاس پہنچ کر رک گئی جیسے شدید تذبذب میں ہو۔ اسی دوران میں ایک شخص پرالی میں سے نمودار ہوا۔ رستم کو اس کی بس ایک جھلک نظر آئی۔ اس کے قد کاٹھ اور حلیے سے نہ جانے کیوں رستم کو شک ہوا کہ یہ وہی لالٹین بردار شخص ہے جس کے ساتھ اس بستی میں آتے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کریہہ چہرہ رستم کے تصور میں گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ زوردار جھانپڑ بھی یاد آ گیا جو رستم نے اسے مارا تھا۔

رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے مہراں کا بازو پکڑا اور اسے بڑی وحشت سے پرالی کے ڈھیر میں کھینچ لیا۔ دونوں پرالی میں اوجھل ہو گئے۔ پرالی کے اندر تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مہراں کو اپنی طرف کھینچنے والے شخص کی ''طلب'' مہراں کے جسم سے نبرد آزما ہے۔ رستم حیرانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ یہ کیسی لڑکی تھی؟ کل رات وہ ایک عجیب کیفیت کے زیرِ اثر رستم کے پاس آئی تھی لیکن آج صبح وہ اپنی رات والی کیفیت پر بہت نادم ہوئی تھی۔ اس

www.pdfbooksfree.pk

نے رستم کے سامنے آنسو بہائے تھے اور بہ زبان خاموشی خود کو ملامت کی تھی لیکن اب صرف چند گھنٹے بعد وہ ایک اور شخص کی بانہوں میں نظر آ رہی تھی۔ یہ کیا ماجرا تھا۔

''کس سین میں کھو گئے ہو لالے دی جان؟'' گوہرے نے بالکل پاس سے سرگوشی کی۔

رستم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے واپس بوریوں کے درمیانی خلا میں بھیج دیا۔ پرالی کے اندر کی ''سرگرمی'' جاری تھی۔ گاہے بگاہے کانچ کی چوڑیوں کی مدھم کھنک بھی سنائی دے جاتی تھی..... رستم کو اندیشہ پیدا ہوا کہ پرالی کے اندر سے مہراں دروازے میں موجود جھری دیکھ لے گی اور مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا اور واپس گوہرا کے پاس آ گیا۔

گوہرا نے ٹوہ لینے کی کوشش کی کہ رستم نے دروازے میں سے کیا دیکھا ہے لیکن رستم نے ٹال دیا۔ یہ لڑکی ایک معمے کی طرح سامنے آئی تھی۔ قریباً بیس تیس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی اندر آیا۔ ساتھ میں لالٹین کی روشنی بھی آ گئی۔ چوڑیوں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ آنے والی مہراں ہی ہے۔

وہ ایک ہاتھ میں لالٹین لئے جھک کر چلی آ رہی تھی۔ اس کے بالوں میں ابھی تک پرالی کے دو چار تنکے موجود تھے۔ لباس بے ترتیب سا تھا۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ سفید چاول، روٹی، مرغی کا سالن اور دودھ تھا۔ پتا نہیں کیوں رستم کا دل نہیں چاہا کہ مہراں کے ہاتھ کا کھانا کھائے۔ وہ جیسے ایکا ایکی اس کی نظروں سے گر گئی تھی۔ بہرحال اس کے دل کی کیفیت اس کی زبان پر نہیں آئی۔ کچھ بھی تھا مگر وہ اب تک بہت اچھی میزبان ثابت ہوئی تھی۔

کھانا پروسنے کے بعد مہراں نے کہا۔ ''تساں دونوں جانے کے لئے تیار ہو؟''

''اگر تم بھیجنے کے لئے تیار ہو تو ہم بھی تیار ہیں۔'' گوہرا نے جواب دیا۔

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''مینڈے بس میں ہو تو میں ساری حیاتی تم کو یہاں رکھوں۔ پر یہ تو تساں بھی جانتے ہو کہ جانا کی مجبوری ہے۔''

گوہرا کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ رستم نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ الوداعی لہجے میں بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں تساں چلے جاؤ گے پھر شاید کبھی تساں سے میل نہ ہو۔ پر پچھلے دو دن مجھ کو ساری حیاتی یاد رہیں گے۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ اب پولیس نے رستم اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر رہنا ہے..... زندہ یا.....'' آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ وہ بڑے افسردہ لہجے میں بولی۔

''مینڈی اتی عقل تو نہیں کہ تساں نوں مشورہ دے سکوں پر اتنا ضرور کہوں گی کہ تساں اس علاقے سے نکل جاؤ۔ کہیں دور چلے جاؤ۔ کچھ دنوں کے لئے پولیس کی آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔''

''اوئے بے وقوف یہاں سے نکلیں گے تو دور ہوں گے ناں۔'' گوہرے نے مرغی کا لیگ پیس ادھیڑتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اس کھانے کو آخری سمجھ کر کھا رہا تھا۔

''مینڈا یقین ہے کہ تساں نکل جاؤ گے۔ جبھڑا بندہ تساں کو ساتھ لے کر جا رہا ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ سمجھو کہ جادوگر ہے وہ۔'' مہراں نے کہا۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' رستم نے پوچھا۔

''سراج۔ یہ وہی بندہ ہے جو تساں کو شروع میں ملا تھا۔ اصل میں یہ چوکیدار نہیں ہے۔ یہی ہماری ڈھوک کے سرپنچ کا چھوٹا بھائی ہے۔ تساں اس کو غلطی سے چوکیدار سمجھتے رہے ہو۔''

''سرپنچ کا چھوٹا بھائی۔'' رستم نے پوچھا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ سرپنچ کا چھوٹا بھائی تم پر بُری نظر رکھتا ہے۔ تنگ کرتا ہے تم کو۔ جب تم اپنے نشئی بندے کو ڈیرے سے واپس لانے کے لئے جاتی ہو، تو وہ تم سے چھیڑ خانی کرتا ہے۔''

''نن..... نہیں۔ وہ دوسرا بھائی ہے۔'' مہراں نے کہا۔ رستم کو لگا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ رستم کچھ پوچھتا، گوہرا بول اٹھا۔ ''اس بندے کے تھوبڑے کو کیا ہوا ہے۔ کہیں جل گیا تھا؟''

مہراں کی آنکھوں میں کراہت کے سائے لہرائے اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس پر اس کی عورت نے تیزاب پھینک دیا تھا۔''

''واہ۔ یہ تو خوب کہی۔'' گوہرا نے حیرت سے آنکھیں کھولیں۔ ''مردوں کے بارے میں تو سنا تھا کہ عورتوں پر تیزاب پھینکتے ہیں لیکن عورت نے.....''

''ہاں اس کی عورت نے پھینک دیا تھا۔ اصل میں یہ وہی تیزاب تھا جو اس نے اپنی عورت پر پھینکنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ وہ سیانی نکلی اور پہل کر کے بھاگ گئی ڈھوک سے۔''

''مطلب ہے کہ یہ سارے بھائی ایک جیسے ہیں۔'' گوہرا نے تبصرہ کیا۔

اسی دوران میں باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ مہراں چونکتے ہوئے بولی۔

''مینڈا خیال ہے کہ سراج آ گیا ہے۔ تساں تیار ہو جاؤ۔''

''ہم بڑی دیر سے تیار ہیں۔'' گوہرا نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم گہری نظروں سے مہراں کو دیکھ رہا تھا۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ مہراں کا کردار ایک نئے رخ سے اس کے سامنے آ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مہراں سے کچھ کہتا یا پوچھتا کمرے کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ مہراں نے ڈری ہوئی ہرنی کی طرح دروازے کی طرف دیکھا اور جھک کر باہر چلی گئی۔ دو منٹ بعد وہ واپس آئی۔ اس کے ساتھ جو شخص تھا وہ بدنما چہرے والا سراج ہی تھا۔ اس کی ناک اونچی اور ٹھوڑی لمبی تھی۔ تیزاب کی مار نے اس کی آنکھ کو تقریباً گول کر دیا تھا اور چہرے کی کھال کئی جگہ سے سکڑ گئی تھی۔

اس نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے رستم کو دیکھا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ یہ تمی ہو۔ نہیں تو اس دن تساں سے اس طرح گل نہ کرتا۔“ اس کا مخاطب رستم تھا۔

”چلو اس پرانی بات کو بھول جاؤ۔ میں نے بھی تو تمہیں تھپڑ مار دیا تھا۔ انجانے میں ایسا ہوتا ہے۔“

سراج کے پاس خاکی رنگ کی دو بڑی چادریں تھیں۔ یہ چادریں اس نے رستم اور گوہرا کو دے دیں۔ اس کے پاس سفید رنگ کی دو پگڑیاں بھی تھیں۔ یہ پگڑیاں رستم اور گوہرا نے منڈاسوں کی طرح اپنے چہروں سے لپیٹ لیں۔ ”چلو جی چلیں۔“ سراج نے کہا۔ ”یہی وقت ہے یہاں سے نکلنے کا۔ پلس والے ڈیرے پر کھانا شانا کھا رہے ہیں۔“

وہ دونوں سراج کے ساتھ اس نیم تاریک کمرے سے نکل آئے جہاں انہوں نے باداموں اور خشک خوبانیوں کے ساتھ تقریباً 24 گھنٹے بسر کئے تھے۔ وہ چھت پر پہنچے۔ ڈھوک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مہراں خاموش کھڑی تھی۔ ”مینڈے کولوں کوئی گلتی ہوگئی ہو تو تساں ماف کر دینا۔“ وہ رستم کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔

”غلطی تو تم نے بہت بڑی کی ہے..... لیکن خیر۔“ رستم نے گہری سانس لی۔

وہ تینوں احتیاط سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے۔ نیچے کے کسی کمرے سے بچی کے رونے اور نشئی ظفری کے کھانسنے کی آوازیں ایک ساتھ آ رہی تھیں۔ برآمدے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ وہ تینوں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گلی میں پہنچ گئے۔ نیم پتھریلی گلی کے دونوں طرف گھروں کے چوبی کواڑ بند تھے۔ ان کواڑوں کے پیچھے چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی مدھم اور سہمی سہمی نظر آتی تھی۔ یہ ڈھوک، خاموشی کی ڈھوک بنی ہوئی تھی۔

قریباً نصف فرلانگ تک بستی سے باہر جانے کے بعد سراج درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں پہنچا۔ یہاں اُنیس بیس سال کا ایک دراز قد لڑکا بھی موجود تھا۔ وہ بھی مقامی

لباس یعنی تہمد بند اور چولے میں تھا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ اس کی چادر میں ہتھیار وغیرہ موجود ہے۔ وہ کچھ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس لڑکے نے بھی بڑی دلچسپی اور توجہ سے رستم کو دیکھا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ لڑکے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ سراج نے اس سے رستم کا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔

”یہ کون ہے؟“ رستم نے سراج سے پوچھا۔

”فدا نام ہے جی اس کا..... فدا بہادل۔ ایک سال پہلے ڈھوک ہاناں میں ایک پولیس والے سے اس کی مار ماری ہوئی تھی۔ یہ اس پولیس والے کا ایک دانت توڑ کر دوڑ گیا تھا۔ بعد میں یہ ہماری ڈھوک میں ”ڈھی“ گیا۔ اب یہ ڈرا ہوا ہے۔ ڈھوک پولیس کے گھیرے میں ہے۔ اس کو خطرہ ہے کہ کہیں تلاشیوں اور شناختوں میں یہ بھی نہ پکڑا جائے۔“

”اب یہ کہاں جا رہا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”تساں دونوں کے ساتھ ہی یہاں سے نکل رہا ہے۔“ سراج نے جواب دیا۔

لڑکے نے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ زیادہ موٹا تازہ نہیں تھا لیکن پھرتیلا اور کسی حد تک دلیر نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی روشن تھیں۔ اسے دیکھ کر رستم کو وہ دن یاد آ گئے جب اس نے بھی سماج کے ٹھیکیداروں سے ٹکر لی تھی۔ اپنی آپاں کی توہین کرنے والے خود سر بدمعاشوں کو للکارا تھا اور ان کو خونم خون کیا تھا۔ ان دنوں اس کے چہرے پر بھی ایسا ہی جوشیلا لڑکپن تھا۔

درختوں کے اس جھنڈ میں جنگلی انجیر، بیری اور کھینگر کے بہت سے درخت تھے۔ بھربھرے پتھروں اور کٹی پھٹی زمین نے اس جگہ کو گھیرا ہوا تھا۔ سراج انہیں لے کر ایک نشیب میں اُتر گیا۔ یہ نشیب ایک کھائی کی طرح تھا اور سامنے سے بند نظر آتا تھا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ یہاں جھاڑ جھنکار اور خودرَو گھاس کے درمیان ایک تنگ خلا موجود تھا۔

سراج ترچھا ہو کر اس خلا میں گھسا اور اس کے پیچھے رستم اور گوہرا بھی گھس گئے۔ آخر میں لڑکا فدا حسین آیا۔

اس طرح کی دراڑ نما جگہیں یہاں قدم قدم پر مل جاتی تھیں لیکن کون سی درز ایا سرنگ منزل تک پہنچائے گی اور کون سی ایک ہی جگہ پر گھما گھما کر راہی کو دیوانہ کر دے گی یہ خاص خاص لوگ ہی جانتے تھے۔ کھرا اٹھانے والے کھوجیوں کی طرح یہ فن بھی یہاں ورثے میں ملتا تھا اور نسل در نسل چلتا تھا۔ دراڑ میں گھسنے کے بعد سراج نے اپنے لباس میں سے ایک ٹارچ نکال لی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ کئی جگہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ انہیں ترچھا ہو کر یا زمین پر رینگ کر گزرنا پڑا۔ زمین کی سطح سے بیسیوں فٹ نیچے ایسی قبر نما جگہوں میں

www.pdfbooksfree.pk

موجود ہونا ایک ایسا تجربہ ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انسان خود کو جس اور جتنے کے ایک ناقابلِ بیان شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

یہ دراڑ قریباً ایک فرلانگ تک سیدھی چلتی رہی پھر شاخ در شاخ تقسیم ہونا شروع ہو گئی۔ ایسی بھول بھلیاں سامنے آ رہی تھیں کہ کئی جگہ کہنہ رہبر بھی ذرا چکرا جاتا تھا۔ اس سفر میں انہیں حشرات الارض، چوہوں اور چوہوں کی پیدا کردہ شدید بُو سے واسطہ پڑا۔ یہ سفر طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ ''یار! کہیں اسی طرح لاہور پہنچانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟'' گوہر نے تنگ آ کر کہا۔

''بس دو ڈھائی فرلانگ اور ہے۔'' سراج نے کہا۔

''دو ڈھائی فرلانگ۔'' گوہر نے زچ ہو کر پوچھا۔

''ہاں..... مگر اب راستہ ذرا سوکھا (آسان) ہو جائے گا۔'' سراج نے جواب دیا۔

واقعی کچھ آگے جا کر یہ تنگ دراڑ قدرے کشادہ دراڑ میں تبدیل ہونے لگی۔ یہاں پتھر بہت بھربھرے تھے۔ گول سنگریزوں سے اَٹی ہوئی دیواروں کا درمیانی فاصلہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو جاتا تھا..... بالآخر وہ منزل کے قریب پہنچ گئے۔ سراج کا پختہ خیال تھا کہ وہ پولیس کے گھیرے سے باہر آ چکے ہیں بلکہ اس کے اندازے کے مطابق انہوں نے کم و بیش تین فرلانگ سے زیادہ فاصلہ طے کیا تھا۔ دراڑ نشیب سے بلندی کی طرف جانے لگی، پھر وہ دہانے کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں راستہ ایک بار پھر نہایت تنگ ہو گیا۔ گوہر اکو زخمی ہاتھ کی وجہ سے بار بار کراہنا پڑ رہا تھا۔ کسی وقت وہ خود کو زخمی کرنے والے نامعلوم رائفل مین کو گالیاں بھی دیتا تھا۔

سراج نے ان تینوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود نوے کے زاویے پر جھک کر چلتا ہوا دہانے کی طرف گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا سا پریشان تھا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس کا بدنما چہرہ کچھ اور بھی بدنما دکھائی دیتا تھا۔ ایک عجیب سی کراہت جاگتی تھی دل میں۔ (اور مہراں چند گھنٹے پہلے اسی کراہت کے ساتھ پرالی کے ڈھیر میں موجود تھی)

''کیا بات ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' وہ بولا تو اس کے منہ سے بدبو کا بھبکا نکلتا محسوس ہوا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' گوہر نے پوچھا۔

''باہر پُلسیوں کی گاڑی موجود ہے۔ مینڈا خیال ہے کہ اس میں کوئی خرابی ہے۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا ہے۔ تین چار پُلیسے اس کے آلے دوالے کھڑے ہیں۔''

''پھر کیا کرنا ہے؟'' گوہر نے پوچھا۔

''ان کے جانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تساں بے فکر رہو۔ ہم خطرے والی جگہ سے کافی دور تھی گئے ہاں (آ گئے ہیں) اگر یہ پولیس والوں کی ''ماں'' یہاں خراب نہ ہوتی تو ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

رستم نے خود دہانے کے پاس جا کر دیکھا۔ دہانہ کیا تھا بس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جہاں سے ایک بندہ پھنس پھنسا کر گزر سکتا تھا۔ رستم کو دس پندرہ گز کے فاصلے پر پولیس کی ایک جیپ آڑھی ترچھی کھڑی نظر آئی۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ چار اہلکار جیپ کے قریب موجود تھے۔ ان میں سے دو رائفل بردار سنتری تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید دو تین مزید افراد بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ سراج ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ فی الوقت یہاں سے نکلنا خواہ مخواہ مصیبت کو دعوت دینا تھی۔ انہیں ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ چاروں دہانے سے کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ قریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک ہموار اور کشادہ جگہ انہیں آرام کرنے کے لئے موزوں نظر آئی۔ یہاں ٹھنڈک بھی نہیں تھی۔ وہ نیم پتھریلی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سراج شکل و صورت سے کرخت لگتا تھا مگر رستم کے سامنے وہ بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے دبے دبے لہجے میں رستم سے ایک دو سوالات کئے اور روکھے پھیکے مختصر جواب پا کر خاموش ہو گیا۔

ابھی رستم اور گوہر اکو سراج کی ضرورت تھی۔ دہانے سے نکلنے کے بعد بھی انہیں تین چار میل تک سراج کی رہنمائی میں جانا تھا، ورنہ شاید وہ اسے یہیں سے واپس کر دیتے۔ نوجوان لڑکے فدا کے پاس ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔ اس نے پوٹلی میں سے آلو والے پراٹھے نکالے اور بڑے خلوص و اشتیاق سے رستم کو کھانے کی دعوت دی۔ رستم نے یہ دعوت قبول نہیں کی تاہم گوہر اکے ایک پراٹھا لے لیا۔ دہانہ یہاں سے کافی دور تھا اس لئے انہوں نے ایک ٹارچ روشن کر لی۔ ٹارچ کی زرد روشنی نے اردگرد کے منظر کو اور بھی پُراسرار کر دیا۔ یہاں شاخ در شاخ دراڑیں تھیں۔ ان دراڑوں میں چکرانے والی ہوا کسی وقت عجیب سی آواز پیدا کرتی تھی۔ پُرہول اور گونجتی ہوئی آواز۔ جیسے کوئی درندہ کسی کچھار میں چھپا ہوا اور گاہے بگاہے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہو۔

رستم نے ایک ٹارچ لی اور ان دراڑوں کو دیکھنے نکل کھڑا ہوا۔ گوہر اکے سگریٹ سلگا لی اور ایک پتھر کو سرہانہ بنا کر نیم دراز ہو گیا۔ رستم قریباً آدھا گھنٹہ ان بھول بھلیوں میں چکرانے کے بعد واپس آیا تو گوہر اور سراج سو رہے تھے۔ سراج غالباً نشے میں بھی تھا۔ اس کی نیند بے

www.pdfbooksfree.pk

خبری کی تھی۔

لڑکا فدا حسین جاگ رہا تھا۔ رستم کو واپس آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رستم کے بیٹھنے کے لئے جگہ اپنے کپڑے سے صاف کی۔ رستم اس کے پاس ہی بیٹھ گیا..... اس نے سراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔ اسے کون نہیں جانتا۔'' لڑکے نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ ڈھوک کے سرپنچ کا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی بیوی نے اس کے منہ پر.....''

''ہاں ہاں مجھے پتا ہے۔'' رستم نے جواب دیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ شخص عورتوں کا رسیا ہے۔''

''بہت زیادہ جی۔ ایک وقت میں کئی عورتوں سے اس کا چکر رہتا ہے۔ آج کل ڈھوک کی دو عورتوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ ایک اس کے چھوٹے چاچے کی نوکرانی ہے۔ دوسری نشئی ظفری کی گھر والی ہے۔''

''نشئی ظفری کی گھر والی؟'' رستم نے فدا حسین کو کریدا۔

''جی ہاں۔ جوان لڑکی ہے اور سوہنی بھی ہے۔ نشے باز بندے کی وجہ سے وچاری کو گھر سے باہر نکلنا پڑا ہے۔ اپنے سورے (سسر) کے ساتھ مل کر باغیچے کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اب تو ویران کھیتی میں ہل چلانے کا بھی سوچ رہی ہے وچاری۔ اس کے بندے کو نشے میں غرق کرنے والا بھی یہی سراجا ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ہیروئن لا کر دے دیتا ہے اسے۔ ہیروئن پلا کر ظفری کو اپنے ڈیرے پر ہی سلا دیتا ہے۔ جب اس کی بیوی مہراں، ظفری کو لینے ڈیرے پر جاتی ہے تو اس سے چھیڑ خانیاں کرتا ہے۔ وچاری کی جان مشکل میں آئی رہتی ہے لیکن اب تو خیر مہراں نے ڈیرے پر جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

فدا حسین بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا تاکہ آواز سراجے کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

رستم نے پوچھا۔ ''سرپنچ دوسا کا کوئی اور بھائی بھی ہے؟''

''بس ایک تھا جی۔ وہ تین سال پہلے قتل ہو گیا تھا۔''

رستم کو یقین ہو گیا کہ مہراں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے بات پر پردہ ڈالنے کے لئے رستم کو بتایا تھا کہ سرپنچ کا جو بھائی اس سے چھیڑ خانی کرتا ہے وہ سراج نہیں ہے۔ اب لڑکا بتا رہا تھا کہ سرپنچ کا ایک ہی بھائی ہے۔

صورتِ حال رستم کے سامنے بالکل واضح ہو گئی تھی۔ آج اس تاریک رات میں ڈھوک شاہاں کی جھانکش ضیار مہراں نے ایک عجیب کام کیا تھا۔ ایک انوکھی قربانی دی تھی۔ رستم اور

گوہرا کو پولیس کے مہلک گھیرے سے نکالنے کے لئے مہراں نے اپنا آپ کریہہ صورت سراج کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ رستم کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں نے اور اس کی زبان نے پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں کئی بار اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جو مہمان آج اتفاقاً اس کے گھر میں اترا ہے، وہ پھر کبھی نہیں اترے گا۔ نہ پھر کبھی ایسی راتیں آئیں گی، نہ پھر کبھی ایک اہم زندگی کو موت کے گھیرے سے نکالنے کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ اس نے سب کچھ بہت تیزی سے سوچا تھا اور پھر اس کی دہقانی عقل نے اس سے ایک انوکھا کام کرا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر رستم اور گوہرا کو کوئی شخص پولیس کے محاصرے سے نکال سکتا ہے تو وہ سراجا ہے اور اگر کوئی ہستی اسے اس کام کے لئے آمادہ کر سکتی ہے تو وہ ہستی وہ خود ہے اور وہ جانتی تھی کہ یہ کام غیر مشروط طور پر نہیں ہوگا۔ اس کام کے لئے ایک کڑی شرط تھی اور یہ شرط مہراں نے پوری کی تھی۔ رستم کو پرالی کے ڈھیر کو متحرک کرنے والی دہشت یاد آئی اور کانچ کی چوڑیوں کی کراہتی ہوئی سی کھنک سنائی دی اور اس کا دل غم سے بھر گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ مرد و زن کے حسین و نرم و نازک رشتے کو مکروہ گندی گالی کیوں بنا دیا جاتا ہے۔

اس نے سوئے ہوئے سراج پر ایک آتشیں نگاہ ڈالی۔ اس کا جی چاہا کہ پتھر اٹھا کر اس کا سر کچل دے۔ رستم کے علم میں یہ سب کچھ اس وقت آیا تھا جب سب کچھ ہو چکا تھا۔ اگر اسے پہلے بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ مہراں کو اس صورتِ حال سے کبھی نہ گزرنے دیتا۔ اب بھی وہ سراج کو معاف کرنے والا نہیں تھا۔ سراج کا جرم معمولی نہیں تھا۔ اس نے رستم کی مدد کے لئے اپنی ہی ڈھوک کی ایک بے بس لڑکی سے بھاری قیمت وصول کی تھی اگر اتفاقاً رستم گھر کی چھت پر پرالی کے ڈھیر میں ہونے والی نقل و حرکت دیکھ نہ لیتا تو اس کے علم میں کبھی یہ بات نہ آتی کہ سراج نامی اس شخص نے رستم کی مدد کیونکر اور کس جذبے کے تحت کی ہے۔ اب تک جو صورتِ حال رستم کے سامنے آئی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا کہ سراج آئندہ بھی مہراں سے اپنے ''تعاون'' کا خراج وصول کرتا رہے گا۔ آج شب کی گناہ آلود تاریکی میں جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد رستم اٹھا اور دوبارہ دراڑ کے تنگ دہانے کی سمت گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی کہ پولیس کی جیپ اب نظر نہیں آ رہی۔ وہ واپس آیا اور سراج کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ سراج ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بڑی سرور انگیز نیند تھی اس کی۔ چند گھنٹے پہلے اس نے اپنے اندر کی آگ سے چھٹکارا پایا تھا۔ اب وہ بڑا پُرسکون نظر آتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

وہ ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ پھر رستم کو اپنے روبرو دیکھ کر قدرے مؤدب ہو گیا۔

''تساں دیکھیا ہے کہ باہر کا کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں جیپ چلا گئی ہے۔''

وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''تو پھر چلتے ہیں جی۔''

''چاچا سراج، تمہارے حصے کا پراٹھا پڑا ہے۔'' لڑکے فدا حسین نے کہا۔

''نہیں۔ پھر کھالوں گا۔''

''پھر کا کیا پتا۔ ابھی کھالو۔'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

فدا حسین نے پوٹلی کھولی اور ایک ایک پراٹھا رستم اور سراج کے سامنے رکھ دیا۔ سراج جھجک رہا تھا۔ رستم نے نوالہ توڑا تو وہ بھی کھانے لگا۔ ابلے ہوئے آلوؤں کے ساتھ ادرک اور پیاز کے ٹکڑے اور انار دانہ بھی ڈالا گیا تھا۔ مزے دار چیز تھی۔

رستم نے سراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری مدد کا بہت شکریہ بھئی۔ تم نے خود کو خطرے میں ڈالا اور کافی محنت کی۔''

''بس جی۔ جب مجھے ظفری کی بیوی سے پتہ چلیا کہ تساں ہماری ڈھوک میں موجود ہو اور تساں کو مدد کی ضرورت ہے تو میرے دل پر ہتھ پڑا۔ میں نے سوچیا، اللہ نہ کرے اگر تساں کو ہماری ڈھوک میں کچھ ہوا تو میں ساری حیاتی اپنے آپ سے شرمندہ رہوں گا۔ اوپر والا تساں کو لمبی جندگی دے۔ ہم کو تساں کی بڑی لوڑ (ضرورت) ہے۔''

سراجا خوشامدیوں کے لہجے میں بول رہا تھا اور اس کے الفاظ سے منافقت کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ رستم پر احسان جتا رہا ہے اور مستقبل میں اس سے فائدے کی توقع بھی رکھتا ہے۔ پانچ چھ بڑے بڑے لقموں میں سراجے نے قریباً ایک فٹ قطر کا پراٹھا با آسانی ہڑپ کر لیا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا آخری کھانا کھا لیا ہے۔

رستم نے بھی اپنا پراٹھا ختم کر لیا تو وہ چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا رخ دہانے کی طرف تھا۔ دہانے سے باہر نکل کر انہیں ہلکی سی سردی اور تیز ہوا کا احساس ہوا۔ مدھم چاندنی نے ٹیلوں کے بالائی کناروں کو تاریک آسمان کے پیش منظر میں نمایاں کر رکھا تھا۔ وہ ٹیلوں کے درمیان احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ ان کے عقب میں ڈھوک شاہاں کی چند ٹمٹماتی روشنیاں خاصی دور رہ گئی تھیں۔ بے شک خطرہ تو آگے بھی موجود تھا لیکن یہاں وہ مخاصمے والی کیفیت نہیں تھی۔ ایک تنگ گزرگاہ سے گزرنے کے بعد وہ قدرے کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہاں سے آگے وہ اکیلے سفر کر سکتے تھے۔ ان کی بائیں طرف چالیس پچاس فٹ گہرا نشیب

تھا۔ دائیں طرف سطح مرتفع دور تک چلی گئی تھی۔ اس پر جھلیکھڑی..... گھنگر اور بیری کے پودے تھے۔ ہلکی ہوا سے رستم کے لمبے بال ہولے ہولے لہرا رہے تھے۔ سراج اب واپس جانے کے لئے تیار تھا۔ وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''مینڈے خیال میں اب تساں کو ان چادروں اور پگڑیوں کی ضرورت نہیں۔''

اس کا مطلب تھا کہ یہ چادریں اور پگڑیاں اسے واپس دے دی جائیں۔

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اب تمہیں بھی ان چیزوں کی ضرورت نہیں کیونکہ اب تم واپس ڈھوک نہیں جا رہے ہو، کہیں اور جا رہے ہو۔''

''مم..... میں سمجھا نہیں جی؟'' سراجا قدرے حیران ہو کر بولا۔

''مجھے یہاں تک پہنچانے کی کیا قیمت لی ہے تم نے؟'' رستم کا لہجہ سفاک تھا۔

''کک..... کیسی قیمت سیال جی؟''

''ظفری کی بیوی کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟''

سراجے کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ پھڑکنا شروع ہو گئے۔ رستم نے ہاتھ بڑھا کر گوہرا سے ٹرپل ٹو رائفل لے لی۔ اس کا انداز خوف ناک تھا۔ سراج بے ساختہ تین چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''سس..... سیال جی! تساں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مم..... میں نے تو.....''

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ رستم کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ معافی تلافی کا وقت گزر گیا ہے۔ رستم نے ٹرپل ٹو رائفل کو دستے کی بجائے بیرل کی طرف سے پکڑ لیا تھا۔ اچانک اس نے رائفل کو سر سے بلند کر کے ایک بھرپور وار سراجے کی پیشانی پر کیا۔ اس شدید وار سے ناریل کے چٹخنے کی سی آواز پیدا ہوئی۔ سراجا نشیب کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ چوٹ کھا کر وہ ڈکرایا اور الٹ کر کھائی میں گرا۔ نشیب کی طرف اس کا سفر چالیس پچاس فٹ سے کم نہیں تھا اور نیچے نوکیلے پتھر تھے۔ اس کے گرنے سے ''بھد'' کی آواز پیدا ہوئی اور خاموشی چھا گئی۔

لڑکا فدا حسین تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رستم نے ٹرپل ٹو گوہرا کو واپس کی اور اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔

رستم اور گوہرا ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر نشیب میں اُترے۔ یہاں سراجا اوندھے منہ بے سدھ پڑا تھا۔ اس میں زندگی کے معمولی آثار باقی تھے۔ رستم کے اشارے پر گوہرا نے سراجے کی مشکل آسان کر دی۔ رائفل کے کندے کی دو شدید ضربوں نے سراجے کی کھوپڑی بالکل توڑ دی۔ گوہرا ٹارچ جلا کر سراج کے مرنے کی تسلی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ضرورت

www.pdfbooksfree.pk

نہیں تھی۔ ویسے بھی ٹارچ جلانا خطرناک تھا۔ رستم نے اسے روک دیا۔ نیم تاریکی میں ہی رستم نے سراج کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی ایک جیب سے وہ پانچ ہزار روپیہ برآمد ہوا جو اس نے فدا حسین سے اینٹھا تھا۔ اس کے علاوہ دو ڈھائی سو کی نقدی، سگریٹ، ہیروئن کی دو تین پڑیاں اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی اس کے کپڑوں سے برآمد ہوا۔

اس کی لاش کو وہاں پتھروں کے درمیان چھوڑ کر رستم اور گوہر اواپس اوپر کی طرف روانہ ہوگئے۔ رستم نے سراج کا پستول اور تھوڑی سی نقدی اس کی جیب میں واپس رکھ دی تھی۔

''یہ کس لئے؟'' گوہر انے پوچھا۔

''سراج کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ وہ رات کے وقت بلندی سے گر کر مرا ہے۔ اس کی جیبیں بالکل خالی نہیں ہونی چاہئیں۔'' رستم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

رستم چاہتا تھا کہ سراج کی جیب سے نکلنے والے پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ نوجوان فدا حسین کو واپس لوٹا دے لیکن جب وہ اس جگہ پر پہنچے جہاں سے سراج نیچے گرا تھا، تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ فدا حسین راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ سراج والے واقعہ کی وجہ سے وہ بہت دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ رستم اور گوہر انے اسے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آگے بڑھ گئے۔ رستم نے ایک الوداعی نظر نیچے نشیب میں ڈالی۔ تاریک نشیب جہاں بدنما بدفطرت سراج کی لاش دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ مہراں نے..... ڈھوک شاہاں کی مہراں نے آج رات جو کچھ اس کے لئے کیا تھا، اس کا صلہ دینا تو شاید ممکن نہیں تھا لیکن رستم نے اس کا کچھ نہ کچھ مداوا ضرور کر دیا تھا۔

اب رستم اور گوہر کا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا۔ وہ جلد ہی ''رکھ پیل'' پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سے انہیں جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے اس ریلوے ٹریک تک پہنچنا تھا جو کنڈیاں اور سرگودھا کو آپس میں ملاتا ہے..... ہاں رستم کا رخ جنوب کی طرف تھا..... جہاں پیر قدرت اللہ تھا۔ اس کی پھیلائی ہوئی منافقت اور شعبدہ بازی تھی اور جہاں بی بی تھی۔ بی بی جسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دیکھنا چاہتا تھا..... جسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ملنا چاہتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں موت تھی اور وہ اس موت سے تھوڑی سی مہلت چرا کر زندہ لوگوں کی طرف جا رہا تھا۔ پوٹھوہار کا ویرانہ اس کے عقب میں تھا اور آباد بستیوں کی طرف سے آنے والی ہوا اس کے جسم کو چھو رہی تھی اور اس کے لمبے چمک دار بالوں کو ہلکورے دے رہی تھی۔ چاند کافی دیر پہلے مغرب میں اوجھل ہو چکا تھا۔ اب رات کے پچھلے پہر آسمان پر پلکیں جھپکتے ستاروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

☆======☆======☆

شانی بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ یہ ہوٹل کا کمرہ تھا۔ اس کا دل اداسی اور غم سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔ سب انسپکٹر اختر نے جو کچھ بتایا وہ بہت تشویش ناک تھا۔ اس نے حاجی حیات کا پیغام دیتے ہوئے شانی کو اطلاع پہنچائی تھی کہ پولیس، رستم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف گرینڈ آپریشن کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اب اعلیٰ حکام ڈاکوؤں کے اس ٹولے کو مزید مہلت دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اخباروں میں جو خبریں آ رہی تھیں وہ بھی اسی نوعیت کی تھیں۔

دوسری طرف راجو اور کوکی والا معاملہ بھی بدستور شدید الجھن کا شکار تھا۔ تین چار دن پہلے بہت بڑا ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ یہ خبر ملنے کے بعد کہ چوہدری بشیر نے کمسن کوکی سے شادی رچالی ہے، تاؤ حشام اور اس کے ساتھی غصے سے بے قابو ہوگئے تھے۔ وہ بے حد اشتعال کے عالم میں ہوٹل سے نکلے تھے اور عثمانیہ ہاؤس کا رخ کیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہسپتال میں شانی سے ان کا ٹاکرا ہوگیا تھا۔ شانی نے انہیں بتایا کہ کوکی کے حوالے سے راجو کی پوزیشن کتنی خطرناک ہے۔ وہ بس امید کے سہارے زندہ ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ ہونی ہوگئی ہے اور کوکی بیاہی جا چکی ہے تو وہ اپنی جان لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔ اس موقع پر بابر بے نے بھی شانی کا ساتھ دیا تھا اور تاؤ حشام کو اس کے غصیلے ارادوں سے باز رکھنے میں شانی کی مدد کی تھی۔

صورتِ حال میں شدید تناؤ موجود تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ کوکی چوہدری بشیر کے عثمانیہ ہاؤس میں دو دن رہنے کے بعد اپنے گھر حیات کالونی واپس آ چکی تھی اور ابھی دوبارہ چوہدری کے پاس نہیں گئی تھی۔ کوکی کے اہلِ خانہ کی ''قید'' بھی شادی کے بعد ختم ہوگئی تھی اور وہ اپنے گھر میں تھے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بے حد توہین آمیز تھا۔ وہ چوہدری کے لئے اپنے غم و غصہ کو بہ مشکل دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ شانی نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شور سا سنائی دیا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔ نہ جانے کیوں شانی کی دھڑکن زیر و زبر ہوئی۔ پتا نہیں آج کل ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ جب کوئی دستک ہوتی تھی یا آہٹ سنائی دیتی تھی یا فون کی گھنٹی بجتی تھی، شانی کے دل میں بے وجہ اور بے سبب ایک اضطراب سا پیدا ہوتا تھا۔ نہ جانے کہاں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آواز اٹھتی تھی۔ بے نام آس کا ایک ستارہ سا چمک کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ اب بھی یہ خاموش فون سن کر وہ ایک دم ڈسٹرب سی ہوگئی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

چند سیکنڈ بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عارف کھوہ تھا۔ ''تم نے پہلے جواب ہی نہیں دیا۔'' عارف نے کہا۔

''آواز نہیں آئی تھی۔'' شانی نے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''راجو! تمہیں بلا رہا ہے شانی بہن۔ صبح سے قریباً دس دفعہ کہہ چکا ہے مجھے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بس ایک گھنٹے میں پہنچتی ہوں۔''

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی نشتر ہسپتال میں راجو کے پاس اس کے کمرے میں تھی۔ وہ آج بہت ناراض اور چپ چاپ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات کو جاگتا اور روتا رہا ہے۔

''کیا حال ہے راجو؟'' شانی نے اس کے الجھے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''میرے حال کو چھوڑو۔ مجھے بس یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ کیا کر رہی ہو تم؟'' وہ بے حد بے زاری سے بولا۔ ''کوئی مجھے ٹھیک بات نہیں بتاتا۔ تین دن سے ابا بھی ملنے نہیں آیا۔''

''اب کوئی نئی بات ہوئی ہے؟''

''وہی پرانی بات ہے۔ تم ہر روز مجھے تسلی دیتی ہو کہ کوکی میرا حال پوچھنے آئے گی۔ ہر روز میں صبح سے شام تک دروازے کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ کوکی تو ایک طرف اس کے گھر والوں میں سے بھی کسی نے صورت نہیں دکھائی ہے۔ دوسری طرف تم کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

راجو کے تیور دیکھ کر شانی نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ دوبارہ راجو کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے اس کا کمزور ہاتھ تھاما اور بولی۔ ''راجو! میں نے شروع میں تم سے کیا کہا تھا؟ یہی کہا تھا ناں کہ حوصلہ چھوٹا نہیں کرنا۔ راستے میں مشکلیں آئیں گی، اونچ نیچ بھی ہوگی لیکن ہمارا ارادہ مضبوط ہوگا تو منزل ضرور ملے گی۔ کہا تھا ناں میں نے؟''

راجو کے بگڑے ہوئے تیور قدرے بہتر ہو گئے۔ شانی اسے بڑے نرم اور مہربان لفظوں میں سمجھانے لگی۔ اپنی دانش مندی سے اس کے دل کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھنے لگی۔ وہ شانی کی باتوں میں بہتا چلا گیا اور قدرے پُرسکون ہو گیا۔ شانی نے اسے بتایا کہ جہاں کوکی کی شادی ہونے لگی تھی وہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب راجو کی طرف بات چل رہی ہے۔ کوکی کے گھر والوں میں سے زیادہ تر راضی ہیں صرف ایک دو بندے اعتراض کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا اعتراض بھی جلد دور ہو جائے گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

''مجھے پتا ہے کون اعتراض کر رہا ہوگا۔ چاچا سیف ہوگا۔ اسے مجھ پر بڑا غصہ ہے اور ایبے پر بھی۔ اگر..... اگر تم کہتی ہو تو میں..... اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔'' وہ رک رک کر بولا۔

شانی حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ سچ کہتے ہیں محبت لوگوں کو اور ان کے دلوں کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ نوخیز لڑکا کس قدر بدل گیا تھا۔ میانہ کی حویلی میں یہ ایک بگڑا اکھڑا چوہدری زادہ تھا۔ بات بعد میں کرتا تھا، گالی پہلے دیتا تھا۔ زرق برق کپڑے پہن کر راجا اِندر کی طرح حویلی کی چار دیواری میں دندناتا تھا لیکن آج حالات کی بھٹی میں تپ کر اس کا میل کچیل صاف ہو گیا تھا۔ یہ کوکی کے غریب باپ سے معافی مانگنے کی بات کر رہا تھا۔

''نہیں راجو، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کہ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کی آنکھوں میں آس کے بجھے ہوئے دیے پھر جلنے لگے۔ وہ ذرا اوپر کو کھسکا اور تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کا ہاتھ شانی کے ہاتھ میں رہا اور وہ اسے تسلی دیتی رہی۔

راجو نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ ''پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے..... میرا دل چاہتا ہے کہ کوکی سے میرا ویاہ ہو جائے تو میں اسے لے کر کہیں دور نکل جاؤں۔ کسی دوسری جگہ جہاں نہ کوئی رشتے دار ہو نہ کوئی سجن، نہ کوئی دشمن۔''

''لیکن تمہیں تو کچھ آتا نہیں ہے۔ کیا کرو گے، اسے کھلاؤ گے کہاں سے؟''

''میں کوکی کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تم دیکھنا، میں کرنے پر آ گیا تو پیسے کے ڈھیر لگا دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں خواب تھے۔ شانی نے اسے بولنے دیا۔ وہ بولتا گیا۔ ''میری طرف سے اور ایے کی طرف سے کوکی کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں، میں اس کی ساری کسر پوری کر دوں گا۔ اتنا خوش رکھوں گا، اسے اتنا خوش رکھوں گا کہ وہ حیران ہو جائے گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو سرگودھا شہر سے تھوڑی دور ہماری پندرہ ایکڑ نہری زمین ہے۔ اس میں امرود اور مالٹے کا ایک بڑا باغ بھی ہے۔ اس باغ میں میرے دادا کے زمانے کی ایک چھوٹی سی حویلی ہے۔ میں اس حویلی کو ٹھیک ٹھاک کراؤں گا۔ میں اور کوکی وہاں جا کر رہیں گے۔ بس ہم ہوں گے یا ایک دو نوکرانیاں ہوں گی اور کوئی نہیں ہوگا۔''

شانی اس کی رومانی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ''اتنی دور چلے جاؤ گے۔ نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ پریشان نہ ہو جاؤ گے۔''

اس نے اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ہسپتال کی سفید چھت کو گھورتے

ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ کوکی صرف اور صرف میرے لئے ہو.....اور میں صرف اور صرف کوکی کے لئے۔ کوکی پر کسی کی میلی نظر نہ پڑے اور تو اور اسے ہوا بھی چھو کر نہ گزرے۔ پتا نہیں.....میں کیوں ایسا ہوگیا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے، اسے ہر ایک سے چھپا لوں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور تب شانی کی طرف رخ پھیرا لیکن اس سے نظر ملائے بغیر بولا۔ ''کیا وہ بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچتی ہے؟''

''وہ تم سے بھی زیادہ سوچتی ہے۔ کوئی اس کے سامنے تمہارا نام لیتا ہے تو اس کی آنکھوں میں اتنی پیاری چمک آتی ہے کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

راجو کہیں کھو سا گیا۔ جیسے تصور کی نگاہ سے اپنی کوکی کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک دیکھ رہا ہو۔ شانی کسی دوسری سوچ میں کھو گئی۔ یہ ایک تکلیف دہ سوچ تھی۔ راجو کے جذبات کوکی کے بارے میں وہی تھے جو ایک نوخیز عاشق کے ہو سکتے ہیں۔ وہ اسے صرف اور صرف اپنے لئے خاص دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ کوئی دوسرا مرد اسے ہاتھ لگائے.....اور اس سے جسمانی قربت قائم کرے۔ چند دن پہلے اس نے اپنی کوکی کو کسی دوسرے کا ہوتے دیکھا تو زہریلی گولیاں پھانک لی تھیں۔ زندگی سے منہ موڑ لینے کی نہایت سنجیدہ کوشش کی تھی لیکن ہوا پھر بھی وہی تھا جو قدرت کو منظور تھا۔ کوکی ایک اَن چاہی شادی کے نام پر بسترِ ہوس کی زینت بنی تھی اور کچلی مسلی گئی تھی۔ اب وہ کلی سے پھول بن چکی تھی اور یہ ایسا پھول تھا جس کی ہر پتی پر کسی دوسرے مرد کی موجودگی کے انمٹ نشان تھے.....سوال یہ تھا کہ کیا راجو کو یہ صورتِ حال قبول ہوگی۔ کیا وہ الہڑ دوشیزہ کی جگہ ایک کچلی مسلی کوکب کو قبول کرے گا۔

اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو پھر راجو بھی کون سا ''کنوارہ'' تھا۔ کوکی سے جدا ہونے کے بعد وہ اپنے جاہل باپ کے بہکاوے میں آیا تھا اور اس نے خود کو عیش و عشرت میں گم کر دیا تھا.....کئی ماہ تک میانہ میں تاؤ حشام کی حویلی نے نشاط گاہ کا روپ اختیار کئے رکھا تھا۔ حویلی کی جوان نوکرانیوں نے عہدِ قدیم کی کنیزوں کا روپ دھار لیا تھا اور میانہ کے نوعمر ولی عہد کو عیش و طرب کے نت نئے جہانوں کی سیر کراتی رہی تھیں۔

اس اعتبار سے کوکی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف ایک مرد سے آشنا ہوئی تھی اور وہ بھی سخت مجبوری اور گریز کی حالت میں لیکن کچھ بھی تھا شانی جانتی تھی کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ یہاں کا معاشرہ مردوں کے لئے لاتعداد رعایتیں فراہم کرتا ہے اور عورت کے لئے ایک دم سخت اور بے لچک ہو جاتا ہے.....جو کچھ بھی تھا اب راجو کے لئے

ضروری تھا کہ وہ اپنے لئے ایک درمیانی راستہ اختیار کرے۔ ایک ایسا راستہ جو اس کی اور کوکب کی زندگی اور محبت کا راستہ ہو۔

شانی، راجو سے یہ بات کرنے کے لئے کئی دنوں سے پر تول رہی تھی۔ اب اس بات کو مزید التوا میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ شانی نے حوصلہ جمع کیا اور راجو سے کہا۔ ''راجو! میں تم سے ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟''

''ہاں پوچھو'' وہ اپنے مخصوص دیہاتی انداز میں بولا۔

''تم کوکی سے بہت پیار کرتے ہو۔ کوکی بھی تم کو بہت چاہتی ہے۔ تم ایک دوسرے کے لئے جان دینے کو تیار ہو.....ہو کہ نہیں؟'' راجو نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ماضی میں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، لیکن اب تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو کہ کوکی کے علاوہ کوئی اور لڑکی تمہارے قریب آئے۔ اسی طرح کوکی بھی نہیں چاہے گی کہ تمہارے علاوہ کسی کا سایہ بھی اس پر پڑے۔ وہ صرف اور صرف تمہاری بننا چاہتی ہے اور دن رات تمہاری بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بستر پر کیوں لگتی اور ڈولا کئی مہینوں تک تمہیں در بدر کیوں ڈھونڈتا پھرتا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے ناں؟''

''ہاں آ رہی ہے۔ پر اصل بات کیا ہے؟'' راجو کی آنکھوں میں ہلکا سا اندیشہ جاگ گیا۔

شانی بولی۔ ''راجو! تم تھوڑی دیر کے لئے فرض کرو۔ خدانخواستہ.....خدانخواستہ چاچے سیف کے گھر میں کوئی ڈاکو گھس جاتا ہے۔ وہ کوکی کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ خدانخواستہ وہ اس کو بے بس کر کے اس کی عزت سے کھیل جاتا ہے۔ کوکی پوری کوشش کے باوجود کچھ نہیں کر سکتی.....ایسے میں کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟'' راجو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تم بتاؤ ناں کیا ہوگا۔ کوکی کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس میں کوکی کا تو کوئی قصور نہیں ہوگا۔ وہ تو کمزور اور بے بس ہے۔ اس کے گھر والے اسے بچا نہیں سکے۔ اس نے ڈاکو سے خود کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی اور پھر مجبور ہوگئی۔ وہ جس طرح لوٹے جانے سے پہلے تم کو چاہتی تھی اس طرح بعد میں بھی چاہتی ہے۔ اب بتاؤ تم کیا کرو گے؟''

وہ خالی خالی نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا۔ وہ بات سمجھ رہا تھا لیکن جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ شانی نے کہا۔ ''اگر خدانخواستہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسا ہو جائے تو اسے پیار کرنے والے کے پاس دو راستے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ اسے ناپاک اور جھوٹا سمجھ کر چھوڑ دے اور

www.pdfbooksfree.pk

اس کی بے بسی کے لئے اسے زندگی بھر کی سزا دے دے۔ دوسرا یہ کہ وہ لڑکی کو بے قصور و مجبور سمجھے اور اس سے اسی طرح پیار کرتا رہے جس طرح پہلے کرتا تھا۔ یہ خیال بھی دل میں نہ لائے کہ وہ بدل گئی ہے یا اس میں کچھ بدل گیا ہے۔ تم بتاؤ کہ اب ان میں سے کون سا راستہ انصاف کا ہے اور بہتر ہے؟''

راجو نے پریشان ہو کر کہا۔ ''لیکن..... تم یہ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔ کک..... کیا کوکی کے ساتھ..... میرا مطلب ہے.....؟''

''کوکی کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ میں تمہیں ساری بات بتاؤں گی لیکن پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ ہم نے کچھ دیر کے لئے فرض کیا ہے کہ ایک ڈاکو نے کوکی کے گھر والوں کو اور کوکی کو بے بس کر کے اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ اس بُرے سلوک کے ساتھ تم کوکی کو معاف کر دو گے، اس کے آنسو پونچھو گے یا اس کو ہمیشہ کے لئے زندگی سے دور کر دو گے؟''

''میں اس کے آنسو پونچھوں گا..... اگر اللہ نہ کرے اس کے ساتھ کوئی زبردستی کر جائے تو اس میں وہ بے قصور ہے۔''

''تم اس کے جسم کو اُجڑا اور ناپاک تو نہیں سمجھو گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں نہیں؟''

''مم..... مجھے پتا نہیں لیکن..... تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم اس کے جسم کو اُجڑا بچڑا کیوں نہیں سمجھو گے۔ اس لئے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتی ہے اور محبت دل سے کی جاتی ہے اور جب دل صحیح سلامت ہو تو پھر جسم میں آنے والی تبدیلی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔''

''تمہاری باتیں پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں، لیکن پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ رہ رہا سا ہو رہا تھا اور اصل بات جاننا چاہتا تھا۔

شانی جانتی تھی کہ اب بات فیصلہ کن مرحلے میں پہنچ چکی ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور راجو کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''راجو! زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا ہے اور اسے قبول کر لینے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ناپسندیدہ چیز کے اندر ہی کوئی نہ کوئی خوشی بھی ہمارے لئے چھپی ہوتی ہے۔ جیسے کانٹے کے ساتھ پھول، مکھی کے ڈنک کے ساتھ شہد اور گھنن کے ساتھ بارش۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ آج میں تمہیں جو ناپسندیدہ بات بتا رہی ہوں..... اور جو تمہیں صدمہ بھی پہنچائے گی، وہ یہ

ہے کہ..... کوکی کے ساتھ واقعی ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ میں نے شروع میں جو ڈاکو اور زبردستی والی بات تمہیں بتائی ہے، وہ درست ہے۔''

راجو کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر شانی کی آنکھوں میں جھانکا اور کراہ کر بولا۔ ''یہ..... کیا کہہ رہی ہو تم..... تم ہوش میں تو ہو۔ کیا ہوا ہے کوکی کو؟''

شانی نے سر جھکایا۔ ''ہاں راجو! وہ ایک ڈاکو کے ہاتھوں لٹی ہے اور بڑی مجبوری کی حالت میں۔ اس پر جتنا بھی ترس کھایا جائے کم ہے۔''

راجو کی آنکھیں دکھ آمیز حیرت سے وا ہو گئیں پھر ان آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ ''کب ہوا ایسا؟ کس نے کیا؟''

''میں تمہیں بتا دوں گی، لیکن ایک شرط پر..... تمہیں اپنے غصے پر قابو رکھنا ہوگا۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جانا ہوگا اور آگے کی طرف دیکھنا ہوگا۔''

اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو چھلکنے لگے۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔''

''پھر وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئی۔ نہ اس کے گھر والوں میں سے کوئی آیا ہے۔''

''اس کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔'' شانی نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''راجو! میں نے تمہیں صرف سمجھانے کے لئے بات کو دوسرے طریقے سے کیا ہے۔ کوکی کے ساتھ سہی ڈاکو نے بدسلوکی نہیں کی لیکن اس کے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہوئی ہے اور یہ شادی زبردستی کی گئی ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکی۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکا اور تو اور میں بھی کچھ نہیں کر سکی۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ میں وہ شادی رکوانے کے لئے ہی جا رہی تھی اور میں رکوا بھی سکتی تھی لیکن راستے میں میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پچھلے ہفتے..... میرے سر پر پٹی دیکھی تھی ناں تم نے؟ وہ اسی حادثے کی نشانی تھی۔''

راجو کانپ رہا تھا۔ ''تو تم نے، تم سب نے جھوٹ بولا کہ کوکی کی شادی رک گئی ہے اور اب اس کی شادی میرے ساتھ ہونے والی ہے۔''

''ہاں راجو، جھوٹ بولا تھا۔'' شانی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''لیکن یہ جھوٹ تمہاری بہتری کے لئے ہی بولا تھا۔ تب تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ تمہیں کچھ بتایا جا سکتا۔ اب اگر میں تمہیں بتا رہی ہوں تو اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اب تم بہت حد تک اپنے حواس میں ہو اور دوسری یہ کہ اب حالات میں بہتری آ گئی ہے۔ وہ شادی جو بس نام کی شادی تھی

www.pdfbooksfree.pk

تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ کوکی اپنے گھر واپس آچکی ہے۔ وہ شخص بھی کوکی کو آزاد کرنے پر رضامند ہے۔ میں نے کوکی کے گھر والوں کو راضی کرلیا ہے، چاچا سیف بھی تقریباً مان گیا ہے۔ میں کوکی کو تمہاری دلہن بنانا چاہتی ہوں اور اس کام کے لئے رستہ تقریباً ہموار ہے۔''

راجو سناٹے کی کیفیت میں بیٹھا تھا..... بالکل ساکت و جامد۔ شانی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ راجو کا ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک بار پھر شدید ترین ڈپریشن کا شکا ہوجاتا اور خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ یہ امکان بھی تھا کہ اس کے سارے غم و غصے کا رخ کوکی کی جانب مڑ جاتا۔ وہ اسے بُرا بھلا کہنا شروع کردیتا اور اس ساری صورتِ حال کے لئے اسے موردِ الزام ٹھہراتا۔ تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا اور شانی کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرتا۔

اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہوئے اور پھر وہ اُشک بار ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور چہرہ بازوؤں میں چھپالیا۔ ''راجو..... راجو۔'' شانی نے دوبارہ پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب شانی نے محسوس کیا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس کے جسم میں جنبش تھی، وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

''راجو! دیکھو میری طرف۔ میری بات سنو۔'' شانی نے اسے پلٹنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ایک تیز حرکت سے شانی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''باہر چلی جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

شانی بیٹھی رہی۔ وہ ایسے موقع پر باہر کیسے جاسکتی تھی۔ وہ تو اس سے نظر ہٹانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ (اس سے پہلے مایوسی کے عالم میں راجو جو کچھ کرچکا تھا، وہ بہت خطرناک تھا) وہ راجو کے بیڈ کے قریب کرسی پر موجود رہی۔ وہ اسی طرح لیٹا اور روتا رہا۔ شانی بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ چوہدریوں اور چوہدری زادوں میں عورت کے حوالے سے ایک خاص قسم کی سوچ پائی جاتی ہے۔ ان کے اپنے اندر تو بے شک ہزاروں عیب ہوں لیکن وہ اپنی ''عورت'' کو بے عیب و بے داغ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایسے شدت پسند بھی ہوتے ہیں جو دانی عورت کو جان سے مار ڈالتے ہیں اور اس حوالے سے نسل در نسل چلنے والی دشمنی کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد راجو رخ بدل کر سیدھا لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ وہ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آتا تھا۔ دکھ نہ سکون..... نری نہ سختی۔ وہ ساکت لیٹا تھا۔ شانی دھڑکتے دل سے اس کے ردِعمل کا انتظار کرتی

رہی۔ آخر اس نے شانی کی طرف دیکھا اور ان حالات کے بارے میں پوچھا جن میں کوکی کی شادی ہوئی تھی۔ شانی نے اس موقع پر کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے راجو کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ اس نے سب سے پہلے تو راجو پر یہ انکشاف کیا کہ کوکی کی شادی کے حوالے سے ایک عجیب اتفاق ہوا ہے۔ جس شخص کے ساتھ کوکی کی شادی ہوئی ہے وہ راجو کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ وہ چوہدری امانت کا بیٹا اور راجو کا چچازاد چوہدری بشیر ہے۔

اب تک یہ بات راجو سے چھپائی گئی تھی۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونے پر اسے شدید جھٹکا لگا۔ شانی نے اسے بتایا کہ اس رشتے میں کسی طرح کی خاندانی رنجش یا رقابت کا ہرگز دخل نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اتفاق تھا۔ یہ اتفاق جس طرح سے پیدا ہوا تھا اس کے بارے میں بھی شانی نے تفصیل بتائی۔

بعدازاں شانی نے بتایا کہ معاملہ گڑبڑ ہونے کے بعد کس طرح چوہدری بشیر آناً فاناً کوکی اور اس کے گھر والوں کو اپنے گھر عثمانیہ ہاؤس میں لے گیا اور کس طرح وہاں جلدی میں کوکی کا نکاح ہوا۔ یہ ساری تفصیل راجو کے لئے بے حد تکلیف دہ تھی تاہم وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ شانی نے کوشش کی کہ وہ جو کچھ راجو کو بتا رہی ہے اس میں چوہدری حشام اور چوہدری بشیر میں خاصمت کا پہلو نمایاں نہ ہو۔

ساری باتیں سننے کے بعد راجو ایک بار پھر گم صم ہوگیا۔ اس کے تاثرات سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ یہ خاموشی بڑی بوجھل تھی۔ کسی وقت تو شانی کو لگتا تھا کہ کہیں پھر کوئی ہنگامہ وجود میں نہ آجائے۔ پچھلی مرتبہ راجو نے بوتل توڑ کر شیشہ اپنی گردن پر چلا لیا تھا۔ وہ اب بھی کوئی ایسی حرکت کرسکتا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین۔

آخر تذبذب کی وہ کٹھن ترین گھڑیاں گزر گئیں۔ راجو نے شانی کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لے کر بولا۔ ''میں کوکی سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ جیسی بھی ہے میری ہے.....'' اس کی آواز ہوا کی لہروں میں پھیلی اور اس کی گونج تادیر شانی کے کانوں میں برقرار رہی۔

شانی نے بے اختیار اس کا سر اپنے کندھوں سے لگالیا۔ وہ چپ چاپ کندھے سے لگا رہا۔ شانی نے کہا۔ ''تم نے ہاں کہہ دی ہے۔ بس اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی۔ تمہیں اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے بڑی محبت اور بڑے یقین سے راجو کی پشت تھپتھپائی اور جذباتی انداز میں باہر نکل آئی۔ شاید ابھی راجو اس سے کچھ مزید سوالات پوچھنا چاہتا تھا لیکن شانی کی عجلت نے

www.pdfbooksfree.pk

اسے موقع نہیں دیا۔

شانی ہسپتال سے سیدھی عثمانیہ ہاؤس پہنچی۔ سفید فام اسٹیفن اور اس کی خوش اندام بیوی گریس، چوہدری بشیر اور ایک ملازم باغیچے کی طرف موجود تھے۔ وہ ایک پودے کے پاس سر جوڑے بیٹھے تھے اور بڑے انہماک سے کچھ کر رہے تھے۔ شانی کو لگا جیسے وہ کوئی پرندہ مرغی، بطخ وغیرہ ذبح کر رہے ہیں۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ شانی کی آمد سے بالکل باخبر نہیں ہوئے۔ نہ جانے کیوں شانی کو یہ انگریز جوڑا اور اس کی یہاں مصروفیت پُراسرار نظر آتی تھی۔

وہ اندرونی برآمدے میں پہنچی تو سب سے پہلے اسے مُنا ہی نظر آیا۔ وہ دوڑ کر آیا اور شانی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ شانی نے اسے پیار کیا۔ وہ پچھلے سات آٹھ دن میں تین چار بار یہاں آ چکی تھی۔ بشیر سے بھی ملاقات ہوتی رہی تھی۔ مُنے نے شانی کی گود میں سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تاتی! تم کپلوں (کپڑوں) سمیت کیوں نہاتی ہو؟''

''میں نہاتی ہوں؟ تمہیں کس نے کہا؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''میں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے تمہاری تصویل دیکھی ہے۔''

''تصویر دیکھی ہے؟ کہاں؟'' شانی مزید حیران ہوئی۔

''آؤ، میں دکھاؤں۔'' مُنے نے شانی کی انگلی تھامی اور اسے لے کر خراماں خراماں اپنے ابو کے کمرے میں آ گیا۔ چوہدری بشیر کمرے میں نہیں تھا۔ مُنے نے الماری کا ایک پٹ کھولنے کی کوشش کی، لیکن الماری لاک تھی۔ وہ بندر کی سی پھرتی کے ساتھ کھڑکی کی طرف گیا اور اس کی چوکھٹ پر پاؤں دھر کر الماری کے اوپر پہنچ گیا۔ یہاں سے اس نے چابی حاصل کر لی۔ غالباً یہ ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ اس نے جہازی سائز کی الماری کا ایک پٹ کھولا۔ اندر چند پوسٹر سائز کی فوٹوز کو رول کر کے رکھا گیا تھا۔ مُنے نے ان میں سے ایک بڑے رول کو کھولا اور اپنی آنکھیں جھپک جھپک کر شانی کے سامنے پھیلا دیا۔ شانی بھی حیرت سے پلکیں جھپکنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ اسی کی ایک انلارج کی گئی فوٹو گراف تھی لیکن یہ تصویر اس نے نہیں کھنچوائی تھی۔ وہ ایسی تصویر کھچوا ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بڑی بولڈ بلکہ شرم ناک تصویر تھی۔ وہ کپڑوں سمیت سوئمنگ پول سے نکلی تھی اور کپڑے بھی پیاز کے چھلکے جیسے تھے۔ یہ اس کے جسم کو چھپانے کی بجائے دکھا رہے تھے۔ یہ بالکل فلمی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ چند سیکنڈ میں شانی سمجھ گئی کہ اس تصویر کے ساتھ کیا کیا گیا ہے۔ چوہدری بشیر کو فوٹو گرافی کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ وہ کمپیوٹر گرافکس کے ذریعے فوٹو گرافی میں نت نئے تجربے بھی کرتا رہتا تھا۔ اس تصویر پر بھی تجربہ کیا

گیا تھا۔ یہ لاہور کی کوٹھی میں چوہدری کے کیمرے سے کھینچی گئی عام سی تصویر تھی۔ چوہدری نے اپنی ذہنی عیاشی کے لئے اسے کمپیوٹر کی مدد سے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

اسی دوران میں کسی قریبی راہداری سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ چوہدری غالباً اپنے غیر ملکی دوست اسٹیفن کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ شانی نے جلدی سے تصویر کو رول کر کے اس پر ربڑ بینڈ چڑھایا اور الماری میں رکھ کر دروازہ مقفل کر دیا۔ چابی اس الماری کے اوپر ہی پھینک دی۔ یہ مشکل چار پانچ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ دروازہ کھلا اور چوہدری بشیر اندر آ گیا۔ اسٹیفن بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ اسٹیفن کے ہاتھ میں ٹشو پیپر تھا۔ وہ اس پیپر سے اپنے ہاتھوں کو پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ شانی کو صاف اندازہ ہوا کہ اسٹیفن کے ہاتھ پر خون کے دھبے ہیں۔ یقینی بات تھی کہ وہاں باغیچے میں کوئی پرندہ وغیرہ ذبح ہوا ہے۔

شانی اور مُنے کو کمرے میں دیکھ کر چوہدری اور اسٹیفن دونوں ہی ٹھٹکے۔ پھر بشیر نے خود کو تیزی سے سنبھالا اور بولا۔ ''شانی تم یہاں؟''

''میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ مُنا مجھے زبردستی یہاں کھینچ لایا۔''

''وہ میں..... تاتی کو ان کی.....''

''یہ مجھے میری ہیئر پن ڈھونڈ کر دے رہا تھا۔ حالانکہ میری ہیئر پن تو گم نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کس کی ہیئر پن دیکھی ہے اس نے۔'' شانی نے جلدی سے بات بدلی اور اس کے ساتھ ہی مُنے کے بازو پر ہلکی سی چٹکی بھی لی۔ وہ کم سن ہونے کے باوجود شانی کا اشارہ فوراً سمجھ جاتا تھا۔

اسٹیفن نے سر جھکا کر شانی کو سلام کیا۔ شانی نے بھی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ اسٹیفن نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے داغ دار ٹشو کو شانی سے چھپانے کی کوشش۔ پھر بشیر اور شانی کو ایک ساتھ ایکسکیوزمی کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

چوہدری بشیر کی موٹی کھال والی پیشانی پر ناگواری کی ایک موٹی شکن موجود تھی لیکن جلد ہی یہ شکن دور ہو گئی۔ اس نے شانی کو خوش دلی سے ویلکم کہا اور اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ شانی بیٹھی تو مُنا بھی اس کے ساتھ بیٹھا۔ ''اوئے منا! تم تو وم چھلہ بن کے رہ گئے ہو۔ دو منٹ ہمیں اکیلے بھی بیٹھ لینے دیا کرو۔'' چوہدری خلاف معمول بلکہ ہلکے لہجے میں بولا۔

مُنا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر جلدی سے باہر چلا گیا۔ چوہدری نے سگریٹ سلگانے کے لئے اپنا طلائی لائٹر، واسکٹ کی جیب سے نکالا اور بولا۔ ''میں پرسوں بھی تمہارا

www.pdfbooksfree.pk

انتظار کرتا رہا۔ تم آئی ہی نہیں۔''

شانی نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا۔ ''بس، ایک حتمی فیصلے پر پہنچ رہی تھی۔''

''.....تو پھر.....کیا ہوا فیصلہ؟'' چوہدری کے لہجے میں شدید اضطراب پوشیدہ تھا۔

''کوئی نیا فیصلہ نہیں ہے۔ وہی ہے جس پر پچھلی ملاقات میں بھی بات ہوئی تھی۔'' شانی نے بارے ہوئے لہجے میں کہا۔

چوہدری کے تمتمائے چہرے پر روشنی بکھر گئی۔ اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لئے اور مطمئن نظر آنے لگا۔ بولا۔ ''چلو ہم ایک بار پھر ساری تفصیل دہرا لیتے ہیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ سارے پوائنٹ ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہیں گے۔'' شانی خاموش رہی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تو ہمارے درمیان طے ہوا ہے کہ میں کوکی کو آزاد کردوں گا۔ وہ جب بھی مجھ سے طلاق لینا چاہے لے سکتی ہے۔ شادی کے موقع پر میری طرف سے جو بھی چیزیں اس کے پاس گئی ہیں، وہ چاہے تو انہیں اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ ہماری اس علیحدگی کی وجہ سے کوکی کی فیملی پر کسی طرح کا کوئی بوجھ نہیں آئے گا۔ سیف کے بھائی کے علاج.....سیف کے مکان.....اور اس کے سالے کے لئے میں جو کچھ کر چکا ہوں اس کے لئے کسی طرح کا معاوضہ نہیں مانگوں گا اور وہ سب کچھ اب ماضی کا حصہ ہے۔ ٹھیک ہے؟'' جواب میں شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہدری بشیر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس سوچ بچار کے لئے اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے پورے چھ مہینے ہوں گے۔ تاہم یہ تمہارا وعدہ ہے کہ ان چھ ماہ میں کوئی دوسرا شخص، چاہے وہ کوئی بھی ہو، کسی بھی حوالے سے تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا۔ جو کچھ ماضی میں ہوا وہ ہوگیا لیکن اب تم ہر پرانے ناتے سے علیحدہ رہو گی۔'' چوہدری ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ جیسے چاہتا ہو کہ شانی اس موقع پر تائیدی انداز میں سر ہلائے لیکن پھر شاید اسے احساس ہوا کہ اس طرح یا قاعدہ اقرار کروانا زیادتی ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ان چھ مہینوں میں تمہیں مُنے سے ملنے کی آزادی ہوگی۔ اگر تم چاہو تو مہینے میں دو تین دن کے لئے اسے اپنے پاس بھی رکھ سکو گی۔ تم فون پر بھی اس سے بات کر سکو گی۔''

مزید دس پندرہ منٹ تک شانی اور بشیر میں اس حوالے سے بات ہوئی۔ پھر شانی جانے کے لئے اٹھ گئی۔ وہاں سے شانی سیدھی حیات کالونی میں سیف اللہ کے گھر پہنچی۔ کافی دنوں بعد آج اس کے دل میں ایک طرح کی خوشی اور اطمینان کا احساس تھا۔ اس نے کوکی اور راجو

کے حوالے سے کافی معاملات درست کر لئے تھے۔ وہ راجو کو بھی ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی اور دوسری طرف چوہدری بشیر سے بھی کوکی کی آزادی کے لئے بات ہو چکی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو صحن میں سیف اللہ کی موٹر سائیکل نظر نہیں آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے.....شاید اپنے سالے کے پاس ہسپتال گیا ہوا تھا۔

جونہی شانی نے صحن میں قدم رکھا سنبل، ثریا، کوکی سب کی سب اسے امید بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ان نظروں میں امید کے ساتھ ساتھ اَن گنت اندیشے بھی تھے اور خاموش دعائیں تھیں۔ شانی ان سب کو دیکھ کر مسکرائی۔ ان سب کے چہروں پر بھی ہلکی سی روشنی پھیل گئی جیسے سورج کی تابانی سے ستارے چمک اٹھتے ہیں۔

سب سے پہلے کوکی کی والدہ نے ہی زبان کھولی۔ وہ شانی کے قریب آتے ہوئے بولیں۔ ''لگتا ہے کہ میری بچی خیر کی خبر ہی لائی ہے۔''

شانی نے ان کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''خیر کی خبر ہی ہے خالہ۔''

کوکی اور سنبل کی والدہ نے شانی کو گلے سے لگا لیا اور اس کا سر چومتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔ ''ہم ترس گئے ہیں کسی اچھی خبر کو بیٹی.....بالکل ترس گئے ہیں۔''

سنبل اور ثریا کی آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ کوکی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ جیسے سکتے کی حالت میں ہو۔ شانی نے آگے بڑھ کر اس کا نرم و نازک گال چُھوا اور سنبل کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''میری چوہدری بشیر سے بات ہوگئی ہے۔ وہ کوکی سے علیحدہ ہونے کو تیار ہے۔ اس کے علاوہ راجو سے بھی بات ہوئی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے اور اس نے سب کچھ سن لیا ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔''

کوکی کی والدہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر لے لگے۔ انہوں نے شانی کو پھر گلے سے لگا لیا۔ شانی ان سب میں گھر کر بیٹھ گئی اور انہیں سب کچھ تفصیل سے بتانے لگی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد گھر میں مسرت کا سا سماں تھا۔ کوکی تو اندر کمرے میں جا چکی تھی لیکن باقی سب عورتوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ پڑوس سے دو خواتین بھی آ گئی تھیں۔ ان سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ کسی نے چپکے سے ایک لڑکے کو پیسے دیئے اور وہ قریبی دکان سے مٹھائی لے آیا۔ مٹھائی آئی تو کوتاہ قد ڈولا بھی ساتھ ہی آیا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں شانی سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ شانی نے آنکھوں آنکھوں میں بتایا کہ سب اچھا ہے۔ اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما گیا۔

سنبل اور کوکی کی والدہ نے کہا۔ ''ڈولے! وہاں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آجاؤ تم سے کیا

www.pdfbooksfree.pk

پردہ ہے۔"

وہ چھوٹے چھوٹے پاؤں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندر آ گیا۔ کوکی کی والدہ نے اپنی بڑی بیٹی سنبل سے کہا۔ "نی سنبل! ڈولے کا بھی منہ میٹھا کرا۔"

چنچل سنبل نے ڈبے سے برفی کی ایک بڑی ڈلی نکالی اور ڈولے کو تھمانے کی بجائے کہا۔ "ڈولے، منہ کھولو..... شاباش منہ کھولو۔"

ڈولا پہلے تو شرماتا رہا، پھر اس نے اپنا مختصر سا منہ کھولا۔ سنبل نے پوری ڈلی اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ ڈولے کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے منہ چلا کر برفی کو نگلا۔ سنبل نے لہک کر کہا۔ "بس ایک اور....."

ایک اور ڈلی اس نے ڈولے کے منہ میں ٹھونسی۔ ڈولے کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ "یہ تو برفی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے زہر بھی کھلاؤ گی تو میں آنکھیں بند کر کے کھالوں گا۔"

سنبل نے مٹھائی کا ڈبا ڈولے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "اب تم اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاؤ ڈولا بھائی۔"

ڈولے کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ "ڈولا بھائی" کا لفظ جیسے سیدھا اس کے دل پر لگا تھا۔ شانی بخوبی جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ جب شانی تاؤ حشام کی حویلی میں قید تھی، ڈولے نے اسے سنبل کے بارے میں اپنے سارے احساسات بتائے تھے۔ درحقیقت یہ سنبل کی بے لوث محبت ہی تھی جس کی خاطر ڈولا، راجو کو ڈھونڈتا ہوا ملتان سے لاہور اور پھر میانہ گاؤں پہنچا تھا۔ سنبل کے ساتھ کوتاہ قد ڈولے کا "تعلق" بہت انوکھا پن لئے ہوئے تھا۔ وہی انوکھا پن جو "پیار" کا لازمی جزو ہے۔ یہ پیار کا انوکھا پن نہیں تو کیا ہے کہ پیار اکثر وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے ہوتا ہے جیسے نہیں ہونا چاہیے اور جب ہوتا ہے تب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اپنی راہیں خود منتخب کرتا ہے اور ان راہوں پر اپنی من چاہی رفتار سے چلتا ہے۔ سنبل نے ڈولے کو "ڈولا بھائی" کہا تو اس کا چہرہ مٹی کے ٹوٹے ہوئے پیالے جیسا ہو گیا۔ وہ کھسیانے انداز میں ہنسا اور ایک گلاب جامن سنبل کے منہ کی طرف بڑھائی۔ اس کا چھوٹا سا ہاتھ لرز رہا تھا۔ سنبل نے گلاب جامن دانتوں میں دبا لیا۔ پھر مٹھائی کھانے اور کھلانے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس ہنگامے کا فائدہ اٹھا کر ڈولا خاموشی سے باہر نکل گیا۔

سنبل کمرے کا دروازہ زبردستی کھلوا کر کوکی کے پاس چلی گئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ بند دروازے کے عقب میں چھوٹی بہن کو زبردستی مٹھائی کھلا رہی ہے..... گھر میں عجیب سا ماحول تھا۔ اس ماحول میں خوشی اور آنسو باہم ملے ہوئے تھے۔ ایک مسرت سامنے آ رہی تھی لیکن

ایک نہایت شدید صدمہ جھیلنے کے بعد۔

کوکی کی والدہ نے شانی کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ "بیٹی! اب راجو کا کیا حال ہے؟..... ہم..... میرا مطلب ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گا ناں؟"

شانی نے دھیرے سے کہا۔ "خالہ، وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ پچھلے دس پندرہ دن سے بالکل ٹھیک ہے۔ اسے تو ہم نے جان بوجھ کر ہسپتال میں داخل کرایا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ وقت سے پہلے باہر آئے اور اسے باہر کے حالات کا علم ہو۔ وہ کل صبح ہسپتال سے فارغ ہو جائے گا۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو آج جا کر اس کی عیادت کر سکتی ہیں۔"

"میں ضرور جاؤں گی بیٹی بلکہ ہم سب جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔ پھر وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ شانی ان کے بولنے کی منتظر رہی۔ وہ چند سیکنڈ بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔ "شانی بیٹی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ کیا راجو سب کچھ جاننے کے بعد بھی کوکی کو اپنانے کے لئے....."

"ہاں خالہ! ہاں۔ میں نے پورا یقین کرنے کے بعد ہی آپ سے بات کی ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

خالہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہی بہت دکھ دیکھ لیا ہے۔ اب کوئی اور جھٹکا برداشت نہیں ہو گا۔"

"اب کچھ نہیں ہو گا خالہ۔" شانی نے ان کا سر چوما۔

وہ بولیں۔ "مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ چوہدری بشیر اتنی آسانی سے ہماری جان چھوڑ دے گا بلکہ مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور ہم پر کسی طرح کی سختی کرے۔"

"میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو گا اور فرض کریں کچھ ہو تو میں ہوں ناں فیس کرنے کے لئے۔"

خالہ ڈبڈبائی ہوئی تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی حیرت تھی۔ یہ حیرت بجا تھی۔ وہ جانتی نہیں تھیں کہ خوش رنگ چڑیا جیسی کوکی کو عقاب صفت بشیر کی طوفانی گرفت سے نکالنے کے لئے پس پردہ کیا قربانی دی گئی ہے۔

شانی نے اہلِ خانہ سے کل دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور راجو سے ملنے ہسپتال روانہ ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ تاؤ حشام بھی وہیں ہو گا۔ وہ اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرنا

www.pdfbooksfree.pk

چاہتی تھی..... نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ یہ سارا معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے ہونے والا ہے۔ اس حوالے سے بہت سے دکھ جھیلے جا چکے تھے۔ بہت سی سزا مل چکی تھی اور بہت سی تلافی کی جا چکی تھی اور جب دکھ جھیل کر کفارہ ادا کر دیا جاتا ہے تو پھر اکثر بگڑے ہوئے معاملے سدھر جاتے ہیں۔

شانی ہسپتال کے وسیع گیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اُتر رہی تھی کہ عارف سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ شانی کو لگا کہ وہ گیٹ پر کھڑا شاید اسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ پریشان لگتا تھا۔

''یا اللہ خیر!'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس کا دھیان راجو کی طرف گیا۔

وہ تیر کی طرح شانی کی طرف آیا۔ شانی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ عارف نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''شانی بہن! ایک عجیب خبر ہے تمہارے لئے، بلکہ ہم سب کے لئے۔''

''کیا ہوا؟'' شانی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''آؤ۔ کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

دو منٹ بعد وہ ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کینٹین میں بھانت بھانت کی بولیوں کا شور تھا۔ عارف نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''خبر رستم کے بارے میں ہے شانی بہن۔'' شانی کے دل کی دھڑکن انتہا کو چھو گئی۔ نہ جانے کیوں تصور میں ایک جسم آ گیا جو بان کی تنگی چارپائی پر پڑا تھا۔ اس پر خون آلود چادر تنی ہوئی تھی اور آس پاس ہٹے کٹے رائفل بردار پولیس والے کھڑے تھے۔ جیسے وہ شکاری ہوں اور ان کے سامنے ان کی ٹرافی پڑی ہو۔

''کک..... کیا ہوا عارف بھائی؟''

''تمہارے خیال میں رستم کہاں ہے؟''

''پوٹھوہار۔ سون کے آس پاس۔''

''وہ یہاں ہے۔ ملتان میں..... ابھی دو گھنٹے پہلے میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' شانی سکتہ زدہ رہ گئی۔ عارف کہہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''رستم کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ گوہر احمد عرف گوہرا ہے۔ بہت خطرناک بندہ ہے وہ بھی۔''

''کک..... کہیں تمہیں دھوکا تو نہیں ہوا عارف؟''

''دھوکا ہوتا تو اچھا تھا لیکن یہ دھوکا نہیں ہے۔ وہ یہاں ہے اور کسی خطرناک ارادے سے ہے۔'' عارف کی آواز بھی اندیشوں کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔

''اوہ خدایا۔'' شانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ ''وہ..... وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟ کیوں اتنی جلدی خود کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود چل کر موت کے منہ میں آیا ہے۔ کیا اس کی عقل اتنا بھی کام نہیں کر رہی۔''

کچھ دیر تک دونوں بالکل گم صم..... سناٹے کی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ چائے اور پیٹز ان کے سامنے ٹھنڈے ہوتے رہے۔ بالآخر شانی نے یہ تکلیف دہ سکوت توڑا۔ ''عارف! اگر وہ واقعی رستم ہی ہے تو پھر وہ کیوں ہے یہاں؟ تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟''

عارف نے ایک گہری سانس لی۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ شانی کہ وہ رستم ہی ہے۔ اس بات کا پورا یقین کر لو۔ رہی دوسری بات کہ وہ یہاں کیوں ہے اس کے بارے میں مزید سوچا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے بس ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے حسن پارک کے قریب ہوٹل انڈس کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ اس نے چہرہ چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ ایک کار سے اُترا اور بڑی تیزی سے اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے گوہر عرف گوہرا تھا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رستم کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید..... میرا مطلب ہے شاید..... وہ تمہارے پیچھے یہاں پہنچا ہے لیکن پھر بڑی جلدی مجھے یہ خیال رد کرنا پڑا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بات کچھ اور ہے اور اس کے بعد میری پریشانی کچھ بڑھ گئی ہے۔ ہوٹل انڈس سے تھوڑی ہی دور ایک سڑک چھوڑ کر پیر قدرت اللہ کا مقامی ٹھکانہ ہے۔ یہ ایک بڑی کوٹھی ہے جس پر جھنڈے وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔ قدرت اللہ کو ماننے والے ایسے ٹھکانوں کو آستانہ یا استانہ کہتے ہیں۔ میں جس آستانے کی بات کر رہا ہوں، وہاں پچھلے دو دن سے بڑی رونق ہے۔ پیر قدرت اللہ تین روزہ دورے پر خود یہاں آیا ہوا ہے۔ کل اسے بہاولپور چلے جانا ہے۔ میں ابھی خود دیکھ کر آیا ہوں۔ آستانے کے باہر بہت لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ موٹر سائیکلوں کی دو قطاریں بھی نظر آ رہی ہیں۔ سیکورٹی گارڈ پہرہ دے رہے ہیں۔ مجھے یہ لگ رہا ہے کہ رستم یہاں قدرت اللہ کے لئے آیا ہے۔ وہ ضرور اس کے ساتھ کچھ کر گزرے گا۔''

شانی کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ایک خوف ناک ہنگامے کا تصور اس کے ذہن پر آ گیا۔ ایک ایسا ہنگامہ جس کا اختتام رستم کی موت پر ہو سکتا تھا۔ ''اوہ خدایا! یہ شخص کیا کر رہا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ پھر اس نے عارف کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ رستم، قدرت اللہ کو قتل.....''

''ہاں، میرے ذہن میں تو یہی بات ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''وہ کیوں سوچ رہا ہے ایسا۔ قدرت اللہ کو مارنے سے کیا ہوگا۔ کیا وہ برائی ختم ہو جائے گی جو اس بندے نے پھیلائی ہے؟ یہ تو اور پھیلے گی۔ اس کی جڑیں اور پکی ہوں گی۔ قدرت اللہ سے لڑنے کا طریقہ یہ نہیں ہے۔'' شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔

عارف خاموش بیٹھا تھا۔ ہسپتال کے کسی گوشے سے نوحوں کی دردناک آواز اچانک بلند ہوئی اور فضا کو سوگوار کر گئی۔ راہِ اجل کا کوئی مسافر رستے کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد منزل پر پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک ایمبولینس کسی نئے مسافر کو لے کر شور مچاتی ہسپتال کے احاطے میں آئی اور ایمرجنسی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ آمد و رفت کے ایسے مناظر ہسپتالوں کا معمول ہوتے ہیں۔ کینٹین کا بیرا آیا اور شور مچاتا شانی اور عارف کے سامنے سے گزر گیا۔ وہ دونوں جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھے۔ شانی نے کہا۔ ''عارف! اگر تمہارا اندازہ درست ہے اور رستم قدرت اللہ کے لئے ہی یہاں موجود ہے تو پھر..... یہ بہت خطرناک ہے۔ کیا ہم کسی طرح اسے اس کام سے روک سکتے ہیں؟''

عارف نے رسان سے کہا۔ ''مجھے کسی اور کا تو پتا نہیں لیکن اگر تم کوشش کرو شانی بہن تو شاید اسے روک لو لیکن.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''بات پوری کرو عارف۔'' شانی بے چینی سے بولی۔

''لیکن اگر تمہیں یہ کام کرنا ہے تو پھر بہت جلدی کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہاں جو کچھ بھی ہونا ہے، اگلے تین چار گھنٹے کے اندر ہو جانا ہے۔'' عارف کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

شانی نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ شام اب رات کا لبادہ اوڑھ چکی تھی۔ اسے تاریکی میں جان لیوا اندیشوں کی پھنکار سنائی دی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اور عارف کمبوہ ہوٹل انڈس کے سامنے ایک ٹیکسی سے اُتر رہے تھے۔ شانی نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ یہ وہ چادر نہیں تھی جس میں اس سے پہلے ملتان میں گھومتی پھرتی رہی تھی۔ یہ کریم کلر کی پلین چادر تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر شانی نے ایک سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کی موجودہ سرگرمی کسی کی نگاہ میں بھی آئے۔ راستے میں بھی شانی اور عارف اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ بہرحال اس قسم کے کوئی شواہد نہیں ملے تھے۔ ہوٹل انڈس کے سامنے پہنچ کر پہلے وہ دونوں گارمنٹس کی ایک دکان میں چلے گئے۔ یہاں سے شانی نے مُنے کے لئے ایک نیکر، شرٹ خریدی اور جرابوں کے دو جوڑے لئے۔ اس دوران میں عارف اردگرد کے ماحول کا

جائزہ لیتا رہا۔ دکان سے نکل کر وہ دونوں سیدھے انڈس ہوٹل پہنچے۔ یہ تو بعید از قیاس تھا کہ رستم اور گوہر انے یہاں اپنے اصل نام درج کروائے ہوں گے۔

شانی ایک طرف لابی میں کھڑی ہوگئی۔ عارف نے استقبالیہ پر جا کر معلومات حاصل کیں۔ پروگرام کے مطابق وہ رستم کا حلیہ اور لباس وغیرہ بتا کر کمرہ نمبر جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں موجود شخص نے قدرے سرد مہری سے جواب دیا۔ وہ نام جاننا چاہ رہا تھا۔ عارف ناکام ہو کر واپس آ گیا۔ اسی دوران میں ایک طرف سے ایک ویٹر برآمد ہوا۔ وہ عارف سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہیں آپ باجوہ صاحب کا تو نہیں پوچھ رہے جن کی داڑھی چھوٹی اور بال لیے تھے۔ ان کے ساتھ گرے سوٹ کالی چادر اور پشاوری چپل والے ایک ملک صاحب تھے۔ ان کی ایک آنکھ پر چوٹ کا پرانا نشان ہے۔''

''ہاں بالکل وہی۔'' عارف نے تیزی سے کہا۔

''وہ کمرہ نمبر 104 میں تھے، دوسرے فلور پر۔''

''کیا مطلب وہ جا چکے ہیں؟''

''جی ہاں۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے چیک آؤٹ ہوئے ہیں۔ انہیں میں ہی سروس دے رہا تھا۔'' شانی کے جسم میں تشویش کی نئی لہر ابھری۔

عارف نے ویٹر سے پوچھا۔ ''کیا وہ کسی سواری پر گئے ہیں؟''

''پتا نہیں جی۔ یہاں سے تو پیدل ہی نکل گئے تھے۔ کوئی خاص سامان وغیرہ تو ان کے پاس تھا نہیں۔''

شانی جانتی تھی کہ یہ ویٹر وغیرہ بڑے باخبر لوگ ہوتے ہیں۔ ہوٹل کے مہمانوں کے حوالے سے ان کی حسیات بہت تیز ہوتی ہیں۔ اس نے ویٹر سے پوچھا۔ ''تھوڑا بہت اندازہ ہے تمہیں کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ملتان سے باہر گئے ہیں یا نہیں؟''

ویٹر نے بتیسی نکالی۔ ''میں کچھ کہہ نہیں سکتا جی۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''وہ دو دن یہاں رہے ہیں۔ بس ایک دفعہ کمرے سے باہر نکلے ہیں۔ کھانا بھی کمرے میں ہی منگواتے تھے۔ میں نے انہیں کسی سے ملتے بھی نہیں دیکھا۔ بس کل ایک لمبے قد کے شلوار قمیص والے صاحب ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ مجھے شکل سے پولیس والے لگتے تھے۔ پر ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ ویسے باجوہ صاحب بندے بڑے اچھے تھے۔ بڑے کھلے دل کے جی۔'' باتونی ویٹر بولتا جا رہا تھا۔

شانی سمجھ گئی کہ رستم حسبِ عادت اس ویٹر کو ہزار دو ہزار کی ٹپ دے گیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے سوالیہ نظروں سے عارف کو دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں بات کی اور ویٹر سے رخصت ہوکر باہر نکل آئے۔ اب رات کے دس بجنے والے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ عارف حسب معمول شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول لگا ہوا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف ہتھیار لگاتے ہی نہیں، اسے استعمال کرنے کے لئے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

باہر آنے کے بعد عاف نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''ویٹر کہتا ہے کہ وہ پیدل نکلے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ استانے پہنچ گئے ہیں۔''

''وہ یہاں سے چیک آؤٹ بھی کر گئے ہیں۔ یہ بھی خطرے کی طرف اشارہ ہے۔'' شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''پھر کیا کرنا ہے؟'' عارف نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے وہیں چلتے ہیں۔ قدرت اللہ کے اڈے کی طرف۔'' شانی نے جیسے وجدانی لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم ایک شارٹ کٹ لگا سکتے ہیں۔'' عارف نے سڑک کے پار ایک بیس تیس فٹ چوڑی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ان دونوں نے سڑک پار کی اور نیم روشن گلی میں آ گئے۔ ان کے قدموں میں تیزی تھی۔ شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا وہ اس ''ہونے'' کو روک سکے گی، کیا رستم کے ساتھ اس کا آمنا سامنا ہوگا، کیا رستم اس کی بات مانے گا؟ ایسے اَن گنت سوال شانی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے اور اس کی دھڑکنوں میں تیزی لا رہے تھے۔ چند گھنٹے پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رستم سے اتنی جلدی دوبارہ ملاقات ہو جائے گی۔ وہ تو سرے سے ملاقات کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ کسی کسی وقت اس کے سینے سے ایک گہری ہوک اٹھتی تھی اور وہ سوچتی تھی شاید وہ اور رستم آخری ملاقات کر چکے ہیں لیکن آج رات کے بطن میں ایک عجیب ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ اس ہلچل کے سبب حالات نے ایک تیز رفتار پلٹا کھایا تھا۔

وہ ابھی استانے سے دور ہی تھے کہ انہیں ایک اونچے جھنڈے پر لگا ہوا بلب نظر آنے لگا۔ اس بلند تر جھنڈے کے ارد گرد مختلف رنگوں اور سائزوں کے کئی اور جھنڈے بھی لہرا رہے تھے۔ وہ ابھی استانے سے سو ڈیڑھ سو گز کی دوری پر تھے کہ عارف رک گیا۔ شانی نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ بولا۔ ''اگر ہم نے استانے کے اندر جانا ہے تو پھر..... ہماری تلاشی

www.pdfbooksfree.pk

ہوگی۔ اپنا پسٹل مجھے یہیں کہیں چھوڑنا ہوگا۔''

شانی نے ایک چھوٹی سی فروٹ شاپ کی طرف اشارہ کیا۔ شاپ بند تھی۔ دکان دار نے اپنی چھابڑیوں کے ارد گرد سرکنڈوں کی چق تان دی تھی۔

عارف بھی غالباً اسی دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا وزنی پسٹل نکالا اور اسے چق کے نیچے ''سلپ'' کر دیا۔ گلی کے اس حصے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو بھی یہ کام اس تیزی سے ہوا تھا کہ کسی کی نظر میں نہ آتا۔ وہ دونوں ایک بار پھر استانے کی طرف چل دیئے۔ رہائشی علاقے میں یہ کوٹھی قریباً دو کینال رقبے پر تھی۔ اس پر پورے کا پورا سبز رنگ کیا گیا تھا۔ دیواروں پر حضرت صاحب کے ''زریں اقوال'' جلی حروف میں لکھے تھے۔ ایک دو جگہ پنجابی کے شعر اور عربی عبارات بھی تھیں۔

کوٹھی کے باہر پندرہ بیس کاریں کھڑی تھیں۔ موٹر سائیکل، سکوٹر وغیرہ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دو چار تانگے اور ایک دو ٹیکسیاں سواریوں کے انتظار میں نظر آتی تھیں۔ کچھ لوگ ایک ریڑھی کے گرد جمع تھے۔ یہاں عالی دماغ حضرت صاحب اور ان کے خاص مریدوں کے تصنیف شدہ کتابچے رکھے گئے تھے۔ شانی اور عارف سیدھے گیٹ کی طرف بڑھے۔ یہاں دو باوردی گارڈز تھے۔ اس کے علاوہ دو پہرے دار بھی نظر آ رہے تھے۔ شانی کو دیکھ کر ایک پہرے دار آگے آیا۔

''ہاں بی بی! کیا بات ہے؟'' اس نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں اندر جانا ہے۔'' شانی نے کہا۔

''اب وقت ختم ہو گیا ہے۔ آپ کل آؤ۔''

''لیکن کل تو حضرت جی نہیں ہوں گے۔''

''چھوٹے حضرت جی تو ہوں گے۔''

''لیکن ہمیں بڑے حضرت صاحب سے ملنا ہے۔ میں اور میرا بھائی بڑی دور سے آئے ہیں۔ آج دوپہر کے ساہیوال سے چلے ہوئے ہیں۔ بھاگم بھاگ پہنچے ہیں۔''

''اب میں کیا کر سکتا ہوں بی بی؟''

عارف نے لجاجت سے کہا۔ ''ابھی دو منٹ پہلے ایک عورت کو آپ نے بھیجا تو ہے اندر۔''

''وہ حضرت صاحب کی جاننے والی تھی۔''

''ہمیں بھی جاننے والا سمجھ لو جی۔'' عارف نے سوکا سرخ نوٹ جیب سے نکالتے

ہوئے کہا۔

پہرے دار کا تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد اس نے نوٹ مٹھی میں دبایا اور کسی خورشید نامی عورت کو آواز دی۔ وہ بکری کی طرح منہ چلاتی اور کچھ کھاتی ہوئی آئی۔ اس نے شانی کی جامہ تلاشی لی۔ دوسری طرف پہرے دار عارف کے جسم پر ہاتھ پھیر کر تسلی کر چکا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ گیٹ کے اندر تھے۔

☆======☆======☆

بدنما چہرے والے سراج کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے قریباً آٹھ گھنٹے بعد رستم اور گوہرا گوجرانوالہ جا پہنچے تھے۔ یہاں سے لاہور تک کا سفر انہوں نے ایک لوکل بس میں کیا تھا۔ لاہور پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بااعتماد مخبر نظام کی زبانی رستم اور گوہرا کو معلوم ہو گیا تھا کہ قدرت اللہ عرف حضرت جی لاہور میں موجود نہیں ہے۔ وہ صرف ایک دن پہلے ملتان چلا گیا تھا۔ وہاں اسے اپنے مقامی استانے پر تین دن قیام کرنا تھا۔ اس کے بعد کے پروگرام کا پتا نہیں تھا۔ رستم کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ لاہور میں رک کر قدرت اللہ کی واپسی کا انتظار کرتا۔ اس کے گرد موت کے متحرک سائے تھے اور کسی بھی وقت ''قضا'' سے اس کا آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ گوجرانوالہ سے اس نے اپنے اور گوہرا کے لئے نئے کپڑوں کا انتظام کیا اور آگے چل پڑا تھا۔

وہ بذریعہ ٹرین لاہور سے ملتان پہنچا تھا۔ یہاں وہ حضرت کے استانے کے قریب ہی انڈس نامی ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔ یہاں پر اپنے ایک مقامی دوست جہانگیر حسین کی مدد سے رستم نے حضرت کے استانے اور استانے میں حضرت کی موجودگی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں اور آج وہ استانے پر اپنے ایکشن کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا اور وہ حضرت اور اس کے پیروکاروں کو یادگار سبق سکھانے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ جہانگیر سے مشورے کے بعد رستم نے اپنا پروگرام دوپہر کے وقت ہی تیار کر لیا تھا۔ گوہرا بھی اس مشورے میں بڑے جذبے اور امنگ کے ساتھ شریک رہا تھا۔

رات نو بجے کے قریب رستم اور گوہرا اپنی خونی کارروائی کے لئے حرکت میں آ گئے تھے۔ رستم نے اپنے کولٹ پسٹل پر قریباً آٹھ انچ لمبا جدید سائلنسر چڑھا لیا تھا۔ تین بھرے ہوئے میگزین اس کی جیکٹ کی جیبوں میں تھے، اس کے علاوہ گولیوں والی بیلٹ اور ایک فٹ لمبے پھل والا خوفناک چھرا تھا۔ گوہرا کے پاس موت کے قہقہے برسانے والی ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ رائفل کو اچھی طرح صاف اور چیک کرنے کے بعد اس نے اپنی سیاہ چادر کی بکل

میں یوں چھپا لیا کہ وہ اس کے جسم کا حصہ ہی بن گئی۔ پچھلے دنوں میں رمضان نامی ویٹر نے ان کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ جس طرح شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں، اسی طرح آوازوں سے آوازیں بھی مشابہ ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیوں رمضان جب بولتا تھا تو رستم کو اپنے مرحوم دوست آفندی کا لب ولہجہ یاد آ جاتا تھا۔ آفندی کے لہجے کی ایک جھلک سی رمضان کی آواز میں پائی جاتی تھی۔ (اور آفندی کو رستم کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی موت رستم کے سینے کا ایک رستا ہوا زخم تھی۔ اسے تاؤ حشام نے چھت سے لٹکا کر مارا تھا۔ اس جرم کے بدلے رستم تاؤ حشام کو دس بار بھی موت کے گھاٹ اُتارتا تو یہ کم تھا اور وہ ایسا کرنے کے لئے آزاد بھی تھا لیکن اپنی بی بی کے حکم کے سامنے اسے سر جھکانا پڑا تھا۔ سارے پنجاب کی پولیس مل کر بھی شاید جس شخص کو رستم کے قہر سے نہ بچا سکتی تھی اسے کسی کے ابرو کے ایک اشارے نے زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا۔ ہاں رستم سمجھتا تھا کہ یہ ایک بڑی قربانی ہے جو اس نے بی بی کے حکم پر دی ہے۔)

وقتِ رخصت نہ جانے رستم کے دل میں کیا آئی کہ اس نے آفندی کے ''آہنگ'' والے ویٹر کو پورے پانچ ہزار روپے ٹپ میں دے ڈالے۔ اپنا کچھ غیر ضروری سامان بھی وہ ویٹر کے لئے چھوڑ گئے۔

نو بجے کے لگ بھگ وہ ہوٹل سے نکلے اور پیدل ہی استانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ [illegible] کے سینے میں عجیب سا شور تھا۔ دل کی دھڑکن جنگ کے نقارے کی طرح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بی بی کی زیادہ تر مشکلات کا ذمے دار یہی بہروپیا قدرت اللہ ہے۔ قدرت اللہ اور اس کی تینوں بیبیاں دل وجان سے شانی کی دشمن تھیں۔ لاہور والی کوٹھی میں شانی کے ساتھ قدرت اللہ کی بیبیوں کی باقاعدہ لڑائی ہو چکی تھی۔ اس لڑائی میں قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس لڑائی کے بعد سے قدرت اللہ اور اس کی بیویوں نے شانی سے دشمنی چکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ انہوں نے شانی بی بی کے خلاف ایک منظم پروپیگنڈا مہم چلائی ہوئی تھی اور بی بی پر سنگین الزامات لگا رہے تھے۔

تین پولیس اہلکاروں کے بالکل پاس سے گزرتے ہوئے وہ دونوں قدرت اللہ کے استانے کے سامنے پہنچ گئے۔ (پولیس اور رستم کا بیر بڑا پرانا تھا لیکن رستم جانتا تھا کہ دو دن پہلے اس بیر کو ''چار چاند'' لگ گئے ہیں۔ اس نے ریاض ہنٹر جیسے موذی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے سینے پر لات مار کر اسے زمین چٹوائی تھی) یہاں گاڑیوں کی طویل قطار تھی اور پہرے دار دکھائی دے رہے تھے۔ رستم نے کچھ ضعیف العقیدہ عورتوں کو دیکھا۔ انہیں غالباً عمامت کے

www.pdfbooksfree.pk

اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ وہ عمارت کی بیرونی دیواروں کو ہاتھ لگا رہی تھیں اور چوم رہی تھیں۔ ایک دیہاتی شخص اپنے بیمار بچے کو دیوار کے ساتھ لگائے کھڑا تھا۔ دو افراد اندر جانے کے لئے پہرے دار کی منت سماجت کر رہے تھے۔ رستم اور گوہرا کلاواکاٹ کر عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ چند گھنٹے پہلے بھی یہاں کا سروے کر چکے تھے۔ یہ ایک تیس فٹ چوڑی سڑک تھی۔ استانے کی دیوار بارہ فٹ سے کم اونچی نہیں تھی۔ دیوار پر خاردار باڑ کی دو لائنیں موجود تھیں۔ یہاں ایک ٹرانسفارمر کے پاس واپڈا کا خراب ٹرک کھڑا تھا۔ اس کے چاروں ٹائر فلیٹ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے یہاں موجود ہے۔ رستم اور گوہرا اردگرد کا جائزہ لیتے رہے پھر رستم ٹرک میں داخل ہوا۔ ٹرک کے اندر بہت سا زنگ آلود کاٹھ کباڑ موجود تھا۔ رستم اس کاٹھ کباڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے جیب سے تار کاٹنے والا پلاس نکالا اور دیوار پر لگے تار کاٹ کر اندر جانے کے لئے جگہ بنالی۔ اس دوران میں گوہرا قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ عمارت کے اندر سے مرد و زن کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی وقت کوئی عورت بڑے دردناک انداز میں چیخی تھی۔ وہ کسی بند کمرے میں تھی اس لئے بہت مدھم آواز ہی رستم کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد رستم اور گوہرا دونوں دیوار پھاند کر عمارت کے اندر پہنچ چکے تھے۔

دیوار کے ساتھ ساتھ کیلے اور امرود وغیرہ کے درخت تھے۔ زمین کچی تھی۔ جونہی گوہرا نیچے کودا، کوریڈور کی طرف کھڑے ایک پہرے دار کو شک ہو گیا۔ وہ متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا بیرونی دیوار کی طرف آیا۔ ''کون ہے بھئی؟'' اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی بدبختی اسے کس شخص کی طرف لے جا رہی ہے۔ رستم سفیدے کے ایک تناور درخت کے پیچھے موجود تھا۔ رستم سے چند فٹ کی دوری پر وہ شخص رک گیا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ واپس چلا جائے گا، لیکن تب ایک بار پھر اس کی بدقسمتی نے زور مارا اور وہ مزید تسلی کے لئے چار پانچ قدم آگے آیا۔ اس کی نظر رستم پر پڑی، اس سے پہلے کہ وہ چلانے کے لئے منہ کھولتا یا کندھے سے لٹکی گن کو حرکت میں لاتا رستم چیل کی طرح اس پر جھپٹا۔ اس کی گردن رستم کے بازو میں جکڑی گئی۔ رستم کے ہاتھ میں دبا ہوا ایک فٹ لمبا چھرا سیدھا پہرے دار کے پہلو میں گیا۔ گردن پر دباؤ کے سبب اس کے ہونٹوں سے کراہ تک نہیں نکل سکی۔ رستم نے وحشت کے عالم میں دو مرتبہ اس کا سر پوری شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ وہ مُردہ چھپکلی کی طرح رستم کی بانہوں میں جھول گیا۔ رستم نے ہولے سے اسے کچی زمین پر ڈال دیا۔

وہ دونوں چند لمحوں تک وہیں رہے اور اردگرد کی سن گن لینے کی کوشش کرتے رہے۔ اندر سے بار بار کسی بکری کے ممیانے کی تیز آواز آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے بگاہے کسی عورت کے رونے کی صدا بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز بے پناہ غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''یہ کیا تماشا ہے لالے دی جان؟'' گوہرا نے سرگوشی کی۔

''پتا چل جاتا ہے تھوڑی دیر میں۔'' رستم کا لہجہ سفاک تھا۔

''لالے دی جان! حضرت جی کے پیٹ میں یہ چھرا مجھے گھونپنے دینا، میری ایک بڑی پرانی آرزو پوری ہو جائے گی۔'' گوہرا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''چلو تم گھونپ دینا، لیکن پہلے وہ کنجر کابلی نظر تو آئے۔'' رستم نے جوابی سرگوشی کی۔

''لیکن چھرا مجھے دے دو ناں۔ عین ٹائم پر کیسے دو گے؟''

''چلو ٹھیک ہے لیکن ٹرپل ٹو مجھے دے دو۔'' رستم نے سرگوشی کی۔

گوہرا نے ٹرپل ٹو رستم کی طرف بڑھا دی۔ رستم نے چھرا اسے دے دیا جو اس نے کرتے کے نیچے لگا لیا۔ رستم نے رائفل کو بالکل تیار حالت میں کر کے اپنی چادر کے نیچے چھپا لیا۔ رائفل کے دو بھرے ہوئے فالتو میگزین اس نے واسکٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔ وہ دونوں دھیمے قدموں سے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ان کے خیال میں یہ فیصلہ کن وقت تھا۔ اب کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ پہرے داروں کے پاس سے گزرے اور حیران کن طور پر سلامتی سے اندر پہنچ گئے۔ کسی نے انہیں روکا ٹوکا نہیں اور نہ ہی شناخت کیا۔ یہاں ایک ہال نما کمرے میں دو ڈھائی درجن افراد فرش پر بچھے قالینوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں عام لوگوں کے علاوہ اچھے خاصے کھاتے پیتے خوش پوش لوگ بھی شامل تھے۔ غالباً وہ سب کے سب ''حضرت صاحب'' کے نیاز حاصل کرنے کے لئے اپنی باری کے منتظر تھے۔ کچھ افراد کی گود میں بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہال کو پردوں کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دوسرے حصے میں خواتین تھیں۔ سب لوگ دم سادھے بیٹھے تھے، بس کبھی کبھی کسی بچے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

دربار کے ایک بہت بڑے پالش شدہ دروازے کے سامنے ایک ہٹا کٹا محافظ کھڑا تھا۔ رستم اور گوہرا اگلی قطار میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ دروازے کے سامنے کھڑا باریش محافظ ایک ہاتھ نے دانوں کی تسبیح کو مسلسل انگلیوں سے گردش دے رہا تھا، تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عادتاً ایسا کر رہا ہے، پڑھ پڑھا کچھ نہیں رہا۔ عورتوں والے پورشن کی طرف سے گاہے بگاہے کسی عورت کے رونے کی بلند آواز سنائی دیتی تھی۔ یہی آواز رستم اور گوہرا نے باؤنڈری وال کے

www.pdfbooksfree.pk

پاس سے سنی تھی۔

ابھی رستم اور گوہرا کو بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ پالش شدہ دروازے کے پٹ ذرا سے وا ہوئے اور ایک دربان نما شخص نے کسی کا نام لے کر آواز دی۔ رستم اور گوہرا کے قریب سے تین چار افراد اٹھے اور بے تابی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ رستم کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ ان افراد کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ رستم کے اٹھتے ہی گوہرا بھی اٹھ گیا۔ پکارے جانے والے افراد دروازے میں داخل ہوئے تو رستم اور گوہرا بھی داخل ہو گئے۔ رستم کو دربان نے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ تیزی سے اندر چلا گیا تاہم سب سے آخر میں آنے والے گوہرا کو دربان نے روک لیا۔ ''نہیں بھئی نہیں۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''اب پورا پنڈ ہی اندر نہ گھس آؤ۔''

گوہرا نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔

ایک قالین پوش لابی سے گزر کر وہ ایک شاندار محرابی دروازے کے پاس پہنچے۔ یہاں ہر طرف ایک عجیب خوشبو پھیلی تھی۔ حواس کو مختل اور دھڑکنوں کو زیر و زبر کرتی ہوئی انوکھی مہک۔ رستم کے ساتھ اندر آنے والوں میں ایک بوڑھا شخص بھی تھا۔ وہ کسی گاؤں کا کھاتا پیتا زمیندار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان بھی تھے۔ انہوں نے کلف لگے کپڑے اور طلائی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھے کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی پریشان اور حواس باختہ نظر آتے تھے۔

رستم ان تینوں افراد کے ساتھ ہی اگلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر سنسنی خیز تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض چوکور کمرہ تھا۔ رستم کو ایک جواں سال لڑکی بستر پر سیدھی لیٹی نظر آئی۔ اس کا خوب صورت چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ گہری بے ہوشی میں نظر آتی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور دھیرے دھیرے موت کی طرف کھسکتی ہوئی۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بید کی چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر دو سوگوار عورتیں بیٹھی تھیں۔

تب رستم کی نظر بہروپئے حضرت قدرت اللہ پر پڑی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ داڑھی مونچھ حسب معمول یکسر صاف تھی۔ وہ بے ہوش لڑکی کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور ہونٹ بدبدانے والے انداز میں ہل رہے تھے۔ وہ کسی عمل میں مصروف تھا۔ قدرت اللہ کے عقب میں اس کی دو عدد بیویاں موجود تھیں۔ ان کے چہرے نقاب میں تھے۔ صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ انہوں نے ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھا رکھے تھے۔ چھوٹی بیوی

قدرت اللہ کے پہلو سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیالہ نما برتن تھا۔ برتن میں کوئی محلول تھا جس میں قدرت اللہ گاہے بگاہے انگلیاں ڈبوتا تھا اور بے ہوش لڑکی کے چہرے پر چھینٹا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دربان نے سوگوار عورتوں کو اشارہ کیا کہ وہ اٹھ کر باہر چلی جائیں۔ عورتیں سسکیاں لیتی اور اپنی مریضہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی باہر چلی گئیں۔ دربان نے اندر آنے والے افراد کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رستم بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں کمرے کا دروازہ ہولے سے کھلا اور ایک مینڈی (چھوٹے سائز کی) بکری ممیاتی ہوئی اندر آ گئی۔ بکری کا سفید نر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ان دونوں کی رسیاں ایک پہرے دار نے تھام رکھی تھیں۔ جانوروں کے اندر داخل ہوتے ہی قدرت اللہ کی نقاب پوش بیویاں ایک عقبی دروازے سے باہر چلی گئیں۔ وسیع و عریض کمرے کے ایک گوشے میں قالین پر پولی تھین کی ایک بڑی شیٹ بچھی تھی۔ اس کی پیمائش تقریباً بارہ ضرب بارہ فٹ تھی۔ اس پر کچھ پنجرے رکھے تھے اور پنجروں کے اردگرد خون بکھرا ہوا تھا۔ کئی پرندوں کے کٹے ہوئے سروں کو ایک ہار کی شکل میں پرویا گیا تھا۔ یہ ہار ایک دیوار کے ساتھ جھول رہا تھا۔ درست پتا چلانا مشکل تھا تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ اس بڑے سائز کے ہار میں تین درجن پرندوں کے سر پروئے گئے ہیں۔ ان میں کبوتر، طوطے اور اُلو وغیرہ کے سر پہچانے جا رہے تھے۔ پھر رستم کی نگاہ اس سے بھی زیادہ کریہہ منظر پر پڑی۔ ایک اور ہار بھی پولی تھین کی خون آلود شیٹ پر پڑا تھا۔ یہ پہلے ہار سے بڑا تھا اور اس میں پرندوں کے سر نہیں تھے۔ اس میں چند بلیوں، دو تین کتوں اور ایک چھوٹی بکری کا سر تھا۔

اب دو مزید جانور یہاں لائے گئے تھے۔ یقیناً ان بے زبان جانوروں کو بھی کسی کریہہ عمل سے گزارا جانے والا تھا۔ رستم نے قدرت اللہ کے خونی عملیات کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا لیکن دیکھنے کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔

کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ اس سناٹے کو بس نر اور مادہ کی ممیاتی ہوئی آوازیں توڑ رہی تھیں۔ نر اور مادہ کو پولی تھین شیٹ پر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ آگے پیچھے چکرانے لگے۔ نر مستی میں دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے اس کیفیت میں لانے کے لئے کوئی خاص طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ رستم نے سن رکھا تھا کہ قدرت اللہ جو عملیات کرتا ہے ان میں انسانی اور حیوانی خون کو سب سے اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بعض اوقات کسی پرندے یا چوپائے کو اپنی مادہ سے اولین ملاپ کی حالت میں ہلاک کیا جاتا ہے اور اس کا خون سفلی عمل میں استعمال ہوتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔آج بھی کچھ ایسا ہی نظارہ رستم کے سامنے تھا۔

قدرت اللہ کے مریدوں میں سے ایک ہٹے کٹے مرید کے ہاتھ میں سٹیل کی ایک نہایت نوکیلی اور چمک دار سلاخ نظر آرہی تھی۔اس کے چہرے پر سختی تھی۔نر اور مادہ کے درمیان ایک دو منٹ آنکھ مچولی ہوئی پھر جونہی انہوں نے ''قانونِ فطرت'' کا مظاہرہ شروع کیا، جیسے بجلی چمکتی ہے، مشاق مرید نے آہنی سلاخ کا بھرپور وار بکرے کے بائیں پہلو پر کیا۔کچ کی آواز سے نیزہ نما سلاخ ایک فٹ تک بدنصیب جانور کے سینے میں گھس گئی۔وہ کرب سے چیخا اور مادہ کے اوپر سے الٹ کر فرش پر گرا۔دو مریدوں نے اس کے تڑپتے پھڑکتے جسم کو دبوچا اور تیسرے نے زور لگا کر سلاخ واپس کھینچ لی۔دل کے مقام پر آنے والے گہرے گھاؤ سے خون فوارے کی طرح چھوٹنے لگا۔سلاخ بردار مرید نے سلاخ ایک طرف پھینکی اور چینی کے ایک مرتبان نما برتن میں خون جمع کرنے لگا۔

مادہ ایک طرف لاتعلقی سے کھڑی چلا رہی تھی۔اسے ادراک نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے وصل کے لئے تڑپنے والا ''جوانِ رعنا'' اب اپنے ہی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔یہ ''شادی مرگ'' کا کھیل بہ مشکل پانچ منٹ جاری رہا۔مرتبان میں خون بھر لیا گیا اور زندہ و مُردہ جانور باہر نکال دیئے گئے۔اِدھر اُدھر بکھرنے والا خون ایک بڑے کپڑے سے صاف کیا گیا۔

اس کے بعد ایک مرید چینی کا منقش پیالہ لئے ان افراد کی طرف بڑھا جو رستم کے ساتھ اندر آئے تھے۔چینی کا پیالہ یکسر خالی تھا اور مرید کے دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نشتر نظر آرہا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ سفلی عمل کے لئے ابھی مزید خون اکٹھا کیا جائے گا اور یہ خون حیوانی نہیں انسانی ہوگا۔

مرید نے بوڑھے شخص کے پاس پہنچ کر اسے بائیں بازو سے آستین اوپر اٹھانے کو کہا۔پھر بولا۔''مریضہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے بابا جی؟''

''یہ میری نوں (بہو) ہے۔''بوڑھے نے جوابی سرگوشی کی۔

ہٹے کٹے مرید نے بوڑھے کی کہنی سے ذرا نیچے جگہ منتخب جگہ پر نشتر سے چرکہ لگایا۔وہاں سے خون بہنے لگا اور پیالے میں گرنے لگا۔آٹھ دس ''سی سی'' خون لینے کے بعد دوسرے مرید نے بوڑھے کے زخم پر اسپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی کا ٹکڑا رکھ دیا۔

تب چینی کا منقش پیالہ نوجوان کے پاس پہنچا۔''مریضہ سے تمہارا رشتہ؟''

''یہ میری بیوی ہے۔''نوجوان نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''بازو سے قمیص اوپر اٹھاؤ۔''ہٹے کٹے مرید نے مشینی انداز میں ہدایت جاری کی۔

نوجوان نے آستین اوپر اٹھا دی۔اس کا بایاں بازو کہنی سے نیچے کلائی تک جلا ہوا تھا۔زخم چند دن پرانے تھے اور ابھی بھرے نہیں تھے۔نشتر چلانے والا ہٹا کٹا مرید سوالیہ نظروں سے ''حضرت جی'' کی طرف دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس زخمی بازو سے خون نکالا جائے یا نہیں۔حضرت جی کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آئے۔اس نے پہلی بار اپنی سرخی مائل آنکھیں اٹھائیں اور نوجوان سے پوچھا۔''کیا نام ہے تمہارا؟''

''امیر اکبر جی۔''

''یہ بازو پر کیا ہوا ہے؟''

''جس ایکسیڈنٹ میں فوزیہ کو چوٹ لگی، اسی میں میرا بازو بھی جلا تھا۔ہم خانیوال سے ملتان آرہے تھے جی۔ساہیوال کے قریب ہماری بس ویگن سے ٹکرائی اور پھر اس میں آگ لگ گئی۔فوزیہ تو سر میں چوٹ لگتے ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔اسے بس سے نکالتے نکالتے میرا بازو جلا تھا۔''

''حضرت'' نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔پھر گہری سانس لے کر بولے۔''تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ پندرہ دن ہوئے ہیں ایکسیڈنٹ کو۔''

''جی حضرت جی۔''

''اس کے بعد یہ ایک بار بھی ہوش میں نہیں آئی؟''قدرت کا اشارہ بیڈ پر پڑی لڑکی کی طرف تھا۔

''نہیں حضرت جی۔''نوجوان نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔اندازہ ہوتا تھا کہ اسے جواں سال بیوی سے بہت محبت تھی اور صرف شوہر ہی نہیں لڑکی کا سسر اور دیور بھی بہت آزردہ نظر آتے تھے۔

حضرت یعنی قدرت اللہ نے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''رہنے دو۔''مطلب یہ تھا کہ جلے ہوئے بازو سے خون نہ نکالو۔

مرید لڑکی کے دیور کی طرف بڑھا۔لڑکی کے سسر نے ہاتھ جوڑ کر منتی لہجے میں کہا۔

''حضرت سرکار! میرے پُتر کا گھر اُجڑنے سے بچالیں۔اس کے بدلے آپ جو چاہیں میں دینے کو تیار ہوں۔''

''کیا کرتے ہو بابا؟''ایک مرید نے تیز سرگوشی میں بوڑھے کو جھڑکا۔دوسرے نے غصہ ناک نگاہوں سے اسے گھورا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔بوڑھا

www.pdfbooksfree.pk

سہم کر چپ ہو گیا۔

بوڑھے کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کافی کچھ قدرت اللہ کی نذر کر چکا ہے اور ابھی کافی کچھ نذر کرنے کو تیار ہے۔

پیالہ بدست مرید دوسرے نوجوان کی طرف بڑھا۔ اس نے بائیں بازو سے آستین اوپر اٹھائی۔ ''مریضہ سے تمہارا رشتہ؟''

''میری بھرجائی ہے جی۔'' نوجوان نے کہا۔

سابقہ طریقے سے اس کا خون بھی حاصل کر لیا گیا۔ اب رستم کی باری تھی اور رستم پوری طرح تیار تھا۔ اس کے سر پر چادر تھی اور چادر نے اس کے چہرے کا ایک تہائی حصہ چھپا رکھا تھا اور چادر کے نیچے جان لیوا ٹرپل ٹوتھی۔ مرید رستم کی طرف بڑھا۔ یقیناً اس نے یہی پوچھنا تھا کہ..... مریضہ سے تمہارا رشتہ؟

لیکن اس سے پہلے ہی اس کی نگاہ رستم کے چہرے سے چپک کر رہ گئی۔ شاید اس سے پہلے اس نے دھیان سے رستم کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ اسی دوران میں رستم نے محسوس کیا کہ ''حضرت جی'' بھی سخت چونکے ہوئے انداز میں رستم کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ''تم کون ہو؟'' مرید کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''تمہارا باپ۔'' رستم نے کہا اور چادر میں سے سیاہ رنگ کی ٹرپل ٹو رائفل نکال لی۔

یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی بہت بڑا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا ہے اور چاروں طرف اس کی کرچیاں بکھر گئی ہیں۔ سانس اٹک گئے اور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''خبردار، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔'' رستم دھاڑا۔ اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

''حضرت جی'' اپنی جگہ پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ اس کے تینوں چیلے بھی زرد چہروں کے ساتھ رستم کو دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ اسے پہچان گئے تھے اور اس ''پہچان'' کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں دہشت کے مہیب سائے لہرا گئے تھے۔

پھر سب سے پہلے حضرت جی خود ہی بولا تھا۔ ''تم رستم ہو ناں؟''

''تمہیں کوئی شک ہے؟'' رستم بولا۔

''سنو..... تم کیا چاہتے ہو۔ تم سے کیا دشمنی ہے ہماری؟'' حضرت جی نے اپنی آواز کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ذرا چھری کے نیچے سانس لے، ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی رستم نے تیزی سے چند قدم اٹھائے اور حضرت جی کے سر پر پہنچ گیا۔

اس کی رائفل کی بے رحم نال حضرت جی کی گردن میں دھنس گئی۔ وہ کراہتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے بکرے کے لہو والا مرتبان الٹا اور قالین پر گل کاری کر گیا۔ اس کمرے کے اندر رستم کے سوا کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو شاید رستم کا خوفناک انداز کسی کو مزاحمت کی طرف مائل نہ ہونے دیتا۔

رستم نے قدرت اللہ سے کہا۔ ''اپنے اس موٹے کُتے سے کہو کہ ہال کمرے کے پہرے داروں کو اندر بلائے۔'' موٹے کُتے سے رستم کی مراد وہ ہٹا کٹا چیلا تھا جس نے مریضہ کے لواحقین کا خون پیالے میں جمع کیا تھا۔

قدرت اللہ نے ذرا پس و پیش سے کام لیا تو رستم نے اسے بالوں سے پکڑ کر نہایت بے دردی سے جھنجھوڑ دیا۔ قدرت اللہ شاید جان گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے دوچار ہو چکا ہے لیکن وہ اتنی جلدی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر رستم کے صبر کا پیمانہ تو پہلے ہی لبریز تھا۔ اس نے قدرت اللہ کو دھکیلا اور دو قدم چل کر دیوار سے ٹکرا دیا۔ تصادم شدید تھا۔ قدرت اللہ کے ہونٹوں سے کرب ناک کراہ نکل گئی۔ اپنے پیر و مرشد کی توہین کا یہ بدترین منظر دیکھ کر فرید انداز مرید خاموش نہ رہ سکا۔ وہ ایک دبلی دبلی چنگھاڑ کے ساتھ رستم کی طرف آیا لیکن رستم تک پہنچنا اس کی ہمت و طاقت سے باہر تھا۔ رستم کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس میں سائلنسر لگا کولٹ پسٹل تھا۔ ''ٹھک'' کی آواز سے فائر ہوا اور فرید انداز شخص عین پیشانی پر گولی کھا کر پٹ سے قالین پر گرا۔ تیز دھار نشتر جس سے شاید وہ رستم پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

دوسرا مرید بائیں پہلو سے رستم کی طرف آیا۔ وہ رستم سے زیادہ قریب تھا لیکن وہ مزید دس گنا قریب بھی ہوتا تو شاید رستم پر حملہ آور نہ ہو سکتا۔ سائلنسر لگے پسٹل سے چلنے والی اگلی دو گولیوں نے دوسرے مرید کی چھاتی اور گردن میں دو سوراخ کر دیئے۔ یہ شخص بھی اوندھے منہ قالین پر گرا اور جان کنی کے عالم میں لرزنے لگا۔ تیسرے مرید نے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن رستم کی کڑکتی ہوئی آواز نے اس کے پاؤں زمین میں دھنسا دیئے۔ وہ دروازے سے تین فٹ دور رک گیا۔

دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے قدرت اللہ کی ناک لہولہان ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سفید رومال سے بار بار خون پونچھ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ بیڈ پر مریضہ اپنے قرب و جوار سے بے خبر پڑی تھی۔ اس کے لواحقین کے چہرے ہلدی ہو رہے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے مسیحا ''حضرت جی'' کے کمرہ خاص میں انہیں کشت و خون کے ایسے مناظر دیکھنے کو

www.pdfbooksfree.pk

ملیں گے۔ وہ بس پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھے جا رہے تھے۔ رستم کو ڈر تھا کہ ان میں سے کوئی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مریضہ کے جواں سال شوہر کو مخاطب کر کے پھنکارا۔ ''اپنی جگہ سے ہلنا مت۔ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم سے میری کوئی دشمنی نہیں۔''

وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ اثبات میں سر بھی نہیں ہلا سکا۔ رستم نے پسٹل دوبارہ واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور رائفل بہ دست تیسرے مرید کے سر پر پہنچ گیا۔ ''ہال کمرے میں کتنے پہرے دار ہیں؟'' اس نے مرید سے پوچھا۔

''تت..... تین جی۔ دو اندر ہیں ایک باہر۔'' وہ مشینی انداز میں بولا۔

''ان تینوں کو اندر بلاؤ۔ نام لے کر۔ اگر چالاکی دکھاؤ گے تو ابھی اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاؤ گے۔'' رستم نے قالین پر پڑی خون آلود لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

دبلے پتلے مرید نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے آواز دی۔ ''حشمت..... اندر آؤ۔ نورے اور خلیق کو بھی لاؤ۔''

قریباً دو منٹ بعد ہال کمرے میں موجود تینوں پہرے دار اندر خاص کمرے میں آ چکے تھے۔ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں۔ ایک کے پاس مینٹل ڈی ٹیکٹر تھا۔ کمرے میں موجود سنسنی خیز صورتِ حال دیکھ کر یہ تینوں پہرے دار جیسے بینائز ہو گئے۔ ان سے رائفلیں رکھوانے اور انہیں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کروانے میں رستم کو چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ ان تینوں کے ہاتھ ان کے سروں پر رکھے ہوئے تھے۔ (کمرے سے باہر ابھی تک کسی کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا)

تینوں پہرے داروں پر تسلی بخش طریقے سے قابو پانے کے بعد رستم نے دبلے پتلے پنجابی مرید کو ایک بار پھر باہر بھیجا۔ اس مرتبہ وہ گوہرا کو اندر کمرے میں لے آیا۔ کمرے کا خونی منظر دیکھ کر گوہرا کی باچھیں کھل گئیں اور چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے تعریفی نظروں سے رستم کو دیکھا اور سر ہلایا۔ پھر اس کی نگاہ قدرت اللہ پر پڑی اور ایکا ایکی اس کی آنکھوں میں خون کی شدید پیاس نظر آنے لگی۔

وہ رستم کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''خوش کر دیا، لالے کی جان۔ اب کیا کرنا ہے؟''

''سب سے پہلے تم باہر جاؤ اور ہال کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کر دو۔ کوئی باہر جا سکے اور نہ اندر آ سکے۔''

''لو جی۔ چٹکی بجاتے یہ کام کرتا ہوں۔''

اس نے ایک پہرے دار کی سیون ایم ایم رائفل اٹھائی اور دروازے کی طرف مڑا۔

''لیکن دیکھو..... کوئی زخمی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہوائی فائر کرنا۔''

''جو حکم لالے دی جان۔'' گوہرا نے کہا۔ اس پر موجودہ صورتِ حال کا مطلق اثر نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ موت کے شدید خطرے کو انجوائے کر رہا ہے۔ وہ جھومتا ہوا سا باہر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد رستم نے ہال کمرے کی طرف سے عورتوں کی دبی دبی چیخیں سنیں۔ اس کے ساتھ ہی گوہرا کی کڑکتی ہوئی پٹھوہاری آواز سنائی دی۔ وہ لوگوں کو اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنے کا حکم دے رہا تھا۔ ایسے کاموں کا اسے وسیع تجربہ تھا۔ قریباً ایک منٹ کے اندر اندر اس نے ہال کمرے کی صورتِ حال پر قابو پا لیا۔

رستم نے خاص کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ مختصر راہداری سے آگے ہال کمرے کی دیوار گیر کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ گوہرا ایک ٹیبل پر چڑھا ہوا تھا۔ رائفل بالکل تیار حالت میں اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مردوں اور عورتوں کا درمیانی پورٹ ایبل پردہ ہٹا دیا تھا۔ اب اس کی عقابی نظریں قریباً چار درجن مرد و زن کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اچانک رستم کو چونکنا پڑا۔ اس کی نگاہ ہال کمرے کے سامنے سے نیچے اُترنے والے اسٹائلش زینوں پر پڑی۔ اس نے قدرت اللہ کی ایک بیوی کو دیکھا۔ وہ بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے سیڑھیاں اُترتے ہوئے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ برآمدے کی طرف جانے والا دروازہ بند تھا تاہم ممکن تھا کہ باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہوتا۔

''رک جاؤ۔'' رستم دھاڑا۔

وہ نہیں رکی۔ رستم کے پاس دوسری وارننگ دینے کی مہلت نہیں تھی۔ وہ کسی بھی لمحے نظر سے اوجھل ہو سکتی تھی۔ رستم نے اپنے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا۔ ایک بار پھر ''ٹھک'' کی دبی دبی آواز گونجی۔ قدرت اللہ کی بیوی چلا کر چھٹے ساتویں زینے سے پختہ فرش پر گری۔

''کیا ہوا ہے؟'' قدرت اللہ نے کرب ناک آواز میں پوچھا۔

''تیری ماں کا سر۔ چپ کھڑا رہ نہیں تو کھوپڑی توڑ دوں گا۔'' رستم نے پستول لہرایا۔

قدرت اللہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ غالباً اس نے اپنی بیوی کی ''سریلی آواز'' پہچان لی تھی۔ رستم کا اندازہ تھا کہ یہ قدرت کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی ڈاکٹر صدف ہے۔ رستم کی معلومات کے مطابق قدرت کی منجھلی بیوی عریبہ فراتی ذرا بھاری جسم کی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کے مُردہ چہرے کچھ اور بھی مُردہ ہو گئے۔ وہ رستم کی آنکھوں میں اپنے لئے بدترین صورتِ حال کے سائے دیکھ رہے تھے۔ جب صدف کو گولی لگی تو کمرے میں خوف و ہراس کی فضا عروج پر پہنچ گئی۔ ایک دبلے پتلے مرید نے کھڑے کھڑے اپنی شلوار گیلی کر لی تھی اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ قدرت اللہ کو بھی کھڑے رہنے کے لئے صوفے کے ہتھے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہ لوگ استانے پر آئے ہوئے سوالیوں کے لئے رعونت اور بے نیازی کی علامت تھے لیکن اب خود سراپا ''آفت زدہ'' نظر آ رہے تھے۔

جن پہرے داروں نے دیوار کی طرف منہ کر رکھا تھا، ان میں سے ایک نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رستم نے اسے ایک تسلی بخش گالی سے نوازا اور ساتھ ہی رخ دیوار کی طرف رکھنے کی ہدایت کی۔

اسی دوران میں رستم نے ہال کمرے میں ایک منظر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ چند لمحے کے لئے اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں ہوا۔ گوہر اس نے جن مرد و زن کو اپنی رائفل سے کور کر رکھا تھا ان میں ایک جانا پہچانا چہرہ بھی تھا..... ہاں رستم کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ عارف کمبوہ تھا۔ وہی جوشیلا نوجوان جس نے مہتم سردار دراج کے ساتھ مل کر کٹھولی گاؤں میں رستم اور بی بی کی جان بچائی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوب صورت مونچھوں اور چوڑی پیشانی کے سبب رستم نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔ وہ بھی رستم کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھایا جیسے رستم کی طرف آنا چاہ رہا ہو۔

رستم نے سر کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا رستم کے پاس چلا آیا۔

''تم یہاں عارف؟'' رستم نے سرگوشی کی۔

''ہاں رستم بھائی..... اور میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔''

''کون؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے آپ اس لڑکی کو دیکھیں جو ہیڑھیوں سے گری ہے۔''

عارف کا اشارہ قدرت اللہ کی بیوی صدف کی طرف تھا۔ وہ ٹانگ پر گولی کھا کر اوندھے منہ فرش پر گری تھی اور وہیں بے حس و حرکت پڑی رہ گئی تھی۔ ہال کمرے میں موجود لوگ دہشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

رستم نے ایک تنومند پہرے دار کو اپنی طرف بلایا اور عارف سے کہا کہ وہ پہرے دار

کے ساتھ مل کر قدرت اللہ کی بیوی کو اندر لے آئے۔

عارف نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ قریباً ایک منٹ بعد زخمی صدف کمرے میں صوفہ کم بیڈ پر دراز تھی۔ اس کے سر کے نیچے عارف نے ایک کشن رکھ دیا تھا۔ صدف نامی اس جواں سال ڈاکٹر کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مکمل بے ہوش تھی۔ بظاہر کہیں سے خون وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ عارف نے اس کی شلوار کا پائنچہ اٹھا کر دیکھا۔ ٹانگ کا زخم زیادہ سنگین ثابت نہیں ہوا۔ کولٹ پسٹل کی گولی اس کی پنڈلی کا نرم گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ مرہم پٹی کے ذریعے یہاں سے رِسنے والے خون کو روکا جا سکتا تھا۔ اس کی ناک کے ایک نتھنے سے بھی تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔

اپنی جیتی بیوی کی حالت دیکھ کر قدرت اللہ کی حالت پتلی ہوئی۔ وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھا۔ ''صدف..... صدف۔ آنکھیں کھولو'' وہ اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔

دنیا جہان کا کرب اس کی آواز میں سمٹ آیا تھا۔

رستم پھنکارا۔ ''دور ہو جاؤ اس سے۔ پیچھے ہٹو۔''

وہ ذرا ٹھٹکا پھر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

رستم کی آنکھوں میں لہریں مارنے والی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ابھی تک یہاں جتنے فائر ہوئے تھے سائلنسر لگے پستول سے ہوئے تھے۔ عمارت سے باہر لوگوں کو اندر کی صورتِ حال کا ٹھیک ٹھیک پتا نہیں تھا لیکن یہ سچویشن تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رستم کے سینے میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ یہاں دس پندرہ لاشیں گرانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ وہ قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کو ٹرپل ٹو سے چھلنی کرنے کا اصولی فیصلہ کر چکا تھا۔ غالباً اس کے اندر کا یہی ''تہیہ'' تھا جس نے قدرت اللہ اور اس کے ساتھیوں کا خون..... موت سے پہلے ہی خشک کر ڈالا تھا۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لیکن یہ راہ اچھی اور بُری دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک شخص کی محبت غیر مرئی لہروں پر سفر کر کے دوسرے شخص پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یونہی نفرت بھی سفر کرتی ہے اور اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں نفرت اثر انداز ہو رہی تھی۔ سینے میں پھنکارتی ہوئی آگ اور انگلیوں میں سنسناتی ہوئی موت اثر انداز ہو رہی تھی۔ خون خشک تھا اور سانس سینے میں الجھ رہے تھے۔ قالین پر پڑی دونوں لاشیں ماحول کو مزید خوف ناک بنا رہی تھیں۔

اب ایک سیون ایم ایم رائفل عارف کے ہاتھ میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ رستم نے

www.pdfbooksfree.pk

اسے ہدایت کی کہ وہ اردگرد کے کمروں کا ایک چکر لگائے اور اگر قدرت اللہ کا کوئی اور ساتھی بھی یہاں موجود ہے تو اسے لے آئے۔ عارف بے حد تھیار شناس اور چوکس شخص کا نام تھا۔ اس کے جانے کے بعد چند دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی عورت کی دہشت زدہ چیخ سنائی دی۔ قریباً دو منٹ بعد عارف قدرت اللہ کی منجھلی بیوی عریسہ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک سفید دستانے موجود تھے۔ ان دستانہ پوش ہاتھوں سے وہ اب تک نہ جانے کتنے بے زبان جانوروں کو شوہر کے عملیات کی بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ اس کے ساتھ ایک موٹی تازی مریدنی اور مرید بھی تھا۔ مریدنی کے کپکپاتے ہاتھوں میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی لٹھے کی طرح سفید تھا۔ رستم نے ان تینوں افراد کو بھی قطار میں کھڑا کر دیا۔ اپنی چھوٹی سوکن صدف کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر عریسہ کا خوف انتہا کو پہنچ گیا، لگتا تھا وہ ابھی گر پڑے گی۔

عارف، رستم کی آنکھوں میں ہر دم بڑھتی ہوئی وحشت دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب بہت جلد کچھ نہ کچھ ہو جانا ہے۔

وہ رستم کے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''رستم بھائی! تم جانتے ہو میرے ساتھ اور کون یہاں آیا ہے؟''

''کون ہے؟'' رستم نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''شانی بی بی۔'' عارف نے کہا اور رستم کا پورا جسم سنسنا گیا۔

وہ چند سیکنڈ کے لئے کچھ نہیں بول سکا۔ پھر اس نے اپنے اعصاب کو سنبھالا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کہاں ہیں وہ؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہال کمرے میں موجود خواتین پر ایک تیز نظر ڈالی۔ یکا یک اس کے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ اسے کیسے نہ جانتا؟ کیوں نہ پہچانتا؟ وہ تو سانس کے ساتھ سفر کرتی تھی، وہ تو خون کے ساتھ رگوں میں دوڑتی تھی۔ دن میں اور رات میں، کھلی اور بند آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھتا تھا اور محسوس کرتا تھا اور وہ اس کے سامنے تھی۔ اس کا نقاب اس کی چادر اور نظر کی عینک، اسے رستم سے چھپا نہیں سکے۔ وہ سرتاپا آنکھ بن گیا اور بی بی کو دیکھنے لگا۔ وہ عورتوں والے حصے میں ایک ستون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب کسی کو سراپا آنکھ بن کر دیکھا جاتا ہے تو باقی حسیات ماند پڑ جاتی ہیں۔ رستم جیسا چوکس شخص بھی چند لمحوں کے لئے اپنے قریب کھڑے دراز قد گارڈ سے بے خبر ہو گیا۔ جہلمی گارڈ جسے اپنی موت کا پورا یقین ہو چکا تھا برق رفتاری سے رستم کی طرف آیا۔ اس نے رستم کی رائفل پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی۔ رستم نے رائفل ایک ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ گارڈ کی کوشش

اس حد تک کامیاب ہوئی کہ رائفل رستم کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن دوسرے ہاتھ میں سائلنسر لگا پسٹل بدستور موجود رہا۔ رستم نے پلٹ کر فائر کیا۔ پہلی گولی گارڈ کے پیٹ میں لگی، دوسری آنکھوں کے عین درمیانی پیشانی پر۔ وہ ایک جھٹکے سے پشت کے بل اپنے پشت پناہ عزت مآب حضرت پیر قدرت اللہ صاحب کے قدموں میں جا گرا۔ خون اس کی چھاتی کے نیچے سے کسی فوارے کی طرح نکلا تھا۔ عریسہ اور مریدنی نے دہشت سے چلانا شروع کر دیا۔ عریسہ پر تو جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔

رستم نے دھاڑ کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ چپ نہیں ہوئی تو رستم نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان زمین پر فائر کیا۔ وہ دہشت سے کرلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اور دھڑ سے قالین پر گر گئی۔ پھر اس میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ سکے۔ رستم نے وحشت کے عالم میں عریسہ کو بھی گولی کا نشانہ بنانا چاہا لیکن اس اثناء میں شانی بڑی تیزی سے رستم تک پہنچ چکی تھی۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں رستم کے سامنے آ گئی۔ رستم قالین پر گری عریسہ پر فائر نہیں کر سکا۔

''نہیں رستم۔ ایسا مت کرو۔'' وہ تیز سرگوشی میں بولی۔

چند لمحوں میں رستم کا چہرہ کئی رنگ بدل گیا۔ اس کا پسٹل والا ہاتھ بتدریج جھکتا چلا گیا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' رستم نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

وہ رستم کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''رستم! پلیز دو منٹ ایک طرف آ کر میری بات سن لو۔''

رستم جس جگہ اور جس صورتِ حال میں کھڑا تھا، وہ اِدھر سے اُدھر نہیں جا سکتا تھا لیکن دوسری طرف بی بی کا حکم تھا..... بلکہ دیوی کا حکم تھا۔ وہ شدید تذبذب میں کھڑا رہ گیا۔ رستم کے پہلو میں گویا ہزار رائفل تانے کھڑا تھا۔ اس کی تیز نظریں کمرے اور ہال میں موجود ہر متنفس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عارف کمبوہ ہال کمرے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی بھری ہوئی رائفل تھی۔ وہ ہال نما کمرے کے سکتہ زدہ حاضرین کو پُرسکون رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

پھر رستم کے لئے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بی بی نے رستم کی کلائی پکڑی اور اسے اپنے ساتھ لے کر ایک بغلی کمرے میں آ گئی۔ اپنی کلائی پر بی بی کے ہاتھ کا لمس رستم کے لئے جادوئی اثر کا حامل تھا۔ کمرے میں پہنچ کر بی بی نے دروازہ بند کیا اور روتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''رستم! کیوں کر رہے ہو ایسا، کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میری جان کے دشمن بھی۔ تمہیں پتا نہیں..... تم کتنی تکلیف دے رہے ہو مجھے۔ کتنی

www.pdfbooksfree.pk

اذیت پہنچا رہے ہو۔تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟''

رستم حیرت سے گنگ سنتا رہا۔بی بی کے الفاظ اپنے اندر شدید ترین اپنائیت لئے ہوئے تھے۔اس نے بی بی کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر پلکیں جھکا لیں۔''میں نے کیا کیا ہے بی بی؟''

شانی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔''خدا کے لئے رستم۔اگر تم نکل سکتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔میں تمہیں اپنے سامنے مرتا نہیں دیکھ سکتی۔میں نہیں دیکھ سکتی۔''

رستم نے بے ساختہ بی بی کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لئے۔''ایسا مت کریں بی بی۔آپ حکم دیں۔''

''اسے حکم سمجھ لو، یا التجا یا کچھ بھی سمجھ لو۔تم یہاں سے نکل جاؤ۔یہاں تمہارے ہاتھوں کئی بندے مارے گئے ہیں۔ابھی تھوڑی ہی دیر میں یہاں پولیس کی گاڑیوں کی لائنیں لگ جائیں گی۔وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''تو نہ چھوڑیں۔زندہ رہنا کون چاہتا ہے۔'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔''لیکن مرنے سے پہلے میں اس آستانے کی اینٹ سے اینٹ ضرور بجاؤں گا۔میں یہاں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔''

بی بی نے اپنے ہاتھ رستم کی گرفت سے کھینچ لئے۔قدرے سرد لہجے میں بولی۔''ابھی تم نے کہا ہے کہ میں التجا نہ کروں صرف حکم دوں۔دیکھو، میں التجا کرتی ہوں اور اگر تم مانتے ہو تو حکم بھی دیتی ہوں، تم نے جو کچھ کر لیا وہ بہت ہے۔اب قدرت اللہ اور اس کے ساتھیوں کو کچھ نہیں کہو گے۔ایک گولی نہیں چلاؤ گے۔'' شانی کا لہجہ حتمی تھا۔

رستم نے شانی کی طرف دیکھا۔وہ چند سیکنڈ جیسے صدیوں پر بھاری تھے۔بی بی دیوار کی طرح اس کے اور قدرت اللہ کے درمیان کھڑی تھی اور فقط کھڑی نہیں تھی ایک حکم بھی دے رہی تھی۔تاؤ حشام جیسے ظالم کی معافی کے بعد یہ دوسری بڑی قربانی تھی جو بی بی اس سے طلب کر رہی تھی اور.....اور رستم کے پاس یہ قربانی دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ہاں، وہ چند لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔رستم کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔سینے میں بھڑکتا آتش فشاں ماند پڑنے لگا۔اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی ہو گئیں۔وہ چند سیکنڈ خاموش رہا، پھر گھمبیر آواز میں بولا۔''بی بی! میں آپ کا حکم مانتا ہوں۔میں اب یہاں کسی شخص کو کچھ نہیں کہوں گا لیکن یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میں قدرت اللہ اور اس کے ساتھیوں کو ایک سبق ضرور دینا چاہتا ہوں۔میری آپ سے منت ہے، شاید آخری منت ہے۔آپ مجھے اس کام سے نہ

روکیں۔''

دونوں چند سیکنڈ تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔''اب کسی کی جان تو نہیں لو گے؟'' شانی نے عجیب لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بی بی۔'' رستم نے حتمی جواب دیا۔پھر ذرا توقف سے بولا۔''اب آپ سے گذارش ہے کہ آپ یہاں سے چلی جائیں۔آپ یہاں ہوں گی تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔یہاں سے نکل بھی نہیں سکوں گا۔'' کہنے کو تو وہ کہہ رہا تھا کہ چلی جائیں لیکن ایسا کہتے ہوئے اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی یہ بس وہی جانتا تھا۔دوسری طرف شانی کو بھی کوئی چیز رکنے اور ٹھہرنے پر مجبور کر رہی تھی۔اس کے پاؤں زمین میں پیوست تھے۔ہال کمرے اور خاص کمرے میں صورتِ حال بدستور سنسنی خیز تھی۔گاہے بگاہے عورتوں کے سسکنے اور گوہرا کے دھاڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔گوہرا نے صورتِ حال کو پوری طرح سنبھال رکھا تھا۔عارف اس کا ساتھ دے رہا تھا۔رستم نے ایک بار پھر اصرار کے ساتھ کہا۔''بی بی یہاں سے چلی جائیں۔''

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے رستم کو دیکھ کر اور ہولے سے خدا حافظ کہہ کر واپس مڑی۔اس کے قدم اٹھنے لگے لیکن کوئی نادیدہ اور بے حد مضبوط ڈوران دونوں کے درمیان موجود تھی۔وہ شانی کے قدموں کو کھینچ رہی تھی۔انہیں روک رہی تھی۔وہ چل سکتی تھی، نہ رک سکتی تھی۔یہ قیامت کے لمحے تھے، یہ بے بسی کی انتہا تھی۔وہ دیوی تھی اور لاچار تھی۔اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ رکی.....اور واپس مڑی.....اور اس نے دیکھا تو پتھر کی ہو جائے گی۔مگر نادیدہ ڈور بھی ناقابلِ شکست تھی۔قدموں اور پورے جسم کو جکڑتی چلی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بی بی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی اور رستم دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''دیوی رک جاؤ! کیا پتا کہ یہ آخری ملاقات ہو اور آخری بار ملاقات ایسی تو نہیں ہوتی۔ اپنے پجاری کو آخری بار خود کو چھو لینے دو.....''

اور پھر وہ رک گئی۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ رستم کو مڑ کر دیکھا۔ نادیدہ ڈور موجود تھی اور بڑی مضبوط تھی جو بی بی کو جانے سے روک رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے رستم کو یوں لگا کہ بی بی تیزی سے اس کی طرف آئیں گی.....اور اس کے گلے لگ جائیں گی۔ اپنے بے مثال جسم کی ساری نرمی، گرمی اور حلاوت کے ساتھ۔ ان کے ہونٹ اس کی گردن کے قریب ہوں گے اور وہ سسکتی ہوئی سرگوشی کریں گی۔ ''رستم، میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

وہ لمحے جیسے برسوں پر بھاری تھے۔ وہ کھڑی رہی پھر وہ رستم کی طرف آئی لیکن تیزی سے نہیں، اپنے مخصوص وقار کے ساتھ۔ وہی ٹھہری ہوئی چال جو دیکھنے والے کو مرعوب کر دیتی تھی۔ آنکھوں کے شفاف آئینوں پر آنسوؤں کی چمک بدستور موجود تھی۔ بی بی نے کہا۔ ''رستم! مجھے ڈر ہے۔ میرے جانے کے بعد.....''

''نہیں بی بی! میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے۔ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب میری طرف سے یہاں کچھ نہیں ہوگا۔''

''لیکن کیا ہم..... یہاں سے اکٹھے نہیں نکل سکتے؟''

''بی بی، اکٹھے نکلنے کے بعد بھی تو راستے جدا ہی ہوتے ہیں۔ آپ پہلے نکل جائیں..... تھوڑی دیر بعد میں بھی نکل آتا ہوں۔'' رستم کا لہجہ عجیب تھا۔

بی بی کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی نم ہو گئیں۔ آخر اس نے ایک گہری کرب

ناک آہ کو سینے میں دبایا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔ اس مرتبہ اس کی چال میں استحکام تھا۔ رستم کو یوں لگا کہ کسی نے اس کے سینے میں ہاتھ ڈال کر کلیجہ کھینچ لیا ہے۔ حالات ایک بار پھر جیت گئے تھے۔ دلوں کی تڑپ پھر ہار گئی تھی۔ ان لمحوں میں رستم کو نہ جانے کیوں پنجابی کی ایک کہاوت یاد آئی۔ اس کہاوت کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ ''عشق کی بلا بڑی خوفناک ہے۔ یہ انسان کا خون پیتی ہے، ہڈیاں چباتی ہے لیکن مارتی نہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر رکھتی ہے۔ اس لئے اے پیارے چرواہے، بہتر ہے کہ تُو اپنی بانسری کو خاموش رکھ۔ عشق کرنے کے لئے لوہے کا کلیجہ چاہیے۔''

.....اور وہ چلی گئی۔ رستم نے اسے ہال نما کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لحظے کے لئے عارف کمبوہ کے پاس رکی۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور سیدھی نکلتی چلی گئی۔ خاص کمرے میں موجود قدرت اللہ، اس کی بیوی عریسہ اور دیگر افراد متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بی بی کی صورت دیکھ سکے تھے اور نہ وضاحت سے آواز سن سکے تھے، تاہم ان کے دلوں میں یہ شک ضرور پیدا ہوا تھا کہ یہ بی بی ہے۔

بی بی کے چلے جانے کے بعد رستم دوبارہ قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کے سر پر پہنچ گیا۔ قدرت اللہ کے خاص کمرے کا منظر سنسنی خیز بلکہ تہلکہ خیز تھا۔ ایرانی قالین پر تین لاشیں پڑی تھیں جب کہ دو لڑکیاں گہری بے ہوشی کی حالت میں لیٹی تھیں۔ دو لاشیں قدرت اللہ کے مریدوں کی تھیں۔ تیسری جہلمی پہرے دار کی تھی۔ آخر میں مرنے والے پہرے دار کی عین پیشانی پر 38 بور کی گولی لگی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ یک ٹک چھت کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون قدرت اللہ کے پاؤں تک چلا گیا تھا۔ پہلے مرنے والے دونوں مرید بھی الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان کے جان لیوا زخموں سے بہنے والے خون نے بھی قالین پر خوب گل کاری کی تھی۔ ان میں سے ایک مرید کے جسم میں شاید ابھی کچھ جان باقی تھی کیونکہ اس کے پیٹ میں لگا ہے بگا سے خفیف جنبش پیدا ہوتی تھی۔ بے ہوش لڑکیوں میں سے ایک تو وہی مریضہ تھی جو اپنے شوہر امیر اکبر اور سسر وغیرہ کے ساتھ یہاں موجود تھی، دوسری قدرت اللہ کی چہیتی بیوی صدف تھی۔ مریضہ بیڈ پر اور صدف صوفہ کم بیڈ پر پڑی تھی۔ قدرت اللہ کی دوسری بیوی عریسہ کو گوہر نے صوفے پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ شاید وہ اس قابل ہی نہیں تھی کہ کھڑی رہ سکتی۔ اس کا رنگ ہلدی اور ہونٹ سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کو کسی بھی وقت دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

www.pdfbooksfree.pk

قدرت اللہ کی نگاہیں بس اپنی چہیتی بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپتا چلا جا رہا تھا۔ رستم کو دیکھ کر وہ کراہا۔ ''دیکھو اس کا سانس پھنس رہا ہے اس کو..... جلدی سے ہسپتال پہنچانا چاہیے۔''

''پہنچا دیتے ہیں ہسپتال بھی۔'' رستم نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ہال کمرے کا بیرونی دروازہ بجنے لگا۔ کوئی دستک دے رہا تھا۔ رستم نے قدرت اللہ کے دبلے پتلے مرید کو پسٹل سے اشارہ کیا کہ وہ قریب آئے۔ وہ لرزتا کانپتا قریب آیا۔ اس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی۔ رستم نے کہا۔ ''دیکھو، دروازے پر کون ہے۔ اسے بتاؤ کہ حضرت جی عمل کر رہے ہیں، دروازہ کھولنے سے منع کیا ہے۔''

مرید نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ رستم بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے گیا۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔ رستم کے اشارے پر مرید نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''شوکت ہوں۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے؟''

''حضرت..... عمل کر رہے ہیں۔ دروازہ بند کرا رکھا ہے۔''

''یہ اندر سے آوازیں کیسی آئی تھیں؟''

''کہا ہے ناں، عمل کر رہے ہیں۔'' مرید نے بمشکل جواب دیا۔

''کتنی دیر لگے گی؟''

اس مرتبہ رستم نے جواب دیا۔ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''بے کار کے سوال نہ کرو۔ یہ حضرت جی کو ہی پتا ہوگا کہ کتنی دیر لگے گی۔ جاؤ تم گیٹ پر۔''

باہر خاموشی چھا گئی۔ پہرے دار کچھ تذبذب میں رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔ رستم دوبارہ خاص کمرے یعنی عملیات والے کمرے میں آ گیا۔ اس دوران میں گوہر اپنے ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ دو مریدوں کی لاشیں گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں پہنچا چکا تھا پھر جہلمی پہرے دار کو بھی اس نے اسی طرح قالین پر کھینچ کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ رستم کو امید تھی کہ لاشوں کے منظر سے ہٹ جانے سے ہال کمرے میں موجود حاضرین کا خوف کچھ کم ہوگا۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے جنہوں نے قرب و جوار سے نگاہ چرانے کے لئے سر گھٹنوں میں چھپا رکھے تھے۔ دو دہشت زدہ عورتوں نے اپنے بچوں کو گود میں چھپا کر ان کے اوپر اپنی اوڑھنیاں ڈال دی تھیں۔ ایک عورت بے دم سی ہو کر قالین پر لیٹ گئی تھی، دوسری عورت تسبیح پڑھنے کے ساتھ ساتھ اسے تسلی دے رہی تھی۔

رستم نے حاضرین کے سامنے پہنچتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پھر تم لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہو۔ تھوڑی دیر میں تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

قالین پر لیٹی ہوئی عورت تسلی کے ان بولوں سے رقت زدہ ہو گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

عارف کمبوہ ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ (اس کا چہرہ ڈبی دار صافے میں چھپا ہوا تھا) اس نے ٹیلی فون کا مین تار ڈھونڈ لیا تھا اور اسے کاٹ دیا تھا۔ اب اس بات کا خطرہ بہت کم رہ گیا تھا کہ کوئی یہاں کی ہنگامی صورتِ حال کے بارے میں باہر اطلاع پہنچائے گا۔ (جو دو تین موبائل سیٹ ان لوگوں کے پاس موجود تھے وہ رستم نے پہلے ہی قبضے میں کر لئے تھے)

رستم نے سسکتی ہوئی عورت کے پاس جا کر اسے ذاتی طور پر تسلی دی پھر وہ قدرت اللہ کے پاس پہنچا۔ قدرت اللہ ایک بار پھر جذبات سے لاچار ہو کر اپنی بیوی کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ اسے شانوں سے جھنجھوڑ کر مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رستم دھاڑا۔ ''تمہیں کہا تھا نا اس سے دور رہو۔''

وہ لرز کر پیچھے ہٹ گیا تاہم پھر سنبھل کر بولا۔ ''دیکھو، اس کی جان چلی جائے گی۔ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اس کو ہسپتال لے جانا ہوگا۔''

''ہسپتال میں کیوں؟ اس کا علاج یہیں ہوگا۔'' رستم پھنکارا۔

''کک..... کیا مطلب؟''

''تم جیسے مسیحا کے ہوتے ہوئے اس کو ہسپتال لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب تم سب کچھ یہیں پر کر سکتے ہو تو پھر ہم اسے ہسپتالوں میں لئے لئے کیوں پھریں؟''

''مم..... میں۔'' قدرت اللہ ہکلا کر رہ گیا۔

''ہاں ہاں کہو۔''

''میں..... کیا کر سکتا ہوں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی بے ہوشی گہری ہو گئی ہے۔''

رستم نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بے ہوشی تو اس لڑکی کی بھی بہت گہری ہے۔ اس کے بھی سر پر چوٹ لگی ہے۔ یہ بھی پھنسے پھنسے سانس لے رہی ہے اگر تم اس کا علاج یہاں کر سکتے ہو تو اپنی بیوی کا بھی کر سکتے ہو اور تم ہی کرو گے میری جان۔''

قدرت اللہ کا زرد رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف کے عالم میں پھیل

www.pdfbooksfree.pk

گئیں۔اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ بات کس رخ پر جارہی ہے۔صدف کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے رستم کو یہ موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ قدرت اللہ کو اسی کے سکوں میں جواب دے سکے اور یہ ناقابل فراموش جواب یوں اور بھی ذلت آمیز ہوگیا تھا کہ قدرت اللہ کے درجنوں عقیدت مند موقع پر موجود تھے اور ہال کمرے کے دیوار گیر شیشے سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔

قدرت اللہ نے اپنے سیاہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔''دیکھو رستم! یہ بدلے چکانے کا وقت نہیں۔میری بیوی مر رہی ہے۔یہ ختم ہوجائے گی۔''

''یہ لڑکی فوزیہ بھی مر رہی ہے۔یہ بھی ختم ہوجائے گی۔تم دونوں کا علاج کرو اور ابھی کرو۔دیکھو کیسا اتفاق ہے۔دونوں عورتیں ہیں، دونوں جواں سال ہیں۔دونوں کا مرض بھی تقریباً ایک ہی ہے اور دونوں کو مسیحا بھی ایک ہی ملا ہے۔چلو شاباش جلدی شروع کرو اپنا کام۔''

قدرت اللہ نے بے بسی سے بیوی کی طرف دیکھا۔مرید نے اپنی صوابدید سے کام لیتے ہوئے کالے رنگ کا ایک چوکور رومال صدف کے سینے پر رکھ دیا۔اس رومال پر چمک دار کڑھائی کے ذریعے کوئی عبارت لکھی گئی تھی اور ہندسے وغیرہ نظر آرہے تھے۔بالکل ایسا ہی ایک رومال مریضہ فوزیہ کے سینے پر بھی رکھا تھا۔

قدرت اللہ نے جھنجھلا کر مرید کو جھڑکا۔''پیچھے ہٹاؤ اس کو.....''

غالباً قدرت اللہ نے ادھورہ فقرہ بولا تھا۔پورا فقرہ یہ تھا۔''پیچھے ہٹاؤ اس کو، یہ کیا خرافات ہے۔'' مرید نے اپنے مرشد کو قدرے تعجب سے دیکھا اور رومال اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔

قدرت اللہ کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔وہ شخص جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں تھی، جو بولتا تھا تو ایک خلقت سانس روک کر سنتی تھی، وہ ان لمحوں میں ایک کیچوے کی طرح حقیر اور بکری کی طرح بدحواس نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے خود کو سنبھالا اور رستم کی طرف دیکھ کر بولا۔''تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔میرے پاس جو کچھ بھی ہے اس کا فیض میرے اپنوں کو نہیں پہنچ سکتا۔یہ دوسروں کے لئے ہے.....''

''تیرے جیسے نوسربازوں کا یہ فقرہ اب بڑا پرانا ہوچکا ہے قدرت اللہ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے پاس جھوٹ، بددیانتی اور بے شرمی کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔اب زیادہ ڈرامہ

کر۔دیر کرنے سے تیری چہیتی بیوی کا جتنا نقصان ہوگا اس کا ذمے دار تُو خود ہے۔چل شاباش شروع کردے اپنا عمل۔''

''کک.....کون سا عمل؟''

''وہی جو امیر اکبر کی بیوی پر کر رہا تھا۔''

''دیکھو رستم! اس کی حالت ٹھیک نہیں، یہ مر جائے گی۔''

''بکواس بند کر۔تیرے ہوتے اسے کچھ نہیں ہوسکتا۔تیرے تو چیلے بھی مُردوں کو کھڑا کردیتے ہیں۔تُو تو مہان گرو ہے۔تیرے پاس جادو ٹونہ، تعویذ گنڈا، کالا، نوری علم اور موکل وغیرہ سب کچھ ہے۔'' اس کے بعد رستم نے دبلے مرید سے مخاطب ہوکر پوچھا۔''اوئے کیڑے! بکرے بکری کا اور جوڑا ہے یہاں؟''

مرید نے سوالیہ نظروں سے قدرت اللہ کی طرف دیکھا، جیسے ہدایات لینا چاہتا ہو۔رستم نے اس کے بے گوشت کولہے پر ٹانگ جمائی۔وہ لڑکھڑا کر پولی تھین کی شیٹ پر گیا اور خون پر سے پھسل گیا۔رستم پھنکارا۔''اپنے باپ کی طرف کیا دیکھتا ہے حرامی! میری بات کا جواب دے۔بکرا بکری ہے یہاں؟''

مرید نے اپنا مضروب کولہا دبایا اور اثبات میں سر ہلایا۔''ہاں جی! ایک جوڑا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔اپنا عمل شروع کر قدرت اللہ۔جوڑے کی ضرورت تو بعد میں پڑے گی۔''

اچانک بے ہوش ڈاکٹر صدف کے حلق سے گھیں گھیں کی مدھم آواز برآمد ہونے لگی۔قدرت اللہ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔رستم کی دھمکی کی پرواہ کئے بغیر وہ بیوی کے پاس پہنچا۔اس نے کانپتی انگلیوں سے صدف کی پلکیں اٹھا کر اس کی پتلیاں دیکھیں۔اس کا ایک دستانہ اُتار کر اس کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کی پھر وہ رستم کے پاس آیا اور دردناک سرگوشی میں بولا۔''تم جو کہو گے، میں کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن ابھی مجھے میری بیوی کی زندگی بچا لینے دو۔''

رستم نے بڑی بے رحمی سے اپنا گھٹنا قدرت اللہ کی دونوں ٹانگوں کے درمیان مارا۔وہ لڑکھڑا کر دور گیا اور اپنی ''مضروب جگہ'' کو دبا کر نیچے بیٹھ گیا۔اس کا پورا جسم تو پہلے ہی لرز رہا تھا، اب چہرہ بھی اذیت کا شاہکار ہوگیا۔فربہ اندام مریدنی دیوار کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔اس نے چور نظروں سے اپنے عالی مرتبت مرشد کی حالت دیکھی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔عریسہ کے منہ سے بھی کرب ناک آوازیں نکلنے لگیں۔

رستم نے پھنکار کر قدرت اللہ کو وارننگ دی۔''کان میں پھس پھس نہیں کرنا۔جو بات

www.pdfbooksfree.pk

بھی مجھ سے کہنی ہے، اونچی آواز میں کہو۔ سب کے سامنے۔ میں بھی اونچی آواز میں جواب دوں گا۔ ہاں بتاؤ اب، کیا کہہ رہے تھے؟''

''مم..... میں اس کا علاج نہیں کرسکتا۔ اس کا علاج ہسپتال میں ہوسکتا ہے۔''

''اس کا علاج صرف ہسپتال میں ہوسکتا ہے تو پھر فوزیہ کا علاج یہاں کیسے ہوسکتا ہے یا تُو اپنی حرام زدگی تسلیم کرکہ فوزیہ کا علاج بھی فراڈ تھا۔''

''مم..... میں بندہ بشر ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوسکتی ہے۔ آپ سمجھ لو کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔'' وہ اس موقع پر ہر بات ماننے کو تیار نظر آتا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''یہ غلطی نہیں، جرم ہے اور یہ جرم تم پہلی بار نہیں کررہے، اس سے پہلے بھی ہزاروں بار کرچکے ہو۔ اپنے مریضوں کو اور عقیدت مندوں کو دھوکا دیتے رہے ہو۔ جنہیں ہسپتالوں اور اچھے معالجوں کی ضرورت تھی وہ تمہارے سفلی عملوں کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے رہے ہیں..... اس کی ایک مثال چوہدری بشیر کی بیوی مقبول (بھابو) بھی ہے۔ وہ اسی طرح سسک سسک کر تمہارے ہاتھوں مرگئی تھی۔ مری تھی یا نہیں؟''

قدرت اللہ خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔

رستم نے بدستور بلند آواز سے کہا۔ ''ان سارے لوگوں کے سامنے اس بات کو مانو کہ تم جھوٹ بکتے رہے ہو، فراڈ کرتے رہے ہو۔ لوگوں کی زندگیاں لیتے رہے ہو۔ جس طرح آج اس لڑکی فوزیہ کی زندگی لے رہے تھے۔''

''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا لیکن کبھی غلطی لگ بھی سکتی ہے۔'' وہ کراہا۔

''پھر غلطی..... یہ غلطی نہیں جرم ہے اور قتل ہے۔'' رستم دوبارہ پوری طرح بپھر گیا۔

قدرت اللہ کا مزاحمتی رویہ اسے مشتعل کررہا تھا۔ اس نے دبلے پتلے مرید کو اشارہ کیا کہ وہ ایک طرف رکھا ہوا پیالہ نما برتن لے کر آئے۔ یہ وہی برتن تھا جس میں ہلکے سرخ رنگ کا محلول بھرا ہوا تھا۔ جب رستم اس کمرے میں داخل ہوا تھا، قدرت اللہ اسی محلول میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر بے ہوش لڑکی پر عمل کررہا تھا۔

رستم کے حکم پر مرید برتن لے آیا اور صدف کے سرہانے کھڑا ہوگیا۔ رستم نے قدرت اللہ کو اشارہ کیا۔ ''چلو شروع کرو اپنا کام۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار تمہارے عمل میں زیادہ طاقت ہوگی۔ اب کوئی غیر نہیں تمہاری اپنی پیاری بیوی ''کومے'' میں ہے۔ اس بار تم ضرور کامیاب ہوجاؤ گے۔ چلو شروع ہوجاؤ شاباش۔''

قدرت اللہ نے محلول والے ''مقدس برتن'' کی طرف بے حد عاجز نظروں سے دیکھا۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم نے سائلنسر لگے پسٹل کو خطرناک انداز میں حرکت دی۔ ''میں فارسی نہیں بول رہا ہوں۔ چلو آگے بڑھو۔ شروع کرو عمل۔''

قدرت اللہ سکتہ زدہ کھڑا رہا۔ کبھی رستم کو اور کبھی صدف کو دیکھتا رہا۔ صدف کی سانس اب جھٹکوں سے آرہی تھی۔ رستم نے آگے بڑھ کر محلول والا پیالہ مرید کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے قدرت اللہ کی طرف بڑھایا۔ ''میری جان! کیا کررہے ہو۔ دیر ہوجائے گی۔ اپنی انگلیاں اس میں ڈبو کر بیوی کے چہرے پر چھینٹے دو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم اسے مرنے نہیں دو گے۔''

اچانک قدرت اللہ کی ساری عاجزی اور لاچاری طیش میں ڈھل گئی۔ اس نے پیالے کو ہاتھ مار کر دور پھینک دیا۔ پیالہ دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہوگیا۔ وہ اپنی بیوی کی طرف لپکا اور اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے حواریوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ ''جہانے، بالم، مجید..... جلدی آؤ۔''

رستم نے اندازہ لگایا کہ وہ صدف کو اپنے بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کوشش میں وہ بے ہوش صدف کے اوپر ہی گر پڑا اور پھر ایک دم وہ بھنا کر رستم کی طرف پلٹا اور اس کے ہاتھوں سے پسٹل چھیننے کی کوشش کی۔ یہ بالکل اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ وہ اور اس کے مرید و پیرے دار یہ بازی مکمل طور پر ہار چکے تھے۔ رستم نے ایک بار پھر اس کی ٹانگوں کے درمیان اپنے پاؤں سے بے رحم ضرب لگائی۔ پچھلی مرتبہ وہ صرف کراہا تھا، اب ڈکراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ رنگ لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ قدرت اللہ کی اس بے مثال توہین پر مرید فی اور مرید پھر اونچی آواز میں رونے لگے۔ ہال کمرے میں حاضرین حیرت زدہ تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ آسمان گرا کیوں نہیں۔ زمین پھٹی کیوں نہیں۔ اگر عزت مآب حضرت صاحب کی اتنی شدید ترین توہین کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا تو پھر کب ہوگا؟

قدرت اللہ کی حالت دیدنی تھی۔ تھوڑا سا طیش دکھانے کے بعد وہ پھر منت سماجت پر آگیا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھو رستم، ابھی مسئلہ ایک زندگی بچانے کا ہے۔ باقی ساری باتیں ہم بعد میں کرسکتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ بڑے آرام سے اور تفصیل سے بات کروں گا۔ تمہاری جو باتیں درست ہوں گی، وہ بھی مان لوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ میرے اندر بھی غلطیاں ہوں۔ بلکہ غلطیاں ہیں۔''

''لیکن ابھی تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد تو تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں

ہوسکتی۔'' رستم نے سفا کی سے قدرت اللہ کی بات کاٹی۔ ''تم نے ایک بہت خاص پیالہ اپنے ہاتھوں سے توڑا ہے۔ ایسا ہی ایک پیالہ کچھ عرصہ پہلے بی بی سے ٹوٹا تھا۔ تم نے اب تک بی بی کی جان نہیں چھوڑی۔ ہر جگہ انہیں رسوا کر رہے ہو۔ پیالہ توڑنے کی سزا کے طور پر تمہاری ان دونوں بیویوں نے بی بی جی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔''

''تم ... تم کب کی بات کر رہے ہو۔ مجھے نہیں پتا؟''

''میں چوہدری حشام کی حویلی کی بات کر رہا ہوں۔ تم اتنے چوچے نہیں ہو، سب کچھ جانتے ہو۔ وہاں تمہاری ان دونوں بیویوں نے مشٹنڈی جالاں کے ساتھ مل کر بی بی کو زمین پر گرا کر مارا تھا۔ مارا تھا یا نہیں؟''

پینتیس چالیس سالہ فربہ اندام مریدنی ایک دم پلٹی اور تڑپ کر رستم کے پاؤں میں گر پڑی۔ اس نے اپنا سر رستم کے پاؤں پر رکھ دیا۔ ''خدا کے لئے..... ہم پر رحم کریں۔ حضرت جی کو دکھ پہنچا تو ہم سب کو پہنچے گا۔ ہم سب کو رونا پڑے گا۔ یہ کرنی والے ہیں.....''

رستم نے ٹھوکر مار کر مریدنی کو اپنے قدموں سے ہٹایا۔ ''تو کس نے منع کیا ہے تجھے اور تیرے حضرت جی کو، جو تیر چلانا ہے چلا لو۔ اپنے مؤکلوں اور جنوں بھوتوں کو آواز دے لو۔ میں تیار ہوں ان سے بھی ہتھ جوڑی کرنے کے لئے لیکن یہ بات بالکل صاف ہے۔ اس لڑکی کا علاج ہوگا تو یہیں پر اس حرامی قدرت اللہ کے ہاتھوں سے ہوگا۔''

کچھ دیر بعد گوہر رستم کے قریب پہنچا۔ اس نے رستم کے کان میں سرگوشی کی۔ ''لالے دی جان لگتا ہے کہ گوری آخری دموں پر ہے۔'' گوہر کے اشارہ ڈاکٹر صدف کی طرف تھا۔

وہ واقعی مر رہی تھی۔ قدرت اللہ نے بھی یہ دیکھ لیا۔ اس نے دردناک کرب میں ڈوبی ہوئی ایک خوفناک چیخ ماری اور ایک بار پھر بیوی کی طرف لپکا۔ وہ اس کے اوپر تقریباً گر پڑا۔ اسے جھنجھوڑنے لگا۔ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا پھر اس نے زور لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اب اسے رستم کے پٹھل اور گوہرا کی رائفل کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بیوی کو اٹھا کر ہال کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ رک گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بیوی، اس کی دست راست آخری سانس لے رہی ہے۔ اس کا پورا جسم تشنج کی کیفیت میں تھا۔ اس کے دوسرے نتھنے سے بھی تھوڑا سا خون خارج ہونے لگا تھا۔ اس نے بیوی کو فرش پر رکھا۔ بیوی کے سفید کوٹ کی جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ کانپتے ہاتھوں سے نمبر پریس کیا۔ چند سیکنڈ بعد کرلاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ڈاکٹر رشید..... ڈاکٹر رشید صاحب! آپ کہاں ہیں؟ جلدی آئیں۔ پلیز جلدی آئیں۔ صدف کی حالت خراب ہے۔ جی ہاں.....

آستانے میں..... جلدی پہنچیں۔''

یہ وہی قدرت اللہ تھا جو ڈاکٹروں، مستند حکیموں اور معالجوں کو گندی گالیاں دیتا تھا۔ اس کے نزدیک اس کے عملیات کو ہر چیز پر فوقیت حاصل تھی۔ آج وہ اپنی بیوی کے لئے دیوانہ وار ایک ڈاکٹر کو آوازیں دے رہا تھا۔ اسی وقت اچانک کسی پولیس کار کا سائرن سنائی دیا۔ رستم، گوہرا اور عارف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رستم نے سائلنسر لگا پٹھل واپس جیکٹ کی جیب میں رکھا اور ٹرپل ٹو دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔ وہ بڑی وحشت کے عالم میں قدرت اللہ کی طرف آیا۔ اگر بی بی سے کئے گئے وعدے کا پاس نہ ہوتا تو اس وقت قدرت اللہ کی کھوپڑی میں دو تین روشن دان کھولنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اس نے رائفل کی نال قدرت اللہ کی گردن سے لگائی اور اس زور سے دھکیلا کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اس کا منہ تکلیف کی شدت سے کھل گیا۔ ایک پاؤں سے جوتی بھی اُتر گئی۔ رستم نے رائفل کی نال پھرتی سے اس کے منہ میں ڈالی۔ وہ اس کے دانتوں سے ٹکراتی ہوئی حلق کے اندر چلی گئی۔ اس نے ابکائی لی اور پھٹی نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں بالکل لاش بن گیا تھا۔ یقیناً ان لمحوں میں اسے اپنی موت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید دم توڑتی بیوی بھی کچھ دیر کے لئے نظر سے اوجھل ہوگئی تھی۔

رستم نے ہیبت ناک لہجے میں کہا۔ ''دیکھ بہروپیے! ابھی تُو نے ایک ڈاکٹر رشید کو آوازیں دی تھیں۔ اسی طرح کا ایک ڈاکٹر بہروز بھی ہے۔ اگر تیری وجہ سے ڈاکٹر بہروز کو کچھ ہوا تو میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہوں، تجھے مار کر تیری ٹانگ میں رسی باندھوں گا اور کُتے کی طرح شہر کی گلیوں میں گھسیٹوں گا۔ اگر میں مارا گیا تو پھر یہ کام میرے ساتھی کریں گے۔ میری یہ بات ابھی کسی کاغذ پر لکھ لے اور سنبھال لے۔''

اس کے بعد گوہرا اور عارف کو اشارہ کرتے ہوئے وہ ہال کمرے کی طرف آیا۔ گوہرا اور عارف باہر کی سن گن لے رہے تھے۔ گوہرا نے قدرے اطمینان سے کہا۔ ''پولیس کی گاڑی آگے نکل گئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی خیریت ہی ہے۔''

''لیکن پھر بھی اب ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔'' عارف نے کہا۔

رستم نے رائفل ایک بار پھر اپنی چادر کے نیچے چھپالی۔ وہ ہال کمرے میں حاضرین کے پاس پہنچا۔ سرخ و سپید رنگ والا ایک موٹا تازہ سیٹھ خوف زدہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ اس کے جسم پر چڑھی ہوئی چربی دیکھ کر نہ جانے کیوں ذہن میں پہلی بات یہی آتی تھی کہ

www.pdfbooksfree.pk

یہ شخص حرام خوری کرتا ہے۔ اس کے بیوی جو عمر میں اس سے کم وبیش دس سال چھوٹی ہوگی اس کے بازو سے چمٹی بیٹھی تھی۔ رستم نے اس سے پوچھا۔ ''سیٹھ گاڑی ہے تیرے پاس؟''

''ہے جی..... لل..... لیکن۔''

''چابی نکال۔'' رستم پھنکارا۔

سیٹھ نے چابی نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ساتھ ہی بولا۔ ''پر وہ آپ سے سٹارٹ نہیں ہوگی۔ مم..... میرا مطلب ہے چور سوئچ.....''

''اوئے ایسی کم تیسی چور سوئچ کی۔'' گوہر ادھاڑا۔ ''میں تو تیری بیوی کا بھی چور سوئچ ڈھونڈ کر ایک منٹ میں سٹارٹ کرلوں گا اسے۔ چابی نکال۔''

سیٹھ نے لرزتے ہاتھوں سے چابی گوہر کے حوالے کردی۔

''کہاں ہے چور سوئچ؟'' رستم نے پوچھا۔

سیٹھ نے سوئچ کی لوکیشن بتائی۔ ''نمبر کیا ہے گاڑی کا اور رنگ؟'' رستم نے پوچھا۔

''سفید سوئفٹ ہے۔ نمبر 1866۔'' سیٹھ گوہر کا تیور دیکھ کر مشینی انداز میں بولا۔

رستم نے قدرت اللہ کے دبلے پتلے مرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چل کیکڑے! ہمیں یہاں سے باہر لے کر چل اور خبردار کوئی چالاکی دکھائی تو..... چادر کے اندر سے گولی ماروں گا اور دوسری کی نوبت نہیں آئے گی۔''

دبلے پتلے مرید نے بڑی شدومد سے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے رستم کو باور کرایا تھا کہ وہ چالاکی دکھانے کی حماقت بھولے سے بھی نہیں کرے گا۔ اس کے بعد رستم نے سکتہ زدہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے جانے کے بعد دس منٹ تک کوئی باہر نہ نکلے۔ دوسری صورت میں ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہے۔''

حاضرین اس حد تک ڈر چکے تھے کہ دس منٹ تو کیا رستم انہیں دس گھنٹے کی وارننگ بھی دیتا تو وہ بھی انہیں قبول ہوتی۔ رستم نے دبلے پتلے مرید کو ڈبی دار مفلر اس کے سر سے کھینچا اور اپنے منہ کے گرد لپیٹ لیا پھر رستم اور گوہر امرید کو اپنے آگے لگا کر ہال کمرے سے باہر نکل آئے۔ رستم اور گوہر کے ہتھیار مکمل طور پر چادروں میں چھپے ہوئے تھے۔ عارف پہرے دار کی رائفل خالی کرکے لابی میں چھوڑ آیا تھا۔ احاطے میں بس دو چار افراد ہی موجود تھے۔ ان میں سے ایک گارڈ پریشانی کے عالم میں مشتاق نامی کسی ساتھی کو آوازیں دے رہا تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ مشتاق وہی گارڈ ہے جو قریباً ایک گھنٹہ قبل اس کے ہاتھوں سے شدید زخمی ہو چکا ہے یا داعی اَجل کو لبیک کہہ چکا ہے۔ اس کے ساتھیوں کو اس کی گمشدگی کا خیال ''بڑی

جلدی'' آ گیا تھا۔

رستم مین گیٹ پر پہنچا۔ دو ہٹے کٹے پہرے دار یہاں موجود تھے۔ وہ شک کی نظروں سے رستم اور گوہر کی طرف دیکھنے لگے لیکن وہ ان دونوں کو پہچاننے میں ناکام رہے یا شاید انہوں نے پہچان کر دم سادھ لیا۔ پچھلے چند برسوں میں رستم نے بارہا یہ دیکھا تھا کہ اِکا دُکا پولیس والے اگر خطرناک اشتہاری ملزموں کو پہچان لیتے ہیں تو بھی وہ انجان بن جاتے ہیں۔ انہیں اپنی جانیں دوسرے لوگوں کی طرح ہی پیاری ہوتی ہیں۔ رستم، گوہر اور عارف تیزی کے ساتھ باہر نکل آئے۔ صرف ایک گارڈ نے دبلے پتلے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''نذیر صاحب! ابھی کتنی دیر لگنی ہے؟'' اس کا مطلب تھا کہ اندر جمی ہوئی محفل ''وجد اور کیف'' کتنی دیر چلنی ہے۔ مرید نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''بس دس پندرہ منٹ۔''

آستانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اب بھی سادہ لوح عقیدت مند موجود تھے۔ کچھ دیواروں کو ہاتھوں سے چھو رہے تھے اور کچھ حضرت صاحب کی ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔ رستم نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اسوک گرے رنگ کی مارگلہ کے ساتھ سفید رنگ کی سوزوکی سوئفٹ موجود تھی۔ نمبر 1866 تھا۔ رستم اور اس کے ساتھی کار تک پہنچے، دروازے کھولے اور بیٹھ گئے۔ چور سوئچ ڈھونڈنے میں رستم کو زیادہ دِقت پیش نہیں آئی۔ رستم نے چادر کے اندر سے ہی رائفل کی نال مرید کے پیٹ میں چبھوئی۔ وہ موت سے بچنے کے لئے سرتاپا التجا بن گیا۔ اس کے کپڑوں سے ابھی تک پیشاب کی باس اٹھ رہی تھی۔

رستم نے کہا۔ ''دس منٹ تک کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ اگر بتاؤ گے تو مجھے پتا چل جائے گا۔''

مرید نے کسی بھک منگے کی طرح ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''نہیں سر! کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

رستم کے لئے سر کے خطاب پر گوہر ایز لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

ذرا ہی دیر میں وہ تینوں سوزوکی کار پر آستانے کی مخالف سمت میں مڑ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک کار تیزی سے آستانے کے گیٹ کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نکلا۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ یقیناً یہی وہ ڈاکٹر رشید تھا جسے قدرت اللہ نے ہنگامی کال کی تھی۔

سوزوکی سوئفٹ بڑی سڑک پر آئی تو عارف نے کہا۔ ''رستم بھائی! اس سامنے والی گلی کے اندر سے نکلیں۔ یہاں میری ایک چیز رہ گئی ہے۔''

رستم نے گاڑی تیزی سے گلی میں موڑ دی۔ کچھ آگے جا کر عارف نے رستم کو گاڑی روکنے کا کہا۔ وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ فرونٹ شاپ کی چھت کے نیچے سے ہاتھ

www.pdfbooksfree.pk

ڈال کر اس نے اپنا پستول نکالا اور پھرتی سے واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک بار پھر روانہ ہوئی۔ گاڑی میں پولی تھین کی چند چھوٹی چھوٹی تھیلیاں پڑی تھیں۔ ان تھیلیوں میں آٹے کے نمونے تھے۔ ایک وزیٹنگ کارڈ بھی ملا جس سے اندازہ ہوا کہ گاڑی کا مالک آٹے کا کاروبار کرتا ہے۔ ''میاں ممتاز آٹے والے'' گوہرا نے کارڈ پڑھ کر زیرلب دہرایا۔

''خود بھی تو حرامی آٹے کے بڑے توڑے جیسا ہی تھا۔'' رستم نے کہا۔

''اور بیوی دبلی پتلی سنیارے کے ترازو جیسی۔'' عارف نے رائے ظاہر کی۔

گوہرا ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ''پتا نہیں لوگ آٹے کے توڑے کو سنیارے کے ترازو پر کیسے تول لیتے ہیں۔''

گوہرے پر صورتِ حال کی سنگینی کا ذرا بھر بھی اثر نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ان شدید خطرات کو بھی انجوائے کر رہا ہے۔ رستم کے چہرے پر بھی کسی طرح کا ہیجان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں عارف ضرور تھوڑے سے تناؤ میں تھا۔ ابھی وہ قریباً ایک کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ انہیں اپنے سامنے سے پولیس موبائلز کے تیز سائرن سنائی دیئے۔ پھر موبائلز نظر آئیں۔ یہ دو گاڑیاں تھیں اور آندھی کی رفتار سے قدرت اللہ کے آستانے کی طرف جا رہی تھیں۔ سوزوکی سوئفٹ اور پولیس موبائلز نے آمنے سامنے سے ایک دوسرے کو کراس کیا۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ آستانے میں پیش آنے والے خونی واقعے کی خبر ''بریک آؤٹ'' ہو چکی ہے۔

''اب کدھر جانا ہے سر جی؟'' گوہرا نے رستم سے پوچھا۔ رستم کو ''سر جی'' کہہ کر وہ قدرت اللہ کے خوف زدہ مرید کی نقل اُتار رہا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''سٹیشن یا بس اڈے کی طرف جانا غلط ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہر سے باہر نکلتے ہیں اور بائی دے پر پہنچتے ہیں پھر دیکھتے ہیں، کیا کرنا ہے۔''

عارف نے کہا۔ ''اس گاڑی کو جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہیے۔ پولیس والوں نے وائرلیس پر پیغام چلا دیا ہوگا۔''

رستم کے اپنے ذہن میں بھی یہی بات تھی لیکن جب تک کوئی دوسری گاڑی میسر نہ ہوتی اس گاڑی کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی وہ کچہری روڈ سے آگے نہیں گئے تھے کہ اچانک انہیں پتا چلا۔ پولیس پیچھے لگ گئی ہے۔ یہ ایک پولیس کار تھی۔ اس کی چھت پر ''ریوالونگ بلیو لائٹ'' صاف نظر آ رہی تھی۔ رستم نے جبڑے بھینچے اور گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ پولیس کار کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی سائرن کی کریہہ آواز رستم اور اس کے ساتھیوں کے کانوں میں گونجنے لگی۔ آگے ٹریفک سگنل پر کچھ رش تھا۔ رستم نے گاڑی بائیں

طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ پولیس کار بھی ذیلی سڑک پر آ گئی۔ رستم مشاقی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا تاہم اگلے دو چار منٹ میں حالات سنگین ہو گئے۔ کم از کم دو مزید گاڑیاں ان کے پیچھے لگ گئیں۔ ان کے تیز سائرن رات کا سناٹا چیرنے اور فضا میں سنسنی پھیلانے لگے۔

رستم نے پوچھا۔ ''کتنی گاڑیاں ہیں؟''

''دو تو صاف نظر آ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے تیسری موٹر سائیکل ہے۔'' عارف نے کہا۔

اس علاقے میں چھوٹی بڑی سڑکوں کا جال سا تھا۔ رستم برق رفتاری سے گاڑی کو مختلف سڑکوں پر موڑتا رہا۔ ایک موقع پر بلیو لائٹ والی پولیس کار زیادہ قریب آ گئی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ تڑتڑ کی ہیجان خیز آواز ابھری۔ پولیس کار سے سوزوکی پر تین فائر کئے گئے۔ ایک گولی گاڑی کی باڈی میں کہیں لگی۔

گوہرا نے بھنا کر ایک گالی دی اور رستم سے جوابی فائر کی اجازت طلب کی۔

''نہیں..... ابھی نہیں۔'' رستم نے تحمل سے کہا۔

سامنے سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کو رستم نے بمشکل بچایا اور اپنا رخ پھر کچہری روڈ کی طرف کر لیا۔ راہ گیروں اور دکان داروں کے چہروں پر خوف کے سائے تھے۔ پولیس گاڑیوں کے سائرن، فائرنگ کی آواز اور سفید سوزوکی کی رفتار..... یہ سب پیچھے لوگوں کو بتا رہا تھا کہ کوئی فلمی قسم کا سین یہاں حقیقت میں موجود ہے۔

کہنے کو تو رستم بھی گوہرا سے کہہ سکتا تھا کہ وہ پولیس کار پر گولی چلائے لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر پولیس والوں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا۔ پولیس نے ایک بار وقتی راستے پر راہ گیروں کی پرواہ کئے بغیر فائرنگ کی تھی، رستم ابھی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ابھی اس سے بچنا چاہتا تھا۔ اچانک رستم کے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا۔ اس کے مالتانی یار جہانگیر حسین کی موجودہ رہائش گاہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ اس وقت رستم اور گوہرا کی پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ بلیو لائٹ والی کار پھر قریب آ گئی تھی۔ گوہرا، رستم کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ کی انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی۔ اس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کہا۔ ''دو تین ہوائی فائر کر دو۔''

گوہرا نے عمل کیا۔ تاریکی میں دھماکوں سے شعلے چمکے اور پولیس کار ایک دم بہت پیچھے رہ گئی۔ رستم نے ایک رائونڈ اباؤٹ سے گاڑی کو جہانگیر کی قیام گاہ کی طرف موڑ دیا۔ اب پولیس گاڑیوں کے سائرن عقب سے ہی نہیں دائیں بائیں سے بھی سنائی دے رہے تھے تاہم

www.pdfbooksfree.pk

ابھی یہ آوازیں خاصے فاصلے پر تھیں۔ نزدیک ترین گاڑی وہی بلیو لائٹ والی تھی۔ اس کا فاصلہ 200 میٹر کے قریب تھا۔

اچانک رستم نے بریک لگائے۔ گاڑی ایک نسبتاً تنگ گلی میں داخل ہو کر رہ گئی۔ یہ نیم تاریک گلی تھی۔ گاڑی اس طرح رکی تھی کہ ذرا ترچھی ہو گئی تھی اور اس کا اگلا بمپر ایک دیوار سے ٹکرا کر پچک گیا تھا۔ یہ میاں ممتاز آنے والے کے لئے پانچ چھ ہزار کا نسخہ تو بن ہی گیا تھا۔ گاڑی ترچھی ہونے کے سبب راستہ بھی مسدود ہو گیا تھا۔ وہ تینوں تیزی سے باہر نکلے۔ ایک سائیکل سوار لڑکے نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اوپر ایک چوبارے کی کھڑکی کھلی اور پریشان چہرے والی ایک لڑکی نے نیچے جھانکا۔ وہ تینوں ہتھالی سے آگے بڑھ گئے۔ اس سے آگے شاخ در شاخ کئی چھوٹی سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ انہوں نے نیم تاریک گلیوں کا انتخاب کیا اور فرید ٹاؤن کی طرف بڑھنے لگے۔ جہانگیر کی رہائش فرید ٹاؤن میں ہی تھی۔

☆======☆======☆

آدھے گھنٹے بعد رستم، گوہر اور عارف ایک آرام دہ ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ یہ جہانگیر کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم تھا۔ جہانگیر خود بھی موجود تھا۔ اس کی عمر 30 سال سے اوپر تھی۔ وہ لمبے قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے بال لہرے دار تھے۔ ٹھوڑی کے نیچے زخم کا پرانا نشان اور روشن آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بدترین حالات میں بھی خوش رہنے اور زندگی سے رس نچوڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔ رستم سے اس کی یاد اللہ اس دور سے تھی جب اس نے ایک بدمعاش اکم ٹیکس آفیسر کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس واقعے کے بعد دونوں میں دوستی پروان چڑھی۔ جہانگیر کچھ عرصہ رستم کے ساتھ وادی سون میں بھی رہ چکا تھا۔ اب وہ مجاز کے نام سے یہاں ملتان میں مقیم تھا۔ زندگی نے جہانگیر کو بے حد تلخیاں دی تھیں لیکن وہ بہت ہنس مکھ اور کھلے دل دماغ کا مالک تھا۔ خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا اس کا مشغلہ بن چکا تھا۔

اس نے فوراً رستم اور عارف کے لئے گرما گرم چائے بنوائی..... گوہر کے لئے جانی واکر کی بوتل اور پکوڑوں کا انتظام کیا۔ اس کوٹھی میں صرف جہانگیر اور اس کا بابا عتماد ملازم نوشیر ہی رہتے تھے۔ نوشیر فی الوقت جہانگیر کا باورچی، نوکر، مخبر سبھی کچھ تھا۔ وہ بڑا کائیاں اور ہر فن مولا قسم کا شخص تھا۔

رستم اور اس کے ساتھی کھانے پینے لگے تو جہانگیر نے نوشیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اوئے نوشے! جا موٹر سائیکل لے جا اور ذرا باہر کی خیر خبر لے کر آ۔''

وہ بڑی فرماں برداری سے سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ رستم نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''جہانے! تجھے پریشان تو نہیں کیا، اس وقت آ کر؟''

جہانگیر نے بڑا برا سا منہ بنایا۔ ''اس بات کی بجائے تُو میری کھوپڑی پہ یہ بڑے والا گملا توڑ دیتا تو زیادہ اچھا تھا۔ کچھ خدا کے خوف کو ہاتھ مار رستم۔ اتنی دیر بعد بھی ہم ایک دوجے کو نہ سمجھے تو کب سمجھیں گے۔'' وہ ایک دم اداس سا نظر آنے لگا۔

رستم (زیر لب مسکرایا۔ ''اچھا بابا غلطی ہو گئی۔''

جہانگیر نے جانی واکر کی بوتل سے اپنے لئے گلاس بناتے ہوئے کہا۔ ''میری جان! ہمیں تو مزہ ہی اس بندے کو مہمان بنانے کا آتا ہے جس کے پیچھے آٹھ دس تھانوں کی پولیس لگی ہوئی ہو اور تمہاری تو بات ہی اور ہے۔ تم تو جانِ جگر ہو۔''

رستم، جہانگیر کو تفصیل سے بتانے لگا کہ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے میں کیا واقعات پیش آئے ہیں اور کیا خون خرابہ ہوا ہے۔

جس دوران میں یہ گفتگو ہو رہی تھی قریبی سڑکوں پر گاہے بگاہے پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگتے تھے۔ فرید ٹاؤن ایک خالص رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں دس مرلہ اور ایک کنال کی کوٹھیاں تھیں تاہم بڑی سڑک ٹاؤن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ نوشا واپس آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سنسنی خیز خبریں لایا ہے۔ وہ جہانگیر کو بابو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ آنکھیں گھما کر بولا۔ ''بابو شہر میں تو تڑتھلی مچی ہوئی ہے۔ پولیس سارے شہر میں بھاگی پھر رہی ہے۔ میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ لاری اڈے اور سٹیشن پر بھی پولیس پہنچ چکی ہے۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہے۔''

''آستانے کی کیا خبر ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''سنا ہے وہاں چھ سات بندے قتل ہوئے ہیں اور ان میں حضرت صاحب کی ڈاکٹر بیوی بھی ہے۔''

ڈاکٹر بیوی کا سن کر رستم اور گوہر کے کان کھڑے ہوئے۔ رستم نے پوچھا۔ ''حضرت کی بیوی کے بارے میں کیا معلوم ہوا ہے۔ وہ کیسے مری ہے؟''

''اس بارے میں زیادہ پتا نہیں چلا جی۔ صرف یہ سنا ہے کہ لاش ہسپتال میں ہے۔ باقی لاشیں بھی پولیس ہسپتال لے گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک آٹھ دس سال کی بچی یہاں کچہری روڈ کے قریب زخمی ہوئی ہے۔ اس کی گردن میں گولی لگی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس

www.pdfbooksfree.pk

ایک سفید سوزوکی کار پر گولیاں چلا رہے تھے، یہ لڑکی زد میں آ گئی لیکن پولیس والوں کا کہنا ہے کہ بچی کو کار والوں کی گولی ہی لگی ہے۔''

عارف نے رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے رستم بھائی، مجھے اب جلدی سے شانی بہن کے پاس پہنچنا چاہیے۔ پولیس والے جانتے ہیں کہ شانی بھی ملتان میں ہی ہے۔ وہ آستانے میں ہونے والے واقعے کے ڈانڈے شانی سے اور مجھ سے ملانے کی کوشش ضرور کریں گے۔''

''چلو اتنی تسلی تو ہے کہ آستانے میں کسی نے بی بی کو دیکھا ہے اور نہ تمہیں۔'' گوہر نے کہا۔

''پھر بھی جتنی جلدی شانی بہن کے پاس پہنچ جاؤں اتنا ہی بہتر ہے۔'' عارف نے کہا۔

رستم، عارف کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے عارف سے پوچھا۔ ''بی بی جی تو وہاں تمہارے پنڈ جوہر آباد میں تھیں۔ یہاں کیسے پہنچ گئیں؟''

''تاؤ کے لڑکے راجو کے لئے۔'' عارف نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''تمہیں پتہ ہی ہے کہ راجو کتنا بگڑا اکھڑا لڑکا تھا۔ وہ کسی اور کے ہاتھوں قتل ہوتا یا نہ ہوتا لیکن میرے ہاتھوں ضرور ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے میری بھتیجی صفیہ موت کے منہ میں گئی اور ہم سب کو خون کے آنسو رونا پڑا۔ تم کو یہ سب باتیں پتا ہی ہیں رستم بھائی۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ عارف بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک موقع پر میں راجو کو شوٹ کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا لیکن شانی میرے اور راجو کے درمیان آ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر اور آنسو بہا کر اس نے راجو کی جان بچالی۔ کہنے لگی جو کچھ کیا تھا راجو نے نہیں کیا تھا، اس کے باپ نے کروایا تھا۔ باپ کے جرم کی سزا اس کے نابھگت بیٹے کو نہ دو۔ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہے، وہ بہت بدل چکا ہے اور بھی بدل جائے گا۔ دیکھنا ایک دن تمہارے پاؤں پر سر رکھ کر تم سے معافی مانگے گا۔''

چند لمحے توقف کر کے عارف نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''رستم بھائی، شانی عجیب لڑکی ہے۔ انوکھی اور سمجھ میں نہ آنے والی۔ اس کی دلیلیں عقل میں نہیں آتیں لیکن پھر بھی ان میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ انہیں ماننا پڑتا ہے اور یہ بات تو کسی حد تک درست ہے کہ راجو بہت بدل گیا ہے۔ ہسپتال میں زیادہ تر میں ہی اس کے پاس رہا ہوں۔ شاید اس چیز نے بھی اس کے دل پر اثر ڈالا ہے۔ وہ میرے سامنے نظر نہیں اٹھاتا۔ کسی وقت مجھ سے التماس نظر آتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ راجو ہی نہیں اب اس کا خبیث باپ

تاؤ حشام بھی اتنا زہریلا نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔ اس کی حرام زدگیاں اب پہلے سے کم نظر آتی ہیں۔ وہ اب کئی موقعوں پر شانی کی بات سنتا ہے۔''

''کیا حشام بھی یہاں ملتان میں ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''ہاں، اصل میں کچھ دن پہلے یہاں بڑی سخت گڑبڑ ہو گئی تھی۔ شاید تم کو پتا ہو یا نہ ہو، راجو ایک لڑکی سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ یہ لڑکی پاک پتن شریف کی تھی۔ اسی لڑکی سے راجو کا دھیان ہٹانے کے لئے تاؤ نے میانہ کی حویلی میں جوان نوکرانیوں کا دستہ بھرتی کیا تھا۔ بعد میں اس نے راجو کو ان نوکرانیوں کے درمیان سرکاری سانڈ بنانے کی کوشش کی۔ بہرحال جب راجو کی عقل مت ٹھکانے پر آئی تو پاک پتن والی لڑکی کو کی کے لئے اس کا پیار پھر پوری طرح جاگ گیا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ راجو کو پتا چلا کہ چند دن بعد لڑکی کی شادی ہے۔ راجو لڑکی کے پیچھے ملتان آیا اور اس نے یہاں زہریلی گولیاں کھالیں۔ شانی بھی اس کے پیچھے بھاگی ہوئی یہاں پہنچ گئی۔ اب وہ دن رات راجو کو سنبھالنے میں لگی ہوئی ہے۔''

عارف یہ بات جان بوجھ کر چھپا گیا کہ کوکی کی شادی نارپور کے چوہدری بشیر سے ہونے جا رہی تھی۔ (وہ اس تفصیل میں پڑ کر رستم کو مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا)

رستم نے پوری بات سننے کے بعد پوچھا۔ ''مگر بی بی جی تمہارے ساتھ قدرت اللہ کے ٹھکانے پر کیسے پہنچیں؟''

''رستم بھائی! یہ سب ایک اتفاق ہی ہوا ہے۔'' عارف نے پردہ پوشی کی۔ ''شانی بی بی کب کیا کرے گی، اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ قدرت اللہ سے ملنے اور اپنی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ اسے یا مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ یہاں یہ خونی ڈرامہ ہو گا اور آپ دونوں سے بھی اس طرح ملاقات ہو جائے گی۔''

رستم گہری نظروں سے عارف کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس کے بیان کی صحت جانچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عارف نے نظر پھیر لی۔

رستم کے دل میں یہ شک موجود تھا کہ ہو سکتا ہے عارف غلط کہہ رہا ہو۔ بی بی کسی طرح آستانے میں اس کی آمد سے باخبر ہو گئی ہوں اور اسے اس کے ارادے سے روکنے کے لئے وہاں پہنچ گئی ہوں۔

اس سے پہلے کہ رستم اس حوالے سے عارف سے کوئی مزید سوال پوچھتا۔ عارف کی مشکل خود بخود آسان ہو گئی۔ جہانگیر کے ملازم خاص نوشے نے اندر آ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ ایک بار پھر باہر کا چکر لگا کر آیا تھا۔ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں رستم سے

www.pdfbooksfree.pk

مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب قدرت اللہ کی بیوی کے بارے میں تازہ بہ تازہ خبر ملی ہے۔ وہ ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں ہی مرگئی تھی۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور دونوں نتھنوں سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد قدرت اللہ کی حالت بہت پتلی ہے۔ وہ ہسپتال میں تھوڑی دیر بے ہوش بھی رہا ہے۔ قدرت اللہ کے سینکڑوں مرید اور عقیدت مند ہسپتال میں اور آستانے کے سامنے جمع ہیں۔ انہوں نے آستانے کے اردگرد کی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی ہے اور نعرے لگائے ہیں۔ وہ پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کررہے ہیں۔''

''اور کیا معلوم ہوا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

نوشیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''کچھ لوگ شک کررہے ہیں کہ شانی بی بی بھی آستانے پر موجود تھیں۔ کسی نے انہیں دیکھا تو نہیں ہے لیکن لوگوں کو شک ہے کہ وہ وہاں پہنچی تھیں۔''

نوشیر نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں آستانے کے سامنے قدرت اللہ کے دو مریدوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا میں نے ابھی اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایک مرید بی بی کو بُرا بھلا کہنے لگا تو دوسرے نے اسے سختی سے ٹوکا اور کہا کہ اگر نقاب والی لڑکی بی بی تھی تو پھر اس کو گالیاں دینے کی بجائے اس کا شکریہ ادا کرو۔ وہ نہ ہوتی تو رستم اور اس کے ساتھی سب کو بھون ڈالتے۔''

عارف اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''رستم بھائی! میرا خیال ہے کہ مجھے اب شانی بہن کے پاس پہنچنا چاہیے۔ اسے میری ضرورت ہوگی۔''

''کہاں ٹھہری ہوئی ہیں وہ؟''

''ہوٹل فاران میں۔'' عارف نے جواب دیا۔

رستم نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ پولیس بی بی کو اور تمہیں تنگ کرنے کی کوشش کرے۔ میں یہاں سے حاجی حیات کو فون کرتا ہوں۔ اگر کہتے ہو تو اسے یہاں ملتان میں بلوا بھی سکتا ہوں۔''

''نہیں۔ ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو دیکھ لیں گے۔''

''لیکن، ایک بات ذہن میں رکھنا عارف، بی بی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر اس خبیث ریاض ہٹلر کی طرف سے ہے۔ اگر وہ یا اس کا کوئی کارندہ تمہیں بی بی کے آس پاس بھی نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دو کہ اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔''

''تم بے فکر رہو، رستم بھائی۔''

رستم نے جہانگیر سے کہا کہ وہ عارف کو اپنا موبائل نمبر لکھوا دے۔ جہانگیر نے اس کی بجائے دو نمبر لکھوا دیئے۔ رستم نے کہا۔ ''تم سمجھ دار ہو عارف! تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب فون کے علاوہ ہمارا رابطہ نہیں ہونا چاہیے۔''

عارف نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ کوٹھی سے بحفاظت نکلنے کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ سب سے پہلے عارف نے لباس تبدیل کیا۔ جہانگیر کے کپڑے اسے تھوڑے سے کھلے تھے لیکن پھر بھی کام چل گیا۔

جہانگیر کے گیراج میں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک ننھی منی ایف ایکس، دوسری سیاہ رنگ کی شاندار ہونڈا۔ بڑی گاڑیوں کو ٹریفک پولیس اور پولیس ناکوں والے عموماً کم ہی روکتے ہیں۔ جہانگیر نے عارف کو نوشے کے ساتھ روانہ کردیا۔

نوشیر عرف نوشا، عارف کو چھوڑ کر قریباً ایک گھنٹے میں واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ عارف صاحب کو ہوٹل فاران میں چھوڑ کر آیا ہے۔ نوشے کے مطابق بی بی شانی بھی وہیں ہوٹل میں موجود تھیں اور عارف صاحب کا بے چینی سے انتظار کررہی تھیں۔

وہ رات رستم نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اسے بی بی کی طرف سے ان گنت اندیشے تھے۔ اس نے عارف کو تاکید کررکھی تھی کہ اگلے روز دوپہر سے پہلے پہلے وہ فون ضرور کرے اور بی بی کی خیر خیریت کے بارے میں بتائے۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے جہانگیر کے موبائل پر عارف کا فون آگیا۔ یہ فون وہ ہوٹل کے کمرے سے ہی کررہا تھا۔ جہانگیر کے موبائل کی سم فرضی نام پر تھی، اس لئے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ یہ کال ٹریس کی جاسکے گی۔

عارف نے بتایا۔ ''رات تین بجے پولیس کی ایک گاڑی ہوٹل میں پہنچی تھی۔ اس میں ڈپٹی ریاض کا ایک سب انسپکٹر ماجد تھا۔ اس نے بی بی سے پوچھ گچھ کی کہ آج رات نو اور گیارہ بجے کے درمیان وہ کہاں تھیں۔ بی بی نے بتایا کہ وہ ہوٹل میں ہی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرنے لگا۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے ایک دو سخت باتیں کیں۔ کہنے لگا میں تمہیں تھانے لے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے سب انسپکٹر اختر کو فون کیا۔ اس نے حاجی حیات صاحب سے رابطہ کرادیا۔ حاجی حیات کی ڈانٹ کھا کر سب انسپکٹر ماجد واپس چلا گیا۔''

''بی بی پریشان تو نہیں تھیں؟''

''جب ماجد مجھے تھانے لے جانے کی بات کررہا تھا، اس وقت شانی کو بھی غصہ آگیا تھا

www.pdfbooksfree.pk

لیکن پھر وہ نارمل ہو گئیں۔"

"بی بی اب کہاں ہیں؟"

"وہ راجو کے پاس ہسپتال گئی ہیں۔ آج اس کی چھٹی ہو رہی ہے۔"

"چھٹی کے بعد وہ کہاں جائے گا؟"

"پہلے تو گاؤں واپس جانے کا پروگرام تھا لیکن اب بی بی کے کہنے پر پروگرام تبدیل ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تاؤ حشام اور اس کے ساتھی یہاں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب ہسپتال سے چھٹی کے بعد راجو کو بھی ہوٹل میں لے جایا جائے گا۔ پتا چلا ہے کہ میانہ سے دو تین عورتیں بھی کل یہاں ملتان پہنچیں گی۔ یہ لوگ سیف اللہ کے گھر جا کر راجو اور کوکی کی بات پکی کریں گی۔"

"بی بی کو کیا مصیبت پڑی ہے ان چکروں میں پڑنے کی؟" رستم نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ تو بی بی ہی بتا سکتی ہیں۔" عارف نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے رستم بھائی! شانی بی بی کی وجہ سے ہمارے پورے علاقے میں نفرت اور انتقام کی آگ کچھ سرد پڑتی محسوس ہو رہی ہے۔ اب تم دیکھو کہ تاؤ حشام جیسا خونی جانور بھی اپنے مدار سے ہٹا ہوا لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بدل رہا ہے اور وہ راجو کا چچا زاد بابرا ... اس میں تو بہت زیادہ تبدیلی آئی ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو رستم بھائی! شانی نے چوہدری بشیر سے بابرے کی جان بچائی تھی۔ بابرے نے شانی کو "رکھ" میں لے جا کر اس سے دست درازی کی کوشش کی تھی لیکن پھر اسے چوہدری بشیر کے ہاتھوں سے بچانے والی بھی شانی ہی تھی۔ سنا ہے چوہدری بابرے نے شراب اور عیاشی چھوڑ ہی دی ہے۔ نماز پڑھنے لگا ہے اور ہاں، میں ایک اور بات بتانا تو بھول گیا تم سن کر حیران ہو گے۔" رستم کے استفسار پر عارف نے بتایا۔ "چند دن پہلے شانی ایک انجان انگریز بچے کو بچانے کے لئے ایک خونی ریچھ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کوشش کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے ریچھ کو شوٹ کر دیا۔ بچے کے والدین اب شانی کے نام کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ میں اس واقعے کے بارے میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔" فون لائن پر کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر رستم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "قدرت کی بیوی کی موت کا پتا لگ گیا ہے بی بی

کو؟"

"ہاں، آج صبح اخبار میں پڑھ لیا ہے انہوں نے۔ بڑی دکھی ہو گئی تھی۔ رونے لگ پڑی تھی۔ اسے تم پر بھی رنج ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سارے معاملے کا عینی شاہد ہوں۔ رستم بھائی نے اپنے وعدے کا پاس کیا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد آستانے میں کسی کو کچھ نہیں کہا۔ ڈاکٹر صدف کی موت دماغ کی چوٹ کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہ چوٹ اسے کچھ دیر پہلے سیڑھیوں سے گر کر آئی تھی۔"

رستم نے کہا۔ "عارف! اب تمہیں ایک بات کا دھیان اور رکھنا ہے۔ بی بی کے مزاج کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا خبر کہ وہ صدف کی ہمدردی میں قدرت اللہ کی طرف ہی چل پڑیں۔ خدانخواستہ انہوں نے ایسا کچھ کیا تو بہت خطرناک ہو گا۔ قدرت اور اس کے چیلے چھانٹے اس وقت "ایٹم بم" بنے ہوئے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں رستم بھائی! اپنی طرف سے تو پوری کوشش کروں گا، لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" عارف الجھے الجھے لہجے میں بولا۔ "کسی وقت لگتا ہے کہ بی بی کی وجہ سے کوئی بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا لیکن کسی وقت یہ بھی لگتا ہے کہ بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ بہرحال تم بے فکر رہو رستم بھائی، میں نے سارے معاملے پر نظر رکھی ہوئی ہے۔"

کچھ دیر مزید رستم سے گفتگو کرنے کے بعد عارف نے اجازت طلب کی۔

اسی دوران میں نوشاتین چار بڑے لفافوں میں بہت سا پھل لے آیا اور جہازی سائز کے فریج میں ٹھونسنے لگا۔ دس بارہ کلو کچی مچھلی، صاف شدہ بٹیر اور دیسی مرغی کا گوشت اس کے علاوہ تھا۔ گوہر کے لئے جانی واکر شراب کی کئی بوتلیں بھی پہنچ گئی تھیں۔

جہانگیر نے رستم اور گوہر کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کے کپڑے کافی میلے ہو چکے ہیں۔ تم نوشے کو اپنا ناپ دے دو۔ یہ خود ہی جا کر مارکیٹ سے تمہارے کچھ جوڑے لے آتا ہے۔ یہ بڑا کایاں شخص ہے۔ جو کام کرے گا ایک دم فسٹ کلاس کرے گا۔ اگر اس بندے سے تمہیں ذرا سی بھی شکایت پیدا ہو جائے تو میرا نام بدل دینا۔"

رستم نے کہا۔ "لیکن، اگر تم سے شکایت پیدا ہو تو کس کا نام بدلیں؟"

"کیا مطلب ہے شہزادے؟" جہانگیر نے لاہوری لہجے میں دریافت کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

''مطلب یہ ہے کہ اتنا لمبا چوڑا خرچا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ لمبا چوڑا خرچا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔''اوئے جانِ جگر! لمبا چوڑا خرچا تو ابھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ سب کچھ تو ابھی ہونا ہے۔تم دونوں جتنے دن یہاں رہو گے، مغل شہزادوں کی طرح رہو گے بلکہ مغل شہزادے بھی کیا شے ہیں یار! تم دیکھنا تو سہی۔''

پھر اس نے مٹھی میں گولڈ لیف کا سگریٹ دبا کر ایک طویل کش لیا اور بولا۔''یار میرے! بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کی زندگی ہے ہی کتنی۔ کچھ خبر نہیں کس وبلے گھٹی بج جائے۔ سچ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ہم ان مرغوں کی طرح ہیں جن کی گردنیں کاٹی جا چکی ہوں لیکن وہ پھر بھی بھاگے پھر رہے ہوں۔ کتنی دیر بھاگیں گے؟ آخر تو گھسن گھیری کھا کر گرنا ہی ہے۔ تو مطلب یہ ہے میرے شہزادے..... کہ جتنے دن زندہ ہیں، زندہ رہنے کا ''حق حقوق'' تو ادا کریں۔ وہ کیا کہا تھا اپنے ٹیپو سلطان نے، شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کے سو سال سے اچھی ہوتی ہے۔''

''بات ہو رہی تھی فضول خرچی کی اور ٹوکس طرف لے گیا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''یار! کیسی فضول خرچی۔ بس پانچ چھ جوڑے منگوا رہا ہوں تمہارے۔ ایک ایک ٹیلی ویژن تم دونوں کے کمرے میں۔ تھوڑی سی ولایتی شراب اور اگر گوہرے کو پسند ہو تو ملتان کے بازارِ حسن سے ایک دو ''چپل پیس'' رانجھا راضی کرنے کے لئے۔'' جہانگیر نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

رستم نے گہری سانس لی اور قدرے بے زاری سے بولا۔''دیکھ جہانے! اگر تیرے پاس کچھ پیسے ہیں تو اچھے بُرے وقت کے لئے بچا کر رکھ۔ اس طرح عیاشیوں میں نہ اُڑا۔''

جہانگیر نے رستم کی آنکھوں میں دیکھا۔''تم نے بچا کر رکھے ہوئے ہیں؟''

''مجھے بچانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اب مجھے زیادہ دیر جینا ہی نہیں ہے لیکن تیرے حالات تو اتنے خراب نہیں ہوئے۔ پولیس ابھی ہاتھ دھو کر تیرے پیچھے نہیں پڑی ہے۔''

''جینے مرنے کی بات نہ کرو۔ وہ تو کسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کیا پتا تم تیس سال اور نکال جاؤ۔ کیا پتا میں دو دن بعد پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں۔ اب کی بات کرو۔ جو کچھ ہے، آج ہے، اب ہے۔ آنے والی گھڑی کسی نے نہیں دیکھی۔ میں بھی آج کی بات کر رہا ہوں اور آج میں امیر ہوں۔ میرے پاس خرچ کرنے کے لئے بہت کچھ ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ میرے شہزادے کہ تم بھی ایسے غریب نہیں ہو۔ تمہارے پاس بھی کافی کچھ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رستم نے چونک کر پوچھا۔

''تم کچھ بھول رہے ہو میرے جگر۔'' جہانگیر استہزائیہ سے مسکرایا۔

اس سے پہلے کہ رستم کچھ کہتا، جہانگیر اٹھ کر اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا چرمی بیگ تھا۔ اس نے بیگ کی زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا۔ اندر ہی اندر کچھ گنا اور پھر ہزار ہزار کے نوٹوں کے پچیس بنڈل نکال کر رستم کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔

قریباً پچیس بنڈل مزید اندر ہی پڑے تھے۔ یعنی یہ پچاس لاکھ کے قریب رقم تھی۔ رستم حیرت سے جہانگیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہانگیر بولا۔''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں یاد آ گیا ہوگا۔ پچھلے سال ہم نے جو ناجائز قبضہ چھڑوایا تھا، یہ اسی کی قیمت ہے۔''

رستم کو یاد آ گیا تھا۔ یہ قریباً پندرہ بیکڑ زمین لاہور کے انڈسٹریل ایریا میں تھی۔ ایک بدنام قبضہ گروپ جس کا سرغنہ ایک اجرتی قاتل فیاض جگی تھا، اس زمین پر اپنے پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ رستم اور جہانگیر نے مل کر یہ ناجائز قبضہ چھڑوایا تھا۔ اس کام کی طے شدہ رقم 50 لاکھ تھی۔ زمین کا مالک اتنی رقم دے کر کبھی بہت فائدے میں رہا تھا۔ اگر وہ مقدمے بازی میں پڑتا تو کہیں زیادہ رقم خرچ ہوتی اور پتا نہیں کہ کتنا عرصہ لگتا۔

50 لاکھ کے نصف 25 لاکھ روپے رستم کے سامنے پڑے تھے۔ یہ بہت بڑی رقم تھی لیکن رقم بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی۔ رقم کی ''قدر و قیمت'' انسان کی ضرورت متعین کرتی ہے اور رستم کے لئے اس بڑی رقم کی قدر و قیمت بڑی نہیں تھی۔ اتنے روپے کا اس نے کیا کرنا تھا۔ کہاں لے جانا تھا؟

وہ خالی نظروں سے نوٹوں کے اس ڈھیر کو تکتا رہا پھر اچانک اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک نمودار ہوئی۔ بالکل مدھم اور غیر محسوس چمک۔ اس نے نوٹوں کو ذرا دھیان سے دیکھا پھر جہانگیر کا چہرہ دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی ایک دو لکیریں نمودار ہوئیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' جہانگیر نے مسکرا کر پوچھا۔

''بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔''

''سارے کے سارے؟'' جہانگیر نے پوچھا۔

''ہاں سارے کے سارے، بس تھوڑے سے نکال لو ہمارے خرچے کے لئے۔''

''خرچے کی بات اس وقت کرنا جب یہاں سے جاؤ گے، ابھی تم میرے مہمان ہو۔ خرچے شرچے کا لفظ تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔'' وہ پھنکارا۔

www.pdfbooksfree.pk

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کیا طریقہ ہو کہ اگلے دس پندرہ دن میں، میں دس پندرہ لاکھ روپیہ تم دونوں پر اور خود پر خرچ کر سکوں۔''

''اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے لالے دی جان۔'' گوہرا نے کہا۔ ''ہزار کے نوٹ سے سگریٹ سلگاؤ، ہزار ہزار کے نوٹوں سے چولہا جلاؤ اور ہزار ہزار کے نوٹوں کا بستر بنا کر اس پر لیٹو۔ جب نوٹوں کی استری ٹوٹ جائے تو نئے نوٹ بچھا لو۔''

''اونہیں یار اور بھی کئی طریقے ہیں۔ میں تجھے بتاؤں گا۔'' جہانگیر نے کہا۔

''مثلاً؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''مثلاً، پنجابی فلموں کی مشہور ہیروئن بلکہ سب سے بڑی ہیروئن کو جانتے ہو؟''

''عمر میں تو ساری بڑی ہیں۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''عاصمہ کی۔''

''ہاں جانتا ہوں بڑی پٹاخا شے ہے لیکن وہ تمہارے پیسوں کا کیا حل نکالے گی؟''

''تم پیسے کی بات کر رہے ہو..... کھوتے! وہ تو پوری پوری نکسال کھا جاتی ہیں۔''

ایک دم گوہرا کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ پرانا رنگین مزاج تھا۔ جہانگیر کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر ذرا اداس لہجے میں بولا۔ ''لیکن یار! یہ اسکرین کی پریاں تو بڑی اونچی ہوا میں ہوتی ہیں۔''

''کوئی اونچی ہوا شوا نہیں ہوتی، بس ساری پیسے کی کھیڈ ہے۔ پیسا ہو ناں تو قسم پیدا کرنے والے کی تین دن بعد دبئی یا لندن میں سری دیوی تیرے باتھ روم میں نہا رہی ہوگی.....''

رستم نے بُرا سا منہ بنایا۔ جہانگیر نے ذرا شریر نظروں سے رستم کو دیکھا اور گوہرا کا بازو دباتے ہوئے بولا۔ ''چل آ ذرا پاسے ہو کر بیٹھتے ہیں۔ اِدھر باتیں کریں گے تو اپوزیشن کھڑا ک شروع کر دے گی۔''

اگلے دو تین روز میں جہانگیر نے ان کی میزبانی پر پوری پوری توجہ دی۔ پتا نہیں، وہ کہاں سے ایک زبردست قسم کا خانساماں لے آیا۔ یہ شخص فوج کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ پاکستانی، چائنیز اور مغلائی کھانوں میں اسے زبردست مہارت حاصل تھی۔ وہ ہر طرح سے جہانگیر کے لئے قابلِ اعتماد بھی تھا۔ جہانگیر نے دو جہازی سائز کے ویڈیو سسٹمز کے علاوہ کچھ قالین اور تھوڑا سا فرنیچر بھی منگوا لیا تھا۔ یہ سب اشیاء نہایت قیمتی اور لگژری اسٹائل کی تھیں۔ اگلے دن

www.pdfbooksfree.pk

رستم نے دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا۔ دو عدد زبردست شاور کیبن ایک ٹرک پر لدے چلے آ رہے تھے۔

رستم نے بھنا کر کہا۔ ''یار جہانے! یہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ ہمیں آٹھ دس دن سے زیادہ یہاں نہیں رہنا اور تم آٹھ دس برسوں کا انتظام کر رہے ہو۔''

''آٹھ دس دن تو نہیں، تمہیں کم از کم پندرہ بیس دن یہاں رہنا پڑے گا۔ پولیس والے شہر کے کونے کونے میں تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں اور جان جی! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے یہ دس پندرہ دن اتنے مزے میں گزریں کہ دس پندرہ مہینوں کی کسر پوری ہو جائے۔'' تب ایک بار پھر اس نے اپنا پسندیدہ گانا دہرایا۔

یہ زندگی کے میلے، دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس یار، ہم نہ ہوں گے

وہ جب بھی یہ بول بولتا تھا ان میں ''یار'' کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیتا تھا۔ اخباروں میں آستانے کے بارے میں تواتر سے خبریں چھپ رہی تھیں۔ آستانے میں ہلاک ہونے والے پانچ افراد کے قتل کی ذمے داری سوفیصد رستم پر ڈالی جا رہی تھی۔ اسے ایک سفاک اور بے رحم قاتل قرار دیا جا رہا تھا۔ کرائمز رپورٹرز نے اس امر کو خاص طور سے اجاگر کیا تھا کہ رستم نے حضرت صاحب کی شدید زخمی بیوی کو ہسپتال پہنچائے جانے سے روکا اور اس امر پر اصرار کیا کہ اس کا علاج آستانے میں ہی روحانی طریقے سے کیا جائے۔ رستم کے اس بے جا اور بے رحم اصرار کی وجہ سے حضرت صاحب کی بیوی کی جان گئی۔

کچھ پڑھے لکھے لوگ اس صورتِ حال کو دوسرے زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے قدرت اللہ کی اس بہیمانہ منافقت کو محسوس کیا تھا جسے رستم نے اجاگر کرنا چاہا تھا۔ ایک کالم نگار نے لکھا تھا جس وقت قدرت اللہ کی بیوی بے ہوشی کا شکار ہوئی عین اس وقت ایک اور لڑکی بھی اسی قسم کی بے ہوشی میں مبتلا ہو کر قدرت اللہ کے سامنے مریضہ کے طور پر موجود تھی۔ قدرت اللہ اور اس کی بیویاں اس مریضہ پر اپنے ٹونے ٹوٹکے آزما رہے تھے۔ قدرت اللہ نے اس مریضہ کو ہسپتال پہنچانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا۔ اسی قسم کی رائے کچھ اور لوگوں نے بھی ظاہر کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ قدرت اللہ اور اس نوع کے دوسرے لوگ روحانی علاج کے نام پر سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ کینسر، ایڈز اور کالے یرقان جیسی بیماریوں کا علاج مٹی اور راکھ سے کرتے رہتے ہیں اور جب مریض لاعلاج ہو جاتے ہیں تو ان کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں..... اسی حوالے سے اخبارات میں ایک بحث سی شروع

ہوگئی تھی۔

دوسری طرف پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے قدرت اللہ کے ہزاروں مرید بھی بے حد اشتعال کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان مریدوں اور عقیدت مندوں میں ہر طبقے کے خواص و عام شامل تھے۔ یہ لوگ رستم کے ساتھ ساتھ پولیس کے محکمے کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر پولیس، رستم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف بروقت کارروائی کرتی تو یہ سانحہ رُونما نہ ہوتا۔ کچھ جگہوں پر ان لوگوں نے توڑ پھوڑ بھی مچائی تھی۔ خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس پریشر کی وجہ سے پولیس کی کارروائیوں میں کچھ تیزی آئی ہے۔

یہ تیسرے چوتھے دن کی بات ہے۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ رستم شاور کیبن میں نہا کر باہر نکلا اور تولیے سے اپنے سر کے لمبے بال پونچھتا ہوا کامن روم کی طرف آیا۔ یہاں فرش پر فرانسیسی شراب کی دو بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ ادھ کھائے چرغے پڑے تھے اور تاش بکھرے ہوئے تھے۔ رستم تو سو گیا تھا لیکن رات ڈھائی تین بجے تک گوہر اور جہانگیر کی محفل جمی رہی تھی۔ نوشا بھی اس محفل میں شریک تھا۔ رستم کو بیڈ روم میں گاہے بگاہے جہانگیر کی بے سُری آواز سنائی دیتی رہی تھی۔

یہ زندگی کے میلے، دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس یار، ہم نہ ہوں گے

اس آواز میں کسی وقت گوہر کی مخمور آواز شامل ہو جاتی تھی۔ وہ تال دینے کے لئے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا تھا اور پٹھو ہاری لب و لہجے میں گاتا تھا۔

بھٹی بھنا چھولے
اج مینڈے ماہی آونا، کوٹھے تے کاں بولے

رستم نے تاش کے پتے سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور ادھ کھائے چرغوں کے ٹکڑے بلیوں کے لئے گیراج کی چھت پر پھینک دیئے۔ اچانک وہ ٹھٹکا۔ ڈرائنگ روم کی طرف سے کسی عورت کے رونے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ رستم نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اسے ڈرائنگ روم کا منظر نظر آیا۔ ایک جوال سال عورت گود میں ایک خوبرو بچہ لئے جہانگیر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ وہ بڑے التجا آمیز لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔

اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بالوں کی لمبی چوٹی اس کی

پنڈلیوں پر جھول رہی تھی۔ اس کی گود کا ڈیڑھ دو سالہ بچہ، ماں کی حالت سے بے خبر چوٹی سے کھیل رہا تھا۔ پھر رستم نے دیکھا کہ جواں سال عورت نے روتے روتے جہانگیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور نیچے جھک کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔

جہانگیر کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے شفقت کے انداز میں لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی آمیز لہجے میں کچھ کہا۔

تب رستم نے دیکھا کہ جہانگیر ڈرائنگ روم سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رستم نیم تاریکی میں تھا۔ ڈرائنگ روم میں روشنی تھی لہٰذا اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ لڑکی صوفے پر بیٹھ کر سسکنے لگی۔ گاہے بگاہے وہ اپنے بچے کا سر بھی چوم لیتی تھی۔ وہ شکل و صورت سے واقعی مصیبت زدہ لگتی تھی۔ جہانگیر اب ساتھ والے کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی مدھم آواز اب رستم کے کانوں تک پہنچنے لگی تھی۔

''جی وکیل صاحب..... میں مجاز ملک بول رہا ہوں۔'' جہانگیر نے کہا۔ ''جی ہاں..... جی ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔'' کچھ دیر تک وہ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا پھر بولا۔ ''میں آپ کی طرف ایک لڑکی بھیج رہا ہوں جی، میری بہن ہی سمجھیں جی۔ بے چاری مشکل میں ہے۔ اسے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کا شوہر پولیس حراست میں ہے..... جی ہاں..... جی ہاں۔ باقی باتیں یہ خود آ کر آپ کو بتا دے گی۔ اس کا بڑا بھائی بھی ساتھ ہوگا۔ ٹھیک ہے جی، بہت مہربانی۔ میں احسان مند ہوں۔''

جہانگیر نے فون بند کر دیا۔ وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں یقیناً رقم تھی اور اگر رستم کے اندازے کے مطابق یہ ہزار ہزار والے نوٹ تھے تو رقم یقیناً تیس چالیس ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ وہ ایک بار پھر ہمدردی کے انداز میں لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ رستم کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد لڑکی رخصت ہوگئی تو رستم نے جا کر جہانگیر سے پوچھا۔ ''یہ کُڑی کون تھی جہانے؟''

جہانگیر کے چہرے پر قدرے تشویش نظر آئی۔ کہنے لگا۔ ''ڈیرے پر تجھے اپنا پرانا ساتھی کاٹھیا یاد ہے ناں؟''

''ہاں ہاں۔'' رستم چونک کر بولا۔ ''میں ابھی چھ سات دن پہلے اس سے ملا ہوں۔ وہ ڈیرے پر ہی ہے۔''

''یہ کاٹھیا کے چھوٹے بھائی خیام کی بیوی ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، خیام اپنے پانچ

www.pdfbooksfree.pk

ساتھیوں سمیت وڈے ڈیرے کے پاس سے پکڑا گیا ہے۔''

''وڈے ڈیرے کے پاس سے؟'' رستم نے حیران ہوکر پوچھا۔

''ہاں، بُری خبر یہ ہے کہ پولیس نے علاقے میں اپنا آپریشن شروع کردیا ہے۔ وڈے ڈیرے کے آلے دوالے بڑا سخت گھیرا ڈالا گیا ہے۔ اب ڈپٹی مدیاض اور اس کا عملہ اس گھیرے کو تنگ کرتا جارہا ہے۔ تین دن سے وہاں مسلسل فائرنگ ہورہی ہے۔ کئی لوگ مرے ہیں اور کچھ پکڑے بھی گئے ہیں۔''

رستم سخت تشویش اور سناٹے کے عالم میں یہ خبریں سنتا رہا۔ جہانگیر گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ نیا سگریٹ سلگا کر وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم بڑے اچھے وقت پر نکل آئے ہو۔ اب وہاں حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔ لگتا ہے کہ پولیس نے وہاں بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے۔''

''یہ خیام کی بیوی کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس بے چاری نے کیا کہنا ہے۔ یہ وہ سب کچھ بھگت رہی ہے جو اس جیسیوں کا نصیبا ہوتا ہے۔ یہ دو سال سے آس لگائے بیٹھی تھی کہ خیام ایک دن اچانک آئے گا۔ اس کے پاس ویزے اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ ہوں گے۔ وہ اسے اور بچوں کو اپنے ساتھ دبئی لے جائے گا جہاں خیام کے پیچھے پولیس نہیں ہوگی، نہ ہی وہ ایک اشتہاری ڈکیت کی بیوی کہلائے گی۔ وہ وہاں ایک نئی زندگی شروع کردیں گے لیکن تمہیں پتا ہی ہے یار! ایسے سپنے کہاں پورے ہوتے ہیں۔ خیام وڈے ڈیرے سے پکڑا گیا ہے۔ اب خوشاب کے کسی تھانے میں اس کی زبردست چھترول ہورہی ہے۔ اس کی بیماراں رو رو کر مرنے کے قریب ہے اور یہ بے چاری اس خوف سے کانپ رہی ہے کہ پولیس والے اس کے بندے کو ٹارچر کر کے مار ڈالیں گے یا پھر پولیس مقابلے میں پار کردیں گے۔ یہ بات تو وہ بھی جانتی ہے کہ وہ اب رہا نہیں ہوسکتا لیکن چاہتی ہے کہ وہ کم از کم تھانے سے چھوٹ کر جیل پہنچ جائے۔ یار! یہ بندہ بھی کیا شے ہے۔ اوپر والا اس مٹی کے پتلے کو کیسے کیسے توڑتا موڑتا ہے۔ جیل جانا کون پسند کرتا ہے لیکن یہ عورت دن رات بھاگ دوڑ کر کے اپنے بندے کو جیل پہنچانا چاہ رہی ہے۔''

یوں تو رستم، جہانگیر کی باتیں سن رہا تھا مگر اس کا دھیان وڈے ڈیرے اور وہاں کے حالات کی طرف تھا۔ وہ یہاں جہانگیر کی شاندار کوٹھی میں عیش کررہا تھا اور وہاں قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس نے گوہرا کو جگا کر اسے سب کچھ بتایا پھر موبائل فون پر اپنے مخبر خاص نظام سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چار

پانچ منٹ بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری طرف سے ہلکے سے شور کے ساتھ نظام کی آواز ابھری۔ ''کون؟''

''میں رستم بول رہا ہوں۔''

''اوہ خدایا! آپ کہاں ہیں؟'' نظام نے کانپتی آواز میں کہا۔

''تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ ڈیرے کے کیا حالات ہیں؟''

''کچھ نہ پوچھیں جی۔'' نظام کی آواز رندھ گئی۔ ''لگتا ہے کہ ڈپٹی ریاض اور اس کی نفری نے وہاں کسی کو نہیں چھوڑنا۔ بڑے وسیع پیمانے پر آپریشن شروع ہوا ہے جی..... ڈپٹی ریاض کے علاوہ اور بھی کئی بڑے افسر اس آپریشن میں شامل ہیں۔ کئی سو پولیس والے حصہ لے رہے ہیں۔ اجرال برادری کے کچھ مقامی لوگ بھی پولیس کے ساتھ ہیں۔ پرسوں ایک اجرالی سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ ڈپٹی ریاض صاحب بالکل آتش فشاں بنے ہوئے ہیں۔ ان پر رستم نے باقاعدہ حملہ کیا ہے اور پولیس پارٹی پر دستی بم بھی پھینکا ہے۔ آج سویرے میں نے ایک ہیلی کاپٹر بھی وادی کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ پتا چلا ہے کہ پچھلے تین دن سے وہاں مسلسل فائرنگ ہورہی ہے۔ پولیس والے گھیرا تنگ کرتے جارہے ہیں۔ نہ کوئی علاقے سے باہر آسکتا ہے نہ اندر جاسکتا ہے۔''

''لالہ فرید اور حسنا وغیرہ کی کیا خبر ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''وہ ابھی تک تو خیریت سے ہیں۔ کل شام سیٹ (وائرلیس) پر ان دونوں سے بات ہوئی ہے۔ جس وقت بات ہورہی تھی اس وقت بھی فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ڈیرے پر خوراک کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ بہت سے بندے مرے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں لیکن پھر بھی وہاں لوگوں کے حوصلے بلند ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ پولیس کو زیادہ آگے نہیں آنے دیں گے۔'' رستم نے نادیہ کی خیریت کے بارے میں پوچھا۔ نظام کو اس بارے میں معلوم نہیں تھا تاہم اس نے بتایا کہ ڈیرے پر موجود چاروں پانچوں عورتیں خیریت سے ہیں۔''

رستم نے پوچھا۔ ''مراد، ناصر اور کاٹھیا وغیرہ کا کیا حال ہے؟''

''وہ بھی خیریت سے ہیں جی..... لیکن دلاور کے بارے میں بُری خبر ہے۔ دلاور کو جانتے ہیں ناں آپ؟''

''ہاں..... ہاں، کیا ہوا اسے؟''

''وہ مارا گیا ہے۔ وہ پرسوں شام گشت پر تھا۔ اتنے میں فائرنگ شروع ہوگئی۔ رائفل کا برسٹ اس کی چھاتی پر لگا۔ چار اور بندے بھی مارے گئے۔ اس واقعے کا لالہ پر بڑا اثر ہوا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ دلاور پر اسے بڑا بھروسہ تھا لیکن..... لیکن آپ کہاں ہیں؟''

نہ جانے کیوں رستم نے خود کو ایک دم قصوروار محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا جہاں وہ ہے۔ اسے اپنے دکھ سکھ کے ساتھیوں کے پاس ہونا چاہیے تھا جن کے ساتھ اس کے جینے مرنے کے پیمان تھے، وہ وہاں ڈپٹی سیاض کے جان لیوا گھیرے میں زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار تھے اور وہ یہاں نت نئی ڈشیں کھانے اور اسٹیم باتھ لینے میں مصروف تھا۔

''ہیلو۔ رستم صاحب! ہیلو، آپ بول نہیں رہے۔'' نظام نے پریشان ہو کر کہا۔

رستم نے گہری سانس لی اور پوچھا۔ ''فرید یا حسنے نے میرے بارے میں کوئی بات کہی تھی؟''

نظام بولا۔ ''ہاں، لالہ فرید نے آپ کے اور گوہر ابھائی کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے کہا مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ لالہ نے کہا کہ اگر آپ سے میرا رابطہ ہو تو میں آپ کو بتا دوں کہ یہاں سون میں حالات بڑے خراب ہو گئے ہیں۔ آپ اب وہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔''

رستم کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے خود سے پوچھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ وہاں اس ویرانے میں جمعہ کے بیاسے موت کا مقابلہ کریں اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے روپوش رہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا۔

پھر وہ نظام سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب اگر لالے وغیرہ سے تمہاری بات ہو تو انہیں بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں اور ان سے زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت جلد ان سے ملاقات ہو۔''

''وائرلیس پر یا.....؟''

''کسی بھی صورت میں۔'' رستم نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''میں آج کسی وقت تم سے پھر بات کروں گا۔ تم فون پر مل جاؤ گے ناں؟''

''ہاں جی! دوپہر کو صرف ایک گھنٹے کے لئے میں نے کہیں جانا ہے۔ پھر یہیں رہوں گا۔''

رستم نے سلسلہ منقطع کیا اور ایک بار پھر بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

خانساماں کرامت نے لمبا چوڑا ناشتہ ڈائننگ روم میں سجا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ناشتہ نہیں یورپی ڈنر سجا ہوا ہے۔ وہ صبح چار بجے سے اپنے کام پر جت جاتا تھا۔ ناشتے میں

سینڈوچ، سوپ، حلوہ پوری، نہاری، آملیٹ، چکن ونگز، فروٹ جوسز اور پتا نہیں کیا کیا شامل تھا۔ پوری کوٹھی مہکنے لگی تھی۔ جہانگیر اور گوہر دونوں خوش خوراک تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے ناشتے کی میز پر بیٹھتے تھے لیکن آج وہ دونوں بھی کچھ افسردہ نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ سون سے آنے والی خبریں تشویش ناک تھیں۔

''چلو رستم، تھوڑا سا کھا لو۔'' جہانگیر نے کہا۔

''نہیں بالکل بھوک نہیں۔'' رستم نے کہا اور صرف چائے کا ایک کپ لے لیا۔

رستم کی کیفیت دیکھ کر گوہر اور جہانگیر نے بھی ہاتھ کھینچ لئے۔ یہ ناشتہ جو کم و بیش پندرہ آدمیوں کے لئے کافی تھا ویسے کا ویسا ہی میز پر پڑا رہ گیا۔ تینوں سر جوڑ کر نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ وہ کافی دیر تک تازہ صورت حال پر بات کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد مطلع ابر آلود ہونا شروع ہو گیا۔ ہوا بھی چلنے لگی۔ رستم کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ وہ اٹھا تو ان کی میٹنگ پھر شروع ہوئی۔

''اب کیا کرنا ہے لالے دی جان؟'' گوہر نے رستم سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا جوش بھی تھا۔

رستم کی بجائے جہانگیر نے جواب دیا۔ وہ وہسکی کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔ ''ہمیں جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں تم دونوں کو یہ رائے ہرگز نہیں دوں گا کہ تم واپس سون کی طرف جاؤ۔ یہ تو سراسر بے وقوفی ہوگی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' گوہر نے گلاس بھرتے ہوئے پوچھا۔

''بہتر یہ ہے کہ تم سون سے باہر رہ کر ساتھیوں کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔''

''باہر رہ کر کیا کر سکتے ہیں؟'' رستم نے ذرا تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''رستم! پولیس کے محکمے میں تمہارے تعلقات ہیں۔ مجھے پتا ہے اور بھی دو چار لوگ تمہاری بات سنتے ہیں۔ تم کسی طرح لالے اور ساتھیوں کو گھیرے سے نکالنے کی کوشش کر سکتے ہو۔''

''میں حاجی حیات کے سوا کسی بااثر کو نہیں جانتا اور حاجی حیات بھی محکمے کا حاضر سروس ملازم ہے۔ وہ بس ایک حد تک ہی جا سکتا ہے۔ سون میں ہونے والا آپریشن بڑے بڑے مگرمچھوں کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ حاجی حیات وہاں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''مجھے پتا ہے، لاہور کا ایک منسٹر بھی تمہیں فون کرتا رہتا ہے۔ تم نے اس کی خاطر انڈین اسمگلر گروجیت کو پار کیا تھا۔''

www.pdfbooksfree.pk

''لیکن مجھے تم سے زیادہ پتا ہے، وہ منسٹر بھی آج کل زیرِ عتاب ہے۔'' رستم نے بھی گلا اس بھرتے ہوئے کہا۔

اچانک رستم کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز سن کر رستم کے چہرہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ بی بی تھی۔

''جج..... جی بی بی..... کک کیسے فون کیا؟''

جو جواب ملا، وہ مزید پریشان کن تھا۔ بی بی نے کہا۔ ''رستم! میں تمہاری طرف آ رہی ہوں۔''

''میری طرف..... لیکن..... میں تو.....'' وہ ایک بار پھر ہکلا کر رہ گیا۔

بی بی نے کہا۔ ''میں تمہاری رہائش سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ بس چار پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

رستم کے ماتھوں سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس نے چند لمحے بعد ذرا سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! پولیس ہمیں ہر جگہ ڈھونڈ رہی ہے۔ کہیں آپ کا پیچھا کرتے ہوئے.....''

''نہیں..... نہیں۔'' بی بی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''ہم پوری احتیاط کر کے آ رہے ہیں۔ اس بارے میں بے فکر رہو۔''

بی بی جمع کا صیغہ استعمال کر رہی تھیں۔ رستم سمجھ گیا کہ عارف بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے عارف پر غصہ آیا۔ رستم نے اسے تاکید کی تھی کہ بی بی کو یا اسے خود یہاں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔ وہ نا سمجھ نہیں تھا لیکن اس سے ناسمجھی والا کام ہوا تھا۔

رستم کی چھٹی حس نے گواہی دی تھی کہ بی بی یہاں اسے سمجھانے بجھانے کے لئے آ رہی ہے۔ اس نے آ کر یقیناً یہی کہنا تھا کہ وہ موت کی اس یورش سے بچ کر کہیں دور نکل جائے۔ اتنی دور کہ اس کے ساتھ زندگی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

لیکن وہ ایسے کیسے کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا اور آج ملنے والی اطلاعات کے بعد تو یہ کام بالکل ہی خارج از امکان ہو گیا تھا۔ وقت ایک بار پھر اسے بدترین جنگاموں اور خطرات کی جانب کھینچ رہا تھا۔

رستم کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے ایک فیصلہ کیا۔ اگر بی بی ایک بار اسے منع کر دیتی تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا تھا پھر بی بی کے حکم پر عمل کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہنا تھا پھر وہی کچھ ہونا تھا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا۔ بی بی کے حکم پر اس نے بلا چوں و چرا رنگ والی کی حویلی چھوڑی تھی۔ بی بی کے حکم پر اس نے تاؤ حشام جیسے

درندے اور اس کے بیٹے کی جان بخشی کی تھی اور اب بی بی کے حکم پر اس نے قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کو معاف کیا تھا۔

اب وہ چاہتا تھا کہ بی بی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خود کچھ کہہ ڈالے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو بی بی کے یہاں آنے سے پہلے ہی کہیں دور نکل جائے۔ وقت بہت کم تھا۔ اسے جو فیصلہ بھی کرنا تھا بہت جلدی کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے جہانگیر کو اشارہ کیا کہ وہ وہسکی کی بوتلیں اور سگریٹوں کے پیکٹ وغیرہ یہاں سے ہٹا دے۔ جہانگیر کی ہدایت پر نوشا کمرے کی صفائی کرنے لگا۔ رستم بے قراری سے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ بی بی سے بات ہونے کے بعد اب اس کے لئے یہ بھی آسان نہیں تھا کہ یہاں سے نکل جاتا۔ اسی دوران میں کوٹھی سے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد کال بیل ہوئی۔ رستم کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اور بی بی نشست گاہ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بی بی آج سیاہ برقعے میں نظر آ رہی تھی۔ صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں۔ وہ اس روپ میں بھی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ رستم کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔ نظروں کے یوں پھیرنے میں اس کے دل پر جو گزر رہی تھی یہ وہی جانتا تھا۔ یہ پودے کو جڑوں سے کھینچنے کا عمل تھا۔ یہ جان کو جسم سے نکالنے کی روداد تھی۔

شانی نے کہا۔ ''رستم! تم عارف سے ناراض مت ہونا۔ یہ مجھے یہاں نہیں لایا ہے، میں لائی ہوں اور مجبور کر کے لائی ہوں۔ اس میں عارف کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

رستم بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ رستم نے بہتر سمجھا کہ وہ اس خاموشی کو توڑنے میں پہل کرے۔ وہ بولا۔ ''بی بی! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں بڑی پریشان کن خبریں ملی ہیں۔ ان خبروں کا تعلق وڈے ڈیرے سے ہے۔ وڈے ڈیرے پر پولیس کا بڑا آپریشن شروع ہو گیا ہے۔ وہ لوگ ڈیرے کا گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔''

شانی نے ایک دکھ بھری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لگ رہا تھا کہ اب ایسا ہی ہونا ہے۔''

رستم کبھی کبھار شانی کے چہرے کی طرف نظر اٹھاتا تھا۔ عموماً یہ نظر تب شانی کے چہرے پر پڑتی تھی جب اسے کوئی خاص بات کہنا ہوتی تھی۔ اس نے بی بی کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا۔ ''بی بی! میں نے وڈے ڈیرے سے آتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر زندہ بچ گیا تو واپس آؤں گا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اس مصیبت کے وقت میں ان کے پاس واپس پہنچوں۔ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے چونک کر رستم کی طرف دیکھا۔ رستم نے اپنی بات عام سے الفاظ میں کہی تھی لیکن الفاظ کے پیچھے جو توانائی، طاقت اور التجا تھی اس نے شانی کو اندر تک ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر رستم کی گہری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس جگہ واپس جاؤ گے جہاں سے نکلنے کے لئے تمہارے ساتھی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ مر رہے ہیں اور مار رہے ہیں۔''

''میں وہاں جانے کی بات نہیں کر رہا ہوں بی بی۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں انہیں اس موقع پر اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق جو کچھ کر سکتا ہوں وہ کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس نے وڈے ڈیرے کو ایک بڑے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم دو جگہیں ایسی ہیں جہاں سے یہ گھیرا کافی کمزور ہوگا۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو رستم؟''

''ابھی میرے دماغ میں کچھ صاف نہیں ہے بی بی لیکن میرا خیال ہے کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر ہم پانڈو نامی جگہ پر پولیس کو عقب میں الجھا لیں تو گھرے ہوئے ساتھیوں کو باہر نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اگر ایک دفعہ وہ گھیرے سے نکل گئے تو پھر سون کی بھول بھلیوں میں جان بچانے کی بڑی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ نے ان ٹیلوں کو دیکھا ہی ہے۔ وہ ہمیشہ زبردست پناہ گاہ ثابت ہوئے ہیں۔''

شانی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس سے پہلے اس کی نگاہیں رستم کی نگاہوں سے ملیں۔ رستم کی آنکھوں میں اسے عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ ان آنکھوں میں گہرے کرب کے ساتھ ایک بے تاب التجا اس طرح شامل ہوگئی تھی کہ وہ گنگ ہوگئی۔ اسے لگا، رستم خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے، بی بی..... آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگ رہا ہوں۔ مجھے رکنے کا حکم نہ دیں۔

شانی کے سینے سے ایک گہری ہوک اٹھی۔ اسے لگا کہ وہ بیٹھے بیٹھے پتھرا گئی ہے۔ رستم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کہے گی وہ رستم مان لے گا۔ اگر ابھی مرنے کا حکم دے گی تو وہ بلا تامل اپنی جان بھی لے لے گا لیکن کیا رستم کی آنکھوں میں اس کی التجا پڑھنے کے بعد وہ کوئی دوٹوک حکم دے سکتی ہے؟ رستم کے الفاظ کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔

''اب میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اس مصیبت میں ان کے پاس پہنچوں۔ اگر ایسا نہ کر سکا تو اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔''

اچانک رستم کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی۔ یہ فون سیٹ ان سیٹوں میں سے تھا جو

رستم اور گوہر نے آستانے سے تلاشی کے دوران میں جمع کئے تھے۔ اب اس میں دوسری سم ڈالی گئی تھی۔ رستم نے شانی سے اجازت لے کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف نظام تھا۔ رستم نظام سے بات کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شانی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ عارف نے اسے اشارہ کیا، شانی عارف کے ساتھ برآمدے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر جا بیٹھی۔

عارف نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''شانی بہن! یہ سب کچھ وہی ہو رہا ہے جس کا مجھے اور تمہیں اندیشہ تھا۔ رستم دن بدن زندگی سے دور جا رہا ہے۔ اب وہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس جانا چاہتا ہے۔ یہ سراسر خودکشی ہے اور بعض اوقات اسے بے وقوفی بھی کہیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ رستم بھائی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ وہ سون میں جائے گا اور وہاں لالہ وغیرہ کے ساتھ ہی مارا جائے گا ... یا پھر پکڑا جائے گا اور پھانسی کے پھندے پر پہنچ جائے گا۔''

''یہ سب کچھ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔'' شانی کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔

''میرا ایک مشورہ ہے شانی بہن! اگر تم مان لو تو۔ میں سمجھتا ہوں کہ بس اس مشورے پر عمل کر کے ہی تم رستم کو جانے سے روک سکتی ہو۔ اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔'' شانی سوالیہ نظروں سے عارف کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''جہاں تک میں رستم کی نیچر کو سمجھا ہوں وہ یاروں کا یار ہے۔ رشتوں ناتوں کے لئے سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اب رشتوں ناتوں کے لئے ہی وہ پھر سے سون میں جانے کا سوچ رہا ہے ناں۔ اپنے یاروں کے کندھے سے کندھا ملانے کے لئے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

عارف نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم رستم بھائی کے مزاج کے مطابق چل کر اسے اپنی بات ماننے پر مجبور کر سکتی ہو۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اگر تم رستم کو یہ بتاؤ کہ تم یہاں اپنی حفاظت کی خاطر آئی ہو تو وہ اپنے اور تمہارے ناتے کے لئے باقی ناتوں کو وقتی طور پر بھول جائے گا۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھی۔''

عارف نے اردگرد دیکھا اور اپنے لہجے کو مزید پست کرتے ہوئے بولا۔ ''شانی بہن اگر تم اس سے کہو کہ تمہیں اس کی پناہ چاہیے ... تو پتہ؟ یہ مطلب ہے کہ یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے۔ تمہیں چاروں طرف سے خطروں نے گھیرا ہوا ہے۔ بے شک تم نے بہت سے

www.pdfbooksfree.pk

دشمنوں کو دوست بنایا ہے لیکن بہت سے دشمن اب بھی خطرناک حد تک دشمن ہیں جن میں ایک قدرت اللہ بھی ہے۔ کسی وقت، کسی بھی وجہ سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر تم رستم سے کہو کہ تمہیں اس کا مضبوط سہارا درکار ہے اور تم اسی سہارے کے لئے یہاں پہنچی ہو..... اور وہ تمہیں لے کر محفوظ جگہ چلا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ رستم بھائی باقی باتیں بھول جائے گا۔''

شانی کے سارے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے دل کی اتھاہ گہرائی میں بھی کہیں یہ خیال موجود تھا۔ اس نے چونک کر عارف کو دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں شانی بہن! میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی طاقت رستم کو موت کی طرف جانے سے روک سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف تم ہو..... ہاں شانی۔ اس کا اب سون کی طرف جانا موت کی طرف جانا ہی ہے۔ یہ ایک ایسا جذباتی فیصلہ ہے جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ تم اسے اس جذباتی فیصلے سے بچالو۔ آج میں بھی وہی بات کہنا چاہتا ہوں جو کچھ عرصہ پہلے مہتم بستی میں بہت سے مردوں، عورتوں نے کہی تھی۔ اگر تم رستم کے ساتھ کسی رشتے میں بندھ کر کہیں دور چلی جاؤ..... کسی گمنام جگہ پر جا بسو تو تم دونوں کی زندگیاں بچ سکتی ہیں۔''

شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں عارف! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا شانی! جو کچھ اب ہونے جا رہا ہے یہ کسی نے کب سوچا تھا کہ ہوگا۔ اخباری خبروں سے پتا چلتا ہے کہ سون میں مفروروں کے خلاف آپریشن ایسے ہو رہا ہے جیسے نہیں جنگ لڑی جا رہی ہو۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہاں موجود کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑنا۔''

شاید عارف اور شانی میں اس بارے میں مزید بات ہوتی لیکن اسی دوران میں رستم فون سن کر واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی تشویش اب پہلے سے گہری ہو گئی تھی۔ گوہرا، جہانگیر اور رستم کا من روم میں کھڑے ہو کر کھسر پھسر کرنے لگے۔

باہر زور سے بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ شام سے پہلے ہی رات کا منظر پیدا ہو گیا تھا۔ شانی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ شاید یہ بے پناہ ذہنی دباؤ کا اثر تھا۔ وہ کئی طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ عارف نے جو بات کہی وہ سو فیصد درست تھی۔ رستم کا واپس سون میں جانا ایک بے حد جذباتی فیصلہ ہوتا۔ اس فیصلے کا نتیجہ موت کے سوا شاید ہی کچھ اور نکلتا۔ عارف کی یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ رستم اور اس کے ساتھی گوہرا کو اس خودکشی سے صرف اور صرف وہ

خود ہی روک سکتی تھی لیکن رستم کو روکنے کے لئے اسے جو راستہ اختیار کرنا تھا، وہ بڑا کٹھن اور ناقابلِ مسافت تھا۔

شانی کو لگا کہ اس کا حلق خشک ہو رہا ہے اور ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں۔ عارف نے غور سے شانی کا چہرہ دیکھا۔

''کیا بات ہے شانی! تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں۔ بس ذرا سر چکرا رہا ہے۔''

''تت..... تم لیٹ جاؤ شانی۔'' عارف نے جلدی سے آگے بڑھ کر شانی کے شانے تھامے۔ شانی نے پہلے تو نفی میں سر ہلایا لیکن پھر آہستہ سے کراہتی ہوئی صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

اسی دوران میں رستم اور گوہرا نے بھی شانی کو دراز ہوتے دیکھ لیا تھا۔ رستم لپک کر شانی کی طرف آیا۔ ''کیا ہوا بی بی؟'' اس نے بے حد بے تابی سے پوچھا۔

شانی کی بجائے عارف نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں۔ بس ذرا چکر سا آ گیا ہے۔''

جہانگیر نے پہلے نوشے کو آوازیں دیں، پھر خود بھاگ کر گیا اور گلاس میں پانی لے آیا تاہم اس دوران میں شانی خود ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ہلکی سی نمی تھی۔ رنگ اب بھی زردی مائل تھا۔

''کیا ہوا تھا بی بی جی؟'' رستم نے دوبارہ لرزاں آواز میں پوچھا۔

''دراصل رستم بھائی! اس نے آج صبح صرف چائے کا ایک کپ پیا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا۔ پچھلے دو تین دن سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اوپر سے بھاگ دوڑ بھی بہت ہے۔ کمزوری نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا۔''

شانی نے تھوڑا سا پانی پیا اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں اب ٹھیک ہوں۔'' پھر وہ عارف کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چلو عارف اب چلتے ہیں۔'' شانی کی آواز میں بے پناہ افسردگی تھی۔

''بالکل نہیں۔ میں اس طرح تو آپ کو ہرگز نہیں جانے دوں گا۔'' جہانگیر نے کہا پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے بھی موسم اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ آپ باہر نکلیں۔''

جہانگیر نے خانساماں سے کہا، وہ اسی وقت نیم گرم دودھ میں اوولٹین ملا کر لے آیا۔ جہانگیر کے اصرار پر شانی نے تھوڑا سا دودھ پیا۔ چند منٹ بعد خانساماں ایک اور ٹرے لئے

www.pdfbooksfree.pk

چلا آیا۔ اس میں چکن کارن سوپ اور کسٹرڈ وغیرہ تھے۔ عارف اور رستم نے اصرار کے ساتھ شانی کو تھوڑا سا کھانے پر مجبور کیا۔

بارش زور پکڑتی جارہی تھی۔ رات کی تاریکی میں گاہے بگاہے برق کوندتی تھی اور کوٹھی کے طول وعرض میں لہریئے سے لپک جاتے تھے۔ عارف کے کہنے پر شانی ساتھ والے کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی۔

وہ لیٹ تو گئی لیکن آرام اس کی قسمت میں کہاں تھا۔ اس کا ذہن تو گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ رستم کو روکنا چاہتی تھی لیکن اسے روکنے کے لئے جو رکاوٹ درکار تھی وہ شانی کے پاس نہیں تھی۔ وہ کیسے چل پاتی رستم کا ہاتھ تھام کر۔ ان دونوں کے راستے جدا تھے اور منزلیں بھی۔ وہ نادیہ کا ہو چکا تھا۔ اب اس کا گھر تھا، بیوی تھی جو اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ دوسری طرف شانی بھی کچھ نئے بندھنوں میں باندھی گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ایک رخ متعین کر چکی تھی اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس رخ پر چلنا چاہتی تھی۔

وہ بند کمرے میں آنکھیں موندے بظاہر پُرسکون لیٹی رہی لیکن اس کے جسم و جاں میں ایک قیامت برپا رہی۔ ایک بار پھر اس کے اندر سے وہ آواز بلند ہونے لگی جو اس کے دل و دماغ پر ہزارہا ستم توڑا کرتی تھی۔ اس آواز نے کہا۔ ''شانی! کیوں اپنے آپ سے بھاگ رہی ہے۔ کب تک بھاگے گی اور کہاں تک بھاگے گی۔ کیوں تُو یہ بات مان نہیں لیتی کہ تُو اپنی زندگی کو رستم کی زندگی کے ساتھ جوڑنا چاہتی ہے۔ بے شک یہ زندگی چند ہفتوں یا چند دنوں کی ہی کیوں نہ ہو، تُو رستم کا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہے اور وہ جہاں تک چلتا رہے اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہے..... ننگے پاؤں..... پتھروں پر اور کانٹوں پر اور انگاروں پر۔ جب تیرا ہاتھ رستم کے ہاتھ میں ہوگا تو پھر وہ کانٹے اور انگارے پھول بن جائیں گے۔ ہر جاں گسل دکھ نشاط انگیز سکھ کا لبادہ اوڑھ لے گا۔ یہ سفر مختصر بھی ہوا تو ہزاروں سال کی بے کیف اور جامہ زندگی سے بہتر ہوگا۔

''ہاں..... شانی، رستم خودکشی کر رہا ہے۔ اس خودکشی سے اسے تم اور صرف تم روک سکتی ہو۔''

اسے اونگھ سی آنے لگی۔ باہر گرج چمک اور بارش کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ وال کلاک نے رات کے نو بجائے تو عارف اور جہانگیر کمرے میں آئے۔ جہانگیر نے کہا۔ ''شانی بی بی! یہ آپ کے بھائی کا گھر ہے۔ یہاں رہتے ہوئے آپ کو کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ موسم خراب ہے اور آپ کی طبیعت بھی اچھی نہیں۔ صبح آرام سے ہوٹل چلی جایئے گا۔''

شانی رکنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے دل و دماغ میں جو شدید ترین کشمکش تھی وہ اسے رکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کل رستم نے ہر صورت ملتان سے روانہ ہونا ہے اور اس کی منزل وہی ہے جہاں پنجاب پولیس پوری تیاریوں کے ساتھ مفروروں اور اشتہاریوں کا شکار کھیل رہی ہے۔ اگر اسے رستم کو روکنا تھا تو پھر اسے یہاں ٹھہرنا ہی تھا۔

وہ تذبذب میں نظر آئی تو جہانگیر کے اصرار میں توانائی آگئی۔ اس نے شانی کو اپنے گھر میں رکنے پر نیم آمادہ کر لیا۔

جہانگیر اور عارف کے جانے کے بعد شانی ایک بار پھر سوچوں میں گم ہوگئی۔ وہ چاہتی تو رستم کی آنکھوں کی خاموش التجا کو رد کر کے اسے حکم دے سکتی تھی۔ وہ حکم دیتی تو وہ پہلے کی طرح قربانی دیتا اور رک جاتا لیکن کیا وہ ہمیشہ سے قربانیاں ہی لیتی رہے گی۔ کیا ایثار کا یہ سفر یک طرفہ ہی چلتا رہے گا۔

اس کے دل نے پکار کر کہا..... نہیں شانی! اگر تجھے رستم کو روکنا ہے تو پھر تجھے بھی اپنے اصولوں اور ارادوں سے ہٹ کر چلنا ہوگا..... جب کوئی آگ میں چھلانگ لگانے جارہا ہو تو پھر اسے عام ڈگر سے ہٹ کر پکارنا پڑتا ہے۔ ''تو کیا وہ اسے پکارے؟'' شانی نے خود سے سوال کیا لیکن عین اس وقت تین نام ہتھوڑوں کی طرح اس کے ذہن پر برسے۔ نادیہ..... منا..... چوہدری بشیر۔ اگر وہ رستم کو پکارے گی تو ان تین ناموں کا کیا ہوگا؟

شانی کے اندر سے دوسری آواز آئی۔ ''کچھ نہیں ہوگا شانی! تم دیکھنا رستم سب کچھ سنبھال لے گا۔ اس کے لئے یہ بالکل مشکل نہیں کہ وہ مُنے کو چوہدری بشیر کی تحویل سے نکال لے۔ تم مُنے اور رستم کے ساتھ کہیں بہت دور نکل سکتی ہو۔ کہیں ایسی جگہ جہاں تم دونوں کی زندگیاں رستم کے مضبوط ترین حصار میں بالکل محفوظ رہیں گی۔''

''لیکن نادیہ؟'' پہلی آواز نے سوال کیا۔

''نادیہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وڈے ڈیرے پر پولیس کے جان لیوا گھیرے میں ہے۔ خدا کرے وہ بچ جائے اور پھر رستم سے آملے۔ ایسا ہوا تو بھی وہ خوش دلی سے رستم کو تمہارے ساتھ شیئر کر سکتی ہے۔ اس نے خود کہا تھا، شانی! میں ایک ادنیٰ خادمہ کی طرح آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہو جاؤں گی۔ چلیں خادمہ نہ سہی وہ برابر کی حیثیت سے تو رہ ہی سکے گی۔''

پہلی آواز نے کہا۔ ''لیکن یہ بھی دیکھو شانی، رستم نے شادی کی ہے۔ وہ ایک شادی شدہ شخص ہے۔ اگر وہ تمہاری محبت میں اتنا ہی آگے جا چکا ہوتا تو پھر شادی کیوں کرتا۔ لوگ تو

www.pdfbooksfree.pk

پوری زندگی بے نام آس کے سہارے گزار دیتے ہیں۔''

''یہ بڑی کمزور دلیل ہے۔'' دوسری آواز نے پکار کر احتجاج کیا۔ ''رستم نے یہ شادی بھی اس لئے کی تھی کہ یہ تمہارا حکم تھا۔ اس نے جیون ساتھی نہیں چنا بلکہ حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس شادی سے وہ جتنا ''خوش'' ہے اس کا پتا بھی تمہیں وڈے ڈیرے پر چل گیا تھا..... مہنازاور حنیفاں نے تمہیں بتایا تھا کہ رستم اس بندھن کو بس بندھن کے طور پر نبھا رہا ہے۔''

سوچتے سوچتے شانی کو پھر اونگھ سی آنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بار پھر پوٹھوہار کے ان ہی ویران ٹیلوں میں ہے۔ تیسری سرنگ کے اندر بھاگتے بھاگتے وہ اندھی دراڑ میں گر گئی ہے۔ اس دراڑ میں رستم اس کے ساتھ ہے۔ وہ سردی اور بخار سے کانپ رہی ہے۔ پھر اسے رستم کا نرم گرم لمس ملتا ہے۔ اتنا پیارا، اتنا مہربان لمس کہ جس کی خوب صورتی کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس لمس کی یاد نے شانی کو تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر اور گالوں پر ابھی تک رستم کے ہونٹوں کی گرمی موجود ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے سرخ ڈورے تیر گئے۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تواتر سے ہو رہی تھی۔ کسی وقت بجلی چمکتی تھی اور کوٹھی کا وسیع لان روشن ہو جاتا تھا۔ لان کے پھول دار پودے، کیاریاں، گھاس اور سنگِ مرمر کا فوارہ، سب کچھ چند لمحے کے لئے روشن ہوتا اور پھر اتھاہ تاریکی میں ڈوب جاتا۔ شانی نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ قرب و جوار میں خاموشی طاری تھی۔ نیند میں گہرا کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی..... شاید باقی لوگ بھی سو گئے تھے لیکن نہیں..... کوئی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ دور برآمدے کے آخری سرے پر تھا اور ٹہلنے والے انداز میں گھوم رہا تھا۔ شانی نے شیشے سے چہرہ لگا کر دھیان سے دیکھا۔ کچھ نظر نہیں آیا لیکن پھر ایک لمحے کے لئے برقِ آسمانی نے کوند کر رستم کی جھلک دکھائی۔ ہاں وہ رستم ہی تھا۔ اس کے سر کے لمبے بال دور ہی سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ کندھوں پر چادر لئے بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں غالباً سگریٹ تھا۔ وہ تنہا تھا۔ ان لمحوں میں شانی کے دل و دماغ میں ایک عجیب سوچ آئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سب مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کمرے سے نکلے اور رستم کے پاس پہنچ جائے۔ اس سے وہ سب کچھ کہہ دے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔ اسے بتا دے کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہے اور وہ اس کی پناہ میں آنا چاہتی ہے۔ وہ جانتی تھی، ایک بار..... صرف ایک بار اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر رستم باقی سب کچھ بھول جائے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہے گا کہ وہ خواہش کے باوجود کسی اور کے بارے میں کچھ سوچ

سکے۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے گا اور جس طرف وہ کہے گی چل پڑے گا۔

پتا نہیں کہ اس رات..... برسات..... اور حالات میں کیا بات تھی کہ شانی کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کی ساری سوچوں کا رخ رستم کی طرف ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وقت اپنے آپ کو دہرا رہا ہے۔ وہ ایک بار پھر مہتم بستی میں موجود ہے۔ سینکڑوں مہتم مرد و زن اور بچے قطار در قطار چمکیلی دھوپ میں کھڑے ہیں۔ ان کے سیاہی مائل چہرے حدت سے دہک رہے ہیں۔ وہ شانی کی طرف بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور بیک زبان گا رہے ہیں۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو

شانی کے جسم میں ہلکی سی لرزش نمودار ہو گئی۔ وہ دیوی تھی لیکن پتھر کی نہیں تھی۔ وہ بے حد باوقار تھی لیکن پھر بھی گوشت پوست کی انسان تھی۔ طاقت ور جذبے اس پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ شانی نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھا اور شال لے لی۔ بیڈ کے نیچے چپل موجود تھی۔ وہ چپل پہن کر مڑی۔ یہی وقت تھا جب اس کے شولڈر بیگ میں رکھے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے شولڈر بیگ کھول کو موبائل نکالا۔ دوسری طرف سے بلند ہونے والی آواز سن کر وہ سکتہ زدہ سی رہ گئی۔ یہ چوہدری بشیر تھا۔

''ہیلو شانی! کیسی ہو۔ میں نے تمہیں مبارک باد دینے کے لئے فون کیا تھا۔''

''کیسی مبارک باد؟'' شانی نے خود کو شدید دھچکے سے سنبھال کر پوچھا۔

''آخر تم نے راجو اور کوکی کی منگنی کرا ہی دی۔ سنا ہے کہ تاؤ حشام بھی اب خوش ہے تم سے؟''

''مم..... مجھے تاؤ حشام کی خوشی سے کوئی غرض نہیں۔ میں نے وہی کیا جو مجھے ٹھیک لگا اور میرا خیال ہے کہ یہ آپ کو بھی ٹھیک ہی لگا ہوگا۔''

''مجھے بھی اس سے کوئی غرض نہیں کہ مجھے کیا ٹھیک لگتا ہے۔ جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے وہ مجھے بھی قبول ہے۔'' چوہدری بشیر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

''آ.....آپ کہاں ہیں؟''

''گھر میں۔ تمہیں اس لئے فون کیا تھا کہ طلاق کے کاغذات بالکل تیار ہو چکے ہیں۔ پرسوں سے میری گاڑی میں پڑے ہیں۔ خود آ کر لے جاؤ یا منگوا لو۔''

''شکریہ۔'' شانی نے کہا۔

''میرے لائق کوئی اور خدمت؟''

''مُنا کیسا ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے۔ آج دیر تک ٹی وی دیکھتا رہا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے اور تم آج کہاں ہو؟''

''ہو.....ہوٹل میں۔'' شانی گڑبڑا گئی۔

دوسری طرف گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری کی آواز آئی تو آہنگ کچھ بدلا ہوا تھا۔ ''میں نے کچھ دیر پہلے لینڈ لائن پر ہوٹل فون کیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ تم اور عارف دوپہر سے کہیں نکلے ہوئے ہو۔''

''ب.....بس ابھی واپس پہنچی ہوں۔''

دوسری طرف سے چند سیکنڈ تک گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ شانی ایک بات سوچ کر کانپ گئی۔ اس نے یہ کہہ کر غلطی کی تھی کہ وہ ہوٹل سے بول رہی ہے۔ ہوٹل ایک مصروف سڑک کے کنارے واقع تھا اور کمروں میں ہر وقت ٹریفک کا مدھم شور سنائی دیتا رہتا تھا۔ ہارنوں کی آوازیں بھی آتی تھیں لیکن یہ کوٹھی ایک پُرسکون رہائشی علاقے میں تھی۔ فون لائن پر سنائی دینے والی خاموشی چوہدری بشیر کو چونکا سکتی تھی اور شاید وہ چونک گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی چوہدری بشیر کی آواز پھر ابھری۔ اس مرتبہ آواز کا آہنگ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ چوہدری نے کہا۔ ''شانی! تمہیں یاد ہے تم نے مجھ سے ایک وعدہ کر رکھا ہے.....اگر بھول گئی ہو تو میں تمہیں یاد کرا دیتا ہوں۔ یاد کرا دوں؟'' چوہدری کے لہجے میں یکایک سخت مزاج شوہر کی سی سختی تھی۔

''جی.....میں سمجھی نہیں۔''

''میرے ساتھ تمہارا وعدہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرو گی اور اس تیاری کے لئے چھ مہینے سے زیادہ نہیں لو گی۔ ان چھ مہینوں میں کوئی دوسرا شخص چاہے وہ کوئی بھی ہو، کسی بھی حوالے سے تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا.....اور ایک خاص بات یہ کہ.....جو کچھ ماضی میں ہوا وہ ہو گیا لیکن اب تم ہر پرانے ناتے سے علیحدہ رہو گی۔ یہ وعدہ

ہوا تھا ناں.....''

پتا نہیں کیوں شانی کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس نے بمشکل کہا۔ ''کیا بات ہے۔ آپ یہ باتیں کیوں یاد دلا رہے ہیں؟''

چوہدری بشیر کا لہجہ مزید سنگین ہو گیا۔ وہ بولا۔ ''اس لئے یاد دلا رہا ہوں کہ ایک بار ڈسا جا چکا ہوں۔ اب دوبارہ ڈسوانا نہیں چاہتا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ حضرت صاحب کی بیوی اور مریدوں کو قتل کرنے کے بعد رستم ملتان سے نکلا نہیں، یہیں کہیں موجود ہے۔''

''م.....مجھے نہیں پتا۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ تمہیں پتا ہے.....اور تم اس سے ملنے پہنچی ہوئی ہو۔ میں تم پر کوئی شک نہیں کر رہا شانی بیگم اور نہ کسی طرح کا الزام لگا رہا ہوں لیکن میری ایک بات تم آج کان کھول کر سن لو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے چوہدری کا لہجہ نہایت سنگین بلکہ جنونی ہو گیا۔ ''میں اب اور برداشت نہیں کروں گا۔ میں بڑا کمزور بندہ ہوں۔ زیادہ ہمت نہیں ہے مجھ میں.....میں سب کچھ ختم کر دوں گا.....تمہیں.....مُنے کو.....اور خود کو بھی۔''

آخری الفاظ اتنی وحشت سے کہے گئے تھے کہ شانی کی رگوں میں خون جم گیا۔ اس کی وہی کیفیت ہوئی جو آج سہ پہر کو ہوئی تھی۔ اسے چکر سا آ گیا۔ فون بند کرتے ہوئے اس نے دیوار کا سہارا لیا لیکن دیوار جیسے اس سے دور ہو گئی۔ اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور وہ گر گئی۔ گرتے ہوئے اس کا سر دروازے سے ٹکرایا تھا۔ دبیز ایرانی قالین نے اسے شدید چوٹ سے محفوظ رکھا لیکن وہ کچھ دیر کے لئے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔ بے ہوشی کا دورانیہ طویل نہیں تھا، شاید ایک منٹ یا دو منٹ۔ پھر یہ بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی۔ شانی کو احساس ہوا کہ وہ قالین پر پڑی ہے۔ کمرے کے باہر سے کوئی اسے پکار رہا ہے۔ یہ رستم تھا۔ شاید وہ دروازے سے اس کے ٹکرانے کی آواز سن کر اس کی طرف لپکا تھا۔ تب شانی نے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس کیا.....دروازہ کھولا گیا اور پھر رستم کا لمس۔ ہاں وہی جانا پہچانا لمس جس نے اندھی دراڑ کی تیرگی میں شانی کو ایک انوکھے تجربے سے روشناس کرایا تھا۔ شانی اس لمس کو زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتی تھی۔ بھرپور مردانہ لمس لیکن پھول سے بڑھ کر نازک اور مشک و عنبر سے زیادہ معطر۔ شانی نے محسوس کیا کہ رستم نے قالین پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا ہے اور اسے آوازیں دے رہا ہے۔ ''بی بی جی.....آنکھیں کھولیں.....بی بی جی.....''

اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ کسی گہرے عمیق کنویں سے۔ شانی کا

www.pdfbooksfree.pk

ذہن بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بدستور سُن تھے پھر اس نے محسوس کیا کہ رستم نے اسے قالین سے اٹھایا ہے اور بستر کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ رستم کے بازوؤں میں تھی۔ اس کا سر رستم کی کشادہ چھاتی سے چھُو رہا ہے۔ ایک لمحے کے لئے..... صرف ایک لمحے کے لئے شانی کے جی میں آئی کہ ان لمحوں میں اسے موت آ جائے۔ سب کچھ ختم ہو جائے۔ یہ لمحے امر ہو جائیں اور وہ یہ احساس لئے اس دنیا سے چلی جائے کہ اس نے اپنے مَن پسند مرد کی بانہوں میں جان دی ہے۔

رستم نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ بڑی نرمی سے شانی کے رخساروں کو تھپتھپانے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اسے آواز بھی دے رہا تھا۔ ایک دم شانی کو ڈر لگا کہ کہیں اس رات کی طرح وہ پھر اسے اپنی بانہوں میں نہ لے لے۔ کہیں اس کے ہونٹ پھر بے تابانہ اس کے چہرے سے ہم کلام نہ ہو جائیں۔

ایک جھرجھری سی اس کے جسم میں جاگی۔ ایک نہایت لذت آمیز لیکن نہایت تکلیف دہ لہر۔ شانی نے بڑی کوشش کے ساتھ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف کی اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کے حواس بتدریج واپس آ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس دوران میں عارف اور جہانگیر بھی پہنچ گئے۔ غالباً جب رستم نے دروازے کے باہر سے شانی کو پکارا تھا تو یہ آوازیں جہانگیر اور عارف کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ رستم کی طرح یہ دونوں بھی ازحد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ جہانگیر نے کہا۔ ''اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہے تو میں انتظام کر لیتا ہوں۔ ایک بھروسے کا بندہ ہے یہاں فرید ٹاؤن میں۔''

''نہیں۔'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب میں ٹھیک ہوں۔''

''یہ تو آپ نے دوپہر کو بھی کہا تھا کہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' جہانگیر نے کہا۔

''یہ لیں جی۔ گلوکوز ملا پانی پئیں۔'' نوشا گلاس لے کر شانی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

شانی نے دو گھونٹ لئے اور واقعی بہتری محسوس کرنے لگی۔ چوہدری بشیر سے بات کئے اب اسے چار پانچ منٹ گزر چکے تھے، تاہم اس کی زہر آلود آواز ابھی تک شانی کے کانوں میں خنجر اُتار رہی تھی۔ ''میں اب برداشت نہیں کروں گا۔ میں سب کچھ ختم کر دوں گا۔ تمہیں..... مُنے کو..... اور خود کو بھی۔''

اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ وہ دھیمے مزاج کا تھا لیکن اس کی رگوں میں تو وہی اجڈ ناروپری خون دوڑتا تھا۔ بڑے مہر جی کا خون..... جس نے درجنوں بے گناہوں کو قتل کرایا تھا..... اور اَن گنت لوگ بجلی کے ٹوکے میں سے گزار دیئے تھے۔

چوہدری بشیر پڑھ لکھ گیا تھا۔ اسے انگریزی بولنا آ گئی تھی۔ اس کا لباس اور رکھ رکھاؤ شہریوں جیسا ہو گیا تھا مگر اس کی خصلت میں ناروپریوں کی خون آشامی اور ہٹ دھرمی بہ درجہ اتم موجود تھی۔ شانی ابھی اس کی منکوحہ نہیں بنی تھی لیکن شانی کے ساتھ اس کا رویہ ابھی سے سخت مزاج شوہروں جیسا تھا۔ وہ جب غصے میں پھنکارتا تھا تو شانی کو اس کے لب و لہجے میں فاخر کی جھلک نظر آتی تھی۔ شانی کو بہت واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر ایک ''حاکم مرد'' کی وہی کہنہ روح ہے جو عورت کو ایک زرخرید جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ یہ زرخرید جانور اپنے آقا کے بتائے ہوئے راستے پر بلا چوں چراں چلتا رہے تو ٹھیک، ورنہ اسے جسمانی اور ذہنی مار سہنا پڑتی ہے اور یہ مار کبھی کبھی اتنی اذیت ناک ہوتی ہے کہ اس کے مقابل موت سہل محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ عورت اور مرد کا رشتہ نہیں ہوتا۔ آقا اور ''زرخرید'' کا رشتہ ہوتا ہے۔ آقا کی بڑی سے بڑی غلطی قابلِ درگزر ہوتی ہے لیکن ''زرخرید'' کی چھوٹی سے چھوٹی بھول سخت ترین سزا کی حق دار۔

آج اسی آقا نے بالکل کھلے لفظوں میں شانی کو بدترین نتائج کی دھمکی دے دی تھی۔ اس نے مُنے کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے، انہیں سوچ کر ہی شانی کا کلیجہ سوکھنے لگا..... پھر اس کے ذہن میں راجو اور کوکی کا تصور ابھرا۔ ان کی متلاشی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں کے مسکراتے آنسو شانی کے ذہن میں آئے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ برقی کوندوں کی طرح شانی کے ذہن میں لپک گیا۔

شانی کے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ اس ہوک نے اس کے پورے جسم میں جیسے خون کی جگہ آنسو دوڑا دیئے۔ اس نے ایک درد بھری الوداعی نگاہ رستم پر ڈالی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے شال اپنے سر پر رکھ لی۔

''کہاں جا رہی ہیں بی بی؟'' رستم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مجھے ہوٹل جانا ہے۔'' شانی کا لہجہ مستحکم تھا۔

''لیکن بی بی! موسم ٹھیک نہیں ہے..... اور آپ کی طبیعت بھی ایسی نہیں کہ آپ گھر سے باہر نکلیں۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' جہانگیر نے کہا۔

''نہیں بھائی صاحب! آپ کا بہت شکریہ لیکن میری مجبوری ہے۔'' پھر وہ عارف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''عارف! چلو چلیں۔''

عارف بھی تھوڑا سا حیران نظر آ رہا تھا تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ شانی کا موبائل اس کے بیگ میں نہیں، ہاتھوں میں ہے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ شاید شانی

www.pdfbooksfree.pk

نے کوئی خاص کال ریسیو کی ہے۔

رستم اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ بی بی جانے کا حتمی فیصلہ کر چکی ہے اور اب وہ رکے گی نہیں۔

شائی جانے سے پہلے رستم کے قریب رکی اور اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''رستم شکریہ۔''

''کس بات کا بی بی؟'' وہ کراہ کر بولا۔

''تاؤ حشام کو معاف کرنے کا..... اور قدرت اللہ کو چھوڑنے کا۔''

''بی بی! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' رستم کے لہجے میں دنیا جہان کا درد تھا۔ اس کے نام سے ایک خلقت کانپتی تھی لیکن اس وقت وہ دست بستہ اپنے ''عشق'' کے رُوبرو کھڑا تھا اور بالکل ناچیز نظر آ رہا تھا۔

''معاف کرنا اچھی بات ہے رستم..... سب کو معاف کر دو۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور عارف کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

جہانگیر نے بے بسی سے رستم کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی کی چابی نوشاد کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ نوشا! بی بی جی جہاں کہیں انہیں چھوڑ آؤ۔''

☆======☆======☆

رستم نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور گرج چمک، شب کی تاریکی کو طوفانی رنگ دیتی رہی۔ وقتِ رخصت بی بی کا کہا ہوا جملہ، کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود رستم کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ''معاف کرنا اچھی بات ہے رستم۔ سب کو معاف کر دو۔''

یہ بہت گہرا جملہ تھا۔ اس کے کئی رنگ تھے اور مطالب تھے۔ ان میں سے ایک مطلب یہ بھی تھا کہ بی بی نے رستم سے اپنے بارے میں کہا تھا کہ وہ اسے معاف کر دے۔ اس سے ملتی جلتی بات بی بی ایک دفعہ پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ بی بی نے کہا تھا، رستم! میں حالات کے شکنجے میں ہوں۔ میرے دامن میں تمہارے لئے پریشانی اور دکھ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں تم اس کے مستحق نہیں ہو۔ مجھے معاف کر دو۔

بی بی کا یہ جملہ پچھلے چند گھنٹوں میں جتنی بار رستم کے ذہن میں آیا اس کے دل میں ایک گہرا چرکا لگا۔ بی بی کو کیا پتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے..... وہ تو ہر حال میں خوش تھا۔ اس کا عشق ایسے مرحلے میں تھا کہ جہاں جدائی اور ملاپ کا مطلب ایک

ہی ہو گیا تھا۔ بس ایک لذت آمیز آگ تھی جس میں جلنا، جھلسنا اور کراہنا ہی اس کے لئے زندگی کا حسن تھا۔ یہ آگ ہی عشق کی سزا تھی اور اس کا انعام بھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب اس نے بی بی کو دیز قالین سے اٹھا کر بستر تک پہنچایا تھا تو اس نے بی بی کو جسمانی طور پر بھی خود سے بہت قریب محسوس کیا تھا۔ تب اس نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہا تھا کہ کتنا اچھا ہو کہ اس کی زندگی کا سفر اسی جگہ، انہی لمحوں میں ختم ہو جائے۔ وہ بی بی کو بستر پر لٹائے اور پھر بی بی کے جسم سے علیحدہ ہونے سے پہلے ہی اپنی زندگی سے علیحدہ ہو جائے۔

پھر اس کا دل چاہا تھا، کاش ایسا ہو بی بی ہوش میں آنے کے بعد اس سے کہے۔ ''رستم، مجھے لے جاؤ۔ کہیں بہت دور..... ان بے رحم در و دیوار سے بچا کر دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں.....'' اور وہ بی بی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دے اور کہے..... بی بی! ایسا ہی ہوگا۔ میں نے تو آپ سے کٹھولی کے میلے میں ہی کہہ دیا تھا کہ آپ ایک بار، صرف ایک بار میرے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لیں پھر میں آپ کو لے جاؤں گا۔ ہمارے سارے دشمنوں کا سارا اسلحہ، ان کی کھڑی کی ہوئی ساری دیواریں اور ان کی پہنائی ہوئی تمام زنجیریں مل کر بھی ہمارا راستہ روک نہیں سکیں گی۔

لیکن بی بی نے نہیں کہا تھا..... عشق کی یاری تو اَن کہی باتوں سے ہوتی ہے۔ محبت کا ناتا بندھنوں سے رہتا ہے..... کھل کی سسی ہو، گجرات کی سوہنی، جھنگ کی ہیر یا پھر عشق کہانی کا رانجھن بھی کردار، اس کی پہچان بند ہونٹ ہی ہوتے ہیں اور ان ہونٹوں کے پیچھے اشکوں اور لفظوں کا ایک بے کراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت رستم نے ایک بار پھر نظام سے رابطہ کیا۔ نظام نے وڈے ڈیرے کی خبریں دیتے ہوئے بتایا۔ ''معاملہ بڑی تیزی سے خراب ہوتا جا رہا ہے۔ پولیس نے گھیرا تنگ کر دیا ہے۔ بھاری اسلحے سے فائرنگ کی جا رہی ہے۔ پرسوں رات تین بندوں کی ایک ٹولی کسی طرح پولیس کے گھیرے سے نکل کر اگلے ڈیرے کی طرف آئی ہے۔ ان میں سے زاہد نام کا ایک بندہ تو کھائی میں گر کر مر گیا ہے۔ ایک کو رستے میں پولیس نے مار دیا ہے۔ ایک یہاں میرے پاس پہنچا ہے۔ اس کے موڈھے میں بھی گولی لگی ہوئی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ڈیرے پر خوراک کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ منگل کے روز وہاں دودھ دینے والی پانچ بھینسیں گوشت کے لئے ذبح کی گئی ہیں لیکن یہ گوشت بھی دو تین دن سے زیادہ چلنے والا نہیں۔ پولیس کی مسلسل فائرنگ سے بکریوں اور مویشیوں کو گھاس والی ڈھلوانوں کی طرف لے جانا ممکن نہیں۔ اس وجہ سے ان کا دودھ سوکھتا جا رہا ہے۔ پچیس تیس بکریاں اور کچھ بھینسیں

www.pdfbooksfree.pk

فائرنگ کی وجہ سے مر بھی گئی ہیں۔"

"لالہ فرید سے بات ہوئی ہے؟"

"ہاں جی!.....آج صبح سویرے ہوئی تھی۔ میں نے لالے تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے لیکن لالے نے کہا کہ اب وڈے ڈیرے کی طرف آنا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ تو خود کو جان بوجھ کر مصیبت میں ڈالنے والی بات ہوگی۔"

"اور کوئی خبر؟"

"ایک اور بُری خبر ہے جی۔" نظام نے اٹکتے ہوئے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "لالے فرید کی گھر والی.....بھرجائی مہناز اور بیٹا ٹیپو دونوں گولی کا نشانہ بن گئے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" رستم کی آواز بھرا گئی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں جی۔ یہ حادثہ کل صبح سویرے ہوا ہے۔ ٹیپو گھومتا ہوا ٹیلوں میں کافی آگے نکل گیا۔ اس وقت لالہ اور بھرجائی دونوں سو رہے تھے، کچھ دیر بعد بھرجائی جاگی اور ٹیپو کو ڈھونڈنے لگی۔ یہ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی کہ وہ کافی آگے پہنچا ہوا ہے۔ وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگی۔ وہ بچہ تھا، شرارت میں آکر وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنے میں فائرنگ شروع ہوگئی۔ دونوں ماں بیٹا اُدھر ٹیلوں میں ہی ڈھیر ہوگئے۔ ان کی لاشیں اٹھانے کے لئے لالہ وغیرہ کو رات تک انتظار کرنا پڑا۔"

رستم کی آنکھوں میں شوخ آنکھوں والے خوبرو ٹیپو کی شکل گھوم گئی جو بڑے پیار سے اسے "چاچا" کہا کرتا تھا اور بے تکلفی سے اس کی گود میں گھس بیٹھتا تھا۔ رستم نے کئی بار لالے سے کہا تھا کہ وہ بیوی بچے کو میوت کے اس نرغے سے نکال دے۔ وہ اس بات پر آمادہ بھی ہو چکا تھا کہ مہناز ٹیپو کو لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی جائے اور وہ اسے اپنے ساتھ امارات لے جائے۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہونا تھا اور جو ہونا تھا وہ کل صبح سویرے ہو گیا تھا۔

رستم کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ اسے مہناز یاد آئی.....جو ہمیشہ ہر ایک سے گھونگھٹ کی اوٹ سے بات کرتی تھی۔ جس نے سینکڑوں ہی مکھن والے پراٹھے اور انڈے بنا کر لالے اور اس کے دوستوں کو بڑی محبت سے کھلائے تھے اور ان سب کی سلامتی کی دعائیں کی تھیں۔ وہ واقعی بھرجائی تھی.....اس کے سینکڑوں دیور تھے اور ان میں سے ایک رستم بھی تھا جس کے ساتھ اس کو بہت انس تھا۔ رستم کو محبت کی خوشبو میں بسا ہوا آخری ناشتہ یاد آیا جو مہناز نے روانگی سے پہلے اسے کھلایا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے نظام سے پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟"

نظام نے اپنا ٹھکانا بتایا۔ رستم نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "اگلے دو دن کے اندر میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔"

نظام نے کہا۔ "رستم بھائی! قریباً پندرہ بندے اور بھی آگے جانے کے لئے تیار ہیں۔"

اس اطلاع نے رستم کی رگوں میں جوش پیدا کیا۔ وہ اس جملے کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ کل نظام نے بتایا تھا کہ کچھ مقامی لوگ ایسے ہیں جو پولیس کارروائی سے بہت مشتعل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کوئی نہ کوئی قریبی عزیز دیگر مفروروں کے ساتھ پولیس کے گھیرے میں ہے۔ علاقے میں اجرال برادری کے کچھ لوگ پولیس کی مدد کر رہے ہیں۔ اعوانوں کی ایک دوسری گوت سنگوال کی دشمنی اجرال برادری کے ساتھ چل رہی ہے۔ اتفاقاً سنگوالیوں کے کچھ عزیز واقارب پولیس کے گھیرے میں بھی ہیں۔ اب یہ لوگ جوالا مکھی بنے ہوئے ہیں اور اپنے بھائی بندوں کی مدد کرنے کے لئے پولیس سے مزاحمت کرنا چاہتے ہیں۔

نظام کے مطابق سنگوالیوں کا ایک جوان چوہان احمد اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ چوہان اس علاقے کی اونچ نیچ کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتا تھا۔ چوہان کا کہنا بھی یہی تھا کہ اگر پانڈو کے مقام پر کوشش کی جائے تو پولیس محاصرے میں آنے والے لوگوں کو نکالا جا سکتا ہے۔

چوہان کی رائے، نظام کی زبانی سننے کے بعد رستم کی رائے مزید پختہ ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔

نظام سے بات چیت ختم کرنے کے بعد رستم پھر اپنا لائحہ عمل ترتیب دینے میں لگ گیا۔ اب وہ جلد از جلد نظام کے پاس جگوال پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے نکل کر جگوال تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ یہاں چپے چپے پر پولیس اس کا ڈیتھ وارنٹ لئے گھوم رہی تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں جہانگیر کے پاس بھی وہ زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح حرکت اس کے لئے خطرناک تھی اسی طرح سکونت بھی جان لیوا تھی۔ ہاں سکونت میں ایک اور اندیشہ بھی پوشیدہ تھا اور یہ کہ کہیں وہ اور گوہرا چوہے کی موت نہ مر جائیں۔

رستم اپنی ٹرپل ٹو رائفل سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب اس رائفل کا ساتھ خطرناک ہوگا۔ اس نے اور گوہرا نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پاس فقط پستول رکھیں گے۔ تیز دھار آلے کے نام پر رستم کے پاس جو لمبا چھرا تھا وہ آستانے میں گوہرا نے اس سے لے لیا تھا، قدرت اللہ کو قتل کرنے کے لئے۔ قدرت اللہ بچ گیا تھا اور وہ چھرا اب

www.pdfbooksfree.pk

پھر رستم کے پاس تھا۔ کولٹ پسٹل کا سائلنسر بھی رستم کے لئے ایک کارآمد شے تھا۔ انہوں نے اپنے پستول اچھی طرح صاف کئے اور گولیوں کے دو دو فالتو میگزین بھر لئے۔ بارش بند ہوگئی تھی لیکن بادل موجود تھے۔ رستم کا تجربہ بتاتا تھا کہ بارش کے دوران میں پولیس سے بچ کر نقل و حرکت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ رستم کی خواہش تھی کہ کل جب وہ جانے کے لئے نکلیں تو بارش ہو رہی ہو۔

دوپہر کے بعد جہانگیر نے ایک حجام کو کوٹھی پر ہی بلا لیا۔ اس نے رستم کے لمبے بال تراش کر عام سائز کے کر دیئے۔ داڑھی کو بھی تراش خراش کر سنوار دیا تھا۔ گوہرا نے اپنی جہازی سائز کی مونچھیں بالکل مختصر کروالیں اور سر پر استرا پھروالیا۔ جہانگیر نے اپنی شناخت چھپانے کے لئے سر کے بالوں کو ہلکا براؤن رنگ دے رکھا تھا۔ یہی رنگ رستم نے بھی استعمال کیا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال ہلکے بھورے نظر آنے لگے۔ جہانگیر نے رستم اور گوہرا کے لئے بازار سے چار چار جوڑے منگوائے تھے۔ ان میں ایک ایک جوڑا پتلون قمیص کا بھی تھا۔ رستم کبھی کبھار پتلون قمیص پہن لیتا تھا اور یہ لباس اس کے کسرتی جسم پر جچتا بھی خوب تھا..... اب بھی اس نے سیاہ پتلون کے ساتھ بونیزا کی چیک دار قمیص پہنی اور اوپر بند گلے کی جرسی زیب تن کر کے قمیص کا کالر باہر نکال لیا۔ اس لباس کے ساتھ وہ کیا سے کیا نظر آنے لگا۔ جہانگیر نے اسے دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''یار! ایک فلمی ہیروئن تو تم نے قابو کر ہی رکھی ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ جو روپیہ ہمارے پاس موجود ہے اس سے سیدنور یا حسن عسکری کو قابو کرتے اور ایک زبردست قلم بنا ڈالتے۔ اس میں ہیرو تم خود ہوتے۔ میرا کیا ہے میں نے ولن کا کردار ادا کر کے بھی خوش ہو جانا تھا۔''

''نہیں، ایک بنا بنایا ولن ہمارے پاس موجود ہے لالے دی جان..... قدرت اللہ۔'' گوہرا نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

''اور سیکنڈ ولن ڈپٹی ریاض بن جاتا۔'' جہانگیر نے قہقہہ لگایا۔

''فلم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب اصلی فلم چلنے والی ہے۔ مار دھاڑ سے بھرپور اور امید ہے کہ ناکرا بھی ڈپٹی ریاض سے ہی ہونا ہے۔'' رستم نے پسٹل کو بیلٹ میں لگا کر اوپر موٹی جرسی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

پھر ایک دم رستم کو جیسے خیال آیا، اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ اس نے جہانگیر سے کہا۔ ''دیکھو جہانگیر! ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں زندگی کے چانس کم ہیں اور موت کے زیادہ۔ تم نے میرا ایک کام کرنا ہے۔''

''ایک کام۔ تم ایک سو کام کہو میرے جگر..... بلکہ میری تو تمنا یہ ہے کہ کسی طرح میں بھی تمہارے ساتھ جا سکوں۔''

''فالتو باتیں نہ کرو۔ تم نے کہیں نہیں جانا۔ جو کچھ تم ہمارے لئے کر رہے ہو یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ جو کام میں تمہارے ذمے لگا رہا ہوں وہ ایک لڑکی تک کچھ رقم پہنچانے کا ہے۔ لڑکی کا نام پتا میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں۔ دو تین ہفتوں تک، دو تین مہینوں تک یا جب بھی ممکن ہو سکے تم نے میرے حصے میں سے یہ رقم وہاں پہنچانی ہے۔''

''یار! تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرا دل خون ہونے لگتا ہے۔ تم ایسی وصیتیں نہ کرو تو اچھا ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود واپس آؤ گے اور اپنے کام کرو گے۔''

''چلو، میں خود ہی کروں گا لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے بھی ذہن نشین رکھو۔''

اس کے بعد رستم نے اسے اس لڑکی کے بارے میں بتایا جس کی ''انوکھی مدد'' سے وہ پٹھوہار میں پولیس کے مہلک گھیرے سے نکلا تھا۔ ڈھوک شاہاں کی مہراں جس نے ایک پتھریلے شخص کو اپنا کانچ سا جسم سونپا تھا اور اس کے بدلے اس سے رستم اور گوہرا کے لئے ایک رعایت حاصل کی تھی۔

جہانگیر نے جاننا چاہا کہ وہ اپنے حصے میں سے چار لاکھ کی خطیر رقم اس لڑکی کو کیوں دینا چاہتا ہے لیکن رستم نے یہ کہہ کر اسے خاموش کرا دیا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اپنے حصے میں سے دو لاکھ روپے مزید رستم نے اپنے اور گوہرا کے ذاتی خرچے کے لئے علیحدہ کروا لئے۔ باقی رقم اس نے جہانگیر کے پاس رہنے دی اور اس سے کہا کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو یہ رقم وہ زرداریا شیری تک پہنچا دے۔

اسی دوران میں جہانگیر کا ہوشیار ملازم خاص نوشا اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ''جناب آپ کے لئے ایک تازہ خبر ہے۔''

''کس بارے میں؟'' جہانگیر نے کہا۔

''بی بی جی کے بارے میں۔ پرسوں انہوں نے ایک بڑا خاص کام کیا ہے جی۔ بلکہ دو بڑے خاص کام کئے ہیں۔ چوہدری حشام کے بیٹے اور سیف اللہ کی منگنی کرائی ہے بی بی جی نے..... دوسرا کام اس سے زیادہ خاص ہے۔ منگنی کے بعد بی بی جی نے چوہدری حشام اور چوہدری بشیر کو آپس میں ملایا ہے اور ان میں صلح کروائی ہے۔ ان لوگوں میں بڑی شاش چلی آ رہی تھی لیکن اب انہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا ہے اور اپنے معاملے ایک کرنے کا عہد کیا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

رستم خاموشی سے سنتا رہا۔ جہانگیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بی بی جی کی کیا بات ہے جی۔ کچھ نہ کچھ خاص ہے بی بی کے اندر۔ اتنی چھوٹی عمر میں وہ بڑے بوڑھوں والے کام بھی کر گزرتی ہیں۔ میں نے ان کی والدہ کے بارے میں سنا تھا۔ رنگ والی اور آس پاس کے علاقے کے لوگ ان کی عزت رانیوں مہارانیوں کی طرح کرتے تھے۔ خدا ترسی اور غریب پروری میں بڑا نام تھا ان کا۔''

اسی دوران میں کال بیل بجی اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نوشا باہر گیا اور چند سیکنڈ بعد واپس آ کر اس نے بتایا کہ ایک لمبی گاڑی میں کچھ مہمان آئے ہیں۔ گاڑی کے شیشے کالے تھے اس لئے وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا تھا۔ جہانگیر کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ لمبے گھونگر یالے بالوں والا ایک سونٹ بوٹ شخص اندر آیا اور تین چار منٹ تک جہانگیر سے کھسر پھسر کرتا رہا۔ وہ مٹھی میں دبا کر سگریٹ پی رہا تھا۔ رستم کو وہ چہرے مہرے سے اچھا شخص نہیں لگا۔ وہ شخص باہر گیا اور اس کے جانے کے دو منٹ بعد کوٹھی کا گیٹ کھل گیا اور نئے ماڈل کی ایک ہونڈا سوک کار اندر آ گئی۔ کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں چاند اور سورج طلوع ہو گئے ہیں۔ دو نہایت پُرکشش لڑکیاں، چہکتے کپڑوں میں اور جگمگاتے چہروں کے ساتھ اندر آ گئیں۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر جہانگیر کا چہرہ اندرونی مسرت سے سرخ ہو گیا۔

رستم دنگ رہ گیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کو وہ پہچان گیا۔ وہ پنجابی فلموں کی معروف ہیروئن عاصمہ تھی۔ اپنے تناور خوب شاداب جسم کی بدولت وہ فلم بین حلقوں میں بہت مقبول تھی۔ ساتھ میں جو دوسری لڑکی تھی وہ شکل وصورت سے عاصمہ کی بہن نظر آتی تھی تاہم وہ عاصمہ کے مقابلے میں کچھ کم عمر اور کافی دبلی پتلی تھی۔

عاصمہ کافی مہنگی اور مصروف ایکٹریس تصور کی جاتی تھی۔ چار پانچ دن پہلے جب جہانگیر نے گوہرا سے خوش گپیاں لگاتے ہوئے عاصمہ کو یہاں بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو رستم نے اسے مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے ہرگز یقین نہیں تھا کہ سلور سکرین کا یہ دمکتا ستارہ یوں شوبز کی روشنیوں سے نکل کر یہاں جہانگیر کی کوٹھی میں آ جائے گا لیکن آج اس ابر آلود شب میں رستم اسے یہاں دیکھ رہا تھا۔ یہ سب روپے کی کرشمہ کاری تھی۔

جہانگیر نے روپیہ خرچ کیا تھا۔ رستم کی طرح جہانگیر کے نزدیک بھی روپے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مہلت کم ہے اور روپیہ زیادہ۔ یعنی سفر کی نسبت زادِ سفر زیادہ تھا۔ اس نے غالباً سات آٹھ لاکھ روپے آفر کر دیئے تھے اور یہ دونوں کڑکتی بجلیاں گوہرا اور

جہانگیر کی دل پشوری کے لئے سر کے بل چل کر یہاں پہنچ گئی تھیں۔ ہر جگہ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں بھی اچھے لوگ تھے اور ایسے بھی تھے جو ایک رات میں دو تین لاکھ کما لینے کو ہی اپنے ''فن'' کی معراج سمجھتے تھے۔

جہانگیر کا من روم میں رستم کے پاس آیا تو اس کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ رستم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور رستم کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔ ''یار! بُرا نہ ماننا، میں نے گوہرا سے وعدہ کر رکھا تھا۔ بس آج رات کی رعایت دے دو۔ اس کے بعد تم کہاں، ہم کہاں۔ نہ جانے پھر ملاقات بھی ہونی ہے یا نہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم گوہرا کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہو۔''

''چلو یہی سمجھ لو لیکن حقیقت یہ ہے یار کہ میں چاہتا ہوں، کل جب گوہرا یہاں سے جائے تو بہت خوش ہو۔''

پتا نہیں کہ جہانگیر حسین نے یہ بات کس لہجے میں کہی کہ رستم کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کے غصے کا گراف ایک دم نیچے آ گیا۔

دس بجے کے قریب محفل شروع ہو گئی۔ جہانگیر کی کوٹھی کافی بڑی تھی۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر دبیز پردے کھینچ کر دروازے بند کر دیئے گئے۔ اب اندر جو بھی شور شرابا ہوتا، باہر کسی کو خبر نہ ہوتی۔ پتا نہیں کہ رستم کا موڈ کیسا ہو رہا تھا..... وہ بھی اس محفل میں جا بیٹھا۔ فرانس کی بہترین شراب اور خانساماں کرامت کے ہاتھ کے پکے ہوئے بہترین کھانے ڈرائنگ روم میں گردش کر رہے تھے۔ آڈیو سسٹم پر ہلکا سا میوزک لگا ہوا تھا۔ دونوں پریاں صوفوں پر براجمان تھیں اور اپنی مسکراہٹ کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ فلم سٹار عاصمہ بار بار اپنی کلائی کی طلائی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ غالباً وہ حسبِ عادت ایسا کر رہی تھی۔ ورنہ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ جو بھاری رقوم خرچ کر کے انہیں یہاں لائے ہیں وہ ''قیمت'' پوری کئے بغیر انہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے اور یہ حساب کتاب صبح سے پہلے کہاں برابر ہونا تھا۔

شانی بی بی کا چہرہ آج بری طرح رستم کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اس نے نوشے کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی منتظر تھا۔ اس نے بوتل اٹھا کر رستم کا گلاس بھی بھر دیا۔ ایک گوشے میں ٹی وی مدھم آواز میں چل رہا تھا۔ عاصمہ کی چھوٹی بہن الماس نے سکرین پر نظر ڈالی اور چونک کر بولی۔ ''مجاز صاحب! ذرا آواز اونچی کیجئے گا۔''

مجاز یعنی جہانگیر نے ٹی وی کا والیم کھولا۔ خبریں آ رہی تھیں۔ ڈیفنس کے ایک گھر میں ڈاکے کی خبر تھی۔ نوعمر ڈاکو اہلِ خانہ کو رسیوں سے باندھ کر لاکھوں کے زیورات اور پرائز بانڈز

www.pdfbooksfree.pk

وغیرہ لے گئے تھے۔

خبر سننے کے بعد عاصمہ نے اپنے جسم کو نمایاں تر کرنے والی ایک لمبی سانس لی اور بولی۔ ''انتہا ہوگئی ہے جی! اب تو اس ملک میں رہنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ میری تو بس دو چار فلمیں سیٹ پر ہیں۔ ان کو مکمل کرالوں۔ میں نے تو نکل جانا ہے فیملی کے ساتھ امریکہ یا کینیڈا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اب تو کسی کو معافی نہیں ہے جی۔ بڑے بڑے اللہ والے لوگ اس رگڑے میں آئے ہوئے ہیں۔ اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا آپ نے۔ کوئی بہت بڑے پیر صاحب آئے ہوئے تھے یہاں ملتان میں۔ ان کی بیوی اور کئی مرید پھڑ کا کر رکھ دیئے ڈاکوؤں نے۔ بدبختوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ کس پر ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ ایک اللہ لوک بندہ جس کی وجہ سے ایک خلقت کو فیض پہنچ رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا مجاز ملک صاحب کہ ایسے لوگوں پر آسمان ٹوٹ کر کیوں نہیں گر پڑتا۔''

رستم نے عاصمہ کے حیاسوز سراپے پر ایک تیز نظر ڈالی اور بولا۔ ''اب یہ آسمان بے چارہ کس کس پر ٹوٹ کر گرے۔ یہاں تو ہر طرف قہر مچا ہوا ہے۔ کوئی کس طرح لوٹ رہا ہے، کوئی کس طرح۔''

عاصمہ نے رستم کے تیکھے انداز کو محسوس کیا اور چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے جہانگیر کو دیکھنے لگی۔ جہانگیر بولا۔ ''یہ اپنا یار ہے۔ لاہور سے آیا ہے۔ آپ کا پرانا فین ہے۔'' آخری فقرہ جہانگیر نے اپنی طرف سے جوڑا تھا۔ رستم کو اس حوالے سے تسلی محسوس ہوئی کہ دونوں ایکٹریسوں نے اسے یا گوہرا کو پہچانا نہیں تھا۔ ان دونوں نے اپنے حلیے میں جو تبدیلیاں کی تھیں وہ کامیاب تھیں۔

گفتگو کا رخ ایک بار پھر قدرت اللہ اور اس کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کی طرف مڑ گیا۔ عاصمہ کی چھوٹی بہن کے خیالات اس بارے میں قدرے مختلف تھے۔ اس نے کوک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن باجی! کچھ سوال پیر صاحب کے بارے میں بھی تو پیدا ہوتے ہیں ناں۔ وہ اپنی ایک مریضہ کا علاج جھاڑ پھونک سے کر رہا تھا لیکن جب اس کی اپنی بیوی اسی تکلیف کا شکار ہوئی تو اسے لے کر وہ ہسپتال کی طرف بھاگا اور پھر اس نے درجنوں لوگوں کے سامنے اعتراف بھی کیا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ جو مریضہ اس کے پاس آئی تھی اس کا علاج بھی ہسپتال میں ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''الماس! یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔ میڈیا والوں نے کہانی بنائی ہے۔'' عاصمہ نے اپنے ریشمی بالوں کو پیشانی سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''پر باجی! کوئی بات ہوتی ہے تو کہانی بنتی ہے۔ ڈاکوؤں نے وہاں پیر صاحب کی کوٹھی میں لوٹا کچھ نہیں، نہ ہی کسی کو اغوا کیا ہے۔ وہ صرف پیر صاحب کو سبق سکھانے آئے تھے..... آخر پیر صاحب نے کہیں کوئی کام دکھایا ہوگا ناں۔''

''کوئی کام شام نہیں دکھایا۔'' عاصمہ بولی۔ ''مجھے اپنے فلمی صحافی گورایہ صاحب نے اس بارے میں سب کچھ بتایا ہے۔ ڈاکوؤں کے سرغنہ رستم سیال کی ایک منظورِ نظر ہے جسے بی بی کہتے ہیں۔ اس بی بی کی ایک جیٹھانی کا علاج پیر صاحب کر رہے تھے۔ علاج کے دوران میں جیٹھانی کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تو بی بی نے چوہدراہٹ دکھائی اور بے وقوفی والا کام کیا۔ اس نے بھڑک کر پیر قدرت کی بیویوں پر حملہ کیا اور ''عمل'' میں استعمال ہونے والا سامان توڑ پھوڑ دیا۔ اس ملے گلے کے دوران میں بی بی کی جیٹھانی کی جان بھی چلی گئی۔ بس اس وقت سے یہ کشمکش چلی آ رہی تھی۔ اب پانچ چھ بزرگ قتل ہوگئے ہیں۔ دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رستم کی منظورِ نظر بی بی بھی اس خونی واقعے کے وقت موقع پر موجود تھی۔''

''پر اس کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے میڈم۔'' جہانگیر نے دبے لہجے میں کہا۔

الماس نے کہا۔ ''کچھ لوگ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اگر بی بی واقعی وہاں موجود تھی تو پھر اسی کی وجہ سے پیر صاحب اور ان کے باقی ساتھیوں کی جانیں بچی ہیں۔ اخبار میں بھی صاف لکھا ہے کہ نقاب والی ایک لڑکی بپھرے ہوئے رستم سیال اور پیر صاحب کی دوسری بیوی کے سامنے آ گئی۔ یہ اسی کا کام تھا کہ خطرناک قاتل کو کھینچ تان کر موقع سے دور لے گئی۔ اس نے رستم سے باقاعدہ جھگڑا کیا اور اسے اس کے ارادے سے باز رکھا۔''

''ففے کٹنی ہوگی۔ پہلے آگ لگائی ہے اب چھینٹے مار رہی ہوگی۔'' عاصمہ نے حسبِ عادت گھڑی دیکھتے اور پیشانی سے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

''دل کے اندر کس نے جھانک کر دیکھا ہے باجی لیکن سنا یہ ہے کہ رستم وغیرہ سے اب بی بی کا تعلق واسطہ نہیں رہا۔ پچھلے دنوں میں نے خود اخبار میں پڑھا تھا۔ سون میں چھپے ہوئے ڈکیتوں کے خلاف کچھ لوگوں کے بڑے سخت بیان آئے تھے۔ ان میں ایک بیان بی بی شہناز کا بھی تھا۔ والد، بھائی اور شوہر کی موت کے بعد وہ اب رفاہی کاموں میں حصہ لے رہی ہے۔ وزیر آباد کے قریب کسی گاؤں میں وہ ایک بڑا ہسپتال بھی بنوا رہی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ پیر قدرت اور بی بی کے درمیان جو چپقلش ہے اس میں ہسپتال کا چکر بھی ہوگا۔''

گفتگو کا رخ ایک بار پھر پیر قدرت اور رستم سیال کے ''ٹاکرے'' کی طرف مڑ گیا۔ اس

www.pdfbooksfree.pk

دوران میں گوہرا اور جہانگیر دلکسی سے شغل کرتے رہے، ہلکی آواز میں میوزک بجتا رہا۔ عاصمہ بار بار اپنے بال پیشانی سے جھٹکتی رہی اور جسم کو نمایاں تر کرنے والے گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی لیکن جسم کمان کی طرح تنا ہوا تھا اور وہ کسی بھی طرح ایک نوخیز لڑکی سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ (اس کی بہن تو تھی ہی نوخیز) رستم نے سوچا، یہ عاصمہ جو آج لاکھوں دلوں پر راج کرتی ہے اگر اس عمر میں کسی گاؤں کے غریب گھرانے میں ہوتی، محنت مشقت کر کے ادنیٰ غذا کھاتی اور شوہر کے لئے لگاتار بچے پیدا کرتی تو اب تک شاید پکی عمر کی عورت بن جاتی۔ اس کا جسم تنی ہوئی کمان جیسا نہیں ٹوٹی ہوئی کمان جیسا ہوتا۔ یہ دولت کا کرشمہ تھا کہ وہ سرتاپا دلکش نظر آتی تھی اور یہ بھی دولت ہی کا کرشمہ تھا کہ وہ اس وقت یہاں فرید ٹاؤن کی اس کوٹھی میں موجود تھی۔

دونوں بہنوں کی گفتگو اب بحث کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ عاصمہ نے کہا۔ ''الماس! رستم سیال جیسے بندوں کو میں تجھ سے زیادہ جانتی ہوں۔ نادیہ والا معاملہ تو تجھے بھی نہیں بھولا ہوگا، کچھ پتا ہے نادیہ اب کہاں ہے؟''

''کہاں ہے؟'' الماس نے ناخنوں کی پالش دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈکیتوں کے ڈیرے پر، جہاں آج کل پولیس نے چڑھائی کی ہوئی ہے۔ اسے وہاں اپنے ساتھ لے جانے والا رستم سیال ہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ وہاں سے زندہ بھی آتی ہے یا نہیں۔''

''مگر وہ تو خود اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ سب لوگ جانتے ہیں اور اس بات کا بھی کون سا پکا ثبوت ہے کہ وہ وہیں پر ہے۔''

''وہ خود پیچھے نہیں پڑی ہوئی تھی، یہی جو خدا ترس بی بی ہے ناں اسی نے پھنسایا تھا اس بے چاری کو اور اس کے ڈیرے پر ہونے کا ثبوت بھی تمہیں دو چار دن میں مل جائے گا۔ اس کی لاش کی تصویر اخبار میں چھپے گی یا پھر وہ پکڑی جائے گی اور پتا نہیں کس کس کے ہاتھوں مٹی پلید کروائے گی۔''

الماس نے ہنس کر فنی میں سر ہلا دیا۔ دونوں پری چہرہ بہنیں اپنی رَو میں گفتگو کر رہی تھیں اور اس بات سے بے خبر تھیں کہ جن کے بارے میں وہ گفتگو کر رہی تھیں وہ انہی کے سامنے موجود ہیں۔ عاصمہ نے بی بی کے بارے میں غلط لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔ اندرونی طیش سے رستم کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ جہانگیر کو یہی لگا کہ وہ پھٹ پڑے گا اور جس طرح اگلے ڈیرے میں اس نے گوہرا کی یادگار پٹائی کر دی تھی، اسی طرح اس فلم سٹار کی بھی کم بختی آ جائے

گی۔ بہرحال ابھی تک رستم نے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اور خاموش تھا۔ جہانگیر نے موضوع بدلنے کے لئے ٹی وی آف کر کے میوزک کی آواز کچھ بلند کر دی۔ حدیقہ کیانی کا ایک بہت تیز گانا لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بہنوں کے حسین پاؤں جیسے خود بخود تھرکنے لگے۔ اعضا کی شاعری ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم کے وسیع قالین پر رقص کرنے کے لئے جہانگیر کے بس ایک اشارے کی منتظر نظر آتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد دونوں نے اپنے خوش نما سینڈل اُتار کر ایک طرف رکھے۔ آنچل جو صرف خانہ پُری کے لئے کندھوں پر رکھے تھے، صوفوں پر پھینک دیئے اور قہقہے بکھیرتی ہوئی رقص فرما ہو گئیں۔ رستم نے اب وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ یہ آگ تیزابی محلول کی تھی اور اس غم کی بھی تھی جو تیزاب کی طرح رستم کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ اس کا عشق تو پہلے ہی بے کراں تھا لیکن سون کی اندھی دراڑ میں بی بی کو چھونے کے بعد یہ عشق اور بھی لامحدود ہو گیا تھا۔ رستم کو لگتا تھا کہ اب اس کے پاس بس دو ہی راستے ہیں۔ وہ بی بی کو پالے یا پھر جلد از جلد اپنی روح کا ناتا اپنے جسم سے توڑ لے..... اس کی انگلیاں اپنے سینے کی جلد پر رینگتی رہیں وہاں ''B'' کندہ تھا۔

وہ وسیع کوٹھی کے کمروں میں اِدھر اُدھر ڈولنے لگا۔ اسے کہیں چین نہیں تھا۔ گاہے بگاہے ایک عجیب سی کسک بھی سینے میں جاگتی تھی، ایک شبہ سا پیدا ہوتا تھا۔ بی بی ملتان میں تھی اور چوہدری بشیر بھی ملتان میں ہی تھا۔ چوہدری بشیر کے ساتھ یقیناً اس کا بیٹا بھی تھا۔ اس بیٹے سے شائی بے حد محبت کرتی تھی۔ یہ بچہ چوہدری بشیر اور بی بی کے درمیان ایک ناتے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا..... رستم کو لگتا تھا کہ بی بی ضرور چوہدری بشیر سے ملتی ہیں۔ بچے کی کشش انہیں چوہدری کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ اب اسے پتا چلا تھا کہ بی بی نے چوہدری حشام اور چوہدری بشیر میں صلح بھی کرائی ہے۔ اس واقعے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری بشیر سے بی بی کا ناتہ ہے۔ رستم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے دل میں جلن پیدا ہوتی۔ دماغ میں شکوے شکایات کا ریلا آتا لیکن وہ تو کچھ اور طرح کا عاشق تھا۔ اس کا عشق غیر مشروط تھا۔ نہ ملن سے کم ہو سکتا تھا نہ جدائی سے اور پھر وہ شکوہ کرتا بھی کیوں؟ وہ تو اس مسافر کی طرح تھا جو اسباب باندھ کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو۔ کسی بھی وقت اس کی گاڑی آ سکتی تھی۔ وہ ان دنوں اپنی بی بی سمیت پوری دنیا کو ایک مسافر کی نظر سے ہی دیکھ رہا تھا۔

کامن روم میں ٹہلتا ہوا وہ کوریڈور میں آیا۔ اس کی نگاہ ڈرائنگ روم میں پڑی۔ بند کھڑکیوں کی دوسری جانب دونوں پری پیکر [illegible] رقص فرما تھیں۔ نشے میں ڈوبے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے گوہر اور جہانگیر بھی ان کے ساتھ رقص فرما ہو گئے تھے۔ عاصمہ کی گوری گداز بانہوں میں ہفت رنگ چوڑیوں کی طویل قطاریں چمک رہی تھیں۔ گوہر بڑے فدویانہ انداز میں ان چوڑیوں پر اپنی کھردری داڑھی رگڑ رہا تھا۔ اس کی ٹنڈ ٹیوب لائٹ میں شیشے کے گلوب کی طرح دمک رہی تھی۔ میوزک اونچی آواز میں بج رہا تھا لیکن ڈرائنگ روم سے باہر بہت مدھم آواز ہی آ رہی تھی۔ رستم نے خوش رنگ تیز ابی محلول کا ایک گلاس اور چڑھایا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ باہر بجلی چمک رہی تھی اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مدھم لے میں ایک آواز رستم کے کانوں میں گونجتی رہی۔ یہ عشق نہیں آساں..... یہ عشق نہیں آساں۔

صبح رستم نو بجے کے قریب جاگا۔ عاصمہ اور الماس جلدی جلدی واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ عاصمہ اپنے بال لپیٹ کر باندھ رہی تھی۔ اس کی کلائیوں پر اب بس تھوڑی سی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً گوہر نے ایک پُر جوش و بدمست رات گزاری تھی۔ عاصمہ نے منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے لپ اسٹک لگائی اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کے جسم کی کمان کچھ ڈھیلی نظر آئی۔ رات اس نے بی بی کے بارے میں کچھ ''سخت'' باتیں کہی تھیں۔ شاید اسی سبب وہ گوہر کے ہاتھوں کچھ ''نرم'' ہوئی تھی۔ الماس بھی جلدی جلدی اپنے بُندے وغیرہ پہن رہی تھی۔ رستم نے گوہر کو دیکھا وہ بڑے مخمور انداز میں صوفے پر اوندھا لیٹا تھا۔ گوہر کے مزاج میں عورت کے لئے رغبت تھی۔ اس رغبت کا مظاہرہ اس نے اگلے ڈیرے پر ناچی چاندی کے ساتھ کیا تھا، بعد میں اسی وجہ سے گوہر اور رستم کے درمیان لڑائی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ناچی چاندی کو اپنے لئے بہت بڑی ''نعمت'' سمجھنے والا گوہر شاید چند دن پہلے تک سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی فلم اسٹار کا قرب اسے حاصل ہو گا۔ پوٹھوہار کی ناچیوں نے تو بس ''بارش والے گانے'' کی نقل کی تھی۔ آج ''بارش کا گانا'' گانے والی خود گوہر کے پہلو میں رہی تھی۔

وہ سو رہا تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ پر بندھی ہوئی سفید پٹی پر آج پھر خون کے دھبے تھے۔ یقیناً رات کو اپنی تند و تیز مصروفیات میں وہ جہاں اور بہت کچھ بھولا رہا تھا وہاں اپنے ہاتھ کو بھی فراموش کئے رہا تھا..... اس کے چہرے پر خمار آلود سکون تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی میں آخری عورت سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔

☆======☆======☆

رستم کی خواہش پوری ہوئی۔ جب رات کو وہ ملتان سے گوجر خان کے لئے روانہ ہوئے تو تیز بارش ہو رہی تھی۔ جانے سے پہلے جہانگیر حسین تادیر رستم کے ساتھ بغل گیر رہا۔ اس کی

آنکھوں میں نمی تھی۔ رستم نے کہا۔ ''ایک آخری بات کہنا تم سے بھول گیا ہوں۔''

''حکم کر جگر۔''

رستم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جہانگیر، ہم اس اسٹیج پر ہیں جہاں ہم میں سے کسی کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسی باتوں پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟'' جہانگیر نم آنکھوں کے ساتھ رستم کو تکتا رہا۔ رستم بولا۔ ''اگر میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو تم نے میرے حصے کی باقی رقم زوار تک پہنچانی ہے۔ اس سے کہنا کہ یہ رقم جوہر آباد کے ہسپتال کے لئے ہے لیکن بی بی کو اس بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ ان کے ذہن میں وسوسے پیدا ہوں گے کہ خبر نہیں یہ کیسی رقم ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

جہانگیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بڑے یقین کے ساتھ بولا۔ ''یہ رقم تم نے جہاں لگانی ہے اپنے ہاتھ سے لگاؤ گے۔''

''جو ہو گا، سامنے آ جائے گا۔'' رستم نے کہا۔

پھر رستم اور گوہر بڑی ہونڈا گاڑی میں بیٹھ کر کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ ڈرائیونگ نوشا کر رہا تھا۔ فرید ٹاؤن کی اس کوٹھی سے نکلتے ہوئے رستم نے کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر نگاہ دوڑائی لکھا تھا۔ ''مجاز ملک۔'' اس آبادی میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مجاز ملک نہیں جہانگیر حسین ہے۔ وہ جہانگیر حسین جو کچھ عرصہ پہلے تک ایک شریف شہری اور دیانت دار کاروباری شخص تھا۔ پھر وہ مسلسل زیادتیوں کا شکار ہو کر جنونی ہوا اور اس نے بھرے بازار میں ایک بدمعاش انکم ٹیکس آفیسر کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ اشتہاری ہوا۔ دوسرے اشتہاریوں کے ساتھ مل کر کئی سنگین جرم کئے اور کیا سے کیا بن گیا..... اب مدت ہوئی اس کی بیوی کسی اور کی بیوی بن چکی تھی۔ باپ اور بھائی اس سے ملنا تو درکنار اس کا سایہ بھی اپنے آس پاس دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اب اس کا کوئی گھر بار نہیں تھا، کوئی رشتہ ناتا نہیں تھا۔ وہ موت کا راہی تھا..... گولی اور پھانسی کا پھندا دونوں اس کے تعاقب میں تھے لیکن ان حالات میں بھی وہ زندگی سے خوشی کشید کرنے کا ہنر جانتا تھا اور وہ ایسا کر رہا تھا۔ رستم نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو زندگی بھاگتے بھاگتے کیوں گزارنا پڑتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے کھانا، بھاگتے بھاگتے سونا اور بھاگتے بھاگتے قدرت کی رنگینیوں کو دیکھنا اور حسرت سے انہیں چھو کر آگے بڑھ جانا۔ شہر کے بیشتر حصوں میں برقی رَو غائب تھی۔ نیم تاریکی اور تیز بارش کے سبب وہ بہ حفاظت ریلوے سٹیشن تک پہنچ گئے۔ بس ایک جگہ پولیس

www.pdfbooksfree.pk

ناکے پر انہیں گاڑی کی رفتار ہلکی کرنا پڑی۔ برساتی پوش پولیس اہلکار نے بے دلی سے گاڑی کے اندر جھانک کر انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

انہوں نے ملتان سے گوجر خان تک کے سیکنڈ کلاس ٹکٹ لئے اور گاڑی میں آ بیٹھے۔ رستم پتلون قمیص اور موٹی جرسی میں تھا۔ گوہر نے کلف لگی سفید شلوار قمیص اور سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ صفاچٹ سر اور ترشی ہوئی مونچھوں کے سبب گوہر کا حلیہ بھی تسلی بخش حد تک بدل گیا تھا۔ جوں جوں ٹرین شمال کی طرف بڑھتی رہی بارش میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ دونوں صبح سویرے لاہور سٹیشن پر تھے۔ یہاں بھی بارش ہو رہی تھی۔ لاہور سے رستم کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا دل چاہا تمام مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر یہاں اُتر جائے اور ان گلی کوچوں میں تادیر گھومتا رہے۔ گوہر نے تازہ اخبار لے لیا تھا اور اسے اپنے چہرے کے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ رستم جانتا تھا اسے اخبار پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں، وہ صرف اپنا چہرہ چھپا رہا تھا۔ رستم کی نگاہ اخبار کے پچھلے صفحے پر نظر آنے والی ایک مختصر خبر پر پڑی۔ نوجوان لڑکی کی خودکشی کی کوشش ناکام۔ لڑکی تھانے کی دوسری منزل سے کود گئی تھی۔

اس سرخی کے نیچے متن میں درج تھا۔ ''نوجوان لڑکی نے گوجرانوالہ تھانہ کی بالائی منزل سے نیچے پختہ سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ اس واقعے میں لڑکی کی ٹانگ اور ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اسے لاہور میو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ لیڈیز پولیس کی سب انسپکٹر نادرہ درانی حوالاتی لڑکی سے تفتیش کر رہی تھی۔ لڑکی نے پہلے حملہ کر کے سب انسپکٹر کا چہرہ نوچنے کی کوشش کی، اس کے بعد کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ سب انسپکٹر ماجد موہلہ کا کہنا ہے کہ مسماۃ ''ج'' کو منشیات فروشی کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور وہ لیڈیز پولیس کی تحویل میں تھی۔''

اس مختصر خبر میں ماجد موہلہ کے نام نے رستم کو چونکا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماجد موہلہ ڈپٹی ریاض کا خاص ماتحت ہے اور عموماً جہاں ڈپٹی ریاض تعینات ہوتا ہے وہیں یہ سب انسپکٹر بھی ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔ یہ بڑے سخت گیر لوگ تھے۔ اپنے شکنجے میں آئے ہوئے لوگوں کو موت اور زندگی کے درمیان لٹکا دیتے تھے۔ کوئی یونہی تو اپنی جان لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب انسان کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے تو وہ موت کو گلے لگاتا ہے۔

پھر رستم کو بھرجائی مہناز اور اس کے پھول سے بیٹے ٹیپو کا خیال آیا۔ ننھا بچہ تو جانی دشمن کا بھی بُرا نہیں لگتا۔ وہ قدرت کا عکس ہوتا ہے۔ وڈے ڈیرے کے نواح میں دور مار رائفل سے ٹیپو اور اس کی ماں کو دھیر کر دیا گیا تھا۔ یہ سفاکی کی انتہا تھی اور رستم اچھی طرح جانتا تھا کہ اس سفاکی کے ڈانڈے ضرور ڈپٹی ریاض سے ملتے ہوں گے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے

مقصد کے حصول کے لئے بے رحمی کی آخری حدود کو چھو لیتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ریاض ہنٹر نے وڈے ڈیرے کے مکینوں کو مشتعل کرنے کے لئے یہ کارروائی کرائی ہو۔ صورتِ حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس افسران وڈے ڈیرے کے مکینوں کو ہر صورت ان کی محفوظ پناہ گاہوں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ خاص طور سے پارودی سرنگوں کا حصار ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ پولیس اور دیگر ایجنسیوں کی یقیناً یہ کوشش ہوگی کہ ڈیرے کے مکین اس حصار سے آگے آئیں۔ ایک طرح سے لالہ اور اس کے ساتھیوں نے دانش مندی کا ثبوت ہی دیا تھا کہ ماں بیٹے کی لاشیں اٹھانے کے لئے دوسرے ٹیلے پر نہیں گئے تھے۔ اگر وہ دن کی روشنی میں آگے جاتے تو یقیناً مزید نقصان اٹھاتے۔ رستم کی معلومات کے مطابق پولیس اور ان کے مقامی مددگاروں کے پاس M642 کی دو مار گنیں تھیں۔ ایسی گنیں باآسانی دو تین میل تک اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی ہیں اگر ایسی گنز کو اچھی ٹیلی سکوپ کی مدد حاصل ہو تو وہ بہترین نارگٹ کلنگ کرتی ہیں۔

وہ لوگ سہ پہر چار بجے گوجر خان پہنچ پائے۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ مارگلہ اور مری کی پہاڑیوں کی طرف سے سیاہ بادل اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے۔ سہ پہر کے چار بجے ہی گہری شام کا ماحول نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سٹیشن کے باہر ایک ہوٹل سے تھوڑی سی پیٹ پوجا کی اور پھر بذریعہ ٹیکسی کار جگوال گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ٹوٹی پھوٹی نیم پختہ سڑک کا دشوار گزار سفر تھا۔ بارش اور کیچڑ کے سبب یہ مزید دشوار ہو گیا۔ وہ جنوب مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ چکوال کو جانے والی سڑک ان کی دائیں ہاتھ پر تھی اور لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ گوہر ابھی تک سرور اور خمار کی کیفیت میں تھا۔ وہ غنودگی کی حالت میں اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتا تھا اور بار بار گنگناتا تھا۔ لک پتلا ٹمپار دا... ہولک پتلا۔ گوجر خان سے قریباً پندرہ کلومیٹر آگے آنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے دیہاتی بازار کے پاس سے گزر رہے تھے جب اچانک رستم چونک گیا۔ اس کی نگاہ ایک ٹی سٹال پر پڑی۔ بلب کی روشنی میں اس کو لکڑی کی بنچ پر ایک ایسا شخص بیٹھا نظر آیا جسے وہ جانتا تھا۔ وہ چوہان تھا۔ وہی چوہان جس کا تعلق سنگوال برادری سے تھا اور جس کے بارے میں نظام نے بتایا تھا کہ وہ وادیٔ سون جانے اور پولیس سے مزاحمت کرنے کے لئے بے حد بے تاب ہے۔ نظام کے مطابق چوہان نے پندرہ بیس کے لگ بھگ ایسے بندے بھی تیار کر لئے تھے جو پولیس کا گھیرا توڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

رستم جانتا تھا چوہان ایک دلیر اور جانباز شخص ہے۔ درحقیقت چوہان کے ... میں

www.pdfbooksfree.pk

اطلاع ملنے کے بعد رستم نے اپنے اندر ایک نئی روح محسوس کی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس کے جسم اور دماغ میں اضافی توانائی آگئی ہے۔ چوہان کو اس ٹی اسٹال پر بیٹھے دیکھ کر رستم کے لئے ممکن نہیں ہوا کہ وہ آگے بڑھ سکے۔ اس نے پنڈی وال ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دے دیا۔

''کیا ہوا صاحب، یہاں کیا کرسو؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''یار! ذرا تمہاری گاڑی کو دم آجاسی۔ تم بھی تھوڑی سی چائے پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔'' رستم نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

ڈرائیور نے گاڑی بیک کر کے ٹی سٹال کے سامنے کھڑی کر دی۔ یہاں پان سگریٹ، کریانہ اور پھل کی کچھ دکانیں بھی تھیں۔ مسلسل بارش اور تھکاوٹ کے سبب ایک پھل فروش اپنی ٹھنڈی ٹھار دکان میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

چوہان نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر لیا تھا۔ رستم کو اس کی صورت واضح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ چوہان تھا بھی یا نہیں۔ رستم نے اردگرد کا جائزہ لیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور کو پوری امید تھی کہ اپنی ان سواریوں سے اسے کرائے کے علاوہ بھاری ٹپ بھی مل جائے گی۔ اس نے باہر نکل کر جلدی سے اپنی چوڑی چھتری کھولی اور رستم پر سایہ کر دیا۔ گویرا گاڑی کے اندر ہی بیٹھا اونگھتا رہا۔ رستم اور ڈرائیور ٹی سٹال پر پہنچے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے شخص کے عین سامنے پہنچ کر رستم نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس شخص نے بھی رستم کو دیکھا۔ اس شخص کے چہرے پر شناسائی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ دفعتاً رستم کو اندازہ ہوا کہ وہ چوہان نہیں لیکن اس کی شکل، چھوٹی داڑھی اور قد وقامت چوہان سے کافی حد تک ملتی جلتی تھی۔

رستم السلام علیکم کہتا ہوا اس کے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنی کہنیاں لکڑی کی کھردری میز پر ٹکا دیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی دونوں سواریوں کی حیثیت و مرتبے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی تن فن سے ٹی سٹال والے دیہاتی کو حکم دیا۔ ''برتن اچھی طرح دھو لینا اور دودھ زیادہ ڈالنا ہے۔''

رستم نے اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائی صاحب! تمہاری شکل کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔''

نوجوان نے کندھوں پر چادر درست کر کے شہادت کی انگلی سے اپنی گھنی مونچھوں کو چھوا اور بولا۔ ''بس جی صورتوں سے صورتیں ملتی ہیں۔ آپ کہاں سے آرہے ہیں؟''

''لاہور سے۔ یہاں جگ وال گاؤں میں اپنا ایک ملنے والا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ چھوٹی نہر کے پاس کچھ زرعی زمین بڑی مناسب قیمت پر مل رہی ہے۔ وہ دیکھنے آئے ہیں اور

تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''بورے والا کا۔'' نوجوان نے مختصر جواب دیا۔ اس کی آواز بھاری اور متاثر کن تھی۔

''جگ وال میں نظام نام کے بندے کو جانتے ہو؟''

''نہیں جی۔ دراصل میں شارجہ میں تھا۔ وہاں ورکشاپ ہے میری۔ دو تین ہفتے پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''چوہان نام کے کسی بندے کو جانتے ہو؟''

وہ چونکا، پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ''آہو جی۔ وہ میرا وڈا بھائی ہے۔ ہم دونوں کی شکل کچھ ملتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''بس پرانی ملاقات ہے۔'' رستم نے مبہم جواب دیا۔

''وہ کل کراچی گیا ہے، ایک شادی میں۔ ایک دو اور کام بھی ہیں۔ ہفتے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔''

رستم بُری طرح چونکا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا وہ واقعی کراچی گیا ہے؟''

''آہو جی۔ میں خود اسے گڈی چڑھا کر آیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر بھی اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے۔''

رستم نے چہرے کے تاثرات پر کنٹرول رکھا مگر اس کے اندر شدید ہلچل مچ گئی۔ اس نے چوہان کے بھائی کو کریدا اور اگلے تین چار منٹ میں تصدیق ہو گئی کہ وہ واقعی کراچی پہنچا ہوا ہے۔ یہ معاملہ کچھ گڑبڑ لگ رہا تھا۔ نظام کہہ رہا تھا کہ چوہان یہاں جگ وال میں ہے اور اپنے ساتھیوں سمیت سون جانے کے لئے بے قرار ہے۔ پتا نہیں کیوں اس سارے معاملے میں ہی رستم کو کچھ بھی محسوس ہونے لگی۔ ایسی صورتِ حال میں اس کی حسیات بہت تیز ہو جاتی تھیں۔ وہ مامون نامی اس شخص سے رخصت ہو کر ٹیکسی میں آبیٹھا۔ وہ اب جگ وال سے زیادہ دور نہیں تھے۔ رم جھم برستی بارش میں ٹیکسی پھر روانہ ہو گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد ٹیلوں کے دامن میں جگ وال کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ نظام جگ وال میں ڈیزل انجنوں کو ٹھیک کرنے کی ورکشاپ چلاتا تھا۔ اسی ورکشاپ کے گودام میں ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جہاں جرمن میڈ طاقتور وائرلیس سیٹ موجود تھا جس کے ذریعے نظام وڈے ڈیرے کے مکینوں کو آباد دنیا کی خبریں فراہم کرتا تھا۔ پچھلے قریباً پانچ سال سے نظام نہایت کامیابی اور جان فشانی سے پیغام رسانی کا اہم ترین فریضہ انجام دے رہا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

ملتان میں فون پر جو پروگرام طے ہوا تھا اس کے مطابق رستم اور گوہرا کو جگ وال پہنچ کر سیدھا نظام کی ورکشاپ پر پہنچنا تھا۔ یہ ورکشاپ گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک پرانے مندر کے قریب واقع تھی۔ نہ جانے کیوں رستم کے ذہن میں آیا کہ وہ ورکشاپ جانے کی بجائے نظام کے گھر پہنچے اور اس سلسلے میں پوری رازداری برتے۔

انہوں نے کیچڑ اور گارے میں لتھڑی ہوئی ایف ایکس سوزوکی ٹیکسی گاؤں سے ایک کلومیٹر پہلے ہی فارغ کردی اور پیدل گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈرائیور نے اپنی چھتری رستم اور گوہرا کے حوالے کردی تھی کیونکہ جتنی اسے ٹپ ملی تھی اس میں وہ ایسی بیس تیس چھتریاں خرید سکتا تھا۔ نظام کی رہائش گاہ کا رستم کو علم تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گاؤں کے ایک مضافاتی گھر کے دروازے پر دستک رہے تھے۔

نظام کی تیس پینتیس سالہ بیوی ایک دابو عورت تھی۔ ہمہ وقت نظام سے ڈری رہتی تھی حالانکہ نظام عام حالات میں سخت گیر شخص نہیں تھا۔ اس کا نام واجدہ تھا۔ واجدہ نے رستم کے چھوٹے چھوٹے بالوں اور پتلون قمیص کی وجہ سے اسے بہ مشکل پہچانا۔ گوہرا کو وہ سرے سے پہچانتی ہی نہیں تھی۔ واجدہ اور نظام کی کل کائنات ایک بیٹا بیٹی تھے۔ بیٹا پنڈی میں کار ٹیپ ریکارڈنگ کا کام کرتا تھا..... بیٹی غیر شادی شدہ تھی اور ان کے پاس ہی رہتی تھی۔ فی الوقت وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ رستم نے واجدہ سے پوچھا۔ ''آپا جی، بیٹی کدھر ہے؟''

''وہ دو مہینے پہلے لاہور چلی گئی ہے۔ اسے نرسوں کا کورس کرنے کا بڑا شوق ہے۔ بہت منع کیا لیکن نہیں مانی۔ اب وہاں ہوسٹل کی دال روٹی کھاتی ہے۔''

''بھائی نظام کدھر ہے؟''

''وہ ابھی تک ورکشاپ میں ہی ہیں۔ کہتے تھے کہ ایک کرنل صاحب کے پمپ کا انجن ٹھیک کرنا ہے۔ ضروری کام ہے، کل پر نہیں ڈال سکتا۔ واپسی میں دیر ہوجائے گی۔ پر اگر تم کہتے ہو تو گوانڈیوں کے منڈے کے ہاتھ ان کو گھر آنے کا پیغام بھیج دیتی ہوں۔''

''نہیں..... نہیں۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ آرام سے تمہارے ہاتھ کی بھنی ہوئی مرغی کھاتے ہیں اور جب بھائی نظام آئے گا تو اس سے سرداروں کے لطیفے سنیں گے۔'' رستم نے رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

واجدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لطیفے ٹطیفے تو ان کو بھول ہی گئے ہیں۔ پتا نہیں آج کس کیا ہوگیا ہے ان کو۔ چپ چپتے رہتے ہیں۔ غصہ بھی بہت آتا ہے۔ پہلے تو میں سمجھتی تھی کہ شاید جمیلہ بیٹی کے لاہور جانے کی اداسی ہے لیکن یہ بات بھی نہیں۔''

''ہوتی ہیں کئی باہر کی پریشانیاں۔'' گوہرا نے لقمہ دیا۔

واجدہ بہت سیانی، سنجیدہ اور معاملہ فہم عورت تھی۔ اسے اردگرد کے حالات کی بھی کافی خبر رہتی تھی لیکن آفرین تھا اس کی طبع پر، کہ عورتوں کے مزاج کے بالکل برعکس پچھلے پانچ سالوں میں وہ نظام ہی کی طرح لالہ فرید کے ہر راز کی امین رہی تھی۔ اس نے اپنے مہندی لگے بالوں پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے کہ سون میں کام خراب ہوتا جارہا ہے۔ وہاں بہت زیادہ پولیس آگئی ہے اور انہوں نے ڈیرے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔'' رستم نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ اسی وجہ سے وہ زیادہ پریشان رہتے ہوں۔'' واجدہ نے ایک بار پھر کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو وہ پڑوسیوں کے لڑکے کو بھیج کر نظام کو ورکشاپ سے بلوا لیتی ہے۔ رستم نے پھر منع کردیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کرنل صاحب کے کام کا تو بس بہانہ ہے، نظام وہاں ان دونوں کا انتظار کررہا ہے۔ اب رستم چاہتا تھا کہ وہ خود ہی واپس گھر آجائے تو اچھا ہے۔ اسے ورکشاپ تک اپنی آمد کا پیغام پہنچانے میں خطرہ محسوس ہورہا تھا۔ اس کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔

ان دونوں نے چولہے کے قریب بیٹھ کر اُپلوں کی آگ سے اپنے گیلے کپڑے سکھائے۔ مکئی کی روٹی پودینے کی چٹنی اور آلو مٹر کے ساتھ کھائی۔ آلو مٹر آج کل رستم کو بہت اچھے لگ رہے تھے، شاید لاشعوری طور پر ان کے ساتھ کوئی یاد وابستہ ہوگئی تھی۔ دونوں نے ملائی والا دودھ پیا اور واجدہ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ لالٹین کی روشنی خواب ناک تھی برآمدے کی چھت ٹین کی تھی اور اس پر پڑنے والی بارش کے تڑیرے آواز پیدا کرتے تھے۔ واجدہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ''لوگ کہہ رہے ہیں کہ پولیس نے بہت جلد ڈیرے پر بڑا حملہ کرنا ہے..... وہاں بہت زیادہ اسلحہ جمع کیا گیا ہے اور دن میں کئی بار ہیلی کاپٹر اُڑنے کی آواز بھی آتی ہے۔''

''صرف پولیس کی بات ہوتی تو بھی کچھ نہ کچھ ہوسکتا تھا لیکن پتا چلا ہے کہ اجرال برادری کے لوگ بھی پوری طرح پولیس کی مدد کررہے ہیں اور سارے خفیہ راستے پولیس افسروں کو بتا رہے ہیں۔''

''ایسی بات تو ہم بھی سن رہے ہیں۔''

رستم نے واجدہ کو کریدنے کی کوشش کی۔ ''اجرال برادری کے لوگوں کی سنگوالیوں سے پرانی دشمنی ہے۔ سنگوالیوں کے بہت سے لوگ بھی پولیس کے گھیرے میں آئے ہوئے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

کیا سنگوالی بھی چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''غصہ تو ان کو بھی بہت ہوگا۔ پر کوئی کیا کرے۔ حاکموں کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔ بس اندر ہی اندر کڑھ رہے ہیں۔''

''مجھے پتا چلا تھا کہ سنگوال برادری کے کچھ لوگوں نے بھائی نظام سے کہا ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں کو پولیس کے گھیرے سے نکالنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں۔''

''یہ تو کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ باتیں تو ہوئی تھیں لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آیا تو کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ بس ایک چوہان تھا اور ایک اس کا دوست تھا۔ وہ دونوں شور مچاتے رہے پھر وہ بھی چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ اب تو میں نے سنا ہے کہ چوہان بھی لاہور یا کراچی چلا گیا ہے۔''

رستم کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔ اب تصدیق ہوگئی تھی کہ نظام نے اسے غلط خبریں دی تھیں اور ایسا پچھلے پانچ چھ برسوں میں پہلی بار ہوا تھا۔

واجدہ میدے اور گوند کا حلوا پکاتے ہوئے اپنی رَو میں بولتی چلی جارہی تھی۔ ''رستم! تمہیں یہاں دیکھ کر میرا غم تھوڑا سا ہلکا ہوا ہے۔ جمیلہ کا ابا تو مجھے کچھ بتاتا ہی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی لالے اور حسنے کے ساتھ اُدھر ڈیرے پر ہی پھنسے ہوئے ہو۔ میں تو مشورہ دیتی ہوں کہ اب چھپتی چھپتی اس علاقے سے نکل جاؤ، یہاں کوئی جگہ بھی پولیس اور ان کے مخبروں سے بچی ہوئی نہیں ہے۔ اجرال برادری میں بڑے بڑے اچھے لوگ بھی ہیں۔ پر اس وقت مخبری کا کام بھی زیادہ تر اجرالی ہی کررہے ہیں۔''

رستم زیرِلب مسکرایا۔ یہ ہمدرد عورت اسے یہاں سے دور نکل جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بہت دور سے خود اس علاقے میں پہنچا ہے اور ابھی مزید آگے جانا چاہتا ہے۔ اس قتل گاہ میں جہاں کچھ بے بس لوگ حالات کے شکنجے میں ہیں اور اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

وہ تینوں چولہے کے پاس بیٹھے رہے۔ ٹیلوں کے دامن میں یہ قصبہ نما بستی بڑی خاموشی سے بارش میں بھیگتی رہی۔ بس کبھی کبھار کوئی چوپایہ یا انسان کیچڑ زدہ گلی میں پاؤں سے چپ چپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گزر جاتا تھا۔ وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ نظام کی واپسی کا انتظار بھی کرتے رہے۔ ساتھ والے گھر میں ٹی وی بلند آواز میں چل رہا تھا۔ شاید بچوں کا کوئی پروگرام نشر ہورہا تھا۔ پہلے ایک بچی نے توتلی آواز میں سنایا پھر ایک بچہ آیا۔ کمپیئر نے نام پوچھا۔ ''ریحان۔'' بچے نے جواب دیا۔

''کیا سناؤ گے بیٹا؟'' کمپیئر نے محبت سے پوچھا۔

''نظم..... عنوان ہے میری امی۔'' پھر بچے نے نظم سنانی شروع کی، وہ سادہ اور معمولی نظم کے الفاظ تھے لیکن ان میں موجود محبت کی لہر نے انہیں معمولی نہیں رہنے دیا تھا۔

امی میری پھول کے جیسی
صاف ہوا اور شہد کے جیسی
باتیں ان کی میٹھی میٹھی
آنکھیں چمکتی تاروں جیسی
اچھی باتیں سکھلاتی ہیں، اچھا کھیل کھلاتی ہیں
اللہ ان کو جیتا رکھے، ان کا ہمیشہ ہی پیار ملے

نظم سنتے ہوئے نہ جانے کیوں رستم کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اسے پھر ٹیپو یاد آگیا۔ وہ بھی تو اتنی ہی عمر کا تھا۔ ایسے ہی اپنی ماں سے پیار کرتا تھا اور جسے پیار کیا جاتا ہے، اسے ستایا بھی جاتا ہے۔ وہ ماں کو ستانے کے لئے بھاگا تھا اور بھاگتا چلا گیا تھا۔ ماں بیٹا آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے اوجھل ہوگئے تھے..... کائنات کی حد سے آگے نکل گئے تھے لیکن انہیں مارنے کے لئے جس انگلی نے لبلبی دبائی تھی وہ رستم کے لئے ناقابلِ معافی تھی اور یقیناً ہر ذی احساس شخص کے لئے بھی ناقابلِ معافی تھی۔ لبلبی دبانے والی یہی بے حس انگلی ہے جس نے پورے کرہ ارض کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ یہ انگلی ماؤں سے ان کے لختِ جگر چھینتی ہے۔ بہنوں سے بھائی اور بھائیوں سے بہنیں اور پتا نہیں کیا کچھ۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر واجدہ فوراً بولی۔ ''جمیلہ کے ابا آگئے ہیں۔''

یہ اندازہ پندرہ سولہ سالہ رفاقت کا نتیجہ تھا، اس لئے بالکل درست ثابت ہوا۔ واجدہ نے دروازہ کھولا تھا تو نظام چھتری تانے اندر آگیا۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا۔ جسم ذرا سا بھاری لیکن مضبوط تھا۔ پیشانی چوڑی، سر کے بال گھنے لیکن کھچڑی تھے۔ وہ شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بڑے ہاتھ اس کے میکینکل مزاج کی نشاندہی کرتے تھے۔ صحن میں پہنچنے کے بعد اس نے رستم اور گوہرا کو چولہے کے قریب بیٹھے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ رستم کو ایک لمحے کے لئے تو محسوس ہوا کہ وہ صحن میں ہی رک جائے گا اور آگے نہیں آئے گا، تاہم پھر وہ خود کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

رستم اور گوہرا کے بدلے ہوئے حلیوں کی وجہ سے اسے ان دونوں کو پہچاننے میں کچھ

www.pdfbooksfree.pk

دشواری بھی ہوئی۔ لالٹین کی روشنی میں دونوں کو دھیان سے دیکھنے کے بعد اس نے السلام علیکم کہا اور چھتری کو ایک طرف رکھتے ہوئے دونوں سے بغل گیر ہوگیا۔ رستم نے محسوس کیا کہ نظام کے جسم میں خفیف جنبش ہے اور اس کا انداز حقیقی گرم جوشی سے عاری ہے۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ بولا۔ ''رستم بھائی! تم دونوں کو تو وہاں ورکشاپ میں آنا تھا۔''

''بس اچانک ارادہ تبدیل ہوگیا۔ میں نے سوچا آج آپا واجدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا سیوڑیں حلوہ کھایا جائے۔ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔''

''کب سے آئے ہو؟''

''بس ابھی ایک گھنٹہ ہوا ہے۔'' رستم نے جلدی سے کہا۔

نظام کی شلوار کا نچلا حصہ کیچڑ آلود اور گیلا تھا۔ وہ اپنے نم کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تو تم اپنی بھرجائی کے پاس بیٹھو۔ میں کپڑے بدل لوں پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔''

''کپڑے ٹھیک ہی ہیں۔ آگ کے سامنے بیٹھو سوکھ جائیں گے۔'' رستم نے کہا۔

''نہیں مجھے اوازاری (پریشانی) ہوتی رہے گی۔ میں بس دو منٹ میں آیا۔''

وہ اندر کمرے میں چلا گیا۔ رستم کے اندر بے حد بے قراری تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نظام اس کے ساتھ اور لالے کے ساتھ کسی طرح کا دھوکا کرسکتا ہے۔ رستم جیسا بندہ بھی نظام پر اور اس کی بیوی واجدہ پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرنے کا ہامی تھا لیکن یہاں جو کچھ محسوس ہورہا تھا اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ سنگوال گوٹھ کا چوہان یہاں موجود نہیں تھا اور نظام کے مطابق وہ یہیں تھا۔

ابھی رستم نے نظام کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی سوجی تھیں اور پتلیوں کے اندر کوئی بہت گھمبیر اور سنگین راز ٹھہرا ہوا تھا۔

رستم سے ممکن نہیں ہوا کہ وہ وہاں رکا رہے۔ وہ نظام کے پیچھے گیا۔ واجدہ پوچھتی رہ گئی۔ ''کیا چاہیے رستم؟''

رستم اندرونی کمرے میں پہنچا تو نظام کپڑے بدلنے کی بجائے کسی کو فون کررہا تھا۔ موبائل سیٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ نمبر ملا رہا تھا۔ ''کسے فون کررہے ہو نظام؟''

رستم نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ ''مم..... میں چوہان کو کررہا تھا۔ میں نے کہا اسے اِدھر ہی بلالوں۔''

''لیکن سنا ہے، چوہان تو یہاں ہے ہی نہیں۔'' رستم نے کہا۔

''کون کہتا ہے؟''

رستم نے جواب دینے کی بجائے نظام کے موبائل کی سکرین کو دھیان سے دیکھا۔ وہ جس شخص کو کال کرنے جارہا تھا، اس کا نام ماجد تھا۔ ایک دم رستم کے چودہ طبق روشن ہوگئے..... ماجد موبلہ ڈپٹی ریاض کے خاص ماتحت کا نام بھی تھا۔ رستم نے موبائل نظام کے ہاتھ سے لینا چاہا تو اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔ ''کیا کرتے ہو رستم بھائی؟'' وہ گھبرا کر بولا۔

''یہ ماجد کون ہے؟'' رستم نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی موبائل نظام کے ہاتھ سے لے لیا۔ نظام کا رنگ سیاہی مائل ہوتا جارہا تھا۔

یکا یک فون کی بیل بجنے لگی۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ اس کے اندر آنے سے پہلے نظام نے مطلوبہ نمبر پر ایک دو بیل کردی تھیں۔ اب اس ''مس کال'' کے جواب میں مطلوبہ نمبر سے کال آگئی تھی۔ رستم نے انگوٹھے سے ریسیو کا بٹن دبا کر کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو..... ہیلو..... کون؟'' اس آواز نے رستم کو سکتہ زدہ کردیا۔ یہ ڈپٹی ریاض ہٹلر کی آواز تھی۔ اپنے ماتحت کے سیل فون پر وہ خود بول رہا تھا۔ رستم نے فون بند کردیا۔ یہی وقت تھا جب رستم کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ اگر اسے اپنا سر جھکانے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو نظام کی چلائی ہوئی کلہاڑی اس کی کھوپڑی توڑ ڈالتی۔ اسے نظام سے ایسے تیز ردِعمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ نظام جیسا شخص اسے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ بالکل بھونچکا رہ گیا۔

کلہاڑی رستم کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری تھی اور پڑچھتی پر سجے برتنوں میں گھسی تھی۔ ایک زوردار چھناکا پیدا ہوا۔ رستم اس شدید ترین جھٹکے سے سنبھل نہیں سکا تھا کہ نظام نے دوسرا وار کیا۔ یہ وار عمودی تھا۔ یعنی اوپر سے نیچے آرہا تھا۔ اس مرتبہ رستم پیچھے کی طرف گیا اور چھوٹے دستے کی تیز دھار کلہاڑی اس کی جرسی کو سینے سے ادھیڑتی چلی گئی..... خدا کی پناہ..... نظام کے چہرے پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور باچھیں وحشی جانور کی طرح پھیل گئی تھیں۔ وہ وحشی جانور ہی کی طرح چنگھاڑا۔ ''زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے رستم پر پے در پے وار کیے۔ کمرے کے مختصر خلا میں رستم کے لئے خود کو بچانا مشکل ہورہا تھا پھر ایک موقع پر کلہاڑی کا دستہ رستم کے مضبوط ہاتھوں میں آگیا۔ رستم نے نظام کو کلہاڑی سمیت گھما کر دیوار سے دے مارا۔ اس کا خیال تھا کہ کلہاڑی نظام کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ نظام کے ہاتھوں میں بیجانی قوت تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم اسے دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دونوں ایک رنگین پایوں والے نواڑی پلنگ پر گرے اور اسے چکنا چُور کر گئے۔ کمرے میں کہرام مچ گیا۔ واجدہ اور گوہرا بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ گھبرائی ہوئی واجدہ نے ایک دو خوف ناک چیخیں بلند کیں لیکن گوہرا نے اس کا منہ دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

نظام نیچے اور رستم اوپر تھا۔ وہ دونوں ٹوٹے ہوئے پلنگ کے چوکھٹے پر گرے تھے۔ رستم نظام سے کلہاڑی چھیننے کی کوشش کر رہا تھا مگر نظام کے مضبوط ہاتھ جیسے کلہاڑی کے دستے کے ساتھ ویلڈ ہو چکے تھے۔ رستم جیسا مضبوط شخص بھی نظام کے ہاتھوں سے دستہ چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ جس طرف کو زور لگاتا نظام کیچوے کی طرح اس طرف مڑ جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہذیان بک رہا تھا۔ ''میں نے کسی کی ماں کے ساتھ کیا بُرا کیا ہے؟ میں نے کسی کی بہن کے ساتھ کیا بُرا کیا ہے؟ میں کسی کُتے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں لاشیں گرا دوں گا۔''

کلہاڑی کے دستے پر اس کی گرفت ناقابلِ شکست تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ رستم اسے کوئی شدید چوٹ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ کلہاڑی چھڑانا قدرے آسان ثابت ہوتا۔

مجبور ہو کر رستم نے اس کی پسلیوں میں گھٹنے کی چوٹ لگائی اور پھر ایک جھٹکے سے کلہاڑی کھینچ لی۔ جس وقت وہ کلہاڑی دور پھینک رہا تھا۔ نیم دیوانے نظام نے ایک دوسرا کام کیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی واسکٹ کے نیچے سے کھلا ہوا چاقو کھینچ لیا۔ بہرحال اب اس کے جنون کا انداز دوسرا ہو گیا تھا۔ اس نے یہ چاقو اپنی گردن میں گھونپنے کی کوشش کی۔ رستم کو ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو شاید وہ خود کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا لیتا۔ رستم نے اس کی کلائی جکڑ لی۔ وہ دردناک انداز میں چلانے لگا۔ ''مجھے مر جانے دو..... میری جان چھوٹ جانے دو..... حرام زادو مجھے مر جانے دو۔''

وہ پوری طاقت سے رستم اور گوہرا کی گرفت میں مچل رہا تھا۔ واجدہ کے ہونٹوں سے دبی دبی اذیت ناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ بالآخر گوہرا نے نظام کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ رستم بار بار نظام کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ نظام کی بلند آوازیں پڑوس کے مکینوں تک نہ پہنچ جائیں۔ بہرطور ابھی تک خیریت تھی۔ کمرہ اندرونی حصے میں تھا اور دروازہ بند تھا۔ دوسرے بادو باراں کا شور بھی آوازوں کو دبا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رستم نے نظام کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ایک مفلر باندھ دیا پھر ایک ازار بند سے نظام کے ہاتھ بھی پشت پر باندھنا پڑے۔

واجدہ کے لئے یہ سارا نظارہ دیکھنا تکلیف دہ تھا لہٰذا رستم نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ جب ہاتھ بندھ گئے اور منہ بھی بند ہو گیا تو نظام کی ہیجانی کیفیت اچانک ختم ہو گئی۔ اس نے نڈھال سا ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو رِس رہے تھے۔

رستم نے واجدہ سے کہا۔ ''آپا! ہمیں اندازہ نہیں، لیکن یہاں کوئی زبردست گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا اور نظام کو ساتھ لے جانا پڑے گا لیکن آپ نے پریشان نہیں ہونا۔ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میرے ہوتے آپ کو یا بھائی نظام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''پر ہوا کیا ہے رستم؟ کچھ پتا تو چلے۔'' واجدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''میں نے بتایا ہے ناں، مجھے ٹھیک سے پتا نہیں..... لیکن میں نے ابھی نظام کے فون پر ڈپٹی ریاض کی آواز سنی ہے۔''

واجدہ ڈپٹی ریاض کے بارے میں جانتی تھی۔ اس کا تاریک چہرہ کچھ اور تاریک ہو گیا۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن رستم کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے فقط اتنا کیا کہ واجدہ کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔ وہ رستم کے ساتھ چمٹ سی گئی۔ ''کچھ نہیں ہوگا آپا۔'' رستم نے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''نظام کی جیپ کہاں ہے؟''

''پچھواڑے کی طرف کھڑی ہے۔ اس میں ڈیزل نہیں ہے۔ جمیلہ کے ابا صبح ہی لے کر آئے ہیں۔''

''کہاں ہے ڈیزل؟'' واجدہ نے برآمدے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں دس لیٹر کا ایک کین پڑا ہوا تھا۔ رستم بولا۔ ''ہم اس جیپ پر جا رہے ہیں۔ نظام بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ اگر کوئی یہاں آئے اور نظام کے بارے میں پوچھے تو اسے یہی بتانا ہے کہ وہ اکیلا جیپ پر گیا ہے۔ ہمارے یہاں آنے اور جانے کے بارے میں کسی کو بھنک تک نہیں پڑنی چاہیے۔'' واجدہ نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ نظام اور جیپ دونوں کل تک صحیح سلامت تمہارے پاس واپس پہنچ جائیں گے۔''

جس دوران میں رستم واجدہ سے باتیں کر رہا تھا اور اسے مختلف ہدایات دے رہا تھا اس وقت گوہرا چھتری لے کر باہر گیا اور گھر کے پچھواڑے کھڑی جیپ میں ڈیزل ڈال کر اور اسے اسٹارٹ کر کے دیکھ لیا۔ رستم نے گھر میں اپنی موجودگی کی ساری نشانیاں تیزی سے مٹائیں اور نظام کو کندھے پر لاد کر باہر لے آیا۔ گوہرا نے جیپ لا کر دروازے کے عین سامنے کھڑی

www.pdfbooksfree.pk

کردی تھی۔ رستم نے نظام کو پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ گہری تاریکی اور بارش میں گلی سنسان پڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں خستہ حال جیپ خستہ حال راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ رستم خود کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ اگر ڈپٹی ریاض نے نظام جیسے شخص تک رسائی حاصل کی ہے تو کیونکر؟ اس کے ساتھ ساتھ اسے ڈپٹی ریاض کی بے پناہ خطرناکی کا احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ تینوں جگ واں گاؤں کی ٹمٹماتی روشنیوں سے قریباً پانچ کلو میٹر آگے آ چکے تھے۔ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں گوروں کا قبرستان تھا۔ دس پندرہ لاوارث قبریں تاریکی اور بارش میں خاموشی سے بھیگ رہی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کبھی اس خطے پر حکومت کی تھی۔ آج ان کے وارث کہیں لندن یا مانچسٹر کی جگمگاتی روشنیوں میں دادِ عیش دے رہے تھے اور یہ یہاں اس جھنڈ میں نشانِ عبرت تھے۔ رستم نے شور مچاتی جیپ ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کر کے اس کی لائٹس بجھا دی تھیں اور اب وہ نظام کی ہتھکڑیاں کھول رہا تھا۔ نظام کا سارا جارحانہ پن اب ایک دلدوز خاموشی میں ڈھل چکا تھا۔

جونہی رستم نے اس کا منہ کھولا وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ اتنے سنجیدہ اور باوقار شخص کو یوں بچے کی طرح بلکتے دیکھ کر رستم کے دل پر چوٹ لگی۔ نظام کراہا۔ ''خدا کے لئے میری بچی کو بچا لو۔ میری جمیلہ کو بچا لو۔ وہ بڑی سوہل (نازک) ہے۔ وہ مر جائے گی۔''

رستم کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یوں لگا کہ اس کے کسی اندرونی خیال کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں شاید نظام کی بیٹی کا بھی کوئی ''لنک'' ہے۔ نظام ہیجانی انداز میں بولتا چلا گیا۔ ''جمیلہ ان کے پاس ہے۔ وہ اسے مار رہے ہیں۔ اس سے بڑا بُرا سلوک کر رہے ہیں۔ میں نے جمیلہ کی ماں کو کچھ نہیں بتایا۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ سب کچھ اکیلا جھیل رہا ہوں۔ وہ ڈپٹی ریاض میری بچی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ لاہور میں تھی، پولیس والے اسے وہیں سے لے گئے ہیں۔ نہ کہیں گرفتاری ڈالی ہے، نہ کہیں نام درج کیا ہے۔ پولیس کی عورتوں نے مار مار کر اس کا بُرا حال کر دیا ہے۔ میں خود اس سے مل کر آیا ہوں۔ وہ مر جائے گی رستم، اس کے مرنے سے پہلے میں مر جاؤں تو اچھا ہے۔'' اس پر پھر ہیجان طاری ہونے لگا۔

رستم اور گوہر انے جیپ کے اندر ہی اسے سنبھالا۔ وہ بے قراری سے سر پٹخنے لگا۔ رستم کے ذہن میں اچانک وہ خبر آئی جو ریل گاڑی میں آتے ہوئے اس نے پڑھی تھی۔ اس خبر میں کسی ''ج'' نامی لڑکی کا ذکر تھا جس نے گوجرانوالہ تھانے کی بالائی منزل سے کود کر خودکشی کی

کوشش کی تھی۔ اس مختصر خبر میں ریاض کے ماتحت ماجد موہلہ کا نام بھی موجود تھا..... اب صورتِ حال واضح ہو رہی تھی۔ اخباری خبر کی وہ ''ج'' نامی لڑکی نظام کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جمیلہ ہی تھی۔ ایک ایک کر کے ساری کڑیاں مل گئیں اور رستم کا دماغ جالا لگھی کی طرح کھولنے لگا۔ نظام کراہ رہا تھا۔ ''گوجرانوالہ کے تھانے میں پولیس کی عورتیں میری بچی کو زندہ درگور کر رہی ہیں۔ وہ میری ملوکڑی بچی کو ایسی بُری دھمکیاں دیتی ہیں جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ زندہ نہیں رہے گی، مر جائے گی..... اب بتاؤ میں کیا کروں۔ کُتے کی طرح ڈپٹی ریاض کے پاؤں نہ چاٹوں تو کہاں جاؤں۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ میرے بس میں کچھ نہیں رہا۔''

رستم نے اپنے ہاتھ سے نظام کے آنسو پونچھے اور دل گیر آواز میں پوچھا۔ ''تم نے ریاض کے لئے کیا کیا ہے نظام؟''

''وہ سب کچھ جس کے لئے تم مجھے دس بار کُتے کی موت مار سکتے ہو۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم ابھی تک آزاد ہو۔ تم میرے گھر کی بجائے ورکشاپ آتے تو اب تک ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوتے یا مر گئے ہوتے۔ اب پتا نہیں وہاں وڈے ڈیرے پر کیا ہوتا ہے۔ ان کے لئے کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ ڈپٹی ریاض نے ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔'' نظام نوحہ کرنے کے انداز میں بول رہا تھا۔

''تم نے سیٹ پر کیا پیغام دیا ہے لالہ وغیرہ کو؟'' گوہر انے پوچھا۔

''وہی جو اس حرامی (ریاض) نے کہا۔ وہ لوگ اس آس پر پانڈو درے کی طرف آئیں گے کہ وہاں پولیس نہیں ہے..... پانڈو درہ ان کا قبرستان بن جائے گا۔''

ڈپٹی ریاض کی خوفناک چال رستم پر آشکارہ ہو رہی تھی۔ اگر لالہ فرید، نظام کی ڈس انفارمیشن کے تحت پانڈو درے کی طرف آتا تو وہ خود بخود ایک زبردست دفاعی حصار سے محروم ہو جاتا۔ یہ حصار دو ہزار بارودی سرنگوں کی صورت میں اسے مہیا تھا اور یہی حصار پولیس اور اجرائیوں کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ رستم کی رگوں میں آگ دوڑ گئی۔ صورتِ حال اس کی توقع سے زیادہ خطرناک تھی..... وہ ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ سے باہر نکل آیا۔ اس کے انداز میں شیر کا بانکپن تھا۔

☆======☆======☆

www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

''میں ڈپٹی ریاض کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' رستم نے زیرلب پھنکار کر کہا۔ اس کی پیشانی اور گلے کی رگیں شدتِ جذبات سے پھول رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا کہ رستم، سسکتے ہوئے نظام اور حیران گوہرا کو وہیں چھوڑ کر کسی انجانی سمت میں روانہ ہو جائے گا۔ گوہرا نے بے قراری سے پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے رستم؟''

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا، نظام بول پڑا۔ ''میری ورکشاپ پر پولیس بیٹھی ہے۔ تین بندے وردی میں ہیں اور چھ سات بغیر وردی کے۔ وہ پوری طرح چوکس ہیں۔ ''سیٹ'' ان کے قبضے میں ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ سیٹ (وائرلیس سیٹ) تک پہنچ سکو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ وہاں سخت خون خرابہ ہوگا اور اگر تم لوگ کسی طرح سیٹ تک پہنچ بھی گئے تو اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ درمیان والے سیٹ پر بھی ڈپٹی ریاض کے بندوں کا قبضہ ہے۔''

رستم اپنے اندر ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ (وادی سون کی گہرائی میں وڈے ڈیرے سے رابطہ رکھنے کے لئے لانگ رینج کے دو سیٹ استعمال کئے جاتے تھے۔ جگ وال کے سیٹ کو خاص تکنیک سے ایک دوسرے سیٹ کے ساتھ مربوط کیا جاتا تھا جو یہاں سے تقریباً پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس درمیان والے سیٹ کے بغیر وڈے ڈیرے تک کوئی پیغام ارسال نہیں کیا جا سکتا تھا اور نظام کے بقول درمیان والے سیٹ پر بھی پولیس مسلط ہو چکی تھی) اگر نظام کی بات درست تھی تو پھر ورکشاپ پر ہلہ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رستم زخمی شیر ہی کی طرح جیپ کے اردگرد چکرا کر رہ گیا پھر تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے خود کو سنبھالا اور جیپ میں دوبارہ نظام کے پاس آ بیٹھا۔ گوہرا باہر ہی کھڑا رہا۔ نظام نے ایک بار پھر ہلکتے

ہوئے کہا۔ ''میں مجبور ہو گیا تھا۔ میں اولاد کی محبت میں لاچار ہو گیا تھا۔ تم جانتے ہو میں ایسا نہیں تھا، لیکن مجھے ایسا کرنا پڑا۔ کاش مجھے اس سے پہلے موت آ جاتی۔ میں یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔'' وہ ایک بار پھر بے حد اضطراب کے عالم میں اپنا سر جیپ کی نشست پر پٹخنے لگا۔

رستم نے سگریٹ سلگانے کا ارادہ کیا لیکن یہ سوچ کر کہ سگریٹ کی روشنی خطرناک ہوگی سگریٹ مسل کر پھینک دیا۔ اس نے کئی بار اپنے سر کے ترشے ہوئے بالوں میں انگلیاں چلا کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تب نظام سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ سب کچھ۔''

نظام نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ڈپٹی ریاض تم لوگوں کی سوچ سے زیادہ خطرناک بندہ ہے۔ مجھے بالکل نہیں پتا کہ وہ کس طرح مجھ تک پہنچا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں کتنی احتیاط کرتا تھا۔ ورکشاپ کے جس تہہ خانے میں وائرلیس سیٹ ہے وہ بالکل الگ تھلگ ہے۔ وہاں بس ڈیزل انجنوں کا بیکار سامان پڑا ہے۔ میرے اور میرے چھوٹے بھائی انعام کے سوا آج تک وہاں کوئی نہیں گیا ہے پھر بھی پتا نہیں کس طرح پولیس کو خبر ہو گئی۔ پہلے ڈپٹی ریاض کا ایک سب انسپکٹر موبلہ میرے پاس آیا تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کے آٹھ دس بندے تھے۔ انہوں نے مجھے ورکشاپ میں ہی چھاپ لیا اور سیٹ تک پہنچ گئے، لیکن میں نے ان کو نمبر (فریکوئنسی) بتانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے رات بھر مجھے برف کی سل پر لٹایا اور میرے پاؤں پر ڈنڈے مارتے رہے۔ یہ دیکھو میرے پاؤں۔'' نظام نے اپنے پاؤں دکھائے، وہ سوجے ہوئے تھے اور نیل پڑ چکے تھے۔ وہ آنسو پونچھ کر بولا۔ ''اگلے دن ڈپٹی ریاض نے لاہور میں نرسوں کے ہوسٹل سے میری جمیلہ کو اٹھوا لیا اور اسے زنانہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ چند گھنٹے بعد وہ انعام کو بھی ساتھ والے گاؤں سے پکڑ کر ورکشاپ میں لے آئے..... اب میں زیادہ تفصیل کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جمیلہ کے پکڑے جانے کے بعد میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں چپ چاپ پولیس والوں کی بات مانتا چلا جاؤں۔ ڈپٹی ریاض سادہ کپڑوں میں خود جگ وال آ گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ''سیٹ'' پر میری بات لالہ فرید سے کروائی اور مجھے سب کچھ لالہ سے کہنے پر مجبور کیا جو وہ چاہتا تھا۔''

''مثلاً کیا؟''

''وہ چاہتا تھا کہ لالہ فرید اور اس کے سارے ساتھی وڈے ڈیرے سے نکل کر پانڈو درے کی طرف آ جائیں۔ اس نے میرے منہ سے یہ بات لالے تک پہنچائی کہ پانڈو کی

www.pdfbooksfree.pk

طرف پولیس کی نفری نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ کہ سنگوال برادری کے مسلح جتھے نے پانڈو کی طرف سے پولیس کا گھیراتوڑنے کا پروگرام بنایا ہے اگر اندر سے لالہ اور اس کے ساتھی کوشش کریں تو بڑی آسانی سے پولیس کے گھیرے سے نکلا جا سکتا ہے۔ ڈپٹی ریاض کے کہنے پر میں نے یہ بات بھی لالے فرید اور حسنا تک پہنچائی ہے کہ کل میں دوبارہ رابطہ کروں گا اور بتاؤں گا کہ سنگوالیوں کا جتھا ٹھیک کس وقت، کس جگہ اور کتنے بندوں کے ساتھ ہلہ بولے گا۔ عین اسی وقت پرلالے اور اس کے ساتھیوں کو بھی پانڈو درے پر موجود ہونا چاہیے۔''

رستم کے چہرے پر نظر آنے والی تشویش ذرا سی کم ہوئی۔ اس نے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ فائنل پروگرام ابھی طے نہیں ہوا۔''

''ہاں، تم کہہ سکتے ہو کہ ابھی ایک بار مزید لالے سے بات ہوگی۔ اس کے بعد ہی وہ لوگ پانڈو کی طرف آئیں گے لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کل کا دن انتظار کرنے کے بعد وہ لوگ خود ہی پانڈو کی طرف چل پڑیں۔''

رستم اور گوہرا کے چہروں پر ایک ساتھ سوچ کی لکیریں ابھریں۔ رستم نے کہا۔''نظام تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ کتنا خطرناک ہے۔ سب کچھ برباد ہو کر رہ جائے گا۔''

نظام کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چہرہ اندوہ کی تصویر تھا۔ رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''نظام! کیا تم کسی طرح ایک دو دن کے لئے سیٹ کو ناکارہ نہیں کر سکتے۔''

نظام نے بڑے کرب کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔''یہ بات میرے دماغ میں بھی آئی تھی لیکن ایسا کرنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میں سیٹ میں خرابی ڈال بھی دوں تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ دن کے اندر ٹھیک کرالیں گے۔ ان کے پاس پولیس کا ہی ایک بڑا کاریگر بندہ ہے۔ اس کے لئے یہ سب کچھ کرنا بالکل مشکل نہیں ہوگا۔ الٹا نقصان یہ ہوگا کہ اگر کسی طرح انہیں پتا چل گیا کہ خرابی میں نے ڈالی تھی تو وہ مجھ پر اور جمیلہ پر اور زیادہ سختی کریں گے۔''

رستم کا دل گواہی دے رہا تھا کہ نظام ٹھیک کہہ رہا ہے اور اس کی زبان پر وہی کچھ ہے جو اس کے دل میں ہے۔

گوہرا نے رستم کو اشارے سے اپنی طرف بلایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔''لالہ، حسنا اور مراد صرف نظام کی بات پر ہی یقین کریں گے۔ اگر ہم کسی طرح نظام کو واپس پولیس کے پاس

نہ جانے دیں تو''غلط پیغام''لالے وغیرہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

''تم ایک بات بھول رہے ہو۔'' رستم نے جواب دیا۔''انعام بھی تو پولیس کے قبضے میں ہے اور کبھی کبھی وہ نظام کی جگہ لالے سے بات کر لیتا ہے۔''

''میرے ہوتے ہوئے تو بس ایک دفعہ ایسا ہوا ہے۔'' گوہرا نے کہا۔

''لیکن میرے ہوتے ہوئے چار پانچ بار ہو چکا ہے.....ابھی کوئی دو ہفتے پہلے بھی جب نظام بیمار تھا، انعام نے ہی سیٹ پر بات کی تھی۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے؟''

''میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آ رہی ہے۔ کسی طرح نظام''سیٹ'' میں خرابی پیدا کر دے۔ زیادہ نہیں تو ہمیں ایک دن کی ہی مزید مہلت مل جائے گی۔ ہم اس دوران میں لالہ وغیرہ تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

گوہرا نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ رستم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''میرے دماغ میں ایک بات آ رہی ہے۔ اگر ہم کسی طرح اس جگہ پہنچ جائیں جہاں منحوس شکل والے سراجے کوکھڈ میں گرایا تھا تو ہمارا سفر آسان ہو سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے لالے دی جان.....وہی تنگ سرنگ والا رستہ؟''

''ٹھیک سمجھ رہے ہو۔''

گوہرا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے رستم کی بات پسند آئی تھی۔

وہ دونوں دوبارہ جیپ تک پہنچے۔ نظام اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور کسی مخبوط الحواس کی طرح بار بار اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ رستم اسے سمجھانے لگا کہ اس کی اور اُس کی بیٹی کی سلامتی اسے ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ان تقریباً نوے ساتھیوں کو بھی بچانا چاہتا ہے جو پولیس اور اجرالیوں کے گھیرے میں ہیں۔ وہ اس حوالے سے نظام کو سمجھانے لگ گیا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔

نظام بے حد کرب کے عالم میں بار بار یہی کہتا جا رہا تھا۔''اگر میری جمیلہ کی بات نہ ہوتی تو میں پہلے بھائی (انعام) کو گولی مارتا پھر خود کو مار لیتا۔ نہ ہم دونوں ہوتے نہ سیٹ پر لالے سے بات ہوتی.....''

رستم نے بڑی دشواری سے اسے تسلی دی اور اپنا نکتہ نظر اس کے ذہن میں ڈالا۔ رات دھیرے دھیرے دوسرے پہر کی طرف سرک رہی تھی۔ تاریک درختوں میں کھڑی اس کھٹارا جیپ کے اندر کچھ اہم فیصلے ہو رہے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

☆======☆======☆

اس رات کی صبح ہونے سے پہلے پہلے رستم اور گوہر اپوٹھو ہار کے اندر کافی گہرائی میں چلے گئے تھے۔ وہ عام راستوں سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سات گھنٹے کے پیدل سفر میں ابھی تک پولیس یا پولیس کے کسی معاون سے ان کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ تاہم یہ صورتِ حال تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دونوں بخوبی جانتے تھے کہ جوں جوں ان کا فاصلہ وڈے ڈیرے سے کم ہوتا جائے گا خطرہ بڑھتا جائے گا۔

دن کی روشنی میں وہ مزید محتاط ہو گئے۔ وہ درختوں اور خودرَو جھاڑیوں کے درمیان سفر کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ نظام کے گھر سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے ایک گٹھڑی میں کچھ سامان جمع کیا تھا۔ یہ ایسا ہی سامان تھا جو دیہات میں شادی بیاہ کے موقع پر شہر سے خریدا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی طرز کے کپڑوں کے دو جوڑے بھی انہوں نے حاصل کئے تھے۔ اب وہ انہی کپڑوں میں تھے۔ دونوں نے کرتہ اور سفید بھجلی (دھوتی) پہن رکھی تھی۔ سروں پر مقامی طرز کی بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔ ان پگڑیوں کے بڑے بڑے لڑ کمر پر یا سینے پر لٹکتے رہتے ہیں اور یہ وقتِ ضرورت بہ آسانی ان میں چہرہ چھپایا جا سکتا ہے۔ سفر کے دوران چہرہ چھپائے رکھنا رواج کا حصہ بھی تھا۔

دوپہر سے ذرا پہلے وہ ستانے کے لئے جھاڑیوں کے درمیان ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ گوہر انے پوٹلی کھولی۔ اس میں قیمے والے پراٹھے اور دہی پودینے کی چٹنی تھی۔ یہ پراٹھے وہ نظام کے گھر سے ہی لے کر چلے تھے۔ رستم کا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں رہ رہ کر اپنے محصور ساتھیوں کا تصور اُبھر جاتا تھا۔ وہ بھوکے پیاسے موت کے گھیرے میں تھے۔ زخموں سے چُور وہ ایک ایک کر کے گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ جب آنکھوں کے سامنے لاشیں ہوں اور لاشوں پر رونے والے ہوں تو ایسے میں کھانے کو دل کہاں چاہے گا۔

گوہر انے ایک لقمہ لیا پھر وہ پراٹھوں کو ناک سے قریب کر کے سونگھنے لگا۔ رستم کو بھی ہلکی سی باس محسوس ہوئی۔ دونوں پراٹھے خراب ہو چکے تھے۔ کھانے کے قابل نہیں تھے۔ گوہر انے پراٹھے ایک طرف لمبی گھاس پر پھینک دیئے۔ ایک جانب سے سیاہی مائل نیولا برآمد ہوا اور ایک پتھر کے پیچھے دبک کر للچائی نظروں سے پراٹھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ تاہم وہ قریب آنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک اور موٹا تازہ نیولا برآمد ہوا..... پھر ایک اور۔ تینوں نیولے پراٹھوں سے قریباً پندرہ میٹر کے فاصلے پر کھڑے رہے۔ ان کے خدشات

انہیں خوراک کے پاس آنے سے روک رہے تھے لیکن ان کی بھوک انہیں دور جانے سے روک رہی تھی۔

پھر بھوک غالب آ گئی۔ قیمے اور گندم کی باس انہیں پراٹھوں کی طرف کھینچنے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتے ہوئے پراٹھوں کے قریب پہنچ کر پھر ایک دم جھپٹے اور انہیں کھینچ کر نامعلوم بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ رستم نے پتھر سے ٹیک لگا کر سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔

''دیکھا گوہرے! سب کچھ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ دانے دانے پر کھانے والے کی مہر ہے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو لالے دی جان۔'' گوہر انے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''یہ پراٹھے ہم کہاں سے لے کر چلے تھے لیکن یہ ہمارے لئے نہیں تھے۔ یہ اس جنگل میں گھومنے والے ان تین نیولوں کے لئے تھے۔''

رستم اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ گوہر انے اوپر نیلے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس کی آنکھوں میں مستی سی بھر گئی۔ وہ بولا۔ ''سب تقدیر کا پھیر ہے جان جی۔ اب دیکھو، میں نے کبھی سفنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ سینما کے پردے پر بجلیاں گرانے والی عاصمہ میرے انگ لگے گی۔ ہم تو تھیٹر اور سرکس میں اس کی نقل کرنے والی ناچیوں پر بھی سو جان سے عاشق ہو جاتے تھے۔ کہاں وہ بالکل اصلی..... سچی مچی کی سانس لیتی اور باتیں کرتی، میری بک (چھاتی) سے لگی ہوئی تھی۔'' ان لمحوں کا تصور کر کے گوہر ایک بار پھر نشے سے سرشار ہو گیا۔ اس کا زخمی ہاتھ اپنے سینے کو سہلا رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی تک وہاں فلم اسٹار عاصمہ کا لمس محسوس کر رہا ہو۔

اچانک رستم نے کان کھڑے کئے۔ وہ غور سے کچھ سننے لگا۔ ''کوئی آواز سنی تم نے؟''

گوہر انے بھی غور کیا۔ ''ہاں، گونج سی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے یہ ہیلی کاپٹر کی آواز ہے۔''

دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر پروں کی بہت مدھم پھڑپھڑاہٹ سنائی دی..... یقیناً یہ ہیلی کاپٹر ہی تھا۔ وہ کافی فاصلے سے گزر کر مغرب کی سمت چلا گیا۔

گوہر انے سفید رنگ کی وہ بڑی گٹھڑی کھولی جو وہ نظام کے گھر سے لے کر چلے تھے۔ اس گٹھڑی میں جہیز کا سامان تھا اور تھوڑی سی خشک مٹھائی بھی تھی۔ پیٹ پوجا کرنے کے لئے گوہر انے یہ مٹھائی کھائی۔ جہیز کے سامان میں دلہن کے پانچ چھ جوڑے، چاندی کی چوڑیاں، چند نقلی زیورات اور میک اَپ کا سستا سا سامان تھا۔ اس سامان کو مقامی زبان میں ڈاج یا داج

www.pdfbooksfree.pk

کہا جاتا تھا۔ نظام کے گھر سے روانہ ہوتے وقت نظام کی بیوی نے رستم کے کہنے پر ایک پڑوسی کی مدد سے یہ سارا انتظام کیا تھا۔ رستم نے اس سامان کی باقاعدہ قیمت ادا کی تھی بلکہ دگنی قیمت دی تھی۔ اس گٹھڑی کا مقصد راستے میں پیش آنے والے خطرات سے بچنا تھا۔ اگر کہیں پولیس یا پولیس کے ٹاؤٹوں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ کہہ سکتے تھے کہ داج کی چیزیں لینے شہر گئے ہوئے تھے، اب واپس اپنی ڈھوک جا رہے ہیں۔

میدے، گھی اور چینی کی بنی ہوئی یہ مٹھائی شکر پارے کہلاتی تھی۔ گوہر ابڑی رغبت سے قریباً ایک کلو شکر پارے کھا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبی ڈکار لی۔ چادر کے نیچے اپنے پستول کو ٹٹولا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی۔ آخری عورت کے بعد گوہر آخری کھابے سے بھی مستفیض ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی کا سفر بتدریج موت کی منزل کے قریب آ گیا تھا لیکن وہ بے خبر تھا جیسے ہر بشر ہوتا ہے۔

اچانک نشیب سے ایک انسانی آواز سنائی دی۔ اب تک کے سفر میں انہیں مختلف جنگلی جانوروں اور پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں لیکن یہ پہلی انسانی آواز تھی۔ یہ گانے کی آواز تھی۔ کوئی عورت دوہے کے انداز میں اپنی سُریلی آواز بکھیر رہی تھی، گا ہے بگا ہے ایک مرد کی آواز بھی اس آواز میں شامل ہو جاتی تھی۔

رستم اور گوہر کا تجسس بیدار ہوا۔ انہوں نے فوراً سگریٹ گل کئے اور پتھروں کی اوٹ سے نیچے نشیب میں دیکھا۔ پہلے تو کچھ دکھائی نہیں دیا پھر ڈھلتے سورج کی روشنی میں تین افراد نظر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ مردوں کے سروں پر پگڑ تھے۔ وہ مقامی دکھائی دیتے تھے۔ عورت بھی مقامی انداز کی سیاہ مجھلی اور گرتے میں تھی۔ وہ کہیں سے سفر کرتے ہوئے آئے تھے اور اب کھانا کھانے کے لئے نیم کے پیڑوں کے سائے میں بیٹھ گئے تھے۔

عہدِ قدیم سے چلا آ رہا ہے کہ جب بھی حضرت انسان کا پیٹ بھر جاتا ہے اور جسم کو تھکن کے بعد آرام محسوس ہوتا ہے تو اس کا دل گنگنانے کو چاہتا ہے۔ غالباً یہ افراد بھی اسی کیفیت کے زیرِ اثر تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ عورت نے ایک پرات کو اوندھا کر کے اسے طبلہ بنا رکھا ہے۔ طبلہ بجانے کے ساتھ ساتھ وہ گا بھی رہی تھی۔ ایک مرد اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

رستم نے گوہر کو اشارہ کیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ گوہر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا، تاہم اس کی نگاہیں بدستور مردوں پر رہیں۔

رات بھر کے سفر نے دونوں کو قدرے تھکا دیا تھا۔ ذرا سستا لینا بہتر تھا۔ جگہ ہموار اور

صاف ستھری تھی۔ دونوں لیٹ گئے۔ موسم گرم تھا تاہم ٹیلے کی بلندی کو چھونے والی ہوا تمازت کو بڑھنے نہیں دے رہی تھی۔ رستم کو اونگھ آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو سائے پہلے سے لمبے دکھائی دیئے۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ سویا رہا تھا۔ گوہر اس کے پہلو میں نہیں تھا۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دس پندرہ قدم کی دوری پر ایک چٹان نما پتھر کے پاس کھڑا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے نشیب میں نظر آنے والے تینوں مرد و زن اس کے ساتھ تھے۔ تینوں بھک منگوں کی طرح پتھریلی زمین پر بیٹھے تھے۔ دونوں مردوں نے گوہر کے سامنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور کسی بات پر گھگھیا رہے تھے۔ دونوں مرد گہرے سانولے رنگ کے تھے۔ جواں سال عورت کے کانوں میں چاندی کے جھمکے اور ہاتھوں میں پلاسٹک کی بہت سی رنگ برنگی چوڑیاں تھیں۔ دو پٹاریاں، ایک کینوس کا بڑا تھیلا، اور دو عدد پیروں والی بینیں بھی ان کے پاس ہی دھری تھیں۔

رستم اٹھ کر ان کے قریب پہنچا۔ وہ تینوں کچھ اور بھی ڈرے ہوئے نظر آنے لگے۔ گوہر نے کہا۔ ''لالے دی جان! میں ان کے پاس نہیں گیا تھا۔ یہ خود ہی چکراتے ہوئے اس طرف نکل آئے۔ ان کی حرکتیں کچھ مشکوک سی لگ رہی تھیں۔ میں نے انہیں یہاں بٹھا لیا۔''

رستم ایک لمحے میں جان گیا کہ گوہر حسبِ عادت جھوٹ بول رہا ہے۔ عورت کی کشش اسے بڑی جلدی اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ رستم کے سونے کے بعد یقیناً اس نے خود ہی پیش قدمی کی تھی اور ان کے پاس جا پہنچا تھا یا پھر جب وہ روانہ ہونے لگے تو انہیں گھیر کر یہاں لے آیا تھا۔ اب وہ انہیں یہاں بٹھا کر ان پر رعب ڈال رہا تھا۔

''کیا کہتے ہیں یہ؟'' رستم نے گوہر سے پوچھا۔

گوہر کی بجائے درمیانی عمر کا مرد ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''سرکار! اساں جھوٹ نئیں بول رہے۔ اساں جوگی لوگ ہیں۔ کیڑوں (سانپوں) کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ حق حلال کی روزی کھاتے ہیں۔ چورا چکے نئیں ہیں جی اساں۔''

گوہر اگر جا۔ ''چوروں ڈاکوؤں کے ماتھوں پر نہیں لکھا ہوتا۔'' پھر رستم کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کیوں لالے دی جان! چوروں ڈاکوؤں کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے؟''

''کیا ہے ان پٹاریوں میں؟'' رستم نے پوچھا۔

جواں سال مرد نے فوراً دونوں پٹاریوں کے ڈھکنے کھول دیئے۔ دونوں میں سانپ تھے۔ ایک میں پانچ چھ فٹ کا کوبرا تھا۔ دوسرے میں ایک موٹا تگڑا اور غیر زہریلا سانپ تھا جسے مقامی زبان میں گوارہ کہا جاتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم کی نگاہ جواں سال عورت پر پڑی تو وہ ذرا سا چونکا۔ مردوں کی طرح عورت بھی بہت غریب اور مفلوک الحال دکھائی دیتی تھی۔ اس کی میلی کچیلی قمیص اس کے بازو کے نیچے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس پھٹے ہوئے حصے سے اس کا گندمی جسم اور اندرونی لباس کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ رستم نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔ پھر اس نے گھور کر گوہرا کی طرف دیکھا..... گوہرا گڑبڑا گیا۔ رستم نے اسے اشارہ کیا اور ایک طرف لے گیا۔ ''تمہیں کہا بھی تھا کہ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔'' رستم نے ناراض سرگوشی کی۔

گوہرا دانا لہجے میں بولا۔ ''رستم بھائی! یہ لوگ یہاں چپے چپے پر گھومتے پھرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ان سے ذرا بات شات کریں۔ ہمیں پتا چل جائے گا کہ پولیس کا زور کس طرف ہے اور ہمارے لئے کون سا رستہ ٹھیک رہے گا۔''

''وہ..... عورت کے کپڑے کیسے پھٹے؟'' رستم نے اچانک سوال کیا۔

گوہرا مسکرایا۔ ''مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے سر کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ پہلے ہی پھٹے ہوئے تھے۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اب لالے دی جان! ذرا یہ بھی غور کرو کہ یہ پھٹے کس جگہ سے ہیں۔ جہاں فوراً سے پہلے مرد کی نظر پڑے۔ اسی لئے تو مجھے شک ہو رہا ہے ان پر۔ شاید یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سانپ پکڑنے کے ساتھ ساتھ دو نمبر کام بھی کرتے ہوں۔''

''دو نمبر کرتے ہوں یا تین نمبر۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بکھیڑے میں نہ پڑو۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں گوہرے۔ عورت کے لئے بڑے ندیدے ہو تم۔''

گوہرا جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر رستم کا موڈ دیکھ کر چپ ہو گیا۔ وہ دونوں پھر ان تینوں کے پاس پہنچے۔ وہ زمین پر پاؤں کے بل بیٹھے تھے۔ تینوں کے چہرے مصیبت زدہ دکھائی دیتے تھے۔ اس مرتبہ عورت نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اساں تم سے جھوٹ نہیں بول رہے سرکار! جو کچھ بتایا ہے سچ بتایا ہے۔ یہ میرا جیٹھ مختار ہے، یہ میرا بندہ انورا ہے۔ اساں گریب اور شریف لوگ ہیں۔''

رستم نے جواں سال عورت کے جیٹھ مختار سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم جانتے بھی ہو کہ یہ خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں ہر طرح کے لوگ دندناتے پھرتے ہیں۔ تم دونوں اس جوان عورت کے ساتھ یہاں گھوم رہے ہو اور گانے گا رہے ہو۔ تم نے اسے گلشن اقبال سمجھا ہوا ہے؟''

اچانک رستم کو ایک مختصر ''بیپ'' سنائی دی۔ جیسے کسی موبائل یا وائی ٹا کی سیٹ پر سگنل

موصول ہوا ہو۔ موبائل تو اس علاقے میں کام نہیں کرتا تھا پھر یہ ''بیپ'' کس چیز کی تھی۔ رستم کے حساس کانوں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ ''بیپ'' کی آواز جواں سال عورت کی طرف سے آئی ہے۔ بیپ کی آواز کے فوراً بعد ہی عورت نے اپنا ایک ہاتھ غیر محسوس طور پر اپنی میلی کچیلی اوڑھنی کے نیچے سرکا لیا تھا۔ یکا یک رستم کو شدید ترین خطرے کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ ردِعمل کے طور پر کچھ کرتا اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ بالکل غیر متوقع طور پر درمیانی عمر کے شخص نے اپنے لباس میں سے ایک ماؤزر برآمد کیا اور اس کا رخ رستم کے سر کی طرف کر دیا۔ ''خبردار!'' وہ بدلے ہوئے لہجے میں چنگھاڑا۔ ''چالاکی دکھائی تو بھون کر رکھ دوں گا۔''

رستم جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ دوسرا شخص بھی اپنی دونوں رانوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر وہاں سے پسٹل برآمد کر چکا تھا۔ اس کی شلوار کے نیفے میں ازار بند کی بجائے لاسٹک تھا اور اس نے پسٹل نکالنے کے لئے اپنی شلوار کے نیفے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں گوہرا کو کور کر لیا۔ جواں سال عورت نے اپنی میلی کچیلی اوڑھنی اُتار پھینکی۔ اس کی شلوار میں سامنے کی طرف ایک تھیلی نما جیب تھی۔ اس جیب میں سے اس نے سیاہ رنگ کا ایک اسمارٹ سا وائی ٹا کی نکال لیا اور خونی نظروں سے رستم و گوہرا کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ تم دونوں۔'' درمیانی عمر کا وہ شخص گرجا، جس کا نام عورت نے مختار لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ سپیرا نظر آتا تھا لیکن اب وہ سرتاپا پولیس والا تھا۔ اس کا لب ولہجہ اور انداز گواہ تھا کہ وہ پولیس والا ہی ہے۔ اس نے اب اپنا ماؤزر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔ انگلی بلی پر تھی۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ رستم کی ذرا سی جنبش پر گولی چلا دے گا۔ غالباً وہ رستم کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

رستم نے گوہرا کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''اب خوش ہو لالے دی جان۔'' اس نے گوہرا کی نقل اُتاری۔

گوہرا نے لاپرواہی سے سر جھٹکا، جیسے کہہ رہا ہو یہ دو بچونگڑے اور ایک بچونگڑی ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ابھی دیکھنا یہ تینوں ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑتے اور رحم کی بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔

درمیانی عمر والے شخص نے اپنی قمیص کی بغلی جیب میں سے ایک تہہ کیا ہوا لیمونیٹرا کارڈ نکالا۔ جیسے رنگ ساز کمپنیوں کے کلرشیڈ کارڈز ہوتے ہیں۔ رستم نے دیکھا کہ اس کارڈ پر بہت سی چھوٹی چھوٹی تصویریں پرنٹ تھیں۔ غالباً یہ وہ خاص خاص اشتہاری اور مفرور ملزم تھے جو

www.pdfbooksfree.pk

یہاں پولیس کو درکار تھے۔ درمیانی عمر کے شخص نے کارڈ پر چھپی ہوئی کسی تصویر کا موازنہ رستم کے چہرے سے کیا۔ پہلے اس نے تصویر کو دیکھا پھر رستم کے چہرے کو، پھر تصویر کو..... پھر چہرے کو۔ یہ عمل تین چار بار دہرانے کے بعد اس کے چہرے پر شدید سنسنی نظر آنے لگی۔ رستم کو یوں لگا کہ وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ چوکس ہو گیا ہے۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور آنکھیں بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ اس نے تصویر اپنے ساتھی کو بھی دکھائی اور معنی خیز نظروں سے تیسری ساتھی کو دیکھا۔

درمیانی عمر کے شخص نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''میں سپیشل برانچ کا انسپکٹر آصف ہوں..... یہ میرا اے ایس آئی باجوہ ہے اور یہ اے ایس آئی فرخندہ چوہدری ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں موقعے پر مرنے کی بجائے خود کو قانون کے حوالے کرنا پسند کرو گے۔ قبر میں جانے سے جیل جانا تو بہرحال بہتر ہی ہے۔''

وہ خود کو باعتماد اور پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ رستم کی دہشت نے اس پر اثر کیا ہے اور وہ ایک بہت مضبوط شخص ہونے کے باوجود اعصابی کشیدگی کا شکار ہے۔ رستم بخوبی جانتا تھا کہ ایسا مدِمقابل زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ فی الوقت پوزیشن ایسی تھی کہ یہ انسپکٹر کسی غلط فہمی کے سبب بھی اپنے ماؤزر کی لبلبی دبا سکتا تھا اور یہی اندیشہ اس کے ساتھی کی طرف سے بھی تھا۔ بلکہ ساتھی زیادہ ''ٹینس'' تھا۔

رستم اور گوہرا اپنے ہاتھ بلند کئے کھڑے رہے۔ ان کے ذہن بہت تیزی سے اس صورتِ حال کا حل سوچ رہے تھے۔ رستم کو پہچاننے کے بعد انسپکٹر اور سب انسپکٹر احتیاط کے طور پر دو دو قدم مزید پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے رستم اور گوہر پر یوں نگاہیں گاڑ رکھی تھیں جیسے وہ بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے یا یکا یک زمین میں سما جائیں گے۔

انسپکٹر نے اپنی ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''رابطہ کرو۔ ڈپٹی صاحب کو بتاؤ کہ دو سانپ پکڑے ہیں ہم نے اور اندازہ یہی ہے کہ یہ دونوں بڑے سانپ ہیں۔ دونوں کنگ کوبرے ہیں۔''

یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ لیڈی اے ایس آئی اپنے وائی ٹا کی کی طرف متوجہ ہو گئی اگر وہ ایک بار یہ پیغام وائرلیس پر چلا دیتی تو پھر پانی سر سے گزر جاتا۔ انہیں پیغام چلنے سے پہلے کچھ کرنا تھا مگر صورتِ حال ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ کچھ کر سکتے۔

''میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں لالے دی جان۔'' گوہر نے کہا اور ہاتھ نیچے گرا

کر دو قدم سب انسپکٹر کی طرف بڑھا۔

''خبردار..... خبردار'' سب انسپکٹر وحشت سے چلایا اور گوہر اکے دو قدموں کے بدلے دو قدم پیچھے پلٹا۔

گوہر اغالباً یہی چاہتا تھا۔ سب انسپکٹر فاصلہ برقرار رکھنے کے لئے دو قدم پیچھے ہٹا تو اس کا دایاں پاؤں نشیب میں چلا گیا، وہ گرا تو نہیں تھا لیکن بُری طرح ڈگمگایا گوہر انے یہ مہلت کافی سمجھی۔ وہ عقاب کی طرح سر جھکا کر سب انسپکٹر پر جھپٹا اور اسے رگیدتا ہوا دور لے گیا۔ انسپکٹر کی توجہ فقط ایک لمحے کے لئے اس واقعے کی طرف گئی۔ رستم کو اس سے آدھا وقت بھی ملتا تو وہ اپنے مدِمقابل کو معاف نہ کرتا۔ اس نے جست لگائی اور اُڑتا ہوا انسپکٹر آصف پر آیا۔ انسپکٹر نے آخری وقت میں بچنے کی کوشش کی لیکن بچ نہیں سکا۔ اس کے ماؤزر نے دھماکوں کے ساتھ تین گولیاں اُگلیں لیکن وہ آسمان کی طرف پرواز کر گئیں۔ رستم نے انسپکٹر کی پسٹل والی کلائی جکڑ لی۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں ایک چھرا آ گیا۔ اس نے لیٹے لیٹے رستم کے منہ پر زوردار ضربیں لگانا چاہیں..... مگر وہ رستم کے چہرے کو چھو نہ سکا۔ رستم نے خود کو پیچھے کی طرف ہٹا کر خود کو اس وار سے بچایا۔ اسی دوران میں رستم اپنی قمیص کے نیچے سے کولٹ پسٹل نکال چکا تھا۔ صرف ایک فٹ کے فاصلے سے اس نے انسپکٹر کے سر پر دو فائر کئے۔ انسپکٹر کی کھوپڑی سے خون کی دو دھاریں بہہ نکلیں۔

جس وقت گوہر انے سب انسپکٹر پر چھلانگ لگائی تھی، سب انسپکٹر نے ایک گولی چلائی تھی۔ رستم کو خدشہ تھا کہ اس گولی نے گوہر اکو نقصان نہ پہنچایا ہو..... انسپکٹر آصف سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے بھی رستم کے ذہن میں گوہر اکے حوالے سے تشویش رہی تھی۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں عدم آباد کا ٹکٹ تھمانے کے بعد رستم کو محسوس ہوا کہ اس کے عقب میں کوئی بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اسے لگا کہ یہ گوہر اہے لیکن جب اس نے مڑ کر دیکھا تو دل اچھل کر رہ گیا۔ یہ گوہر اکا مدِمقابل سب انسپکٹر باجوہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور وہ رستم کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ رستم نے پھرتی سے کروٹ لی اور نیم مُردہ انسپکٹر کو اپنے اوپر کر لیا۔ سب انسپکٹر نے رستم پر تین فائر کئے۔ یہ فائر بدحواسی میں کئے گئے تھے لہٰذا تینوں رائیگاں گئے۔ صرف ایک گولی انسپکٹر آصف کے جسم میں کہیں لگی۔ رستم نے مُردہ انسپکٹر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر گولی چلائی۔ پہلی گولی ہی سب انسپکٹر کی پیشانی پر لگی..... وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا تقریباً رستم کے اوپر ہی آن گرا۔ اس کی پگڑی اچھل کر دور جا گری تھی۔

رستم نے خود کو بہ مشکل دونوں ہلکاروں کے نیچے سے نکالا اور گوہر اکی طرف آیا۔ گوہر ا

www.pdfbooksfree.pk

نشیب میں اوندھے منہ پڑا تھا.....وہ مر چکا تھا۔ گولی سامنے سے اس کی شہ رگ میں لگی تھی اور عقب سے گردن پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کی گردن کے عقبی حصے پر خون اور گوشت کے چند چھوٹے چھوٹے لوتھڑے نظر آ رہے تھے۔

''گوہرا.....گوہرا۔'' رستم چلایا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

اس نے مڑ کر مُڑ دہ اہلکاروں پر دو دو فائر مزید کئے۔ پھر ایک دم اس کا دھیان ان کی تیسری ساتھی کی طرف چلا گیا۔ رستم نے اہلکاروں کے ساماں میں موجود لانگ رینج کی سیون ایم ایم رائفل اٹھائی اور چند قدم بھاگ کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اسے لیڈی اہلکار دکھائی دی۔ وہ جان بچانے کے لئے تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک فرلانگ دور پہنچ چکی تھی۔ نشیب میں اس کا سراپا مزید دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا زندہ رہنا رستم کی زندگی کے لئے مزید خطرات کا باعث تھا۔ اس کے پاس وائی ٹا کی تھا جس پر وہ کسی بھی وقت اپنے محکمے کے لوگوں سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اس نے رائفل کو ایک پتھر پر ٹیکا اور خود کو پُرسکون کرتے ہوئے جواں سال عورت کا نشانہ لیا۔ اس کی انگلی لبلبی پر پہنچی۔ اسے اپنے نشانے پر بھروسہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے دوسری گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

جواں سال عورت کے بھاگنے کے انداز میں دنیا جہاں کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ وہ گرتی پڑتی جا رہی تھی اور مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی چوٹی کھل گئی تھی اور بال بکھر گئے تھے۔ اسے مارتے ہوئے رستم کو افسوس ہو رہا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ مار دیا مر جاؤ والا کھیل ہے۔ اس کی انگلی لبلبی پر پہنچی لیکن عین اس وقت اس کے حساس کانوں نے ایک بار پھر ''بیپ'' کی مدھم آواز سنی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وائی ٹا کی سیٹ چند میٹر دور گھاس پر پڑا تھا۔ یقیناً فرخندہ نامی یہ پولیس اہلکار بدحواسی میں بھاگتے ہوئے یہ سیٹ یہاں گرا گئی تھی۔ ہاں کبھی بدحواسی بھی زندگی کی ضامن بن جاتی ہے۔ رستم لیڈی اہلکار کو نشانہ بنائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

وائی ٹا کی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر گوہرا کی طرف آیا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان انگاروں کے عقب میں آتشیں آنسو تھے۔ اس نے گوہرا کو سیدھا کیا۔ اس کی شہ رگ سے بہنے والا خون اس کے سینے تک چلا گیا تھا.....اس نے گوہرا کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اس کی آنکھیں بند کیں۔ بے ترتیب مچھلی (دھوتی) اس کی نیم عریاں ٹانگوں پر برابر کی اور پگڑی کے پلو سے اس کا کھلا ہوا منہ باندھ دیا۔

''دیکھ لیا ناں، من مانی کا نتیجہ۔'' وہ گوہرا کو مخاطب کرتے ہوئے بڑبڑایا اور دو تین منٹ تک گم صم بیٹھا رہا۔ وہ زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے گوہرا کے لباس میں سے اس

کی ساری ذاتی اشیاء نکال لیں.....قریب ہی ایک قدرتی گڑھا موجود تھا۔ رستم نے باری باری تینوں لاشیں اٹھائیں اور گڑھے میں رکھ کر اوپر خشک ٹہنیاں اور گھاس پھونس ڈال دی۔ یہ عارضی انتظام تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس بہت جلد یہاں پہنچ کر تینوں لاشوں کو تحویل میں لینے والی ہے۔

اب ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ڈپٹی ریاض کے خاص ماتحت بھی اس کی طرح عیار اور حیلہ ساز تھے۔ ڈپٹی ریاض اپنے مخصوص انداز میں کام کر رہا تھا۔ اس کے لوگ بھیس بدل کر علاقے میں گھوم رہے تھے۔ یہ ''تین کی ٹولی'' بھی ان میں سے ایک تھی۔ لڑکی نما عورت کو یقیناً چارے کے طور پر ساتھ رکھا گیا تھا۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ علاقے میں بھٹکنے والے آوارہ گردوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے لئے ایسی عورت ''نعمتِ غیر مترقبہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ سنسان بیلوں میں ایسی عورت کی دید کسی بھی جوان مرد کو اپنی پناہ گاہ سے نکلنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ ان ٹیلوں میں بھٹکنے کے ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی۔ اس گلوکاری کا مقصد بھی یقیناً یہی تھا کہ اگر ارد گرد کوئی ''شکار'' موجود ہے تو وہ اس آواز کی کشش سے دام میں چلا آئے۔ پوشیدہ حصے سے لباس کا پھٹا ہونا بھی ''دام'' کا حصہ ہی تھا۔

رستم کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ ارد گرد کوئی اور پولیس والا موجود نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو فائرنگ کے بعد کہیں آس پاس ہلچل کے آثار ضرور دکھائی دیتے۔ دوسرا ثبوت یہ تھا کہ لیڈی پولیس اہلکار وہاں سے بھاگی تو ضرور تھی لیکن اس نے کافی فاصلے پر جانے کے بعد بھی مدد کے لئے چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا رستم اب جلد سے جلد یہاں سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔

اس نے گوہرا کا پسٹل گوہرا کے ساتھ ہی گڑھے میں دفن کر دیا تھا۔ گڑھے پر ایک الوداعی نگاہ ڈال کر اس نے داج (جہیز) کے سامان والی گٹھڑی اٹھائی اور آگے چل دیا۔ سانپوں کی دونوں پٹاریوں، بینوں اور اہلکاروں کے دیگر سامان پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا وہ نشیب میں اُتر گیا۔ اس کے قدموں میں خاطر خواہ تیزی تھی۔

رستم بے حد دشوار راستے پر بلا رکے سفر کرتا رہا اور آدھی رات کے وقت اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے چند روز پہلے اس نے شیطان صفت سراجے کو بلندی سے گرا کر موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر چند دن پہلے کی ساری باتیں رستم کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ چند دن پہلے جب وہ اس مقام پر پہنچا تھا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں والا گوہرا تھا، شکرا چشم سراجا تھا اور جواں سال لیکن ڈراؤنا سا

www.pdfbooksfree.pk

فدا تھا۔ جوشکر اچشم سراجے کو پانچ ہزار کا نذرانہ دے کر پولیس کے مہلک گھیرے سے نکلا تھا۔ سراجے کو موت کے گھاٹ اُترتے دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہوگیا تھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا تھا..... پتا نہیں کہ اب وہ کہاں تھا..... لیکن باقی دو افراد یعنی گوہرا اور سراجے کے بارے میں رستم کو پتا تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ کبھی واپس نہ لوٹنے کے لئے عدم آباد میں مقیم ہو چکے تھے۔

اب رستم ایسے مقام پر تھا کہ کسی بھی وقت پولیس یا پولیس کے مددگار اجرالیوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ ان لمحوں میں رستم کسی شکاری جانور ہی کی طرح چوکنا اور خطرناک نظر آرہا تھا۔ اس کی تمام حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور قرب وجوار پر اس کی مکمل نگاہ تھی۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ علاقے میں موجود پولیس یہاں اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکی ہے اور ہر طرح سے ہائی الرٹ ہے۔

ٹیلوں کے درمیان واقع سرنگ نما راستے کا دہانہ ڈھونڈنے میں رستم کو تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ وہ جب دہانے میں داخل ہو رہا تھا تو کچھ آوازیں ہوا کے دوش پر تیر کر اس کے کانوں تک پہنچیں۔ یہ جیپوں کے انجنوں کی آوازیں تھیں اور ان کے ساتھ جو دوسرا شور تھا وہ یقیناً پولیس کے ہُو کیر کتوں کا تھا۔ تنگ و تاریک راستے میں قریباً پچاس کلومیٹر آگے جانے کے بعد رستم نے اپنے سامان میں سے ٹارچ نکال کر روشن کرلی اور نسبتاً تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ پولیس والوں کے ساتھ مار کٹائی میں اس کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی اور چلتے ہوئے یہ چوٹ تکلیف دے رہی تھی، لیکن اس چوٹ سے کہیں گہری چوٹیں اس کے سینے میں تھیں۔ جو ہر قدم پر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھیں۔ ان میں سے تازہ ترین چوٹ گوہرا کی موت تھی۔ وہ بالکل اچانک ہی رستم سے جدا ہوا تھا۔ صرف ایک گولی اس کے پہاڑ جیسے مضبوط اور سنگلاخ جسم کو چاٹ گئی تھی۔ زندگی ایسی ہی غیر متوقع اور غیر ہموار ہوتی ہے۔ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ گوہرا ایک دلیر اور جنگجو شخص کا نام تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا تھا۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح اسے بھی معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اسے ناگہانی موت مرنا ہے۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ وہ ایک ہنگامہ خیز موت مرے گا۔ ایسی موت جو ایک ڈاکو کے شایانِ شان ہوگی۔ وہ اپنے درجنوں مدِمقابل افراد کو موت کے گھاٹ اُتارے گا اور زخمی کرے گا۔ اس کے اپنے جسم پر بھی زخموں کے بے شمار تمغے سجیں گے..... لیکن جو ہوا تھا وہ بالکل برعکس تھا۔ پسٹل کی ایک گولی نے چند سیکنڈ کے اندر اس کا کام تمام کردیا تھا۔ تاہم ایک بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی موت

دلیرانہ تھی۔ اس نے یہ دیکھنے کے بعد کہ لیڈی پولیس اہلکار وادی کی ٹاکی پر اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرنے جارہی ہے اپنی جان کی بازی لگائی تھی اور 38 بور پسٹل کی پرواہ کئے بغیر سب انسپکٹر پر جاپڑا تھا۔

یہ دراڑ نما راستہ پہلے کشادہ تھا پھر تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس میں سے کئی شاخیں نکل رہی تھیں۔ رستم کو درست راستے پر رہنے کے لئے حافظے پر بہت زور دینا پڑ رہا تھا۔ ایک دو جگہوں پر وہ بُری طرح گڑبڑایا بھی۔ یہاں چوہوں اور چمگادڑوں کے ڈیرے تھے اور ویسی ہی پریشان کن بُو تھی جو ڈیڑھ سو ڈیرے کی سرنگ نمبر تین میں محسوس ہوتی تھی۔

کئی فرلانگ کے تکلیف دہ سفر کے بعد جب وہ دوسرے دہانے سے باہر نکلا تو افق پہ صبح صادق کے آثار نظر آرہے تھے۔ دراڑ نما سرنگ کا یہ دوسرا دہانہ درختوں کے ایک جھنڈ میں کھلتا تھا۔ رستم کچھ دیر تک اس جھنڈ میں رُکا رہا اور گردوپیش کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے کچھ فاصلے پر ڈھوک شاہاں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ڈھوک کے خدوخال آہستہ آہستہ رات کی سیاہی میں سے نمودار ہوتے چلے جارہے تھے۔ رستم کو کچھ فاصلے پر کھیت نظر آئے۔ وہ ان کھیتوں کی طرف چل دیا۔ یہاں ایک چشمے سے اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے بالوں کی گرد صاف کی۔

کھیتوں سے آگے ایک باغیچے کے آثار نظر آرہے تھے۔ رستم کو یاد آیا کہ مہراں نے اسے باغیچے کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ باغیچہ اس کے سسر نے ٹھیکے پر لے رکھا تھا۔ مہراں کے سسر کی بینائی بہت کم تھی۔ مہراں اپنے سسر کے ساتھ مل کر باغیچے کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اس کا ٹکٹوٹشی شوہر گھر میں چارپائی توڑتا تھا۔ اب دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔ رستم نے دور سے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص باغیچے میں گھوم رہا ہے۔ رستم نے مہراں کے سسر کو دیکھا تھا وہ ایک لحظے میں جان گیا کہ بوڑھا شخص مہراں کا سسر ہے۔ وہ دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر بڑا سا پگڑ اور ہاتھ میں لمبی سی ڈنگوری تھی۔ ایک درخت پر ٹین کے دو خالی کنستر لٹک رہے تھے۔ بوڑھا شخص اپنی ڈنگوری کے ذریعے گاہے بگاہے ان کنستروں کو بجا کر زوردار آواز پیدا کرتا تھا۔ درختوں پر خوشہ چینی کرنے والے پرندے اُڑ کر باغ کے اردگرد پرواز کرنے لگتے تھے۔ رستم کی موجودگی کو محسوس کرکے بوڑھے نے اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ سے چھجا سا بنایا اور آنکھوں کو سکوڑ کر رستم کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''کوئی راہی ہو؟'' اس نے رستم سے پوچھا۔

''ہاں میاں جی! نظر واقعی جارہا ہوں۔ میں نذی بھتیجی کا دیاہ ہے۔ گوجر خان سے اس کے داج کا سامان لے کر آرہا ہوں۔ لمبے سفر سے تھک گیا ہوں۔ ذرا دم لینے آگیا ہوں۔''

www.pdfbooksfree.pk

بوڑھے نے کہا۔ ''آج کل حالات بڑے خراب ہیں۔ دن دن میں اپنا سفر پورا کرلو۔ رات کے وقت پولیس لوگوں کو بہت تنگ کرتی ہے۔''

''بابا جی! لگتا ہے کہ پولیس تو جھلی ہی ہوگئی ہے۔ جدھر دیکھو پلیسے اور ان کے بُوگیر گئے ہرل ہرل کرتے پھر رہے ہیں۔''

''پر جس کے لئے یہ جھلے ہو رہے ہیں۔ وہ اتنی جلدی ان کے ہتھے نہیں آئے گا۔''

''تساں کس کی بات کر رہے ہو؟''

''نیڈا کی خیال ہے میں کس کی بات کر رہا ہوں؟''

''کدھرے تساں رستم سیال.....''

''ہاں ہاں.....وہی تو ہے جس نے ان پلیسوں اور اجرالیوں کو تڑھلی ڈالی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں سے ایسے لوگ ہی ٹکر لے سکتے ہیں۔ وہ یہاں سے پولیس کا گھیراؤ توڑ کر نکل گیا ہے۔ دستی بم مار کر کئی پولیس والے بھی مار دیئے ہیں اس نے اور تو اور یہ بھی سنا ہے کہ پولیس کے سب سے بڑے افسر سے بھی مار ماری کی ہے اس نے۔''

''لیکن وہ کب تک بھاگے گا بابا جی! آخر تو پکڑا جائے گا۔''

''نہیں پکڑا جائے گا۔ اس کے ساتھ دعائیں ہیں۔ اس نے جن لوگوں کے ساتھ اچھا کیا ہے وہ رب سے اس کی سلامتی مانگتے ہیں۔'' بوڑھے نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''یہاں سب لوگ جانتے ہیں کہ رستم سیال اور اس کے ساتھی کبھی ڑفتاری نہیں دیں گے اور اگر گرفتاری کی نوبت آ ہی گئی تو پھر وہ ہنس کر موت کو گلے (گلے) لگالیں گے۔''

''کیا پولیس یہاں تساں کے ڈھوک میں بھی آئی ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''آئی کیا ہے، وہ تو یہاں پکا ڈیرہ ڈال کر بیٹھی ہوئی ہے۔ پلس والوں کو شک ہے کہ رستم اور اس کا ایک ساتھی ڈیرے سے بھاگنے کے بعد ہماری ڈھوک میں آئے تھے۔ پلس والوں کے اس شک کی وجہ سے ڈھوک کے مسکین لوگوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔ پلس والے ہر روز لوگوں کو تفتیش میں بٹھاتے ہیں اور ڈراتے دھمکاتے ہیں.....وہ سامنے پنا مکان دیکھ رہے ہو ناں تم، وہ ڈھوک کے پٹواری ڈاہرے کا ہے۔ پولیس کے افسر وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ دیسی مرغیاں اور تیتر دیسی گھی میں بھون کر کھاتے ہیں اور لوگوں کو اپنی لال لال آنکھیں دکھاتے ہیں۔ مینڈا خیال ہے کہ اب بھی دو تین افسر تو یہاں اس مکان میں ہیں۔''

رستم نے ٹوہ لینے کی غرض سے پوچھا۔ ''میاں جی! سنا ہے کہ یہاں کے چوہدری دوسا

www.pdfbooksfree.pk

صاحب کا ایک بھائی بھی مارا گیا ہے؟''

''نہیں نہیں۔ اسے پلس نے نہیں مارا۔ پلس تو دوسا کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتی ہے اور شرابیں پیتی ہے۔ دوسا کا بھائی سراجا اپنی موت مریا ہے۔ وہ کدھرے جا رہیا تھا۔ شاید نشے میں تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کھائی میں گر گیا۔ سر دو ٹوٹے ہو گیا تھا اس کا۔ شکل نہیں دیکھی جاتی تھی۔ ڈھوک کی بہو بیٹیوں پر بُری نظر ڈالتا تھا۔ بُرے کاموں کا بُرا انجام۔'' بوڑھے نے آخری فقرے سرگوشی کے انداز میں کہے۔

رستم نے لاٹھی میں پروئی ہوئی گٹھڑی کندھے سے اُتاری اور ایک بیری کے تنے کے ساتھ رکھ دی۔ بوڑھے نے ایک چھوٹی پوٹلی کھولی۔ اس میں کھانے کے برتن تھے۔ مکئی کی روٹی، رات کا بچا ہوا شلجم کا سالن، دہی اور شکر۔ وہ بولا۔ ''دور سے سفر کر کے آئے ہو۔ بھوک لگی ہوگئی۔ چلو آؤ شاباش۔ مینڈے ساتھ دو بر کیاں (لقمے) لے لو۔''

رستم نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر بوڑھے کا اصرار دیکھتے ہوئے کھانے میں شریک ہوگیا۔ روٹی کا پہلا نوالہ لیتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ مہراں کے ہاتھ کی روٹی ہے۔ وہ اس روٹی اور سالن کے ذائقے سے اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''میاں جی! تساں اس باغ کے مالک ہو یا رکھوالی کا کام کرتے ہو؟''

جواب میں بوڑھے نے جو کچھ بتایا اس نے مہراں کے بیان کی تصدیق کر دی۔ بوڑھا مہراں کا سسر تھا اور پچھلے کئی برسوں سے وہ اس باغ کا ٹھیکہ لے رہا تھا۔ اس کی محنتی بہو مہراں بھی باغبانی میں سسر کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ بھی ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آنے والی تھی اور پھر اس نے سارا دن یہاں اپنا خون پسینہ ایک کرنا تھا۔ بوڑھا بڑے سیدھے سادے انداز میں اپنی جفاکش بہو کی تعریفیں کر رہا تھا۔ اس نے باغ کے ساتھ ہی واقع ایک کھیتی رستم کو دکھائی اور بتایا کہ یہ ہریالی اس کی بہو کی محنتوں کا ثمر ہے۔

رستم کی آنکھوں کے سامنے مہراں کا کڑیل لیکن لچک دار سراپا گھوم گیا اور اس کی سیاہ آنکھیں جن میں سادگی، محبت اور ایثار کے جذبے موجزن دکھائی دیتے تھے۔ رستم نے بوڑھے سے پوچھا۔ ''میاں جی! تساں اپنی نوں (بہو) کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ انہیں دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔''

بوڑھا بولا۔ ''وہ ابھی تھوڑی دیر میں اتھے ہی آجائے گی پُتر.....مینڈا خیال ہے کہ جیون شاہ کے مزار تک گئی ہوگی۔ آج کل روز صبح سویرے وہاں دعا مانگ کر اور نیاز چڑھا کر آتی ہے۔ بڑی نیک، شرماں والی دھی رانی ہے۔ اللہ ہر کسی کو ایسی نوں دھی دے۔''

رستم خاموشی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ بوڑھے بخشو نے کہا۔ ''پُتر! تیرے پاس داج کا سامان بھی ہے۔ تھوڑی دیر دم لے کر تُو یہاں سے نکل جا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اپنی ڈھوک پہنچ جا۔ ڈاکو تو پھر بھی غریب مسکین بندے کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ پلس والے اور ان کے اجرامی یار آج کل بڑا بھوترے ہوئے ہیں۔ کسی کو معاف نہیں کرینڈے۔ بس اللہ مولا بچائے ان لوگوں سے۔'' بوڑھے بخشو نے اپنا دایاں ہاتھ باری باری دونوں کانوں کو لگایا اور ایک بار پھر تاسف بھری نظروں سے پنواری کے چنے مکان کی طرف دیکھا۔

رستم نے پوچھا۔ ''پنواری کے گھر میں کتنے پولیس والے ہیں؟''

''چار پانچ بندے ہیں۔ پر سرکاری بندہ تو ایک بھی سو پر بھاری ہوتا ہے۔ اس لئے یہ اپنی من مرضی کرر ہے ہیں۔ ڈھوک میں کوئی چوں چراں نہیں کرسکتا۔ سردار دوسا بھی وہی کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں۔ اس نے بھی تو اپنی کھال بچانی ہے ناں۔ ان میں ایک وڈا تھانیدار ہے۔ دوسرا چھوٹا ہے۔ وڈا زیادہ کرخت ہے۔ بالے کی جوان بیوی کو اس نے زبردستی کام کاج کے لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ ڈھوک میں سب کو پتا ہے کہ وہ دس دن سے پنواری کے گھر میں ہے لیکن کسی کی مجال نہیں کہ کچھ کرے۔ سب کو اپنی عزت اور جان پیاری ہے۔''

رستم اس علاقے کے غریب، پسے ہوئے طبقے کی حالت زار اچھی طرح جانتا تھا..... اسے پتا تھا کہ ان دور دراز علاقوں میں سرکاری اہلکار جب اپنے کسی کام سے آتے ہیں تو اپنی من مانی کرتے ہیں۔ محکمہ آب کاری کا کوئی معمولی ملازم، زرعی بینک کا کوئی نمائندہ، مردم شماری کرنے والا کوئی اہلکار یا صرف حفاظتی ٹیکے لگانے والا ڈاکٹر دیکھ کر ہی ان لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں..... پولیس کا تھانے دار تو بڑی چیز تھا لیکن پھر بھی یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ معمولی نہیں تھا۔ ڈھوک کی ایک جواں سال عورت علی الاعلان پنواری کے گھر میں تھی اور وہیں پر وڈا اور چھوٹا تھانے دار بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عوت وہاں صرف ''گھریلو کام کاج'' کے لئے تو نہیں تھی۔

رستم نے کہا۔ ''یہ تو بڑی شرم کی بات ہے میاں جی۔ پوری ڈھوک دو تھانے داروں کے ڈر سے چپ ہے۔ یہاں زیادہ نہیں تو آٹھ دس پڑھے لکھے بندے تو ہوں گے۔ کسی نے پولیس والوں سے پوچھا نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرر ہے ہیں؟''

بوڑھا بخشو زیر لب مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں دنیا جہان کا کرب تھا۔ کہنے کو یہ مسکراہٹ تھی لیکن ہزار ہا نوحوں سے زیادہ دردناک۔ وہ کہنے لگا۔ ''پُتر جس دی لاٹھی اُس دی بھینس..... بلکہ سب کچھ اس کا۔ یہ وچارا بالا بھی تو بولنے کے جرم میں ہی پکڑیا گیا ہے ناں۔

پلس کی پوچھ تاچھ میں پھنسا تو بالے کا ہمسایہ قطب دین تھا۔ اس کے گھر کے سامنے سے کھوجی کو دو بندوں کا کھرا ملیا تھا۔ پلس کا خیال تھا کہ یہ کھرا رستم سیال اور اس کے ساتھی کا ہے۔ پلس والے بالے کے ہمسائے قطب دین کو مار کٹ رہے تھے۔ اس مار کٹ میں وچارے کی دھوتی اُتر گئی۔ وہ اپنے گھر والوں کے سامنے ننگا ہو گیا۔ یہ بالا اپنے یار کو بچانے کے لئے آگے آیا۔ پلس والوں نے اسے بھی لتا کر مارنا شروع کر دیا اور قطب کے ساتھ ہی کھینچتے ہوئے پنواری کے گھر لئے گئے۔ بعد میں بالے وچارے کی شامت قطب سے بھی زیادہ آ گئی۔''

''کیا مطلب؟'' رستم نے نمکین لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''پلس والوں کو پتا چلیا کہ مستری ناجے بہاول کا لڑکا فدا بہاول اس بالے کا بھتیجا ہے۔ فدا بہاول نے ایک سال پہلے ایک پلس والے کا دانت توڑ دیا تھا اور ڈھوک باناں سے بھاگ گیا تھا۔ اس ایک سال پرانی گل کی وجہ سے بالے کی سخت شامت آ گئی۔ پلس والوں کو پتا چلیا کہ فدا بہاول اب تک بالے کے پاس ہی چھپا ہوا تھا۔ پلس والوں نے بالے پر الزام لگایا کہ اس کے پاس فدا کے علاوہ بھی مفرور اور اشتہاری آ کر ٹھہرتے رہتے ہیں۔ اے پلس والے بندے کو ایسے ہی گھیر گھار کر پھنسا لیتے ہیں۔ دو دن تک پنواری کے گھر میں پلس والوں نے بالے کو اتنی مار لگائی کہ اس کی چانگریں (دردناک چیخیں) پوری ڈھوک سنتی رہی۔ بعد میں سرپنچ دوسا لوگوں کو دکھانے کے لئے بالے کا ہمدرد بن گیا اور پلس والوں سے اس کی جان چھڑائی۔ سب کو پتا ہے کہ لوگوں کو پھنسانے میں دوسا اور پنواری ڈاہرا ہی ہیں۔ بعد میں ہمدرد بن کر ان کو چھڑاتے بھی ہیں۔ پنواری ڈاہرا کا گھر تو بالکل تھانہ بنا ہوا ہے۔''

''بالے کی بیوی کیسے پہنچی ڈاہرے کے گھر میں؟''

''بالا چھوٹ کر گھر آیا تو دوسرے دن اس کی بیوی کو ''کام کاج'' کے لئے ڈاہرے پنواری نے اپنے گھر بلا لیا۔ بہانہ یہ تھا کہ روز چھ سات بندوں کی روٹی پکانی ہوتی ہے۔ ڈاہرے کی اپنی دو بیویاں ہیں۔ ایک بچہ پیدا کرنے کے لئے بیو کے گھر گئی ہوئی ہے۔ دوسری کو ڈاہرے نے خود کہیں بھیج دیا ہے۔''

بابے بخشو نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی آواز کچھ اور دھیمی کی اور بولا۔ ''اصل میں ہوا یہ تھا کہ پنواری ڈاہرے نے بالے کی جوان بہن کو بلایا تھا تھانے دار کی دل پشوری کے لئے۔ بالے کی بیوی نے اپنی نناں (نند) کو بچانے کے لئے قربانی دی اور خود چلی گئی پنواری کے گھر۔'' بابے بخشو کی آواز گہرے کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

بابا بخشو جو کچھ بتا رہا تھا وہ رستم کے لئے ہرگز انوکھا نہیں تھا۔ دور دراز پسماندہ علاقوں میں زمانوں سے یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے۔ رستم جانتا تھا کہ لالہ فرید، حسنا گجراتی، مراد اور گوہرا جیسے لوگ ایسے ہی تو نہیں بنتے۔ خود رستم کی اپنی کہانی بھی کون سی مختلف تھی۔ اسے اپنے سینے میں آگ سی بھڑکتی محسوس ہوئی۔

دفعتاً بخشو نے اپنی کمزور آنکھیں سکوڑ کر پگڈنڈی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''وہ دیکھو..... وہ سواری کپڑوں والا بندہ..... مینڈا خیال ہے کہ وہ بالا ہی ہے۔ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہیں ناں؟''

رستم نے دیکھا۔ کچھ فاصلے سے اٹھائیس تیس سال کا ایک شخص ذرا لنگڑاتا ہوا سا گزر رہا تھا۔ آٹھ نو ماہ کے دو بچے اس کی گود میں تھے۔ غالباً یہ دونوں جڑواں تھے۔ جواں سال شخص کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں استری کئے ہوئے کچھ کپڑے تھے۔ رستم نے بوڑھے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں دو بچے بھی ہیں اس کے پاس۔''

''یہی بالا ہے۔'' بوڑھے بخشو نے کہا۔ ''شاید یہ پٹواری کے گھر جا رہیا ہے۔ بچوں کو دودھ پلانے۔''

''دودھ پلانے؟''

''آہو پتر! یہ بالے کے بچے ہی ہیں۔ دونوں جوڑے ہیں۔ ان کی ماں تو پٹواری کے گھر میں پھنسی ہوئی ہے۔ بچے رو رو کر بے حال ہوتے تھے۔ اب بالا دو تین ٹائم انہیں پٹواری کے گھر لے جاتا ہے، ماں سے ملوانے۔''

رستم کے سینے میں بھڑکتی آگ کچھ اور فروزاں ہو گئی۔ نس نس تڑخنے لگی۔ بوڑھے بخشو نے مقامی انداز میں بالے کو آواز دی۔ ''ہو بالے..... ہو..... اراں تھی (ادھر آؤ)''

بالے نے ٹھٹک کر باغیچے میں بیٹھے رستم اور بخشو کی طرف دیکھا پھر لنگڑاتا ہوا ان کی طرف چلا آیا۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے پر نیل نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ اس مار پیٹ کی نشانیاں تھیں جو چند دن پہلے پٹواری ڈاہرے کے گھر میں پولیس والوں نے اس سے کی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ کُرتے میں پیوند تھے۔ وہ بے چارگی اور غربت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دونوں بچوں کے علاوہ شلوار قمیص کے تین عدد استری شدہ کلف لگے جوڑے تھے اور ایک ٹرانزسٹر ریڈیو تھا۔ وہ یہ سامان یقیناً اپنے پلس والے کرم فرماؤں کے لئے لے جا رہا تھا۔

بابا بخشو اور بالا چند لمحے میں باتیں کرنے لگے۔ رستم انہیں باتیں کرنے کا موقع

دینے کے لئے اٹھ گیا۔ اس نے ایک کیکر سے مسواک توڑی اور چشمے کے پانی کے پاس بیٹھ کر مسواک کرنے لگا۔ مسواک کرتے ہوئے اس کی نگاہیں دور پٹواری کے چنے مکان پر لگی ہوئی تھیں۔ اس دور دراز علاقے میں بھی پٹواری کے گھر کی چھت پر ڈش انٹینا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کے گھر میں جنریٹر وغیرہ بھی ہوگا۔ دور کہیں ٹیلوں میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ پرندوں کی ایک ڈار مغربی افق سے نمودار ہوئی اور پرواز کرتے کرتے مشرقی ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ بہت اوپر گدلے آسمان پر کچھ چیلیں اور گدھ چکراتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں گرد آلود ہوا کا دباؤ تھا۔ یہ آندھی اور ابر آلود موسم کا اشارہ تھا۔

بالا کچھ دیر تک بخشو سے مصروفِ گفتگو رہنے کے بعد اٹھا اور اپنے راستے پر چل دیا۔ بخشو سے بات کرنے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ رنجور نظر آنے لگا تھا۔ رستم کو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ اس کے جانے کے بعد رستم پھر بخشو کے پاس آ بیٹھا۔ بوڑھے بخشو نے اپنے کندھے کے صافے سے آنکھوں کی نمی صاف کی اور آہ بھر کر بولا۔ ''اوپر والا بھی پتا نہیں کیوں ہم گریبوں کا تماشا دیکھتا رہتا ہے؟''

''کیا ہوا میاں جی؟''

''وہی جو اساں جیسے لوگوں کا نصیبا ہوتا ہے۔ بالے کے ساتھ تو وہی گل ہوئی ہے کہ جوتے بھی کھا لئے اور گنڈے بھی۔ بہن کو بچانے کے لئے بیوی کو پٹواری کے گھر میں بھیجا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ہوا، اب بہن کو بھی بھیجنا پڑ رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بالے نے بتایا ہے کہ رات سے دو اور افسر شہر سے آئے ہوئے ہیں۔ پٹواری ڈاہرے نے بالے سے کہا ہے کہ اکیلی شمشاد سے سارا کام کاج نہیں ہوتا۔ وہ ایک اور عورت کا انتظام کرے۔ ظاہری گل ہے ڈاہرے کا اشارہ بالے کی بہن سندوری کی طرف ہے۔ وہ رو رہیا تھا اور کہہ رہیا تھا کہ اس سے تو اچھا ہے کہ وہ زہر کھا لے اور اپنی بہن اور بیوی کو بھی کھلا دے۔ وہ ڈھوک والوں کو بھی بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ سب کچھ ان کی اکھیوں کے سامنے ہو رہا ہے پر سب اپنی اپنی جانیں بچا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی اکھ اٹھا کر مصیبت کے ماروں کی طرف نہیں دیکھتا۔''

گرد آلود ہوا چلنے لگی تھی۔ رستم اور بخشو نے پگڑیوں کے پلو سے چہرے ڈھانپ لئے۔ بخشو کے بوڑھے چہرے پر دکھ کے ساتھ ساتھ اب تشویش بھی نظر آنے لگی تھی۔ یہ تشویش آندھی کے حوالے سے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب درختوں سے بہت سا کچا پھل گر جائے گا اور

www.pdfbooksfree.pk

اس کا نقصان ہوگا۔ رستم کو ایک بار پھر اس چار لاکھ روپے کا خیال آیا جو وہ اسی بوڑھے اور اس کے تنگ دست گھرانے کے لئے اپنے یار جہانگیر حسین کو ملتان میں دے آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رقم اگلے دو چار ہفتوں کے اندر ضرور اس گھرانے تک پہنچ جائے گی۔

رستم نے بخشو سے پوچھا۔ ''میاں جی! تساں دی نوں (بہو) نہیں آئی؟''

بخشو نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مینڈا خیال ہے، وہ تیری بہن خراب موسم دیکھ کر رک گئی ہے۔ مینڈا خیال ہے اب مجھے بھی چلنا چاہیے۔ بارش شروع ہوگئی تو مشکل ہو جاسی۔''

''کہتے ہو تو میں تساں کو تہاڈے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

''نہیں پُتر! تیڈے پاس مہنگا سامان ہے۔ تم اپنا رستہ کھوٹا مت کرو۔ بس جلدی سے نکل جاؤ۔''

رستم خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جلد نکل جائے۔ اس کے پاس ضائع کرنے کو وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ جتنی جلد فرید اور حسنے تک رسائی حاصل کر لیتا اتنا ہی ان کے لئے بہتر تھا لیکن اپنے اس نہایت قیمتی وقت میں سے وہ تھوڑا سا وقت ضرور نکالنا چاہتا تھا۔ کم از کم اتنا وقت جس میں وہ پنواری ڈاہرا کے گھر میں گھس کر اپنے کولٹ پسٹل سے چھ سات فائر کر سکتا۔ ہاں یہ وقت نکالنا ضروری تھا۔ اس کی فطرت اسے اجازت ہی نہیں دیتی تھی کہ وہ یہ ''وقت'' نکالے بغیر آگے بڑھ جائے۔

پوری طرح دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی ایک دفعہ پھر رات ہوگئی تھی۔ تیز گرو آلود جھکڑ کے بعد گہرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور گرج چمک کے ساتھ ہلکے چھینٹے پڑنے لگے۔

بوڑھا پلٹنے لگا تو رستم نے کہا۔ ''میاں جی! تساں کے کھلائے ہوئے شلجم اور مکئی کی روٹی ہمیشہ یاد رہے گی۔ بہت بہت شکرانہ۔''

''نہیں پُتر! راہیوں کی سیوا کرنا تو ہر بندے کا فرض ہے۔'' بوڑھے بخشو نے اپنی لمبی ڈنگوری کو لاٹھی کی طرح نم زمین پر ٹیکا اور جھک کر چلتا ہوا بیری اور انجیر کے پیڑوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس نے رستم سیال سے بات کی ہے۔ اگر جانتا ہوتا تو شاید اسے سارا دن بھی یہاں رستم کے ساتھ کھڑے ہو کر بارش میں بھیگنا منظور ہوتا۔ رستم جانتا تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔ لالہ فرید اور حسنا بھی ڈاکو ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی ڈھوکوں اور آس پاس کے علاقے کے لوگ ان ڈاکوؤں کو ڈاکو نہیں سمجھتے تھے۔ جب کبھی گھوڑوں پر سوار کوئی ٹولی کسی ڈھوک میں آنکلتی تھی تو مکینوں کے چہروں پر خوف و ہراس کی بجائے اپنائیت کی جھلکیاں نظر

آتی تھیں۔ وجہ یہی تھی کہ ڈاکو ان غریب مسکین لوگوں سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ اگر کبھی مرغیاں انڈے یا دودھ وغیرہ حاصل کرتے بھی تو منہ مانگی قیمت دیتے تھے اور کبھی کبھی بغیر کچھ لئے بھی بہت کچھ دے جاتے تھے۔ پہلے سردار نادر کاکا کے بعد لالہ فرید نے بھی اپنے ساتھیوں پر مکمل کنٹرول رکھا ہوا تھا۔ خاص طور سے عورت ذات کے حوالے سے گروہ کے افراد پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ عورت چاہے اس پسماندہ علاقے کی ہوتی یا کسی شہر کی، اس کی طرف گروہ کا کوئی رکن بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن..... بالفرض اگر کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ ہو بھی جاتا تو گروہ کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق قصوروار کو کڑی سزا ملتی تھی۔ لالے فرید کا لاڈلا جواں سال بھانجا اباگیر اس کی ایک ''مردہ مثال'' تھا جسے لالے نے اپنے ہاتھوں سے گولی ماری تھی اور جس کی تازہ قبر ڈوڈے ڈیرے کے قبرستان میں موجود تھی۔ اصول بنانا اور دعوے کرنا تو آسان ہوتا ہے لیکن ان پر بلاتخصیص عمل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لالے کے گروہ نے نہ صرف اصول بنائے تھے بلکہ عمل کر کے بھی دکھایا تھا۔ بے شک وہ قانون اور معاشرے کے مجرم تھے لیکن اپنے جیسے دیگر ''مجرموں'' سے انہیں علیحدہ کیا جاسکتا تھا۔

بارش ہو رہی تھی لیکن بہت تیز نہیں تھی۔ ہاں اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ابر آلود موسم جلد اختتام پذیر نہیں ہوگا۔

رستم نے جہیز کے سامان میں سے ایک شاپر نکال کر کولٹ پسٹل کے گرد لپیٹا۔ دو بھرے ہوئے فالتو میگزین بھی شاپر میں رکھ لئے۔ اس شاپر کو کرتے کے نیچے اڑس کر اوپر سے چادر برابر کی اور چلے مکان کی طرف چل دیا۔ جہیز کے سامان کی گٹھڑی اس نے وہیں باغیچے میں رکھی لکڑی کی پیٹیوں کے اندر چھپا دی تھی۔

پنواری ڈاہرا کا چٹا مکان ڈھوک کے نواح میں واقع تھا۔ ڈھوک کی اصل آبادی اور اس مکان کے درمیان کئی پھٹی زمین کا ایک خالی قطع تھا جس میں بارش کا پانی جمع کرنے کے لئے نیم پختہ تالاب بنایا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک یقیناً یہاں مویشی اور لوگ موجود ہوں گے لیکن اب بارش کی وجہ سے سب کچھ سنسان پڑا تھا۔ صرف دو تین بطخیں پانی میں ڈوب ابھر رہی تھیں۔

رستم عام سے انداز میں پنواری کے مکان کے چاروں طرف گھوم گیا۔ داخلی دروازے کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک جیپ تھی۔ دوسری کھٹارا سی پک اَپ جس کی سبز پلیٹ کے ساتھ پولیس کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ پک اَپ خراب نظر آتی تھی۔ اس کے اگلے دونوں پہیے کھول کر ایک طرف رکھ دیئے گئے تھے۔ دن میں ہی رات کا سماں تھا۔ بارش

www.pdfbooksfree.pk

کچھ زور پکڑ گئی تھی۔ عقبی دیوار سے مکان کے اندر گھسنے میں رستم کو چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ پودوں کے درمیان گیلی زمین پر بے آواز کودا اور دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس کے انداز میں چیتے کا سا چوکنا پن تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہوگئی تھیں۔ ہاں، یہی وہ شخص تھا جس کے بارے میں پنجاب پولیس کے ایک نہایت تجربہ کار افسر نے کہا تھا..... یہ بندہ اپنے مدِمقابل کو بے بس کرنے اور جان سے مارنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔

چند قدم آگے رستم کو ایک چھوٹا سا برآمدہ نظر آیا۔ یہاں روئی کا ایک بڑا گدیلا بچھا ہوا تھا اور اس پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ گدے کے پاس سگریٹوں کے بے شمار ٹکڑے اور چائے کے کپ الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ایک ہٹا کٹا شخص جس کی پشت پر گھنے بال تھے صرف ایک نیکر پہنے اوندھے منہ گدیلے پر لیٹا تھا۔ درمیانی شکل وصورت کی ایک جواں سال مقامی عورت اس شخص کی پشت پر مالش کر رہی تھی۔ مشقت کے سبب وہ ہانپی ہانپی تھی اور اس کے شہد رنگ بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ تنومند شخص نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔ ''کیا بات ہے رانی! آج تیرے ہاتھ میں پہلے جیسی طاقت نہیں۔ میرا خیال ہے تُو نے ناشتہ نہیں کیا۔ جا پہلے ناشتہ کر آ۔''

''نئیں صیب جی۔ میں نے نئیں کرنا ناشتہ۔''

''اوئے۔ کھائے پیئے گی نہیں تو اتنا کام کاج کیسے کرے گی۔ چل جا شاباش تھوڑا بہت کھا پی لے۔'' اوندھے لیٹے شخص نے ذرا نرمی سے کہا۔

اتنی دیر میں داخلی دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی۔ ''کون ہے اوئے؟'' اوندھے لیٹے شخص نے آنکھیں بند کئے پوچھا۔

''میں بالا ہوں سرجی۔ تساں کے کپڑے اور دودھ لے کر آیا ہوں۔''

''لے آگیا تیرا خصم۔'' اوندھے لیٹے شخص نے کہا۔ ''جا بات سن لے اس کی اور اس سے بول دینا اپنی نناں (نند) کے بارے میں بھی۔''

عورت اٹھی اور اوڑھنی درست کرتی ہوئی داخلی دروازے کی طرف چلی گئی۔ دروازے کے باہر سے بچوں کے رونے کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ شاید وہ بارش میں بھیگنے کے سبب احتجاج کر رہے تھے۔ بالا، رستم سے پہلے باغیچے سے نکل آیا تھا لیکن اب یہاں پہنچا تھا۔ غالباً وہ راستے میں دودھ لینے کے لئے رک گیا تھا۔

رستم نے دیوار کی اوٹ سے دیکھا۔ بالے نے دہلیز کے باہر سے ہی دونوں بچے،

ریڈیو، استری شدہ کپڑے اور دودھ کا منہ بند برتن اپنی بیوی کو تھما دیئے۔ بیوی یعنی شمشاد باقی چیزیں ایک طرف رکھ کر پہلے دونوں بچوں کو گلے سے لگایا اور ان کے منہ چومے۔ پھر شوہر سے نظریں چراتی ہوئی دیگر سامان کے ساتھ واپس آگئی۔ بالے نے گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی۔

رستم کا خون اس کی رگوں میں ابالے کھانے لگا تھا۔ چادر کے نیچے اپنے قاتل پسٹل پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے گرجنے برسنے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ بھی کوئی پولیس والا تھا۔ پہلے تو رستم نے سمجھا کہ شاید مصیبت کی ماری شمشاد کو لعن طعن کا نشانہ بنایا جارہا ہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ گرجنے برسنے والے کا مخاطب بھی کوئی مرد ہی ہے۔ رستم دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتا ہوا اس کھڑکی کی طرف گیا جہاں سے گرجنے برسنے کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ بالا کی وجہ سے نیم تاریکی تھی اور کمرے میں گیس لیمپ روشن تھا۔ اس روشنی میں رستم کو درمیانے قد کاٹھ کا ایک پولیس اہلکار نظر آیا۔ وہ ایک دوسرے باوردی اہلکار کے سامنے کھڑا تھا۔ باوردی اہلکار نے سر جھکا رکھا تھا۔ اس کے کندھے پر نظر آنے والے دو پھول بتا رہے تھے کہ وہ سب انسپکٹر ہے۔ ایک تیسرا شخص بھی کمرے کے ایک کونے میں موجود تھا اور بالکل مؤدب نظر آرہا تھا۔ سادہ کپڑوں والے اس شخص کے چہرے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کا دو تہائی حصہ ان پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔

سب انسپکٹر نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''سرجی! کام کاج کی مجبوری تھی، ورنہ آپ کو تو پتا ہی ہے، میں.....''

''اوئے بکواس نہ کر میرے سامنے۔'' دوسرے شخص نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''کام کاج کی بات تھی تو کوئی بڑی عمر کی عورت بلا لیتے..... کوئی اور انتظام کر لیتے۔ میں جانتا ہوں تیری اور ناجے کی خصلت۔ اس بچوں والی بے گناہ عورت کو تم نے دس دن سے یہاں بند کر رکھا ہے۔ تم جیسے لوگ ہیں جنہوں نے اس محکمے کو بدنام کیا ہوا ہے۔ لوگ پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں تمہیں۔ تمہاری ماں بہن ایک کرتے ہیں اور جو بددعائیں تم لوگ لیتے ہو اس کا کوئی حساب ہی نہیں۔''

''پر انسپکٹر جی.....''

''چپ رہ۔'' انسپکٹر نے ایک بار پھر کڑک کر ماتحت کی بات کاٹی۔ ''کسی اور کی بات کا میں یقین نہ کرتا۔ پر رات خود میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ وہ تیرا شرابی اے ایس آئی

www.pdfbooksfree.pk

ناجا پٹواری سے بات کر رہا تھا۔ اسے ایک اور لڑکی لانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں نے سب اپنے کانوں سے سنا ہے۔''

''وہ تو جی۔ آپ کے کام کاج کے لئے۔''

''اوئے بک بک نہ کر۔'' انسپکٹر کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ ''کام کاج..... کام کاج..... میں جانتا ہوں تمہارے کام کاجوں کو۔ کیا تم نے سب کو اپنے جیسا رنگ باز سمجھا ہوا ہے۔ کیا سمجھتے ہو تم مجھے..... کیا سمجھتے ہو۔'' انسپکٹر کا غصہ بھڑکتا جا رہا تھا۔

''دراصل پٹواری نے.....''

''اوئے پٹواری اپنی ماں بہن کو کیوں نہیں لے آیا تمہاری مٹھی چاپی کے لئے۔ غریبوں کی بہو بیٹیوں کو کیوں گھسیٹ رہا ہے یہاں۔''

سب انسپکٹر اب تک خاموش تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب وہ جو بھی کہے گا اس سے انسپکٹر کا پارہ اوپر کو ہی جائے گا۔ جس شخص کے چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اس نے پُر اندیش نظروں سے صحن کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ ان کا میزبان پٹواری یہ باتیں سن لے گا۔

انسپکٹر نے اپنے ماتحت کی طرف فیصلہ کن انداز میں انگلی اٹھائی اور بولا۔ ''اب ختم کرو یہ تفتیش کا لعنتی تماشا۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں ٹانگیں چوڑی کر کے بیٹھے ہوئے۔ تمہیں اور ناجے کو ابھی میرے ساتھ واپس جانا ہوگا۔ چلو باندھو اپنا بوریا بستر۔''

سب انسپکٹر کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے یہ نادر شاہی حکم پسند نہیں آیا لیکن اس حکم کی تعمیل کے سوا اس کے پاس چارہ بھی نہیں تھا۔ دوسری جانب کھڑکی سے باہر رستم کو ایک سایہ سا نظر آیا۔ غالباً یہ وہ تیسرا البکارا ے ایس آئی ناجا تھا جو تھوڑی دیر پہلے برآمدے میں اوندھا لیٹا تھا۔ اب شور وغل سن کر وہ بھی اس کمرے کی طرف آ گیا تھا اور باہر ہی سے اندر کی صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''مم..... مجھے جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے سر جی..... لیکن..... گاڑی خراب ہے..... اسے ٹھیک ہونے میں ابھی چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جانے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ ہی وقت لگ جائے۔ اگر آپ کہیں تو ہم کل صبح سویرے نکل پڑیں گے۔''

''نہیں..... ابھی چلو تم۔ گاڑی کی خیر ہے۔ کل تمہارا یہ کانسٹیبل جبرو لے آئے گا۔'' انسپکٹر نے اس دراز قد شخص کی طرف اشارہ کیا جو چہرے پر پٹیاں باندھے کھڑا تھا۔

سب انسپکٹر منمنایا۔ ''لیکن یہ زخمی ہے۔ پتا نہیں اس سے گاڑی.....''

انسپکٹر نے بھنا کر جبرو کو ایک گالی دی اور بولا۔ ''یہ چھترولیا بکرے کی بھنی ہوئی ٹانگ چیر سکتا ہے تو گاڑی بھی چلا کر لے آئے گا۔ تم تیاری پکڑو فٹافٹ۔''

سب انسپکٹر نے ناپسندیدگی کے انداز میں سر کو خفیف جنبش دی اور ''یس سر'' کہا۔

''اس عورت کو فوراً اس کے گھر بھیجو اور اس کے بندے کو بھی تفتیش سے خارج کرو۔ میں ملا ہوں اس سے۔ وہ مجھے بے گناہ لگا ہے۔ اگر کوئی بات سامنے آئی تو میں خود اس سے مل لوں گا۔''

''یس سر'' سب انسپکٹر نے سیلوٹ کے انداز میں ہاتھ ماتھے کو لگایا اور بجھا بجھا سا باہر چلا گیا۔ کانسٹیبل بھی باہر نکل گیا۔

انسپکٹر مضطرب انداز میں کمرے کے اندر چکرانے لگا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دو دفعہ بڑبڑانے والے انداز میں ہلے پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔ رستم وہیں کھڑا رہا۔ یہ کھڑے رہنے کے لئے بہت محفوظ جگہ تھی۔ کولٹ پسٹل رستم کے ہاتھ میں تھا اور انگلی لبلبی پر۔ وہ یہاں قتل کرنے کے لئے آیا تھا اور اگر ایک مرتبہ اس کی انگلی لبلبی پر حرکت کرنے لگتی تو باہر بالے کی عورت کے سوا شاید ہی یہاں کوئی زندہ بچتا لیکن ایک شخص کی وجہ سے سارا منظر الٹ پلٹ ہو گیا تھا اور یہ ''ایک شخص'' ان ہی لوگوں میں سے تھا جنہیں رستم قتل کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اگر ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس ''ایک شخص'' نے اپنے مثبت رویے سے ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے تو جھک جھک کر اس کے پاؤں چومتے۔ پسٹل کی لبلبی پر رستم کی تنی ہوئی انگلی قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔

گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رستم کو تھوڑے فاصلے پر ایک نیچی چھت والے کمرے میں خشک گھاس کا ڈھیر نظر آیا۔ چھپنے کے لئے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ رستم بڑی احتیاط سے اس نیچی چھت والے کمرے میں چلا گیا۔ مقامی زبان میں ایسے کمروں کو ڈھارا کہا جاتا تھا۔ ایک دروازے کے سوا یہ مکمل طور پر بند تھا۔

رستم کے اندازے کے عین مطابق تھوڑی ہی دیر بعد اس نے انسپکٹر کے علاوہ اے ایس آئی ناجے کو بھی وردی میں دیکھا۔ اس کے علاوہ دو سپاہی نظر آئے..... وہ سب یہاں سے جانے کے لئے تیار نظر آتے تھے۔ ایک سپاہی نے دو تین سفری بیگ لٹکا رکھے تھے۔ ایک دوسرے سپاہی نے گھی کے دو ڈبے اٹھائے ہوئے تھے۔ یقیناً ان ڈبوں میں وہ دیسی گھی ہوگا جو یہاں کے لوگوں نے بطور نذرانہ سب انسپکٹر کو پیش کیا ہوگا۔ انسپکٹر کی نظر ان ڈبوں پر پڑی اور اس نے بڑے تلخ لہجے میں سپاہی کو جھاڑ پلائی۔ ''کھوتے دے پتر! یہ کیا پکڑا ہوا ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk

''جی..... گیو ہے۔'' سپاہی نے لرزتے ہوئے کہا۔

''اس بھوتنی دے گیو کو اندر رکھ کر آ اور وہ کیا رکھا ہے برانڈے میں؟''

''وہ جی باسمتی چاول کا توڑا ہے۔''

''اس توڑے کو بھی اندر رکھ۔ پنواری کی ماں، بہن پکاتی رہے گی اسے..... اور گیا کدھر ہے پنواری؟''

''ان کی تاریخ ہے جی۔ وہ آدھی رات کے نکل گئے ہوئے ہیں شہر جانے کے لئے۔''

کچھ ہی دیر بعد انسپکٹر اپنے سب انسپکٹر اور اے ایس آئی سمیت ڈھوک شاہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ رستم نے ڈھارے میں چھپے چھپے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پنواری کے جواں سال بیٹے اور دو تین دیگر افراد نے پولیس والوں کو رخصت کیا۔

رستم کے ذہن میں ایک نئی بات آ رہی تھی۔ اس نے انسپکٹر اور دیگر افراد کے درمیان جو گفتگو سنی تھی، اس سے اندازہ ہوا تھا کہ پنواری کے گھر سے باہر کھڑی لوڈر گاڑی کو ٹھیک کیا جا رہا ہے۔ توقع تھی کہ چند گھنٹے میں یہ گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے بعد یہاں رہ جانے والے ہیڈ کانسٹیبل جبرو نے یہ گاڑی لے کر آگے جانا تھا۔ جبرو کی منزل بھی وہی تھی جہاں پولیس اور ان کے مددگار اجرالیوں کی بڑی جمعیت نے وڈے ڈیرے کو ایک وسیع گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ جبرو نے کچھ سفر پک اَپ لوڈر اور کچھ پاپیادہ طے کرنا تھا۔ رستم اگر کسی طرح اس ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ہی موقع پر پہنچ جاتا تو یہ اس کے لئے آسان ہوتا اور وقت کی بھی بچت ہوتی۔ رستم نے فیصلہ کیا کہ وہ جبرو کے آس پاس موجود رہے گا اور اس کے روانہ ہونے کا انتظار کرے گا۔

یہاں رازداری کے ساتھ موجود رہنے کے لئے اسے بڑی مناسب جگہ میسر آ گئی تھی۔ اب دن کے دس بجنے والے تھے لیکن ابر آلود موسم کے سبب وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رستم لمبی جنگلی گھاس کے خنک ڈھیر کے پیچھے نیم دراز رہا اور سوچتا رہا۔ دور کہیں ٹیلوں میں گولیاں چلنے کی مدھم آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ممکن تھا کہ کسی شکاری نے کسی جنگلی جانور کو مارا ہو لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی اجرالی یا کسی پولیس والے نے لالہ کے کسی ساتھی کو شوٹ کیا ہو۔

پچھلے دنوں میں جو واقعات ہوئے تھے ان میں سے دو زیادہ اہم تھے اور مسلسل رستم کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے۔ پہلا، گوہر کے مرنے کا اور دوسرا نظام سے ملاقات کا۔ نظام ایک بے حد مضبوط اور صابر شخص کا نام تھا لیکن وہ جس طرح بچوں کی طرح رویا تھا اس

سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بُری طرح ٹوٹ چکا ہے۔ رستم دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ نظام کی بیٹی پولیس کے ستم سے بچ جائے۔

اچانک رستم بری طرح چونک گیا۔ اسے قدموں کی آہٹ اپنے بالکل قریب سنائی دی۔ پھر ایک نوجوان لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور گھاس کے ڈھیر پر رستم سے صرف تین چار میٹر کی دوری پر گر گئی۔ وہ دبی دبی آواز میں ہنس رہی تھی۔ اس کے کپڑے بارش کے پانی سے شرابور تھے۔ لڑکی کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان آیا اور لڑکی کے اوپر گر گیا۔ رستم اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈھارے کی نیم تاریکی میں اس نے لڑکی اور نوجوان کے جسم ایک دوجے سے گتھم گتھا دیکھے اور سانسوں کی تیز آواز سنی۔ ''بس..... بس..... بس۔'' لڑکی نے شوخ سرگوشی کی۔ ''مینڈا دم گھٹ رہا ہے۔''

''دم نہیں گھٹ رہا..... نخرے دکھا رہی ہے۔'' نوجوان نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا..... پیچھے ہٹ جا۔''

''ایک شرط پر، رات کو آئے گی۔''

''نہ بابا! جیڈے گھر میں پلس والے ہیں۔ مینڈے ہتھوں میں ہتھکڑی لگوانی ہے۔''

''اوئے میری جنڈی! چلے گئے ہیں پلس والے۔ ایک بندہ رہ گیا ہے وہ بھی شام سے پہلے نکل جائے گا۔ اس کی گڈی ٹھیک ہو رہی ہے۔ بس دو گھنٹے کا کام ہے.....''

''اور تیڈا ابا؟''

''وہ تاریخ پر ہے۔ کل رات سے پہلے نہیں آئے گا۔''

ان دونوں کی باتوں سے پتا چلا کہ نوجوان کا نام دھمید و تھا اور وہ پنواری ڈاہرے کا بیٹا تھا اور لڑکی پڑوس کی تھی۔ رنگ رنگیلے موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ اس ڈھارے میں گھس آئے تھے۔

وہ چلے گئے تو رستم بھی یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا زیادہ دیر تک یہاں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ کسی بھی وقت کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈھوک شاہاں سے باہر نکلنے کا راستہ ایک ہی ہے۔ جبرو کو اپنی پک اَپ پر جب بھی یہاں سے نکلنا تھا، اسی راستے سے نکلنا تھا۔ رستم اس راستے کے کنارے کہیں بیٹھ کر جبرو کا انتظار کر سکتا تھا.....

بادل ایک بار پھر گھر کر آ گئے تھے۔ دن میں رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا اور بجلی چمکنے لگی۔ رستم بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور دیوار پھاند کر باہر آ گیا۔ وہ گھوم کر گھر کے گیٹ کی طرف آیا۔ پک اَپ کے دونوں اگلے پہیے لگا دیئے گئے تھے اور اسے دھکیل کر ایک

www.pdfbooksfree.pk

سایہ دار جگہ پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ایک مکینک اس کے نیچے گھسا ٹھوکا ٹھا کی کر رہا تھا۔

رستم ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتا ہوا ڈھوک سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ قمیص کے نیچے اپنی ران پر کولٹ پسٹل کی سخت محسوس کر رہا تھا۔ یہ پسٹل اب اس نے پولی تھین میں لپیٹ کر دھوتی کی ڈب میں اڑس رکھا تھا۔ چلتے چلتے اس کی نگاہ ایک مزار پر پڑی۔ ڈھوک کی بیرونی حد کے ساتھ ہی یہ پختہ مزار درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک دم بارش تیز ہوگئی۔ تیز اڑنے لگا۔ تیز بارش سے بچنے کے لئے رستم مزار میں چلا گیا۔ مزار کے اندر اور برآمدے میں کافی لوگ موجود تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو تیز بارش سے بچنے کے لئے اندر گھسے تھے۔ رستم بھی ان میں کھڑا ہوگیا۔ دو مقامی بندے اس خونی واقعے کے بارے میں بات کر رہے تھے جس کا ایک کردار رستم خود تھا۔ ''کم از کم تین بندے مرے ہیں۔ کچھ کہہ رہے ہیں کہ اس سے زیادہ ہیں۔'' ایک شخص نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ''مینڈا خیال اور ہے۔ ہوسکدا ہے کہ وہ سپیرے نہ ہوں۔ سپیروں کے بھیس میں ڈاکو ہوں۔''

''سپیروں کے بھیس میں پلس والے بھی تو ہوسکدے ہیں۔'' پہلے نے خیال آرائی کی۔ اچانک رستم کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی اور جم گئی۔ وہ مہراں تھی۔ ڈھوک شاہاں کی مہراں۔ دھریک کے درخت کی طرح لمبی اونچی، مضبوط لیکن لچک دار۔ اس کا رخ مزار کی طرف تھا لیکن رستم کی طرف بھی ہوتا تو وہ با آسانی سے اسے پہچان نہ سکتی۔ رستم کا حلیہ بہت حد تک بدلا ہوا تھا۔ رستم نے دیکھا وہ مزار کی جالی سے ماتھا ٹیکے گم صم بیٹھی تھی، اس کا لباس خستہ تھا اور آنکھیں روئی روئی تھیں۔ نہ جانے کیوں رستم کو اس کے چہرے پر گناہ کی ندامت نظر آئی۔ ہاں یہ گناہ کی ندامت ہی تھی۔ ایک پشیمان تاثر تھا جس نے اس کے دہقانی نقوش کو ڈھانپ رکھا تھا۔

رستم ستون سے لگا اسے دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا کہ مہراں اپنے اس گناہ پر ندامت کے آنسو بہانے اس مزار پر آتی ہے جو کچھ دن پہلے رات کی تاریکی میں اس سے ہوا تھا۔ وہ گناہ تھا، ایثار تھا، یا حالات کا تقاضا..... جو کچھ بھی تھا مہراں کے دل و دماغ پر اس کا بوجھ تھا۔ کسی بھی وجہ سے سہی لیکن اس نے اپنا جسم ایک غیر مرد کو سونپا تھا۔ اپنی ایک ''خواہش'' پوری کرنے کے لئے اس ''دراز دست'' کی ایک خواہش پوری کی تھی۔ اب شاید وہ اسی گناہ کی تلافی کے لئے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس مزار پر حاضری دیتی تھی اور منتیں مانتی تھی۔ رستم کا دل درد سے بھر گیا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے پاس جائے۔ اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھے۔ اس سے پوچھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی خاطر اپنے کومل جسم کو ایک کانٹوں والی جھاڑی میں کیوں پھینکا؟ لیکن پھر بہت سی دیگر خواہشوں کی طرح رستم نے یہ خواہش بھی سینے میں دبالی۔ جو ہو چکا تھا وہ ہو چکا۔ اب مہراں کے روز و شب میں پھر سے تلاطم پیدا کرنا بے کار تھا۔ یہ سوچ کر رستم کو گونا گوں تسلی ہوئی کہ عنقریب جہانگیر کی وساطت سے ایک نہایت معقول رقم اس تنگ دست گھرانے تک پہنچنے والی ہے۔

بارش ذرا مدھم ہوئی تو رستم کچھ دوسرے لوگوں کی طرح مزار کے احاطے سے نکل آیا۔ اس کا رخ ڈھوک کے نواح کی طرف تھا۔ بابے بخشو کے باغیچے میں چھپائی ہوئی داج کی گٹھڑی حاصل کرنے کے بعد وہ اس راستے کی جانب آگیا جو ڈھوک سے باہر جانے کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اپنی گٹھڑی سمیت درختوں کے ایک جھنڈ میں چلا گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ایک مسافر لمبے سفر کے بعد کچھ دیر تک آرام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے دیہاتی انداز میں اپنی چادر کو کمر کے پیچھے سے گزار کر گھٹنوں کے قریب گرہ دے لی۔ یوں ایک ''آرام دہ کرسی'' بن گئی۔ وہ اس کرسی میں ہولے ہولے آگے پیچھے جھولنے لگا۔

رستم کو اپنی توقع سے کہیں کم انتظار کرنا پڑا۔ سہ پہر کے چار بجے تھے۔ بارش تھم چکی تھی مگر آسمان پر ہنوز گہرے بادل ٹھہرے ہوئے تھے۔ رستم کو نیلی پک اَپ ڈھوک کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ رستم تیار ہوگیا۔ گرم چادر کے نیچے اس کا پسٹل بالکل تیار حالت میں تھا۔ پک اَپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی نزدیک پہنچی تو رستم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

ڈرائیونگ کیبن میں زخمی ہینڈ کانسٹیبل ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ اس نے بے حد ناگواری سے رستم کی طرف دیکھا۔

''صیب جی، میں نے ڈھوک باناں کی طرف جانا ہے۔ اگر تساں کو تکلیف نہ ہو تو مجھے اپنے ساتھ بٹھالیں۔ مینڈے ساتھ یہ تھوڑا سا سامان بھی ہے۔''

ہینڈ کانسٹیبل جبرو نے طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی اور ایک غلیظ گالی دے کر بولا۔ ''تیرے لئے ہیلی کاپٹر کا انتظام نہ کرادوں ڈھوک باناں جانے کے لئے۔''

رستم جان گیا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ اس نے چادر تھوڑی سی اوپر سرکائی اور خوفناک کولٹ پسٹل کی جھلک جبرو کو دکھائی اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''زیادہ تن فن دکھائی تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔''

جبرو کا زیادہ تر چہرہ تو پٹیوں میں تھا، جتنا نظر آرہا تھا وہ حیرت اور خوف کی آماجگاہ بن گیا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ پک اَپ لوڈر کو تیزی سے آگے بڑھا دے گا مگر پھر رستم کے

www.pdfbooksfree.pk

تاثرات دیکھتے ہوئے اسے اس ''دلیری'' کی ہمت نہیں ہوئی۔ رستم نے پسٹل پھر اپنی چادر کے نیچے کیا اور لوڈر کے سامنے سے ہوتا ہوا دوسرے دروازے سے اندر آ گیا۔

''سیدھا چلو۔'' اس نے پسٹل باقاعدہ جبرو کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے کہا۔

اب جبرو بڑے دھیان سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والا خوف اب بڑھتے بڑھتے دہشت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ''کک..... کون ہو تم؟'' اس نے نہایت پُراندیش لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم اپنے باپ کو پہچان گئے ہو۔'' رستم اطمینان سے بولا اور گٹھڑی اپنے پاؤں کے قریب رکھ دی۔

ہیڈ کانسٹیبل جبرو کی حالت پتلی ہو گئی۔ یوں لگا کہ وہ ڈرائیونگ کے قابل ہی نہیں رہا ہے۔ رستم نے ایک بار پھر اسے سنگین طریقے سے دھمکایا تو اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

ڈھوک سے نکلتے ہی دشوار گزار ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ ڈھوک پیچھے رہ گئی تھی اور ڈھوک کی مہراں بھی۔ لوڈر اچھلتی کودتی آگے بڑھتی چلی گئی۔ جبرو ان راستوں کا شناور نظر آتا تھا۔ کئی جگہ یوں لگا کہ رستہ مسدود ہو گیا ہے مگر وہ آگے بڑھتا رہا۔ درحقیقت یہ راستے سخت جان جیپ یا گھوڑے، خچر وغیرہ پر ہی طے کئے جا سکتے تھے۔ سوزوکی لوڈر پر سفر طے کرنا ایسا ہی تھا جیسے شہر کی کسی کالجیٹ لڑکی کے سر پر پانی سے بھرے ہوئے دو گھڑے رکھ دیئے جائیں اور کولہے پر بچہ بٹھا دیا جائے۔

جبرو بالکل گم صم تھا۔ رستم کی باتوں کے جواب میں وہ بس ہوں ہاں ہی کر رہا تھا۔ رستم کے سوالوں کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ ہیڈ کانسٹیبل ہے اور اپنے انسپکٹر شاد کے حکم پر یہ گاڑی اپنے کیمپ تک لے کر جا رہا ہے۔ رستم نے پوچھا۔ ''یہ تیرے تھوبڑے کو کیا ہوا ہے؟''

وہ پہلے تو ہچکچایا پھر کہنے لگا۔ ''دستی بم کے چھینٹے پڑے تھے۔''

''دستی بم کے چھینٹے؟'' رستم نے تعجب سے پوچھا۔

جواب میں جبرو نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چند دن پہلے ڈپٹی ریاض کی قیادت میں جس پولیس پارٹی نے ان ٹیلوں میں رستم اور گوہرا کا پیچھا کیا تھا، ان میں یہ کانسٹیبل جبرو بھی شامل تھا۔ جب رستم نے پولیس کی زد سے نکلنے کے لئے دستی بم پھینکا تو اس سے متاثر ہونے والوں میں جبرو بھی تھا۔ اس کے چہرے پر دھات کے بہت باریک ٹکڑے اور بارود کے ذرے لگے تھے۔ اس دھماکے میں تین ہلاکتیں ہوئی تھیں جب کہ جبرو سمیت پانچ افراد زخمی ہوئے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

لوڈر نہایت دشوار راستوں پر چلتی رہی۔ اندھیرا ہونے کے بعد سفر مزید مشکل ہو گیا تھا۔ ہوا چلنے سے بادل بکھر گئے تھے اور کبھی کبھی بدلیوں کی اوٹ سے پوٹھوہار کا خوش نما چاند جھانکنے لگتا تھا۔ جبرو پر موت کا خوف طاری ہو چکا تھا۔ اسے بہت کم امید تھی کہ وہ زندہ بچ سکے گا..... وہ زندگی بچانے کے لئے ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔ رستم کے سوالوں کے جواب وہ فر فر دے رہا تھا اور گاہے بگاہے ان الفاظ میں رستم کی ساجت بھی کر رہا تھا۔ ''رستم صاحب! آپ تو وڈا جوڑ ہو۔ میں تو ایک معمولی ملازم ہوں۔ حکم کا بندہ ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

رستم نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارے اندازے کے مطابق وڈے ڈیرے کے آس پاس کل کتنی نفری ہو گی؟''

''میں آپ کو ٹھیک سے تو نہیں بتا سکتا جی۔ پر جب ہم یہاں آئے تھے تو تین بڑے ٹرکوں پر آئے تھے۔ ہم سے پہلے بھی یہ تین ٹرک ملازموں کا ایک پھیرا لگا چکے تھے۔ کچھ ملازم چھوٹی گاڑیوں پر بھی یہاں پہنچے تھے۔''

''یہاں بھاری اسلحہ کتنا ہو گا؟''

''جہاں تک مجھے پتا ہے جی، یہاں کم از کم آٹھ بڑی رائفلیں ہیں ٹیلی اسکوپ والی۔ اس کے علاوہ کچھ M642 ٹائپ کی گنیں ہیں۔ چھوٹا اسلحہ بھی کافی ہے۔ کچھ اسلحہ اجرالی بھی لے کر آئے ہیں۔''

''اجرالی لوگ یہاں کتنے ہوں گے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اجرالی زیادہ تر پانڈو والی سائیڈ پر ہیں۔ وہاں ستر اسّی بندوں کا جتھا ہے۔ اتنے ہی بندے اور ہیں جو ڈیرے کے آلے دوالے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ہر طرح سے پولیس کی مدد کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے ان سے بھاری انعام و اکرام کے وعدے بھی کر رکھے ہیں۔''

''ڈپٹی ریاض خود کس سائیڈ پر ہے؟''

''وہ گھومتے رہتے ہیں جی۔ گھوڑے پر کافی دور تک نکل جاتے ہیں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں تو روزانہ تیس چالیس میل سفر تو کرتے ہوں گے لیکن میرا خیال ہے کہ اب وہ پانڈو کی طرف ہوں گے۔''

''پانڈو کی طرف کیوں؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''ب..... بس یونہی میرا اندازہ سا ہے۔''

رستم سمجھ گیا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ پانڈو والی بات بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ وہ رستم کو اس سازش کے تانے بانے کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا جس کے مطابق لالہ اور اس کے ساتھیوں کو پانڈو کی طرف بلایا جا رہا تھا۔

کانسٹیبل جبرو کی اس چھوٹی سی ''ادا'' نے رستم کو سمجھا دیا کہ وہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ رستم نے اس سے پوچھا۔ ''پنواری کے گھر میں بالے کی بیوی شمشاد سے کیا ہوتا رہا ہے؟''

پہلے تو جبرو نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی لیکن جب رستم نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتایا بڑا اور چھوٹا صاحب شمشاد کے ساتھ سوتے رہے ہیں۔

''اور تم؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''نہیں جناب۔ ہم تو ملازم لوگ ہیں۔ ہماری تو اپنی عزت ان افسر لوگوں کی وجہ سے خطرے میں رہتی ہے۔ بات بات پر ہماری ماں بہن ایک کر دیتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے پنواری کے گھر میں تم نے کوئی حرام زدگی نہیں کی؟''

اس نے بڑی شدومد سے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تو جی وڈے صاحب (انسپکٹر) سے بالے کی سفارش کرتا رہا ہوں۔''

''کیسی سفارش؟''

''یہی کہ اس کے گھر والی واپس کر دیں۔ وہ زیادہ غریب بندہ تھا۔ پیسے نہیں دے سکتا تھا۔ اگر وہ چھوٹے صاحب کو دو ڈھائی ہزار کا انتظام بھی کر دیتا تو میں نے کوشش کر کے اس کی گھر والی کو گھر بھجوا دینا تھا۔''

رستم سن رہا تھا اور اس کا سینہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ یہ صرف ڈھوک شاہاں کی کہانی نہیں تھی، نہ ہی یہ صرف پنواری ڈاہرے اور سب انسپکٹر ناجے وغیرہ کی کہانی تھی۔ یہ ہر دور دراز پسماندہ بستی کی کہانی تھی۔ ہر پنواری، چوہدری اور بے ضمیر بالادست کی کہانی تھی۔ یہ کہانی ایک زہریلی بھیتی کی طرح تھی جس میں معاشرہ ظلم کے بیج بو کر ڈاکوؤں اور قانون شکنوں کی فصل کاٹتا تھا۔ ملنگی، بہرام، سلطانہ، جگا، محمد خان، چراغ بالی..... ایسے ہی درجنوں نام گنوائے جا سکتے تھے۔

جبرو نے رستم کو بتایا کہ انہیں قریباً دس کلومیٹر آگے ایک پولیس کیمپ تک جانا ہے۔ اس کیمپ سے آگے پیدل سفر ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیمپ سے دو اور افراد کو اس کا ہمسفر بننا ہے۔ ایک مقامی بندہ ملکا دین ہے اور دوسرا ایک خواندار اجمل خان ہے۔ ملکا علاقے کا بھیدی ہے

اور وہ شارٹ کٹ رستے استعمال کر کے انہیں چار پانچ گھنٹے میں ہی موقع پر پہنچا دے گا۔

رستم نے پوچھا۔ ''ملکا تمہیں جانتا ہے؟''

''نہیں جی لیکن میں اسے جانتا ہوں۔ میں پچھیں بندوں کے ایک جتھے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس جتھے کو ملکا ہی لے کر آیا تھا۔''

''اور حوالدار اجمل خان؟''

''مجھے اس کا پتا نہیں۔ اس بندے کو کسی خاص کام کے لئے افسروں نے حسن ابدال سے بلایا ہے۔''

رستم ہیڈ کانسٹیبل جبرو سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں ایک پلان بن رہا تھا۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ ایسی تاریک راتوں میں کسی کو ٹھیک سے شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل جبرو کا دو تہائی چہرہ سفید پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا قد کاٹھ بھی رستم سے ملتا جلتا تھا۔ جو کچھ رستم سوچ رہا تھا اس میں رسک ضرور تھا لیکن لالے وغیرہ تک جلد سے جلد پہنچنے کے لئے وہ ہر رسک لینے کو تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پروگرام کے مطابق نظام نے وائرلیس سیٹ میں خرابی پیدا کر دی ہوگی۔ لہٰذا آج پولیس کے لئے ممکن نہیں ہوا ہوگا کہ وہ وڈے ڈیرے پر لالے سے رابطہ کر سکیں لیکن کل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ جیسے بھی ہو آج رات کی صبح ہونے سے پہلے رستم اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچ جائے۔ یہ بڑی اہم رات تھی۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

جب وہ لوگ پولیس کیمپ سے چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر رہ گئے اور رستم کو دور ٹیلوں کے درمیان کیمپ کی دو تین ٹمٹماتی روشنیاں نظر آنے لگیں تو رستم نے جبرو کو لوڈر روکنے کے لئے کہا۔

''پیشاب کرنا ہے جی؟'' کانسٹیبل نے بڑی حلیمی سے دریافت کیا۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور نیچے اُتر آیا۔ دوسری طرف سے کانسٹیبل بھی اُترا اور لوڈر کے اگلے پہیوں کو چیک کرنے لگا۔ مسلسل ہچکولوں کے سبب پہیوں سے مدھم آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔

رستم کا موڈ عجیب ہو رہا تھا۔ اس نے پشمینہ چادر کے اندر سے نکال لیا۔ بدلیوں کی اوٹ سے نمودار ہونے والے چاند کی مدھم روشنی اردگرد کے ٹیلوں کو روشن کرنے لگی۔ پہیوں کا معائنہ کرنے کے بعد جبرو سیدھا ہوا اور تب اس کی نگاہ رستم کے پشمینہ پر پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''اپنا منہ گاڑی کی طرف کرو۔'' رستم نے اسے حکم دیا اور بیرل پر سائلنسر چڑھا لیا۔

''مم..... مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جناب؟'' وہ گھگھیایا۔

''تمہاری ساری زندگی ہی غلطی ہے۔ منہ دوسری طرف کرو۔'' رستم کے آخری الفاظ میں اتنی درندگی تھی کہ جبرو سرتاپا لرز گیا۔ اسے یہی لگا تھا کہ اگر اس نے تعمیل میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کی تو پسٹل کے بیرل سے شعلہ نکل پڑے گا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا رخ لوڈر کی طرف پھیر لیا۔ وہ شلوار قمیص اور سویٹر میں تھا، پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ اس کی دھلی دھلائی وردی لوڈر کی سیٹ پر رکھی تھی۔

وہ لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا مالک تھا لیکن موت کے خوف نے اسے لرزے کا بخار چڑھا دیا تھا۔ سیدھا کھڑا رہنے کے لئے اسے لوڈر کا سہارا لینا پڑا۔ ''سر جی! مم میری بات سنیں.....'' اس نے مڑ کر کچھ کہنا چاہا۔

رستم نے زوردار لات اس کی پیٹھ پر جمائی اور پسٹل کی سرد نال اس کی گردن میں دھنسا دی۔ ''سیدھے کھڑے رہو۔'' وہ پھنکارا۔

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ''کلمہ پڑھ لو، تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔'' رستم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ ایک بار پھر گھوما اور اس مرتبہ رستم نے سائلنسر لگے پسٹل سے فائر کیا۔ گولی جبرو کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ''اگلی بار گولی تین انچ نیچے سے گزرے گی۔'' رستم کا لہجہ بھیانک تھا۔ جبرو ایک بار پھر کانپ کر سیدھا ہو گیا۔ ''مم..... میں آپ کا بے دام کا غلام ہوں جی..... مم میں آپ کے پاؤں کی مٹی ہوں۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔ مم میں اس گندے محکمے کی نوکری ہی چھوڑ دوں گا۔ میں آپ کا وفادار نوکر بن جاؤں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے گولی نہ ماریں.....'' وہ ہذیانی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تیرے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے جبرو۔ سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ ایک لفظ بھی چھپا کر نہ رکھ۔ جب تیری کتی زبان سے سچ نکلے گا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا کہ تُو سچ بول رہا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تیرا محکمہ خراب نہیں ہے، تیرے جیسے ٹیٹیوں نے اسے خراب بنایا ہے۔ انسپکٹر شاد بھی تو تیرے محکمے سے ہے اور حاجی حیات کا نام بھی تُو نے بڑی اچھی طرح سنا ہوگا۔ سنا ہے کہ نہیں؟''

جبرو نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔

''چل شاباش اب سچ بول۔ کوئی ایک بات بھی غلط نہیں کہنی۔''

''پوچھو جناب..... پوچھو۔'' رستم کو اندازہ ہوا کہ وہ جان بچانے کے لئے سچ بولنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔

''پہلے یہ بتا کہ کتنے بچے ہیں تیرے؟''

''مم..... میری شادی ٹوٹ گئی تھی جی۔ ایک بچی تھی وہ ماں کے ساتھ ہی چلی گئی۔''

''تیرے منہ پر ہی حرام کاری لکھی ہوئی ہے۔ مجھے پتا ہے تُو کوٹھے پر جاتا ہے۔'' رستم نے یونہی اندھیرے میں تیر چلایا۔ ''میں نے تجھے دیکھا ہے لاہور کے شاہی محلے میں۔''

''بب..... بس کبھی کبھی جی..... اب نکاح کر لیا ہے میں نے۔''

''پٹواری کے گھر میں بالے کی بیوی کے ساتھ کتنی بار منہ کالا کیا تھا؟''

''بب..... بس..... ایک بار جی۔'' وہ تھوک نگل کر بہ مشکل بول پایا۔

''بالے سے دو ڈھائی ہزار روپیہ چھونے تھانیدار نے مانگا تھا یا تم نے؟ جھوٹ نہیں بولنا۔ بولو گے تو پھر تمہارا یہ ''پیو'' بولے گا اور تمہارے ناریل میں سوراخ کرے گا۔'' رستم کا اشارہ پسٹل کی طرف تھا۔

جبرو بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مم..... میں نے مانگا تھا جی۔ میں اپنی یہ غلطی بھی مانتا ہوں۔ میں گناہ گار ہوں جی۔ مجھ سے بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن اب نہیں ہوں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں بالکل بدل جاؤں گا۔ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ سب کچھ۔''

''مجھے پتا ہے تجھے چھمتر ولیا کہا جاتا ہے اور تُو ڈپٹی ریاض کے قریبی ماتحتوں میں سے ہے۔ ہے یا نہیں؟''

''ہوں جی..... ہوں جی۔'' وہ فر فر بول رہا تھا۔ اس کی زبان دہشت کے ''موبل آئل'' سے لتھڑی ہوئی تھی اور کہیں بھی اٹک نہیں رہی تھی۔

''آج تک کتنی چھمتر ولیس کی ہوں گی تم نے؟''

''ہزاروں کی ہیں..... بہت مارا ہے لوگوں کو۔''

''ان کو گندگی کھلائی ہے..... ان کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے منہ سے اپنی ماں بہن کو گالیاں دیں۔ ان کو ننگا کر کے گدھوں پر بٹھایا ہے۔'' رستم نے گویا جبرو کی بات مکمل کی۔

جبرو نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا رخ بدستور گاڑی کی طرف تھا۔

''اور اس کے علاوہ بھی لاچار لوگوں کے ساتھ وہ سب کچھ کیا ہے جو زبان پر لایا نہیں جا سکتا۔'' جبرو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم نے کہا۔ ”جبال عرف جبرو تم صرف ایک شخص نہیں ہو..... تم پوری ایک تاریخ ہو۔ اس تاریخ نے لوگوں کے جان مال کی حفاظت کرنے والے ایک پورے ادارے کو گندا کر رکھا ہے۔ تم ایک چھوٹے ملازم ہو لیکن تم اگر بڑے افسر بھی ہوتے تو یہی کچھ کرتے جو اب کر رہے ہو۔ بے شک تب تمہارے ہاتھ میں چھتر نہ ہوتا لیکن اپنے انداز میں لوگوں کی چھترول تم پھر بھی کر رہے ہوتے۔ اس لئے کہ تمہاری فطرت بد ہے۔ تمہارے منہ پر لکھا ہوا ہے کہ تم چیر پھاڑ کرنے والے جانور کی فطرت رکھتے ہو۔ زندگی میں محرومی کسی کو نہیں ملتی، پر تم جیسے گھٹیا اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں سے لیتے ہیں اور ایسا کرنا ان کا شغل بن جاتا ہے۔“

”میں سب مانتا ہوں جناب۔ آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کرتا لیکن اب میں وہ نہیں رہوں گا جو پہلے تھا۔“

رستم نے کہا۔ ”یہ تو بڑی پرانی بات ہے جبرو۔ جب تُو کسی شخص کو ننگا کر کے چھت سے الٹا لٹکاتا ہے اور اس پر ڈنڈے برساتا ہے تو وہ کیا کہتا ہے؟ یہ تو کبھی نہیں کہتا کہ میں پھر وہی کروں گا جو کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔ وہ تجھ سے معافیاں مانگتا ہے، تیرے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے اگلے پچھلوں کی توبہ لیکن تُو اسے چھوڑتا نہیں ہے۔ تجھے پتا ہوتا ہے کہ یہ سب زبانی کلامی باتیں ہیں اور چھترول کا کرشمہ ہیں اور تیرا اندازہ درست ہوتا ہے۔ تھانے کچہری کے چکر سے نکلنے کے بعد نوے فیصد مجرم وہی کرتے ہیں جو پہلے کرتے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں سر۔“ جبرو نے کہا۔ ”لیکن.....“

ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ رستم کا پسٹل والا ہاتھ بے پناہ شدت سے گھوما، وزنی پسٹل کی ضرب جبرو کی عین کنپٹی پر لگی۔ ضرب اتنی شدید اور چوٹ تلی تھی کہ جبرو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پتھریلی زمین پر جا گرا۔ اس کا سر دھپ کی آواز سے زمین پر لگا تھا۔

رستم نے تیزی کے ساتھ اس کے کپڑے اُتارے۔ پھر اس کے چہرے کی پٹیوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد انہیں بھی کھول دیا۔ اپنے کپڑے رستم نے جبرو کے جسم پر گھسیٹ دیئے۔ تب اس نے سائلنسر لگے پسٹل کو جبرو کی کنپٹی سے لگایا اور لبلبی دبا کر اس کی کھوپڑی اُڑا دی۔ گولی کے جھٹکے سے بے ہوش جبرو کا سر تیزی سے ایک طرف کو گیا۔ اس کا جسم ایک بار اینٹھا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس کی کنپٹی سے بہنے والا خون تیزی سے بھربھری مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ رستم نے اس کی لاش ایک قریبی گڑھے میں ٹھکانے لگائی اور پھر لوڈر کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا۔ لوڈر کے ڈیش بورڈ میں سے رستم کو ہیڈ کانسٹیبل جبال عرف جبرو کے شناختی

کاغذات اور کارڈ وغیرہ مل گئے۔ اس کے علاوہ ڈیش بورڈ میں ہی سے کچھ روئی بھی ملی۔

رستم نے لوڈر کی اندرونی روشنی جلائی اور عقب نما آئینے کے سامنے جبرو ہی کے انداز میں پٹی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ پرانی پٹی کے نیچے اس نے تازہ روئی رکھ لی تھی۔ اسے پندرہ بیس منٹ لگے تاہم وہ ہو بہو جبرو کی نقل اُتارنے میں کامیاب رہا۔ رستم کا دوتہائی چہرہ اور تقریباً پورا سر پٹی کی زد میں آچکا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اسے داج والی گٹھڑی کا خیال آیا۔ اس نے تھوڑی دیر سوچا پھر یہ گٹھڑی ایک طرف پتھروں میں رکھ دی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا..... سون کے کسی غریب چرواہے کی بیٹی کے لئے۔

☆======☆======☆

جبرو کی اطلاعات درست تھیں۔ رستم جب کیمپ میں پہنچا تو پورا کیمپ ہی سو رہا تھا..... صرف دو چار افراد بیدار تھے اور ان میں سے وہ دو تھے جنہیں جبرو کے ساتھ پاپیادہ آگے روانہ ہونا تھا۔ ان میں سے درمیانی عمر کا قدرے صحت مند شخص حوالدار اجمل خان تھا۔ وہ نسواری رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے سر پر گول چکیلی ٹوپی تھی۔ مقامی اجرائی شخص کلین شیو تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کا نام ملکاد ین معلوم ہوا۔ دونوں افراد کے سفری بیگ تیار تھے۔ یہ کمر پر رکھنے والے بیگ تھے۔ ایسا ہی ایک تیسرا بیگ رستم کے لئے بھی تیار رکھا تھا۔ درحقیقت یہ رستم کے لئے نہیں ہیڈ کانسٹیبل جبرو کے لئے تھا اور جبرو یہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور ایک گڑھے کے اندر ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس کیمپ میں تقریباً پانچ خیمے تھے۔ دو جیپیں بھی یہاں موجود تھیں۔ یہ پولیس جیپیں تھیں۔ وائرلیس سیٹ کے لئے اینٹینا ایک اونچے ٹیلے پر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک خیمہ دوسروں خیموں سے علیحدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر سرخ ہلال کا نشان تھا۔ مطلب تھا کہ یہ عارضی ہسپتال ہے۔ خیموں میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ تین خیمے بالکل تاریک تھے۔

”کیسے ہو جبرو؟“ ایک آواز نے رستم کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

رستم نے دیکھا یہ بھی ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ وہ اس وقت بھی وردی میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پہرے وغیرہ کی ڈیوٹی پر ہے۔

”ٹھیک ہوں۔“ رستم نے کراہتے ہوئے بہت مدھم اور ناک میں گنگناتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا جبڑا دبایا اور مخاطب پر ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ بولنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔

”اگر زیادہ تکلیف ہے تو آج کا دن یہاں آرام کر لے۔ کل بھی کچھ بندوں نے یہاں

www.pdfbooksfree.pk

سے ڈیرے کی طرف جانا ہے۔''

رستم نے نفی میں سر ہلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ ٹھیک ہے۔

''چائے وغیرہ پی لو۔'' کانسٹیبل نے ازراہِ ہمدردی کہا۔

رستم نے پھر نفی اور قدرے بے زاری سے سر ہلایا۔ جہاں اسے چائے کے لئے مدعو کیا جارہا تھا وہاں مدھم روشنی تھی۔ پہچانے جانے کا رسک نہ ہونے کے برابر تھا لیکن موجود تو تھا۔

ایک خیمے کے اندر کوئی عورت نیند کی حالت میں بُری طرح کھانس رہی تھی۔ پھر وہ کھانستے کھانستے ہی خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی اور ایک طرف بیٹھ کر قے کرنے لگی۔ خیمے کے اندر سے پھٹنے والی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ رستم کو نظر آیا۔ یہ وہی لیڈی ایلکارتھی جو اپنے دو ساتھیوں کی موت کے بعد موقع سے بھاگ نکلی تھی۔ رستم اسے با آسانی شوٹ کرسکتا تھا لیکن اس نے رائفل کا ٹرائیگر نہیں دبایا تھا۔ اب وہ یہاں اپنے ساتھیوں میں موجود تھی اور عین ممکن تھا کہ اپنے ساتھی ایلکاروں کو رستم سیال کے ساتھ اپنے دلیرانہ معرکے کے قصے سناتی ہو..... اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ رستم پر ڈالی اور اپنے اسکارف سے منہ پونچھتی ہوئی واپس خیمے میں چلی گئی۔

دس پندرہ منٹ تک کیمپ میں مزید رکنے کے بعد رستم اپنے دونوں ہمراہیوں کے ساتھ پیدل سفر پر روانہ ہوگیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کی ''رپیٹر'' رستم کے کندھے پر تھی۔ اس کا اپنا کولٹ پسٹل قمیص کے نیچے لگا ہوا تھا۔ سفری بیگ یعنی ''رک سیک'' رستم کی کمر پر تھا۔ بدلیوں میں ڈوبتے ابھرتے چاند کی روشنی میں تنگ گھاٹیوں کے درمیان ان کا دشوار گزار سفر شروع ہوا۔ گاہے بگاہے وہ راستہ دیکھنے کے لئے اپنی ٹارچیں بھی استعمال کرلیتے تھے۔ اجرالی ملکا دین آگے تھا۔ اس کے پیچھے حوالدار اور رستم تھے۔ حوالدار ایک باتونی شخص تھا۔ وہ مسلسل باتیں کررہا تھا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا اور (اجرالی ملکا نے بھی تصدیق کی) کہ حوالدار نہایت ماہر نشانے باز ہے اور نشانہ بازی کے مختلف مقابلوں میں پولیس کی طرف سے بہت سے تمغے حاصل کرچکا ہے۔

حوالدار اور اجرالی کی گفتگو میں بہت جلد رستم اور لالے وغیرہ کا تذکرہ بھی شروع ہوگیا۔ وہ دونوں وڈے ڈیرے کے مکینوں کو بُرے لفظوں میں یاد کرنے لگے۔ رستم ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور خود پر ضبط کرتا رہا۔ حوالدار اجمل خان پنجاب پولیس کے ایک انسپکٹر شجاع کا اپنا پرانا دوست بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ انسپکٹر شجاع سے خصوصی درخواست کرکے وڈے ڈیرے کی لڑائی میں شریک ہونے جارہا ہے۔ اپنی اس شدید خواہش کی جو وجہ حوالدار

نے ظاہر کی وہ رستم کے لئے مزید چونکا دینے والی تھی۔ اس وجہ کا تعلق بہروپیے پیر قدرت اللہ سے تھا۔

حوالدار نے جوش سے کہا۔ ''خو، اس ارامی (حرامی) لالے اور رستم نے امارے پیرو مرشد کے خلاف محاذ کھڑا کررکھا ہے۔ خاص طور سے رستم تو پیر صیب اور ان کی فیملی کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ام آپ کو کیا بتائے ملتان والے واقعے کے بعد سے امارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اس بدمعاش رستم نے ایسا ظلم کیا ہے کہ خدا کا خدائی کانپ گیا ہے۔ امارے پانچ پیر بھائی جان سے گئے ہیں اور سب سے بڑا قہر یہ ہوا کہ پیرو مرشد کا زوجہ امارے درمیان نہیں رہا ہے۔ کاش امارا اپنا خاندان ختم ہوجاتا۔ امارا بچہ بچہ کٹ مرتا لیکن پیرو مرشد کو اتنا بڑا دکھ نہ پہنچتا۔ ام نے قسم کھایا ہے کہ ان بدمعاشوں سے اس ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ اگر اس کام میں جان دینے کا ضرورت ہے تو بخدا ام سب سے آگے بڑھ کر جان دے گا۔'' حوالدار کے لہجے میں بجلی کڑک رہی تھی۔

اجرالی ملکا دین نے کہا۔ ''پیر قدرت اللہ کے بارے میں تو میں نے بھی بہت کچھ سنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایسی جونکیں ہیں جو جسم سے صرف بیمار خون نکالتی ہیں۔''

''خوچے! یہ تو بس ایک کرشمہ ہے۔ ازرت صیب (حضرت صاحب) کے پاس ایسا ایک سو ایک کرشمہ ہے۔ ایسا ایسا کرامات ہے ان کے پاس کہ عقل دنگ رہ جاتا ہے۔ ازرت صیب مہینے میں ایک بار امارے علاقے حسن ابدال میں تشریف لاتا ہے۔ ان سے ملنے والوں کا لائنیں لگ جاتا ہے۔ بہت زیادہ شفا ہے ان کے ہاتھ میں۔''

اجرالی ملکا نے ذرا دبی دبی آواز میں کہا۔ ''لیکن خان صاحب! ہم نے ایک اور بات بھی سنی تھی حضرت صاحب کے بارے میں۔''

''کیسا بات؟''

''سنا تھا کہ حضرت صاحب کی بی بی کو ڈاکوؤں نے زخمی کردیا تھا۔ وہ گر کر بے ہوش ہوگئی تھی لیکن حضرت صاحب اپنے روحانی طریقے سے اسے ہوش میں نہیں لاسکے تھے حالانکہ.....''

''او یہ سب کہنے سننے کا باتیں ہیں۔'' حوالدار اجمل نے غصے سے ملکا کی بات کاٹی۔ ''ازرت صیب کے مخالب ایسی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ ازرت صیب کا بی بی بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ گولی لگنے کے بعد پورا ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ ام کو امارے پیر بھائی قربان علی نے خود بتایا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

اجرالی نے کہا۔ ''کچھ بھی ہے جی لیکن وہاں ہوا ظلم ہے۔ وہ تو سنا ہے کہ رستم کو چاہنے والی کسی لڑکی نے آکر رستم کا ہاتھ روک لیا، نہیں تو رستم نے پیر صاحب کی دوسری بیوی کو بھی مار چھوڑنا تھا۔ پتا نہیں کیا نام ہے اس لڑکی کا.....''

''بی بی کہتے ہیں۔'' حوالدار اجمل نے کہا۔ ''لیکن اماری سمجھ میں تو وہ بھی دوغلا عورت ہے۔ اس کا کیا پتا کہ اندر سے وہ اب بھی رستم کے ساتھ ہی ہو۔ ویسے تو وہ بڑا سماجی کارکن بنتا ہے لیکن خوچہ تم کو مالوم ہی ہوگا کہ یہ عشق ماشوقی کا چکر اتنی جلدی ختم نہیں ہوتا۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ بی بی پکا پکا ماشوق تھا رستم کا۔ ایک گاؤں کے میلے میں اس نے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ اس خبیث کو بھی ڈالا تھا، اس کے حصے کا لاٹھی بھی اپنی پیٹھ پر کھایا تھا.....''

یہ گفتگو اب رستم کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ جی تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ اس چرب زبان حوالدار کی گردن توڑ کر اسے نیچے کھڈ میں پھینک دے لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ فی الوقت کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گفتگو کا رخ موڑ دے۔

''اندازاً کتنا سفر رہ گیا ہے؟'' رستم نے ملکا سے پوچھا۔

''امید ہے کہ فجر سے پہلے پہنچ جائیں گے لیکن کوئی پتا نہیں کہ وہاں سے پھر آگے روانہ کردیا جائے۔''

''آگے کہاں؟''

''تمہیں انسپکٹر شاد نے نہیں بتایا تھا..... زیادہ نفری کو آج سویرے پانڈو درے کی طرف چلے جانا ہے۔ لگتا ہے کہ وہیں پر اصل لڑائی ہونے والی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ لالہ اور اس کے ساتھی پانڈو درے کی طرف چلے جائیں گے؟''

''لگتا ہے کہ وہ یہی غلطی کررہے ہیں لیکن یہ غلطی ہمارے لئے بڑی فائدہ مند ہے۔ دعا کرو کہ وہ یہ غلطی کرگزریں۔'' ملکا نے کہا۔

''اماراتو بس ایک ہی دعا ہے۔'' حوالدار نے نسوار کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ لڑائی جہاں بھی ہو لیکن اس میں اماراسامنا اس ارامی لالے اور رستم سے ضرور ہو۔ خدا قسم ان دونوں کو دیکھ کر ایک میل سے بھی گولی چلائے گا تو دونوں آنکھوں کے بالکل درمیان میں لگے گا۔ ناپ کر دیکھ لینا ایک ملی کا فرق نہیں ہوگا۔''

ملکا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن رستم تو ڈیرے سے نکل چکا ہے۔ اب وہ واپس اس آگ میں کہاں کودے گا؟''

''تم پولیس میں نہیں ہو اس لئے ایسا بات کررہے ہو۔ ام ان ڈکیت لوگوں کو تم سے

زیادہ جانتا ہے اور جس طرح کا یہ بندہ رستم ہے، ام کو تو پورا یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے گا۔ یہ باغی لوگ ایسا ہی کریک ہوتا ہے اور سچ پوچھو تو ان کے کریک ہونے میں ہی ان کا شان ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا جمرو؟'' حوالدار نے رستم سے تصدیق چاہی۔

رستم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

حوالدار اجمل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ام اس کو چھوڑے گا نہیں ملکا۔ ام نے قسم کھارکھا ہے اس سے اپنے پیر و مرشد کا بدلہ ضرور چکائے گا۔ اگر وہ یہاں نہیں ملے گا تو ام اس کو کسی اور جگہ ڈھونڈ لے گا۔''

رات پچھلے پہر وہ تینوں ستانے کے لئے ایک ٹیلے پر رک گئے۔ ہوا میں خنکی تھی، بٹھوہار کا چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور اس کی کرنیں نشیب و فراز کو روشن کررہی تھیں۔ ایک چکور دل گداز صدا میں پکارتا ہوا ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ وہ چاند کا راہی تھا اور چاند اس سے بہت دور تھا۔ وہ بے چارا ساری زندگی بھی اُڑتا رہتا تو اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس کی پرواز بے سود اور اس کی سعی لاحاصل تھی۔ اس کا نصیبا یہی تھا کہ وہ اُڑتے اُڑتے ہانپ کر گرے اور مرجائے۔ سو وہ جتنی جلدی مرجاتا اس کے لئے اتنا ہی اچھا تھا۔ ہاں جب چاند تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو پھر اس کی چاہ میں ہانپ ہانپ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔ رستم کو لگا کہ بی بی بھی ایک چاند ہی ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر۔ ایک تاب دار جسم جس سے نور کی ٹھنڈی کرنیں برستی ہیں اور اپنے اردگرد موجود لوگوں کو سرشار کرتی ہیں اور وہ خود..... گناہ اور جرم کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا ایک قابلِ نفرت شخص جس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہے اور تختہ دار کسی بھی وقت اس کے پاؤں تلے سے نکالا جاسکتا ہے۔ رستم جب اس انداز سے سوچتا تھا تو اس کا دل گواہی دینے لگتا تھا کہ وہ جس راہ پر جارہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ پیار صرف پالینے کا نام ہی تو نہیں ہوتا۔ جدائی کے چناب کے دونوں کناروں پر رہ کر بھی تو پیار کیا جاتا ہے اور یہ بھی تو ضروری نہیں ہوتا کہ اس کہانی کو اختتام تک پہنچانے کے لئے دونوں کناروں پر رہنے والے دونوں مکین لہروں کی نذر ہوں۔ کسی ایک مکین کے لہروں میں کودنے سے بھی تو کہانی ختم ہوسکتی ہے اور رستم ان لہروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے بڑی اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ بی بی کی زندگی کا رخ کس طرف ہے۔ بھابو مقبول کے بیمار بچے میں اس کی جان تھی اور وہ بچہ بھی شافی کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ بی بی شافی کے اردگرد کے دیگر حالات بھی اسے مجبور کرتے تھے کہ وہ انسانوں کے اس پُرخطر جنگل میں محفوظ پناہ حاصل کرنے کے لئے چوہدری بشیر کی حفاظت میں چلی جائے۔ چوہدری بشیر کی بیوی بننے کے بعد

www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنے اردگرد کے حالات کو سدھارنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ بی بی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی نیک نام ماں وڈی آپا کی طرح لوگوں کے دل میں بسیرا کرے۔ ان کے مسائل کے حل کے لئے اور ان کی زندگیوں کو سدھارنے کے لئے اپنا آپ وقف کر دے اور وہ ایسا کر سکتی تھی۔ قدرت نے اسے دوسروں سے جدا پیدا کیا تھا۔ اس میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اگر اسے چوہدری بشیر جیسا مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا میسر آ جاتا تو وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔

رستم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا۔ بی بی ایک بہت اونچی مسند پر بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ اسے عقیدت اور محبت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اپنے مسائل بیان کر رہے تھے۔ اپنے معاملات کے لئے اس سے رائے طلب کر رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان مسکرا رہی تھی۔ اپنے نور کی کرنیں ان پر نچھاور کر رہی تھی۔ پھر رستم کے تصور نے اسے جوہر آباد کے ہسپتال کا منظر دکھایا۔ خستہ حال عمارت کی جگہ ایک بڑی عمارت کھڑی ہو چکی تھی۔ بی بی اس شاندار ہسپتال کا افتتاح کر رہی تھی۔ اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق علاقے کے لوگوں کے لئے صحت مند زندگی کا نیا راستہ کھول رہی تھی۔ چوہدری بشیر اس کے ساتھ تھا۔ ایک بہت بڑے پُرجوش ہجوم نے بی بی کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ پھر رستم نے اپنی بی بی کو ایک بہت بڑی پنچایت میں دیکھا۔ علاقے کے معززین اس کے سامنے مؤدب بیٹھے تھے۔ اس کے پُرشباب چہرے پر دانا لوگوں کا سا ٹھہراؤ تھا۔ وہ لوگوں کے فیصلے کر رہی تھی، ان کے معاملات سلجھا رہی تھی۔ اپنے تصور میں وہ رستم کو اتنی پیاری لگی کہ اس کا دل چاہا اپنی آنکھیں بند کر لے اور زندگی کی آخری سانس تک بند رکھے..... ہاں زندگی، سب کچھ حاصل کر لینے کا نام ہی تو نہیں ہے اور رستم نے دھیرے دھیرے اپنے دل و دماغ کو تلخ ترین حقیقتوں کے لئے قائل کر لیا تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر دل ہی دل میں کہا۔

''کوئی شکوہ نہیں بی بی..... کوئی شکوہ نہیں..... جیسے آپ خوش ویسے میں خوش۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چند قدم چل کر کھائی کے کنارے پر پہنچ گیا۔ نیچے نیم تاریکی میں سے دو گیدڑ چلاتے ہوئے گزرے اور ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ رستم نے دور شمال مغرب کی طرف دیکھا۔ وڈاڈیرہ اب زیادہ دور نہیں تھا اور وہاں رستم کے سنگی ساتھی تھے۔ جن کے ساتھ اس نے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور وہ سب بھوکے پیاسے موت کے گھیرے میں تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے حوالدار اجمل نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جذبے ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں۔ ہاں یہ زندگی کو نفع نقصان کے ترازو پر نہیں تولتے۔ یہ بغیر حساب سب

کچھ لٹا دیتے ہیں۔ یہ ننگے پاؤں انگاروں پر چلتے ہیں۔ یہ عین بہار میں صحراؤں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ کچے گھڑوں پر بپھرے چناب میں کود تے ہیں۔

رستم نے سفید پٹی کے اندر سے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی کے بالوں کو سہلایا اور زیر لب بڑبڑایا۔ ''میں آ رہا ہوں لالے.....''

قریباً تین گھنٹے بعد وہ تینوں وڈے ڈیرے کے نواح میں تھے۔ آج سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے تک پولیس یا کوئی دوسری ایجنسی یہاں تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اب یہاں نہ صرف پولیس موجود تھی بلکہ انہوں نے اچھی جگہوں پر پوزیشن بھی لے رکھی تھی۔ رستم کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے امید تھی کہ شاید یہاں پر ڈپٹی ریاض سے ملاقات ہو سکے۔

ڈیرہ قریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پانی کی بلند و بالا ٹینکی نظر آ رہی تھی اس کے علاوہ تینوں سرنگوں کے دہانوں پر جلتی مشعلیں بھی اپنی روشنی ظاہر کر رہی تھیں۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ ''خونچے تھوڑا سا خوش ہو جاؤ۔'' حوالدار اجمل نے کہا۔ ''ام کو لگتا ہے کہ ام کو آرام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ ڈپٹی صیب اپنے جتھے کے ساتھ پانڈو کی طرف جا چکا ہے۔ اب ام کو شاید دوپہر کے بعد بھیجا جائے گا۔''

رستم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ پولیس کی پوزیشنوں پر زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔ ایک جگہ عینک والے ایک انسپکٹر صاحب نے ان کے کاغذات وغیرہ چیک کئے اور انہیں ایک چھولداری میں بھیج دیا گیا۔ انہیں آرام کرنے کا کہا گیا لیکن رستم کی قسمت میں آرام کہاں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رات کے اس آخری پہر کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اگر گمراہ کن وائرلیس پیغام کے مطابق وڈے ڈیرے کے لوگ بارودی سرنگوں کے حصار سے نکل کر پانڈو درے کی طرف چلے گئے تو پھر ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچے۔ بے حد ضروری تھا کہ انہیں اس خوفناک سازش سے بچانے کے لئے ان تک فوری رسائی حاصل کی جائے۔

چھولداری میں نمدہ بچھا تھا اور لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ اجرالی ملکا اور اجمل نیم دراز ہوتے ہی اونگھنے لگے۔ بظاہر رستم بھی لیٹا رہا تھا وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ وقت ڈیرے کی طرف جانے کے لئے موزوں ترین ہے۔ چاند مغربی افق پر جھک چکا تھا۔ کچھ بڑی بدلیاں دھیرے دھیرے تیرتی ہوئی چاند کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں قرب و جوار پھر تاریکی میں ڈوبنے والے تھے۔ رستم نے رپیٹر چیک کرنے کے بعد اپنے پسٹل کو ٹٹولا۔ سامان میں سے ایک ٹارچ نکال لی اور جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ اپنا بھاری بھرکم سفری تھیلا اس نے چھولداری کے اندر ہی رہنے دیا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ وہ ٹہلنے والے انداز میں چھولداری سے باہر نکل آیا۔ کچھ دور کینوس کے ایک سائبان تلے ایک چوکس سنتری موجود تھا۔ اس کے پاس ایک لالٹین رکھی تھی اور مونگ پھلی کے چھلکوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ایک جرمن ساخت ایل ایم جی اس کے سامنے تھی۔

رستم سنتری کے سامنے سے گزر کر آہستہ آہستہ وڈے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگا۔ سنتری کچھ دیر تو خاموش رہا پھر پکار کر بولا۔ ''کدھر جا رہے ہو بھائی۔ آگے نہیں جانا۔''

رستم سنی اَن سنی کر کے چلتا رہا۔ سنتری نے پھر پکار کر کہا۔ ''آگے نہیں جاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔''

رستم ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہونے کے سبب کچھ دیر کے لئے سنتری کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جب وہ دوبارہ سنتری کی نگاہ کی رینج میں آیا تو سنتری کی آواز کے ساتھ ایک اور پریشان آواز بھی شامل ہو چکی تھی۔ یہ دونوں افراد پکارے۔ ''رک جاؤ.....رک جاؤ۔''

رستم رکنے کے لئے نہیں چلا تھا۔ وہ نیچے جھک گیا اور دوڑنے لگا۔ شاید اب سنتریوں کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے دو فائر کئے۔ تاہم رستم کو صاف پتا چلا کہ یہ ہوائی فائر ہیں۔ وہ اب خاصی دوری پر آ چکا تھا۔ یکا یک اس نے پوری رفتار سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے عقب میں بہت سی آوازیں گونجیں، اس کے ساتھ ہی کئی ٹارچیں بھی روشن ہو گئیں۔ تاہم رستم جانتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ رستم کو زیادہ خطرہ سامنے سے تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ ڈیرے میں موجود اس کے ساتھی اسے اپنی جانب آتا دیکھتے اور پولیس کا کوئی مہم جُو سمجھ کر گولی چلا دیتے۔ رستم تقریباً دو سو میٹر مزید بھاگا اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، سامنے سے گولی چنگاری سی چھوڑتی ہوئی رستم کے آس پاس سے گزری۔ اس کے ساتھ ہی عقب میں دو بڑی بڑی سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ یہ لائٹس پولیس کے سنتریوں نے روشن کی تھیں۔ تاہم رستم اب ان لائٹس کی زد سے دور نکل آیا تھا پھر سامنے سے دور مار رائفل کا ایک اور فائر ہوا۔ رستم حتی الامکان حد تک نیچے جھک گیا اور آگے بڑھتے ہوئے مزید احتیاط کرنے لگا۔ فرید، حسنے اور مراد وغیرہ کو یہ بتانے کے لئے کہ وہ دشمن نہیں دوست ہے، اس کے پاس ایک ذریعہ موجود تھا۔ یہ ٹارچ تھی۔ وہ اس ٹارچ کو خاص انداز میں پانچ بار جلا بجھا کر ان تک اپنا پیغام پہنچا سکتا تھا۔

اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ لے کر ٹارچ والا ہاتھ اس طرح بلند کیا کہ وہ خود فائر سے محفوظ رہے لیکن ٹارچ کی روشنی ڈیرے تک پہنچ جائے۔ یکا یک رستم کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ کوئی اس کے عقب میں موجود ہے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے

ہرگز توقع نہیں تھی کہ کوئی پولیس والا اس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈالے گا اور بائیسکل چھوڑ کر رستم کے پیچھے بھاگا آئے گا۔ پولیس والے کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رُخ سیدھا رستم کی پیشانی کی طرف تھا۔ پستول تھامے جانے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ اگر لبلبی دبائی گئی تو گولی رستم کی عین پیشانی پر لگے گی۔ رستم نے پہچان لیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ یہاں پہنچنے والا حوالدار اجمل خان تھا اور اجمل خان کا نشانہ خطا نہیں جاتا تھا۔

اجمل خان سنگین لہجے میں پھنکارا۔ ''اوئے، یہ ٹارچ نیچے رکھو اور دونوں ہاتھ کھڑا کرو۔''

رستم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ حوالدار اجمل نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔ ''ام کو تم پر پہلے ہی شک تھا۔ سچ بتاؤ، کون ہو تم؟ کیوں بھاگے ہو اس طرح؟'' وہ ہانپ رہا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' رستم نے بھی ہانپتے ہوئے آواز میں پوچھا۔

''ہمارا خیال ہے تم پولیس ملازم نہیں ہو، لالے اور رستم کے ساتھی ہو۔''

''اگر.....ایسا ہے تو پھر؟''

''ام کو بتاؤ کہ ایسا ہے یا نہیں؟'' اجمل خان کا لہجہ عجیب تھا۔ اس لہجے میں بے حد عجلت تھی۔ تین چار گولیاں چلنے کے بعد دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ پولیس والے اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈیرے سے بھی جواب آ رہا تھا۔ وہ دونوں ٹیلے کی اوٹ میں تھے اور چنگاریاں سی اڑتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ دھماکوں نے رات کی خاموشی کا شیشہ چکنا چُور کر ڈالا تھا۔ حوالدار اجمل خان نے سنسنی خیز لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ ''خو، تم چپ کیوں ہو، ام کو بتاؤ کہ تم لالے کے ساتھی ہو؟''

''ہاں ہوں۔'' رستم نے کہا۔

حسن ابدال کے ماہر ترین نشانہ باز نے اپنا پستول واسکٹ میں ڈال لیا اور بولا۔ ''ام تمہارے ساتھ جائے گا۔ چلو جلدی کرو، وہ لوگ ہمارے پیچھے نہ آ جائے۔''

اب ٹارچ سے پیغام رسانی کا وقت نہیں رہا تھا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس فائرنگ کی آڑ میں پولیس اہلکار کسی بھی لمحے ان کے پیچھے آ سکتے تھے۔ رستم نے بڑے دھیان سے حوالدار اجمل کو سرتاپا دیکھا پھر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''خو، کیا بات ہے؟''

''میرے ساتھ جانا ہے تو اپنا پستول مجھے دے دو۔'' رستم کے لہجے میں ہلکی سی الجھن بھی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

حوالدار نے دو سیکنڈ کے لئے سوچا پھر پستول واسکٹ سے نکال کر رستم کو تھما دیا۔ اپنے سر کو پچھلے ہوئے سیسے کی مار سے بچانے کے لئے دونوں جھک گئے اور اسی حالت میں دوڑتے ہوئے ڈیرے کی سمت بڑھنے لگے۔ پوٹھوہار اپنی تاریخ دہرا رہا تھا۔ کچھ لوگ وادی سون میں بھاگ رہے تھے اور کچھ ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ آج کی رات فرق یہ تھا کہ بھاگنے والے پولیس کا گھیراؤ توڑ نہیں رہے تھے۔ اس ''گھیرنے'' میں داخل ہو رہے تھے۔

☆======☆======☆

راجو اور کوکی کی منگنی کے بعد شانی کو اب جوہر آباد واپس جانا تھا۔ کوکی دیر تک شانی کے گلے لگی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے شانی کے کان میں سرگوشی کی۔ ''آپ نے مجھے بے موت مرنے سے بچا لیا ہے۔''

شانی نے اس کی کمر تھپکی اور سر چوم کر خود سے جدا کر دیا۔ اسے اور عارف کو گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ حالات کی یہ کیسی ''کایا پلٹ'' تھی کہ وہ دونوں تاؤ حشام کے ساتھ ہی واپس جا رہے تھے۔ چند ماہ پہلے تک تاؤ حشام شانی اور عارف سے بات تک کرنے کا روادار نہیں تھا لیکن اب وہ شانی اور عارف کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کی گاڑی میں ہی گوجرانوالہ اور پھر میانہ تک کا سفر کریں اور اس کی اس دعوت میں کوئی ہیر پھیر نہیں تھا۔ تاؤ حشام ایک بے حد جہاندیدہ اور خانٹ شخص کا نام تھا۔ وہ بڑی اچھی طرح جان چکا تھا کہ شانی نے رستم سے اس کی اور راجو کی جان بچا کر ایک ایسا کام کیا ہے جو شاید ہی رُوئے زمین پر کوئی اور کر سکتا۔ تاؤ حشام نے رستم پر تم کے پہاڑ توڑے تھے اور اس کے قریبی دوست آفندی کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ جواب میں رستم اسے اور راجو کو اٹھا کر وادی سون کی گہرائی میں لے گیا تھا۔ تاؤ جان گیا تھا کہ اب ان باپ بیٹے کی لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی..... لیکن پھر شانی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہی شانی جس کو ذلیل و رسوا کرنے میں تاؤ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ شانی نے تاؤ حشام، راجو اور ان کی موت کے درمیان ایک آہنی دیوار کا کام کیا تھا۔ وہ باپ بیٹے کو موت کے جبڑوں سے نہیں بلکہ موت کے حلق سے نکال کر لائی تھی اور اب یہ دوسرا ناقابلِ فراموش احسان تھا جو شانی کی طرف تاؤ حشام کے خانوادے پر ہوا تھا۔ شانی نے ایک بار پھر تاؤ کی سب سے چہیتی اولاد یعنی راجو کی زندگی بچائی تھی۔ اس نے بے لوث بھاگ دوڑ کی اور بالآخر ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سے امید کی روشن کرنیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

تاؤ حشام ایک اڑیل شخص کا نام تھا لیکن راجو اور بابر کی مسلسل کوششوں سے وہ آمادہ

ہو گیا تھا کہ شانی کو اپنی زبان سے اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دے۔ وہ ملی الصبح 86 ماڈل کی ٹویوٹا کار میں ملتان سے روانہ ہوئے۔ اس گاڑی میں شانی اور عارف کے علاوہ راجو بھی تھا۔ تاؤ حشام دوسری گاڑی میں تھا۔ ابھی وہ لاہور سے قریباً سو میل دور ساہیوال کے آس پاس تھے کہ شانی کو موبائل پر چوہدری بشیر کا پیغام موصول ہوا۔ یہ موبائل سیٹ چوہدری بشیر نے ہی شانی کو فراہم کیا تھا۔ پیغام کے مطابق آج صبح مُنے کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی اور وہ بخار کی حالت میں ہذیان بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شانی کو بڑی شدت سے یاد کر رہا ہے۔

شانی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ چوہدری بشیر جھوٹ بول رہا ہے یا واقعی مُنے کی طبیعت زیادہ خراب ہے لیکن ایک بات واضح تھی کہ وہ اب اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکے گی۔ اسے لاہور میں رکنا پڑے گا۔ (بشیر اور مُنا دو دن پہلے ملتان سے لاہور پہنچ چکے تھے) مُنے کی محبت نے شانی کے پاؤں زنجیر میں جکڑ لئے تھے۔ اپنی مرحومہ بھابو سے کیا ہوا وعدہ اب شانی کے لئے ایک ایسی شفقت بھری محبت میں تبدیل ہو چکا تھا جس سے نگاہ چرانا شانی کے لئے ممکن ہی نہیں رہا تھا اور اب تو مُنے کے علاوہ شانی کے پاؤں میں اور بھی کئی ایسی زنجیریں پڑ گئی تھیں جن کا دوسرا سرا صرف اور صرف چوہدری بشیر کے ہاتھ میں تھا۔

چوہدری بشیر کے بارے میں سوچا تو شانی کے کانوں میں پھر وہی الفاظ گونجنے لگے جنہوں نے چند دن پہلے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔ چوہدری بشیر کے لہجے میں اسی سپ گندل کا زہر تھا جو کبھی چوہدری کے دادا مہر جی کے لہجے میں ظاہر ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے جنونی لہجے میں کہا تھا کہ اب اگر اس کی مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو وہ مُنے سمیت بہت کچھ ختم کر ڈالے گا۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شانی کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ اب اسے چوہدری بشیر کے پاس جاتے ہوئے ڈر آتا تھا لیکن اس کے پاس جائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ زنجیروں کے سرے اس کے ہاتھ میں تھے۔ نہ جانے پچھلے چند دنوں سے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس کا شوہر..... اس کا سچ مچ کا شوہر چوہدری فاخر پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور اسے پھر سے آزمائش کی بھٹی میں جھونکنے والا ہے..... چوہدری فاخر، چوہدری بشیر کی شکل میں اس کے سامنے ظاہر ہو رہا تھا۔

ایک جگہ پر پٹرول لینے کے لئے کار رکی تو شانی اور عارف باہر نکل آئے۔ عارف نے کہا۔ ''کیا ہوا شانی بہن! تم کچھ گم صم ہو گئی ہو؟''

www.pdfbooksfree.pk

''عارف! مجھے شاید ایک دن کے لئے لاہور میں رکنا پڑے گا۔ تم راجو کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں ان شاء اللہ کل لاہور سے نکل پڑوں گی۔''

''میرا خیال ہے تمہیں چوہدری بشیر کی طرف جانا ہوگا۔'' عارف نے قیافہ لگایا۔

''ہاں یہی بات ہے۔ چھوٹے کی طبیعت پھر خراب ہے۔''

''شانی بہن! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ چوہدری مُنے کی بیماری کے ذریعے تمہیں بلیک میل کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مُنا تمہاری کمزوری ہے اور.....''

''جو کچھ بھی ہے عارف! مجھے لاہور میں رکنا ہی پڑے گا۔''

''دیکھو شانی، میں تمہارے ساتھ آیا تھا اور تمہیں ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔''

''لیکن.....''

''میں ہوٹل میں رہ لوں گا۔'' عارف کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

لاہور میں شانی اور عارف باقی قافلے سے علیحدہ ہو گئے۔ شانی نے تاؤ حشام اور راجو کو بتایا کہ اسے اپنے ذاتی کام سے ایک دن کے لئے لاہور میں رکنا پڑ رہا ہے۔

پروگرام کے مطابق عارف راوی روڈ پر ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا جب کہ شانی لاہور کے مضافات میں چوہدری بشیر کی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ یہ وسیع و عریض کوٹھی ٹیکسٹائل مل سے اونچی تھی۔ اس کوٹھی اور یہاں کی ایکسی سے شانی کی بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ وہ کئی ہفتے تک یہاں کی ایکسی میں قید رہی تھی۔ یہیں پر چوہدری بشیر نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے۔ یہیں پر بھابو نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں اور اپنے مُنے کو شانی کے سپرد کیا تھا۔ یہیں پر شانی نے قدرت اللہ کی دو بیویوں کی پٹائی کی تھی اور نتیجے میں اسے چوہدریوں کے شدید غم و غصہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ٹیکسی سے اُتر کر شانی کوٹھی میں داخل ہوئی تو اس کے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ وہی اونچی دیواریں، وہی پہرے داروں کی طرح ساکت کھڑے سرو اور سفیدے کے لانبے درخت، وہی پُر ہول خاموشی جو وسیع رہائشی عمارتوں کا خاصا ہوتی ہے۔

شانی کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ ایک موٹر سائیکل سوار تھا جو مینار پاکستان کے پاس سے شانی کی ٹیکسی کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ کبھی آگے نکل جاتا تھا کبھی پیچھے رہ جاتا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی تھی اور بال لمبے تھے۔ شانی نے اس بٹے کٹے شخص کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کا گہرا تاثر دیکھا تھا۔ جب شانی چوہدری بشیر کی کوٹھی میں داخل ہوئی، یہ شخص گیٹ سے کچھ دوری پر رک گیا اور پھر واپس چلا

گیا۔ نہ جانے کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ اس شخص کا تعلق پیر قدرت اللہ والے معاملے سے ہے۔ کوٹھی کی چار دیواری میں آ جانے کے بعد شانی نے اطمینان کی سانس لی لیکن یہ خالص اطمینان نہیں تھا..... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اب اس چار دیواری کے اندر اور طرح کے اندیشے شانی کے زُد پر تھے۔

شانی ایک لمبی چادر میں تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ وہ رہائشی حصے کی طرف آئی تو اس نے گراسی لان میں مُنے کو انگریز بچے کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے شانی نے ملتان میں شرابی ریچھ کی دست برد سے بچایا تھا۔

مُنے کو کھیلتے دیکھ کر شانی کو جہاں اطمینان ہوا، وہاں ایک نئی طرح کی پریشانی بھی محسوس ہوئی۔ چوہدری بشیر نے مُنے کے حوالے سے درست اطلاع نہیں دی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اب اوچھے ہتھکنڈوں پر آ گیا ہے۔ شانی کو اپنے پاس بلانے کے لئے اس نے مُنے کی بیماری کا حیلہ بنایا تھا۔

مُنے نے شانی کو دیکھ لیا تھا، وہ دوڑتا ہوا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس کے انداز میں اتنا جوش تھا کہ شانی گرتے گرتے بچی۔ شانی نے اسے اٹھایا اور پیار کیا۔ اس کا جسم تھوڑا سا گرم تھا۔ غالباً ہلکا پھلکا بخار ہوا تھا۔ مُنے کو چومنے چاٹنے کے بعد شانی نے انگریز بچے کو گود میں لیا۔ اس دوران میں بچے کی انگریز والدہ مسز گریس بھی پہنچ گئیں۔ وہ شانی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور ہمیشہ ہی ہوتی تھی۔ شانی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ممنونیت کا ایک عجیب تاثر ابھر آتا تھا۔ شانی کو لگتا تھا جیسے گریس کی آنکھوں سے تشکر کے جذبات ایک پھوار کی طرح نکل رہے ہیں اور اس پر برس رہے ہیں۔ اس کے علاوہ گریس کی آنکھوں میں دیکھ کر شانی کچھ کھو سی جاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ گریس کی آنکھیں اس کی اپنی نہیں ہیں۔ یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں اور وہ ان آنکھوں کو پہلے سے جانتی ہے۔ گریس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی شانی کی۔

رسمی باتوں کے بعد شانی نے مُنے سے پوچھا۔ ''آپ کے ابو کدھر ہیں؟''

''کمبلے میں ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔'' وہ توتلی زبان میں بولا۔

شانی گریس سے اجازت لے کر مُنے کے ساتھ اندر آ گئی۔ چند بلند و بالا محرابی دروازوں سے گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک قالین پوش لاؤنج میں پہنچے۔ چوہدری بشیر یہاں پھیل کر ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور جہازی سائز کے ٹی وی سیٹ پر کوئی انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔ سامنے شیشے کی بیش قیمت تپائی پر سگریٹ اور وہسکی رکھی تھی۔ کمرے میں حسب معمول

www.pdfbooksfree.pk

الکحل کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ شانی نے سلام کیا۔ چوہدری نے سرد نگاہوں سے شانی کو دیکھا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا۔ ''بڑی دیر لگائی تم نے آتے آتے۔''

''جب آپ کا فون ملا ہم ساہیوال کے قریب تھے۔ راستے میں بس کھانا کھانے کے لئے رکے تھے۔''

''وہ تمہارا کمبوہ بھائی کدھر ہے؟''

''وہ..... وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ دراصل اسے بھی یہاں کچھ کام تھا۔''

چوہدری بشیر نے ایسی نظروں سے شانی کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، میں اتنا بے وقوف نہیں کہ تمہاری بات پر یقین کرلوں۔ تاہم یہ بات اس نے زبان سے نہیں کہی۔ سگریٹ کا ایک اور کش لے کر وہ بولا۔ ''منے کو کل تیز بخار ہوگیا تھا۔ آج دوپہر سے کچھ بہتر ہوا ہے۔''

شانی نے ایک بار پھر منے کا گال چوما اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ چوہدری بشیر نے بیل بجا کر ملازم کو چائے کا آرڈر دیا اور فلم دیکھنے میں محو رہا۔ ''یہ انڈیا والے آرٹ موویز اچھی بناتے ہیں۔'' وہ اسکرین پر نظریں جمائے بولا۔

پھر اس نے ریموٹ کے ذریعے فلم ری وائنڈ کی اور فلم کے شروع کے ایک سین کو دوبارہ دیکھنا شروع کردیا۔ بیوی اس نوجوان سے مل کر آتی ہے جس سے وہ شادی سے پہلے محبت کرتی تھی۔ شوہر کے دل میں الاؤ بھڑک رہا ہے۔ وہ بیوی کو ایک نہایت خوب صورت اور قیمتی بنارسی ساڑھی تحفے میں دیتا ہے۔ بیوی ساڑھی پہنتی ہے۔ آئینے کے سامنے گھوم گھوم کر دیکھتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہے لیکن اچانک اس کی نگاہ پلو پر پڑتی ہے۔ پلو سے ساڑھی تھوڑی سی پھٹی ہوئی ہے۔ اسے رفو کیا گیا ہے۔ بیوی کا چہرہ اُتر جاتا ہے۔ وہ شوہر سے کہتی ہے۔ ''یہ تو پھٹی ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شوہر پوچھتا ہے۔

''اس میں نقص ہے جانی۔''

''ایسا نقص تو تمہارے اندر بھی ہے ڈارلنگ۔'' شوہر عجیب لہجے میں کہتا ہے۔

بیوی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔ شوہر باہر چلا جاتا ہے۔

چوہدری بشیر نے ایک بار پھر فلم ری وائنڈ کر کے سین دوسری بار دیکھا اور پھر خاموشی سے اسی جگہ سے دیکھنے لگا جہاں سے پہلے دیکھ رہا تھا۔

شانی کو اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ عرصہ پہلے کا ایک

اور واقعہ یاد آگیا۔ چوہدری بشیر کے مرحوم بھائی فاخر نے بھی نارپور کی حویلی میں ایک بار ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے شانی کو ''شوہر کی طلب اور بیوی کی گرم جوشی'' کا ایک سین ٹی وی پر بار بار دکھایا تھا۔ بشیر بھی فاخر ہی کا بھائی تھا۔ بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ دونوں کے مزاج مختلف ہیں لیکن آہستہ آہستہ ثابت ہو رہا تھا کہ دونوں کی خصلت ایک ہی ہے۔ بتدریج بشیر کا ایک نیا روپ شانی کے سامنے آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد فلم ختم ہوگئی۔ بشیر نے ٹی وی آف کردیا اور منے سے کہا کہ وہ باہر جا کر کھیلے۔ منا خود پر جبر کر کے شانی کی گود سے نکلا اور باہر چلا گیا۔ شانی کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا..... چوہدری بشیر ابھی شانی کا شوہر نہیں بنا تھا لیکن ابھی سے ایک سخت گیر شوہر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولا۔ ''بدھ کے دن سہ پہر تین اور رات بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھیں؟''

''ہوٹل میں۔'' شانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''تمہیں یاد ہوگا، میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ تم ہوٹل سے جواب نہیں دے رہی ہو۔''

''پپ..... پتا نہیں کہ آپ کو ایسا کیوں لگا۔''

''میں جب بھی ہوٹل میں تم سے رابطہ کرتا تھا، تمہارے موبائل سے ٹریفک کا شور سنائی دیتا تھا، اس دن کچھ سنائی نہیں دیا..... کیوں؟''

وہ تھانے داروں کی طرح تفتیش کر رہا تھا۔ شانی کے اندر سے کسی وقت خوف اور کسی وقت طیش کی لہر اٹھ رہی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ کھڑکیاں دروازے بند ہوں..... لیکن..... آپ مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس لئے کر رہا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے اور اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس معاہدے کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ اگر معاہدے کی کسی ایک شق کی خلاف ورزی ہوگی تو پھر سارا معاہدہ ختم ہوجائے گا۔'' بشیر کے لہجے میں طیش کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔

شانی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی بشیر نے ہاتھ بڑھا کر شانی کی کلائی بڑی مضبوطی سے پکڑ لی۔ اس کی گرفت میں ہیجانی سختی تھی۔ وہ چنگھاڑا۔ ''میرے اور اپنے نئے دور کی ابتدا جھوٹ سے نہ کرنا۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، بدھ کے دن تین بجے سے رات بارہ بجے تک تم کہاں تھیں۔ میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔''

شانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ واقعی جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ جو تھوڑی بہت غلط

www.pdfbooksfree.pk

بیانی اس نے مجبوراً کی تھی وہ بھی اس کے دل و دماغ پر مسلسل کوڑے برسا رہی تھی۔ درحقیقت اسے جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں چوہدری! میں اس روز عارف بھائی کے ساتھ رستم کی طرف گئی تھی۔''

چوہدری بشیر کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھیں۔ چہرہ اور کالا ہوگیا۔ شانی کی کلائی پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ ''کیوں گئی تھیں؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب ہر پرانے تعلق کو بھول جاؤ گی۔''

''میں..... رستم کو سمجھانے گئی تھی..... آخری بار..... میں اس سے کہنے گئی تھی کہ پولیس نے اسے مارنے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔ وہ کہیں رُوپوش ہوجائے یا ملک سے باہر چلا جائے۔''

''پھر وہ مانا؟'' چوہدری کا لہجہ عجیب تھا۔

''پتا نہیں میں نے اپنا فرض ادا کیا۔''

''تم نے منانے کی کوشش تو کی ہوگی۔'' چوہدری نے دوسرے ہاتھ سے وہسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میں نے بس ایک ہی بار بات کی۔''

''تم دونوں نے اکیلے میں بات کی..... یا کوئی اور بھی موجود تھا اور دیکھو جھوٹ نہیں بولنا۔''

''اکیلے میں بات کی تھی۔'' شانی نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''بہت خوب..... اکیلے میں بات کی تھی۔'' چوہدری کے لہجے میں کاٹ تھی۔ اس نے اپنی آتشیں نظریں شانی کی نگاہوں میں گاڑھیں۔ ''اس نے..... تم کو چھوا، یا.....؟''

''چوہدری آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔'' شانی بھڑک گئی۔ ''میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے لئے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔''

چوہدری بشیر نے شانی کی کلائی کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے سے شانی کے پورے جسم نے جھٹکا کھایا اور اس کے بال کھل گئے۔ چوہدری نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ''صرف میری بات کا جواب دو..... صرف میری بات کا جواب دو..... اس نے تم کو چھوا..... چھوا یا نہیں؟''

شانی کے آنسو نکل پڑے۔ ''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

چوہدری اپنا بھاری بھرکم چہرہ شانی کے بالکل قریب لے آیا۔ ''کیسے مان لوں..... تم

کہہ رہی ہو کہ آخری ملاقات تھی..... آخری ملاقات میں تم اکیلی اس کے پاس رہیں۔ اس نے تم کو چھوا تک نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''دیکھیں، میں نے آپ کو بتایا ہے کہ رستم سے میری بات صرف تین چار منٹ کے لئے ہوئی تھی.....''

''شٹ اَپ۔'' چوہدری نے دانت پیس کر شانی کی بات کاٹی۔ ''میرے سامنے اس کا نام لے کر بات مت کرو۔ مت لو اس کا نام۔''

شانی نے خوف زدہ نظروں سے بشیر کے جنونی تاثرات دیکھے۔ اس کی کلائی پر بشیر کی گرفت سخت تر تھی۔ چوہدری بشیر پھر پھنکارا۔ ''اس سے تمہاری بات صرف تین چار منٹ ہوئی لیکن تم نو دس گھنٹے تک ایک چھت تلے اس قاتل ڈکیت کے ساتھ رہیں۔ باقی وقت میں تم کیا کرتی رہیں؟''

''مم..... میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ عارف نے مجھے دوا دے کر سلا دیا تھا۔ موسم بھی بہت خراب تھا اس لئے ہم ہوٹل نہ لوٹ سکے۔'' پھر وہ ذرا توقف کر کے کراہی۔ ''پلیز میری کلائی چھوڑ دیں۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔''

چوہدری نے اپنے جنون میں جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں انگارہ تھیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''دیکھو..... میں آخری بار تمہیں پھر معاف کردوں گا۔ مجھے سچ سچ بتا دو۔ ان نو دس گھنٹوں میں کیا ہوا؟''

''میرے ساتھ ایسا سلوک مت کریں۔ میں اس کی حق دار نہیں ہوں۔ میں آخری بار رستم..... ہم میرا مطلب ہے اس سے ملی تھی، اب وہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے..... اور میری کلائی چھوڑ دیں، مجھے درد ہو رہا ہے۔'' وہ سسکی۔

چوہدری نے بڑی ڈھٹائی سے سر ہلایا۔ ''تم سچ نہیں بول رہی ہو اور میں تمہیں سچ بولنے پر مجبور کردوں گا۔'' شانی نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر میز کی دراز میں سے پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر شانی کی روح فنا ہوگئی۔ وہ شانی کا چہرہ دیکھ کر پھنکارا۔ ''گھبراؤ مت..... تجھے کچھ نہیں کہوں گا..... لیکن اور بہت کچھ ختم کردوں گا۔''

شانی کے دل نے گواہی دی کہ آج اس نے یہاں کوٹھی میں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ چوہدری بشیر کی وحشت کسی ایسے سانحے کا باعث بن سکتی ہے جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ اس کا دھیان آپ ہی آپ مُنے کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں اسے مُنے

www.pdfbooksfree.pk

کی زندگی کی طرف سے شدید خطرہ محسوس ہوا۔ کچھ ایسے جانور بھی ہوتے ہیں جن میں نر اپنے بچے کو مار دیتا ہے اور ایسا جنسی جبلت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شانی کو لگا جیسے یہاں بھی کوئی ایسا ہی شدید جذبہ مُنے کے لئے ''خطرہ'' بن رہا ہے۔ وہ سرتاپا کانپ گئی۔ اسے اپنی جان کی مطلق پرواہ نہیں تھی لیکن اپنی پیاری بھابو سے کیا ہوا وعدہ اس کی روح میں بسا تھا۔ اس کی کلائی بدستور چوہدری کی بے رحم گرفت میں تھی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا اور دونوں ہاتھ چوہدری کے سامنے جوڑ دیئے۔ ''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں اسے واپس رکھیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا..... نہ آئندہ کچھ ہوگا۔ ہمارے درمیان جو طے ہوا ہے میں اس کے مطابق ہی چل رہی ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں۔''

چوہدری خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شانی کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور اس بند کمرے میں اسے بدترین سلوک کا نشانہ بنائے گا لیکن یہ بات بھی تھی کہ وہ روتی گڑگڑاتی شانی کی بجائے ہنستی مسکراتی شانی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسی شانی جس کے پیکر میں خودسپردگی اور آمادگی کی تمام تر رعنائی شامل ہو۔ بے شک یہ رعنائی کسی جبر کا نتیجہ ہی ہو لیکن ہو تو۔ اس کی جلتی نگاہیں شانی کے حسین سراپے پر مرکوز رہیں۔ یہ نگاہیں جیسے شانی کے جسم میں سوراخ کر رہی تھیں۔

وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''مجھے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دو کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں اور تم وہاں کیا کرتی رہی۔''

شانی نے رک رک کر سب کچھ بتا دیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں بھی شانی کی کلائی بشیر کی آہنی گرفت میں رہی۔ وہ جیسے اس کی کلائی کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر بھول ہی چکا تھا۔ اس کی انگلیاں شانی کے گوشت میں پیوست تھیں اور تکلیف کے سبب ہاتھ لرزتا جا رہا تھا۔ بشیر کی یہ لاشعوری گرفت شاید اس احساس ملکیت کی عکاس تھی جو وہ شانی کے حوالے سے رکھتا تھا۔ اس نے جیسے صرف کلائی کو نہیں پورے جسم کو اپنی ملکیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس نے ایک ایک بات پوچھی۔ کئی سوالات کئے۔ معاہدے کی ساری شرائط شانی کی زبان سے سنیں۔ اس گفتگو کے دوران میں شانی کو کئی بار بے حد توہین محسوس ہوئی۔ اس کے اندر کی باہمت چوہدرانی نے اسے کچوکے دیئے لیکن وہ یہ سوچ کر سب کچھ سہتی رہی کہ بشیر نشے اور طیش میں دیوانہ ہو رہا ہے..... اس کی دیوانگی کے جواب میں تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا ہی عقل مندی تھی۔

خبر نہیں کہ کب تک شانی کو بشیر کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑتا اور بالآخر یہ صورتِ حال کیا رخ اختیار کرتی کہ ایک دستک نے شانی کی مشکل آسان کر دی۔ بند دروازے پر یہ دستک مسز گریس نے دی تھی۔ وہ شانی کو بلا رہی تھیں۔

مسز گریس کی آواز سن کر بشیر چونک گیا۔ اس کے غضب کا چڑھا ہوا پارہ ایک دم اُتر سا گیا۔ اس نے سگریٹ کا ایک طویل ترکش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور شانی سے بولا۔ ''جاؤ۔ گریس کی بات سن لو۔''

شانی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے۔

''اب جاتی کیوں نہیں ہو؟'' بشیر پھنکارا۔

''میرا..... بازو چھوڑیں گے تو جاؤں گی۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔

چوہدری بشیر نے جیسے چونک کر بازو چھوڑ دیا۔ شانی کی دودھیا کلائی پر انگلیوں کے نشان یوں ثبت تھے جیسے کلائی کو گھنگھرو تک رسی سے باندھے رکھا گیا ہو۔ کلائی چھوٹتے ہی نسوں میں رکا ہوا خون تڑپ کر ہاتھ کی طرف آیا اور اسے گلابی کر گیا۔ انگلیاں کپکپاتی چلی جا رہی تھیں۔ شانی اس ستم زدہ کلائی اور ہاتھ کو اپنی اوڑھنی میں چھپاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس بالکل پاس پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ اس نے رک کر آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا پھر دروازہ کھولتی ہوئی باہر آ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شانی اور گریس کوٹھی کے ایک شاندار سجے ہوئے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ گریس کے چہرے پر شانی کے لئے ترحم اور تشویش کے آثار تھے۔ نہ جانے کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ یہ زیبن آنکھوں والی غیر ملکی خاتون شانی کے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہے۔ شانی نے محسوس کیا تھا کہ ملتان کے عثمانیہ ہاؤس میں بھی شانی جب بھی چوہدری کے پاس پہنچتی تھی گریس اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی۔ جیسے اس کی دیکھ بھال کر رہی ہو اور اس کو کسی متوقع مصیبت سے بچانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

گریس بہت سادہ انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی تھی۔ شانی اس کی بات بہ آسانی سمجھ لیتی تھی۔ شانی ایک چیز دیکھ کر چونکی۔ گریس کے کندھوں پر جو چادر تھی وہ شانی کی تھی۔ گریس نے یہ چادر بڑی چاہت سے اپنے پاس رکھی تھی اور اپنی شال شانی کو دے دی تھی۔ یوں وہ اپنے تئیں شانی کی دوپٹہ بدل بہن بنی ہوئی تھی۔ یہ واقعہ ریچھ والے سانحے کے بعد ہوا تھا۔ شانی، بچے ڈیوس کو خوفناک ریچھ سے بچانے کی کوشش میں سوئمنگ پول کے اندر جا گری

www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ ریچھ کی ہلاکت کے بعد شانی کو پول سے باہر نکالا گیا تھا اور گریس نے شانی کے سر پر اپنی شال ڈالی تھی۔

گریس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم اپنی چادر بچھانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

شانی بھی جواباً ہولے سے مسکرائی۔ گریس نے کہا۔ ''یہ چادر میرے پاس اس واقعے کی نشانی ہے جسے میں اور اسٹیفن زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ میں سچ کہتی ہوں شونی (شانی) میں جتنی بار اپنے بچے کا منہ چومتی ہوں تمہیں یاد کرتی ہوں۔ اگر تم اس شام جرأت نہ دکھاتیں تو شاید آج.....'' گریس کی آواز رندھ گئی۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

''میرا کوئی کمال نہیں تھا میڈم گریس۔ شاید یہ میرے اندر کی عورت تھی جو آپ کے معصوم بچے ڈیوس کو مشکل میں نہ دیکھ سکی۔''

''جو کچھ بھی ہے شونی! تمہارا احسان زندگی بھر میرے دل پر نقش رہے گا۔ میں تمہیں ہر وقت یاد کرتی ہوں۔ تمہارے بارے میں دوسروں سے پوچھتی رہتی ہوں۔ نوکرانی فردوس اور زہرا نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ کچھ باتیں میں نے اپنے طور پر بھی معلوم کی ہیں۔''

شانی پھر ہلکے سے انداز میں مسکرائی۔ ''آپ نے میرے بارے میں تو بہت کچھ جان لیا میڈم! لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرے دماغ میں بھی آپ کے بارے میں کئی سوال ابھرتے ہیں۔''

گریس بولی۔ ''شونی! پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے میڈم نہ کہا کرو۔ جس طرح میں تمہیں بے تکلفی سے بلاتی ہوں اسی طرح تم بھی بلاؤ۔ مجھے یہ اچھا لگے گا۔ جو سوال تم نے کیا ہے اس کا جواب میں تمہیں دینا چاہتی ہوں لیکن ڈرتی بھی ہوں۔ اسٹیفن نے بہت سختی سے منع کیا ہوا ہے۔''

''تو پھر آپ رہنے دیں۔'' شانی نے جلدی سے کہا۔

''تم نے مجھے فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ اسٹیفن نے منع کیا ہے مگر تم اتنی اپنی لگتی ہو کہ میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی اور پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس یہ بات بالکل محفوظ بھی رہے گی۔''

''آپ کی مہربانی ہے کہ آپ مجھے اس لائق سمجھتی ہیں۔''

''پھر وہی آپ جناب..... تم مجھے تم کہہ کر ہی بلایا کرو۔'' ذرا توقف کرنے کے بعد گریس نے اپنی گود میں بیٹھے ننھے ڈیوس کو چوما اور اسے باہر بھیج دیا۔ تب اس نے آہستہ آہستہ

شانی کو بتانا شروع کیا۔ ''کہتے ہیں کہ اچھی بات جہاں سے بھی ملے لے لینی چاہیے۔ لندن میں ہمیں ایک پاکستانی شہری سے ایک اچھی چیز ملی اور ہم اس کی تحقیق کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ وہ پاکستانی کون تھا اور وہ اچھی چیز کیا تھی؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ شخص دارا نام کا ایک دیہاتی تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ اس کے پاس برطانیہ کی شہریت تھی اور وہ اپنے بیٹے اور پوتوں کے پاس دس بارہ سال سے انگلینڈ میں مقیم تھا۔ دارا نامی یہ شخص چار سال پہلے پاکستان آیا۔ یہاں سے وہ اپنے ایک مقامی انڈین دوست یوراج سنگھ کے لئے ایک نباتاتی دوا لے کر گیا۔ یہ دوا ان دواؤں میں سے تھی جو عام طور پر عمر رسیدہ افراد جسمانی قوت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

مسز گریس بولی۔ ''اس دوا کے نتائج حیرت انگیز تھے۔ بوڑھا یوراج سنگھ ایک نئی شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ بعد میں کچھ اور لوگوں نے بھی یہ دوا استعمال کی۔ ان میں لندن کا ایک انگریز کیمسٹ فلپ فریزر بھی تھا۔ فلپ اس روایتی دوا کے نتائج سے بے حد متاثر ہوا۔ ان لوگوں نے دارا نامی شخص کو خاص طور سے اس پودے کے حصول کے لئے پاکستان بھیجا جس سے یہ دوا تیار کی جاتی تھی۔ یہ نایاب پودا ہے اور اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس کی نمو کا ایک خاص موسم ہوتا ہے اور اسے خاص طریقے سے ہی پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ دارا کو اس پودے کے حصول میں جزوی کامیابی ہوئی۔ وہ کچھ دوا تیار کر کے انگلینڈ لایا۔ انگلینڈ میں کیمسٹ فلپ نے یہ دوا پرائیویٹ طور پر اپنے حلقہ احباب میں کچھ لوگوں کو استعمال کرائی۔ اس کے نتائج حیران کن تھے۔ یہ بیش قیمت ایلوپیتھک دواؤں سے کہیں کم قیمت اور کہیں زیادہ مؤثر تھی۔ ایک خاص حلقے میں تہلکہ سا مچ گیا۔ اس دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دارا اس نایاب پودے کو اپنے طور پر کاشت کرنے اور پروان چڑھانے کا قدیم فن بھی جانتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس نے لندن میں اپنے گھر کی پھلواری میں کچھ ایسے پودے تیار بھی کئے تھے لیکن پھر اسی دوران میں ایک انہونا واقعہ ہوا.....''

مسز گریس نے چند لمحے توقف کیا اور شانی تجسس سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

مسز گریس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر انکشاف کیا۔ ''ایک رات کسی نے بوڑھے دارا اور اس کے جوان بیٹے کو قتل کر دیا۔ دونوں کی لاشیں پُراسرار طور پر گھر کے پچھواڑے پھلواری میں پائی گئیں۔ دو سال گزر چکے ہیں۔ اس معاملے کی تفتیش ابھی تک جاری ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا ہے۔ اب آہستہ آہستہ یہ معاملہ سرد خانے میں چلا گیا ہے لیکن حیرت انگیز پودے اور اس سے تیار کی جانے والی دوا کا معاملہ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں ہنوز تازہ ہے اور وہ اس کا کھوج لگانا چاہتے ہیں۔''

شانی کے ذہن میں ہلچل تھی۔ مسز گریس اسے جو کچھ بتا رہی تھی، اس سے شانی کے ذہن میں کچھ نہایت تلخ اور لرزہ خیز یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ گریس جس پودے اور نباتاتی دوا کی بات کر رہی ہے، وہ اس کے بارے میں پہلے سے جانتی ہے۔ اس نے اپنے خیال کی تصدیق کے لئے گریس سے پوچھا۔ ''آپ جس پودے کی بات کر رہی ہیں اسے کیا کہتے ہیں؟''

گریس بولی۔ ''یہ پودا بہت چھوٹا ہوتا ہے، جڑی بوٹی کی شکل میں۔ یہ بہت نایاب ہے۔ اس کا نام چوہدری بشیر نے ''سانپ کی ڈالی'' بتایا ہے۔ سنا ہے کہ چوہدری بشیر کے دادا بھی اس پودے کی کاشت اور نشوونما کا خاص طریقہ جانتے تھے۔''

شانی کے ذہن کی ہلچل کئی گنا بڑھ گئی۔ اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔ غالباً چوہدری بشیر نے ''سپ گندل'' کا ترجمہ ''سانپ کی ڈالی'' کر کے بتایا تھا۔ سپ گندل وہی زہرناک آتشیں جڑی بوٹی تھی جو چوہدری مہر کے دیمک زدہ جسم میں نیلے شعلے بھڑکاتی تھی اور کہنہ سالی میں بھی عورتوں کو حریص نظر سے دیکھتا تھا۔ اس خطرناک دوا کی زہر فشانی شانی کے لئے کوئی ڈھکی چھپی شے نہیں تھی۔ بدقسمتی سے شانی نے اس زہر فشانی کو بھگتا تھا اور بہت قریب سے اس کا سنگین نظارہ کیا تھا۔ شانی کو نارپور کی حویلی میں آگ لگنے سے پہلے کے مناظر بھولے نہیں تھے۔ چوہدری مہر کا سفاک ہرکارہ اکبر شانی کے لئے سرتاپا وحشت بن گیا تھا۔ عہد قدیم کے کسی حبشی غلام کی طرح اپنے کرم خوردہ آقا کو عصمت دری کا تماشا دکھانے کے لئے وہ شانی پر پل پڑا تھا۔ اس وقت اس کی رگوں میں اسی منحوس ''سپ گندل'' کا زہر تھا۔ یہ سپ گندل بے بس شانی کو سانپ ہی طرح ڈس چکی ہوتی اگر اس وقت رستم کسی ڈرامائی کردار کی طرح دلیرانہ، حویلی میں داخل نہ ہوتا اور حویلی کے بے لگام مکینوں کو تہس نہس نہ کرتا۔

''کس سوچ میں کھو گئی ہو؟'' گریس نے پوچھا۔

شانی چونک کر بولی۔ ''کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ''سانپ کی ڈالی'' کے متعلق میں نے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اس پودے سے بننے والی دوا بہت خطرناک ہوتی ہے۔ کھانے والے کو وحشی دیوانہ بنا دیتی ہے۔''

گریس پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''کچھ لوگ وحشی، دیوانہ وغیرہ بننا چاہتے ہیں اور کچھ بیمار ذہن کی عورتیں بھی ایسے دیوانوں کو پسند کرتی ہیں لیکن لندن میں کیمسٹ فلپ فرینکلن کے نزدیک اس دوا کی اہمیت کسی اور وجہ سے ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس پودے سے بننے والی دوا کی ایک خاصیت تو وہ ہے جو تم بتا رہی ہو لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی ایک خاصیت ظاہر ہوئی ہے اور یہ خاصیت پہلی سے بالکل مختلف اور زیادہ حیران کن ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''ابھی مجھے بھی ٹھیک سے بتا نہیں شونی اور شاید اسٹیفن بھی زیادہ نہیں جانتا۔ بس اتنی خبر ہے کہ اس دوا کے استعمال کے دوران میں اتفاقی طور پر اس کی ایک بالکل غیر متوقع خاصیت کا پتہ چلا ہے اور دوا کی یہی اثر انگیزی ہے جس نے کیمسٹ فلپ کو اس پودے میں اتنی دلچسپی ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

''یہ فلپ صاحب کون ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''ایک کروڑ پتی شخص ہیں۔ میرے شوہر اسٹیفن نے ڈی فارمیسی کر رکھی ہے۔ اسٹیفن اور میں فلپ صاحب کی فارماسیوٹیکل فرم میں ہی ملازمت کرتے ہیں۔''

''یعنی آپ دونوں مسٹر فلپ کی طرف سے اس خاص پودے پر تحقیق کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔'' شانی نے پوچھا۔

مسز گریس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن یہ سارا معاملہ بالکل ''کانفی ڈینشل'' ہے۔ ہم بڑے رازدارانہ طریقے سے یہاں آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خاص پودے اور دارا اور ان کے بیٹے کی ناگہانی موت میں گہرا تعلق دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کچھ لوگ اس پودے کی حوالے سے بڑا سخت رویہ رکھتے ہیں..... شاید وہ نہیں چاہتے کہ اس پودے کی مصنوعی کاشت اور پرورش کا طریقہ دوسرے لوگوں تک پہنچے یا شاید وہ لوگ کسی روحانی حوالے سے اس پودے کی پرداخت کو غلط سمجھتے ہیں۔''

''یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں آ رہی ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے ناں شونی! مسٹر دارا کا دعویٰ تھا کہ وہ اس نایاب پودے کی کاشت کا نایاب طریقہ جانتے ہیں اور اس خودرو پودے کو مصنوعی ماحول میں پروان چڑھا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ لندن میں یہ کوشش کر رہے تھے کہ مسٹر دارا یا ان کے بیٹے سے اس پودے

www.pdfbooksfree.pk

کی کاشت کروائیں اور کاشت کا طریقہ جانیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں بڑی رقموں کی پیشکش بھی کی جارہی تھی۔"

"اس صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دارا کو رقمیں آفر کرنے والی پارٹیوں میں سے ہی کسی نے دارا اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگادیا ہو۔"

"یہ امکان بھی رد تو نہیں کیا جاسکتا۔" گریس نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ "مجھے کہنا تو نہیں چاہیے شونی! لیکن صرف یاد دہانی کرا رہی ہوں کہ ہماری یہ گفتگو ہم دونوں بہنوں کے درمیان ہی رہنی چاہیے۔"

"آپ اس حوالے سے بالکل بے فکر رہیں۔" شانی نے کہا۔

گریس بولی۔ "دیکھو، میں کیا بات کرنے بیٹھی تھی اور تم گفتگو کو کس رخ پر لے گئی ہو۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں، زیادہ سے زیادہ اور میرا دل چاہتا ہے کہ گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھ کر تمہاری باتیں کرتی رہوں۔"

"میرے میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"تم میں بہت خاص بات ہے۔" گریس شانی کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔ پتا نہیں کیوں شانی کو لگا کہ اس نے یہ آنکھیں پہلے بھی کہیں دیکھی ہیں۔ پورا چہرہ نہیں صرف یہ آنکھیں۔ گریس نے محبت سے شانی کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "شونی! میں نے کوشش کر کے تمہاری بہت سی کہانی جان لی ہے۔ میں تمہیں جتنا جتنا جانتی گئی ہوں، میرے دل میں تمہارے لئے اتنی ہی ہمدردی اور محبت پیدا ہوتی گئی ہے۔ میں نے سنا تھا شونی کہ مشرقی لڑکی ایثار اور وفا کا پیکر ہوتی ہے۔ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو آمادہ ہوجاتی ہے۔ ایسے کچھ واقعات بھی سن رکھے تھے لیکن ان پر یقین نہیں تھا۔ تمہیں دیکھا اور جانا تو یقین آگیا۔"

"آپ کیا جانتی ہیں میرے بارے میں؟"

"کافی کچھ۔ مجھے پتا ہے کہ تمہارے والد ایک زمیندار چوہدری تھے لیکن ان سے بڑے ایک چوہدری نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا۔ تمہارے والد کی زمینیں بک رہی تھیں، ان پر قرضوں کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ صورتِ حال میں بہتری کا بس ایک ہی راستہ تھا۔ تم اس دوسرے چوہدری سے شادی کرلو جس کی وجہ سے تمہارے والد اور دیگر اہلِ خانہ کو سخت معاشی تنگی کا سامنا تھا اور تم نے شادی کرلی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ شادی فقط ایک نام کی شادی ہے۔ ورنہ اس "ناتے" کے ذریعے تم سے ایک پرانی خاندانی رنجش کا بدلہ چکایا گیا

ہے۔ اس شادی کے بعد سخت گیر شوہر اور سسرالیوں کے ہاتھوں جو کچھ تم پر بیتی یہ ایک علیحدہ کہانی ہے لیکن اس کہانی میں ایک کہانی اور بھی ہے۔ بڑی پیاری..... بڑی نرم گرم اور گداز۔ ایسی کہانیاں جو عام طور پر صرف تصورات کا کرشمہ ہی ہوتی ہیں لیکن تمہارے حوالے سے یہ کہانی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔"

مسز گریس نے چند لمحے توقف کر کے ذرا شوخ نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولیں۔ "یہ ایک خطرناک ڈاکو اور ایک نوعمر چوہدرانی کے پیار کی کہانی ہے۔ میں اس کہانی کے بہت سے نشیب و فراز سے آگاہ ہوچکی ہوں اور جو باتیں رہ گئی ہیں وہ مجھے تم بتا سکتی ہو۔"

"مم..... میں سمجھی نہیں۔"

"مجھے اپنا سمجھتی ہو تو پھر مجھ سے کچھ مت چھپاؤ اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ بہت کچھ تو میں جان ہی چکی ہوں۔"

اس کے بعد مسز گریس نے رستم کے ساتھ شانی کے ناتے کے بارے میں ایسے واقعات بتائے جنہیں سن کر شانی کو گریس کی معلومات پر یقین کرنا پڑا۔ شانی نے سن رکھا تھا کہ یہ انگریز لوگ جب کسی چیز کو کھوجنا شروع کرتے ہیں تو بڑی تندہی اور جان فشانی دکھاتے ہیں۔ ان پر ایک دھن سی سوار ہوجاتی ہے۔ اب شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ پچھلے دنوں میں گریس پر بھی اس قسم کی دھن سوار رہی ہے۔ ملتان میں اور یہاں آنے کے بعد بھی وہ شانی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتی رہی ہے اور اب کافی کچھ جانتی ہے۔ شانی کو یہ دونوں انگریز میاں بیوی پُراسرار لگتے رہے تھے لیکن اب گریس کے ساتھ تفصیلی ملاقات کے بعد یہ پُراسراریت کچھ کم ہوگئی تھی۔ غالباً گریس ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ یہاں حیرت انگیز پودے سپ گندل کی کھوج میں آئے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ اس پودے کی پرورش عجیب و غریب طریقے سے ہوتی ہے۔ شانی نے بڑے چوہدری مہر کو سپ گندل کی دیکھ بھال کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس پودے کو خون پلاتا تھا اور ایک کوبرا سانپ اس پودے کی کیاریوں میں چکر لایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی خبر نہیں کہ کیا کیا ٹوٹکے کئے جاتے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ گریس کا شوہر اسٹیفن بھی چوہدری بشیر کے ساتھ مل کر اسی قسم کے ٹوٹکوں میں مصروف ہے۔ کچھ دن پہلے شانی نے ملتان کے عثمانیہ ہاؤس میں اسٹیفن کو خون آلود ہاتھوں کے ساتھ کسی نامعلوم کام میں مصروف دیکھا تھا۔

"تم بات کرتے کرتے کس سوچ میں کھو جاتی ہو؟" گریس نے محبت سے شانی کو دیکھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''نہیں..... نہیں..... کچھ بھی نہیں۔'' شانی ٹھٹک گئی۔

وہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر خلوص بھرے پیار سے بولی۔ ''ایک بے تکلف بات کہوں؟''

''کک..... کیا؟''

''تم بڑی دلکش ہو۔ تمہاری طرف دل کھنچتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم کسی بھی مرد کو دیوانہ بنا سکتی ہو۔'' شانی کا رنگ حیا سے سرخ ہو گیا لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ گریس بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں نے رستم کو دیکھا تو نہیں لیکن کہتے ہیں کہ وہ روایتی جرائم پیشہ لوگوں کی طرح بدنما نہیں۔ جواں سال اور قبول صورت ہے..... شاید اس کی فطرت بھی غلط نہیں۔ وہ صرف غلط حالات کا شکار ہوا ہے۔''

رستم کے ذکر پر شانی کو وقت ہونے لگی۔ اس نے یوں داخلی دروازے کی طرف دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ بشیر کہیں آس پاس موجود ہوگا اور رستم کے ذکر پر ایک دم آگ بگولہ ہو جائے گا۔ وہ جیسے کراہ کر بولی۔ ''پلیز گریس! یہ ذکر نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''کیا اچھا نہیں لگتا.....؟ وہ جسے تم پیار کرتی ہو یا یہ حالات جنہوں نے تمہیں گھیرا ہوا ہے؟'' گریس نے اعتماد سے کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' شانی کا لہجہ دل فگار تھا۔

گریس نے اپنے سنہرے رنگے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا، اپنے گداز ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور عجیب لہجے میں بولی۔ ''مشرق اور مشرق کی پُراسراریت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور ان مشرقی لڑکیوں کے بارے میں بھی جو الف لیلہ کے کرداروں کی طرح ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ ان کے سینے میں بڑے نازک لیکن بڑے مضبوط دل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں میں دنیا کے حسین ترین سپنے سجاتی ہیں لیکن مجبور ہو جانے کی صورت میں ان سپنوں کو اپنے ہاتھوں سے چکنا چُور کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان پر جو کچھ بھی بیتے لیکن ان کی حالت دیکھنے والوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے پیاسے ہونٹوں کو ایثار کے سوئی دھاگے سے یوں سیتی ہیں کہ ہلکی سی آہ بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتی..... ہاں شانی! میں نے بہت کچھ سنا تھا ان لڑکیوں کے بارے میں لیکن یقین نہیں تھا کہ ایک دن ایک ایسی لڑکی میرے روبرو بھی ہوگی۔ محبت، وفا اور ایثار کی پتلی۔ پھول سے بڑھ کر نازک اور چٹان سے بڑھ کر مضبوط۔''

''یہ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں گریس؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آ رہا ہے۔'' گریس نے غیر معمولی لہجے میں کہا۔ اس نے

ایک آہ نما سانس کھینچی اور خالی نظروں سے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں خاندانی طور پر کرسچن ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا کوئی خصوصی مذہب نہیں ہے۔ مجھے کئی مذاہب کی اچھی باتیں بھاتی ہیں اور میں انہیں اپنے دل میں محفوظ کرتی ہوں۔ خاص طور سے میں نے تمہارے مذہب کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''تم نے یہ مقولہ سنا ہی ہوگا کہ جب جس بہت بڑھ جاتا ہے تو تیز ہوائیں چلتی ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ جب تاریکی بہت گہری ہو جاتی ہے تو پھر صبح کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سنا ہے تم نے؟''

شانی خاموش رہی۔ گریس بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری زندگی میں بھی حبس اور اندھیرا گہرا ہو چکا ہے شونی! اب اور گہرا ہوگا تو تم زندہ نہیں رہ سکو گی۔ اب تمہیں بارش اور ہوا کی ضرورت ہے..... اب تمہیں میری ضرورت ہے۔''

شانی نے ایک بار پھر تعجب سے گریس کو دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں گریس؟''

''میں نے بتایا ہے ناں کہ میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم چاہو یا نہ چاہو، میں تمہاری مدد کروں گی۔ میں تمہاری زندگی کو حبس اور اندھیرے سے نکالنے کے لئے تمہارے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں گی اور یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے شونی، اس میں لمبی سوچ بچار شامل ہے۔''

''آپ کی باتیں بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''دراصل تم سمجھنا نہیں چاہ رہی ہو۔'' گریس نے شانی کی چادر اپنے کندھوں پر درست کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے پنجرے کو اپنا گھر سمجھ لیا ہے۔ تم اس کہنہ تاریکی سے نکلنا نہیں چاہتیں جس نے تمہیں مدتوں سے جکڑا ہوا ہے۔ شونی..... شونی! تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم نے پیار کیا ہے۔ کہاں سے آیا ہے یہ پیار؟ یہ تمہاری اپنی ایجاد نہیں ہے۔ یہ ''اوپر والے'' کا دیا ہوا ہے۔ یہ قدرت نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لہو میں شامل کیا ہے۔ اسے گناہ اس دنیا نے بنایا ہے اور دنیا کے دستوروں نے۔''

شانی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''گریس! آپ نے ایک ایسا موضوع چھیڑ دیا ہے جو میرے لئے ختم ہو چکا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، میں ماضی سے اپنا ہر ناتا توڑ چکی ہوں۔''

''ناتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتے شونی۔ جب تک رستم زندہ ہے ماضی سے تمہارا ناتا نہیں ٹوٹ سکتا۔''

ایک دم شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''وہ زندہ کہاں ہے..... وہ تو بس سانس

www.pdfbooksfree.pk

لے رہا ہے۔ اس کی سانس کی ڈور کسی بھی وقت ٹوٹ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اب تک.....'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

''تم ایسی ناامیدی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''امید ہے بھی کہاں؟'' وہ منمنائی۔ ''اس کے جرم اتنے زیادہ ہیں کہ اسے کئی بار پھانسی کی سزا بھی کم سمجھی جائے۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس کے ہاتھوں کئی پولیس والے قتل ہو چکے ہیں۔ پولیس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ پوٹھوہار کے اندر سون میں جو بڑا پولیس ایکشن ہو رہا ہے اس کی بڑی وجہ رستم ہی ہے۔''

رستم کا لفظ منہ سے نکلا تو شانی ایک دم ٹھٹک گئی۔ کچھ دیر پہلے بشیر کے کہے ہوئے الفاظ وزنی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برسنے لگے۔ بشیر نے کہا تھا۔ ''اس کا نام تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔'' یہ کیسی جان لیوا پابندیاں تھیں۔ یہ کیسا زہرناک جبر تھا۔

''کچھ بھی ہے شونی! وہ زندہ ہے اور جب تک سانس میں سانس ہو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے..... اور میں تمہیں نہیں چھوڑنے دوں گی۔'' گریس کے لہجے میں ایک انوکھے عزم کی جھلک تھی۔

''میرے پاؤں میں بڑی زنجیریں ہیں گریس۔ آپ انہیں نہیں دیکھ سکتیں اور نہ شاید سمجھ سکتی ہیں۔''

''میں دیکھ اور سمجھ کر ہی بات کر رہی ہوں۔ میں نے تمہاری زنجیریں گن لی ہیں اور ان کی مضبوطی بھی دیکھ لی ہے۔'' وہ اپنی دھن میں بولی۔

''آپ میرے لئے کیوں دکھی ہو رہی ہیں۔ مجھے اب اپنے حالات پر صبر آ گیا ہے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' شانی نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

مُنا کھیلتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شانی کے لئے بہت سے پھول تھے۔ اس نے ایک معصوم عقیدت کے ساتھ یہ پھول شانی کی جھولی میں ڈال دیئے اور خود اس کے پہلو سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کرکٹ بیٹ تھا۔ یہ بیٹ بڑا تھا اور اس کے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ گریس مسکرانے لگی۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی کلائی اوڑھنی سے باہر آ گئی۔ ایک دم شانی کو احساس ہوا کہ گریس کی تیز نظریں کلائی کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اس نے جلدی سے کلائی اندر کر لی مگر اس پر انگلیوں کے نیلگوں نشان گریس سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔ وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''تو تم کہتی ہو کہ تم بالکل ٹھیک ہو لیکن میں جانتی ہوں تم ٹھیک نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ تو صرف ابتداء

ہے۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے اور یہ تم بھی بڑی اچھی طرح جانتی ہو۔ تم ایک ہی گھر میں، دوسری بار روندی جانے والی ہو اور اس مرتبہ تمہاری سزا زیادہ کڑی ہوگی کیونکہ اب بات صرف ایک پرانی رنجش کے بدلے کی نہیں۔ بہت سی دیگر رنجشیں بھی تمہارے کھاتے میں جمع ہیں۔ تمہیں بڑے چوہدری مہر جی کی قاتلہ سمجھا جاتا ہے۔ تم پر نارپور کی حویلی کو جلانے کا الزام ہے۔ تم پر رستم کی محبت کا الزام ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔''

''آپ..... آپ سمجھ نہیں رہی۔ مجھے بڑی برائیوں میں سے ایک چھوٹی برائی چننی ہے۔ چوہدری بشیر جو بھی ہے لیکن مجھے تحفظ دے سکتا ہے۔ آپ انداز نہیں لگا سکتیں کہ یہاں کے معاشرے میں ایک عورت کے لئے مضبوط سہارے کی کتنی اہمیت ہے اور پھر چوہدری بشیر کا دیا ہوا سہارا مجھے مُنے سے بھی قریب رکھے گا۔ اس معصوم کی زندگی اور خوشی کے لئے میں خود کو کئی بار قربان کر سکتی ہوں۔ آپ شاید اس ناتے کو ٹھیک سے نہ سمجھ سکیں جو میرے اور اس بچے کے درمیان موجود ہے۔ ہم دونوں ''ایک مرنے والی'' کے ساتھ کئے گئے وعدے میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ دور نہیں ہو سکتے۔'' شانی نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ مُنے کا سر چوما۔

گریس بڑے اطمینان سے مسکرائی۔ ''میں نے کہا ہے ناں کہ میں نے تمہاری ساری زنجیریں گنی ہوئی ہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں ان زنجیروں سے باخبر ہوتے ہوئے ہی کہہ رہی ہوں..... ہاں شونی، میں تمہیں اکسا رہی ہوں۔ تمہیں بغاوت پر آمادہ کر رہی ہوں۔ کیونکہ کبھی کبھی بغاوت نہ کرنا بدترین اخلاقی جرم بن جاتا ہے۔''

باتوں باتوں میں ایک دم شانی کو یاد آیا کہ گریس جیسی آنکھیں اس نے کہاں دیکھی تھیں۔ اس کے بدن میں سرد لہری دوڑ گئی۔ اسے مہر جی کی موت کے بعد کا وہ انوکھا واقعہ یاد آیا جو آج بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اسے عرق آلود کر دیتا تھا۔ اسے نگینہ یاد آئی۔ وہ جو اپنی موت کے بعد اس سے ملی تھی۔ وہ نگینہ تھی؟ یا اس جیسی کوئی اور تھی؟ یا صرف شانی کے الجھتے ہوئے ذہن کا کرشمہ تھا؟ وہ جو کچھ تھا آج تک شانی کی عقل فہم سے باہر رہا تھا اور اب شانی کو یوں لگ رہا تھا جیسے گریس کی آنکھوں میں سے نگینہ جھانک رہی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مماثلت تھی لیکن اس مماثلت نے شانی کو ماضی کے اس ناقابل فہم واقعے کی یاد دلا دی تھی۔

شانی نے ایک بار پھر دھیان سے گریس کی آنکھوں میں جھانکا۔ گریس مسکرائی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ آپ کی آنکھیں کسی سے ملتی ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''دیکھو، میں کیا بات کر رہی ہوں اور تم کیا بات چھیڑ رہی ہو۔ شونی..... شونی! میں تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ بہت ایثار ہو چکا، بہت آنسو بہائے جا چکے۔ اس سلسلے کو اب کہیں نہ کہیں تو رکنا ہے۔ کسی نہ کسی نے تو روکنا ہے تو کیوں نہ ہم روکیں۔''

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی باتوں کا کیا جواب دے۔ وہ خاموش رہی۔ گریس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''شونی! تم نے میرے بچے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ مجھے تم سے بہت قریب لے آیا ہے۔ میں بھی تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں اور تم چاہو یا نہ چاہو، میں نے وہ کر گزرنا ہے اور مجھے اوپر والے پر یقین ہے کہ میرے کئے ہوئے سے تمہاری زندگی میں بہتری آئے گی۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

شانی حیرت سے گریس کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ کتنا آہنی عزم تھا اس عورت کے لب و لہجے میں۔ اچانک لان کی طرف سے کھلنے والی دیوار گیر کھڑکی کا شیشہ ایک زوردار چھناکے سے ٹوٹا اور ایک جسیم جست کر کے اندر آ گیا۔ یہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ شانی کو بس اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور مہندی لگے بال ہی نظر آئے۔ وہ ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چمکیلے پھل والا کمانی دار چاقو تھا۔ شانی اسے فوراً پہچان گئی۔ یہ وہی شخص تھا جو مینار پاکستان سے موٹر سائیکل پر شانی کے پیچھے لگا تھا اور کوٹھی کے مین گیٹ تک آیا تھا۔ اب یہ شخص بلائے ناگہانی کی طرح اس کمرے میں موجود تھا۔ شانی کو اس کے چہرے پر لرزہ خیز جنون نظر آیا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں صرف اور صرف شانی پر مرکوز تھیں۔

''حرام زادی..... کتیا..... تیری تو میں.....'' اس نے شانی پر بدترین گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ اس کا چاقو والا ہاتھ دیوانہ وار گھوما۔ شانی تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ پھل اس کی گردن کو چھوتا ہوا گزرا۔ جنونی حملہ آور نے دوسرا وار شانی کی ناف پر کیا لیکن اس سے پہلے ہی گریس تڑپ کر اس پر جا گری۔ اس کے ساتھ ہی وہ پورے زور سے چلائی تھی۔ شانی نے دونوں کو اوپر نیچے بیلگوں قالین پر گرتے دیکھا۔ حملہ آور گریس کے نیچے تھا مگر نیچے ہونے کے باوجود کسی بھی لمحے گریس کو جان لیوا زخم لگا سکتا تھا۔ مُنا سکتہ زدہ کھڑا تھا شانی نے اس کے ہاتھ سے لکڑی کا بیٹ کھینچا اور آگے بڑھ کر ایک طوفانی ضرب حملہ آور کے چاقو والے ہاتھ پر لگائی۔

شانی کی لگائی ہوئی دوسری ضرب نے حملہ آور کے ہاتھ سے چاقو چھڑوا دیا۔ اسی دوران میں حملہ آور نے زور لگایا اور پلٹی کھا کر گریس کو اپنے نیچے کر لیا۔ گریس عام یورپین لوگوں کی طرح مضبوط جسم کی تھی لیکن لمبے تڑنگے حملہ آور کے نیچے چھپ کر رہ گئی۔ اس نے مردوں کی طرح مٹھی بھینچ کر حملہ آور کے جبڑے پر مکا رسید کیا۔ وہ کس سے مس نہیں ہوا۔ اس

نے وحشیانہ انداز میں گریس کی گردن دبانا شروع کر دی۔ شانی نے چوہدری بشیر کے گارڈز کو مدد کے لئے پکارا اور اس کے ساتھ ہی عقب سے حملہ آور کے جھاڑ جھنکاڑ بال اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے۔ رنگ والی کی یہ چھوٹی چوہدرائی بظاہر نرم و نازک ہونے کے باوجود دودھ مکھن کی پلی تھی۔ خطرے کے وقت اس کا رنگ سرخ ہو جاتا تھا اور جسم میں بے پناہ توانائی بھر جاتی تھی۔ اس نے زور لگا کر حملہ آور کو گریس کے اوپر سے کھینچ لیا۔

یہی وقت تھا جب چودھری کے دو تین کارندے دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ وہ شکاری جانوروں کی طرح حملہ آور پر جھپٹ پڑے۔ انہوں نے اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا اور رائفل کے بٹ مارے۔ وہ چند سیکنڈ میں لہولہان ہو گیا۔ اس حالت میں بھی وہ بار بار شانی کی طرف انگلی اٹھا رہا تھا۔ ''تُو نے پیر دھرشد کی بیوی کو مارا ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔''

کارندوں نے ایک بار پھر اسے رائفلوں کے کندوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بشیر دروازے پر نمودار ہوا۔ ان لمحوں میں یوں لگ رہا تھا کہ شاید کارندے حملہ آور کو جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ بشیر نے انہیں ہاتھ روکنے کا اشارہ کیا۔ حملہ آور فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے اگلے دو تین دانت ٹوٹ گئے تھے، سر پھٹ گیا تھا، دونوں ٹانگیں لہولہان تھیں۔ تاہم اس کی آنکھیں اب بھی انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی پتریلی انگوٹھیوں اور گلے کے تعویذ وغیرہ سے اندازہ ہوا کہ وہ پیر قدرت اللہ کے مریدوں میں سے ہے۔

جب بشیر کے کارندے حملہ آور کو اٹھا کر باہر لے جا رہے تھے، وہ اس وقت بھی شانی کو خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بیٹھے ہوئے گلے کے ساتھ چلا رہا تھا۔ ''میں قتل کر دوں گا تجھے بھی اور تیرے یار کو بھی۔ تم دونوں میرے گناہ گار ہو۔ تم دونوں ہو۔''

شانی کا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے چودھری بشیر کی جانب دیکھا۔ وہ ترچھی نظروں سے شانی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک ساعت کے لیے دونوں کی نظریں ٹکرائیں..... اس ایک ساعت میں ہی بشیر کی نظریں جیسے بہت کچھ کہہ گئیں۔ ان نظروں نے کہا۔ ''سن رہی ہو ناں چودھری ارشاد کی شرماں ولی دھی رانی! لوگ تمہاری کتنی عزت افزائی کر رہے ہیں۔ علی الاعلان، تمہارا نا تا ایک نامی گرامی ڈاکو سے جوڑ رہے ہیں۔ میرا حوصلہ دیکھو! پھر بھی تمہیں بیوی کا درجہ دے رہا ہوں۔ تمہاری بدنامیوں کے لئے پردہ اور تمہاری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن رہا ہوں..... میرے پاؤں دھو دھو کر پیو تو یہ بھی تمہارے

www.pdfbooksfree.pk

لیے کم ہے.....''

بشیر کے کارندے جنونی عقیدت مند کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے موقع سے دور لے گئے۔ اس کی آواز کافی دور سے بھی شانی کے کانوں تک پہنچتی رہی۔

شانی نے مُنے کو دیکھا، وہ ایک طرف ڈرا سہما کھڑا تھا۔ شانی نے اسے پیار کیا پھر آگے بڑھ کر گریس کو گلے سے لگا لیا۔ ''بہت شکریہ گریس! آپ بروقت آگے نہ آتیں تو میرا چاقو سے بچنا محال تھا۔''

''کیوں آگے نہ آتی؟ میری پیاری سی بہن میری آنکھوں کے سامنے مشکل میں تھی۔'' گریس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شانی کا ماتھا چوما۔

بشیر کے مسلح کارندے پوری کوٹھی میں بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں حملہ آور کا کوئی ساتھی بھی یہاں نہ موجود ہو۔

شیر احاطے میں تھا اور غصے میں چیخ چیخ کر اپنے ملازموں کو ہدایات دے رہا تھا..... حرامزادو! پورا لشکر یہاں گھوم رہا ہے۔ چالیس چالیس ہزار کی گن بغل میں لے رکھی ہے لیکن کوئی بھی کتا تمہاری ٹانگوں سے گزر کر کوٹھی میں آجاتا ہے لعنت ہے تم پر اور تمہاری سیکورٹی پر۔''

''یہ کون بندہ تھا؟'' گریس نے اپنی شرٹ کے پھٹے ہوئے گریبان کو سینے پر برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ یہ اس بہروپیے پیر قدرت اللہ کا کوئی گماشتہ ہے۔ آپ کو پتا چلا ہی ہوگا، چند دن پہلے رستم اور اس کے ساتھیوں نے ملتان میں قدرت اللہ کے کچھ مریدوں کو مار ڈالا ہے۔ یہ اسی ''بدلے'' کے لیے یہاں گھسا ہے۔''

شانی اور گریس نے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، حملہ آور کو نیم کے درخت تلے ایک چارپائی سے باندھ دیا گیا تھا اور اب بشیر کے کارندے اسے طبی امداد دے رہے تھے۔ بشیر بھی وہاں موجود تھا لیکن اب ایک دم چپ ہو گیا تھا۔

گریس نے کہا۔ ''شونی! لگتا ہے چودھری باشر (بشیر) کا رویہ اس حملہ آور کے ساتھ زیادہ سخت نہیں ہے۔ کہیں چودھری باشر بھی تو پیر صاحب کے ماننے والوں میں سے نہیں؟''

''کچھ عرصہ پہلے تک تو نہیں تھا لیکن اب میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ چند ماہ پہلے کچھ لوگوں کو خاص قسم کی خارش کی بیماری ہوئی تھی۔ ان میں بشیر بھی شامل تھا۔ بشیر کی طرح بہت سے لوگوں کو یہ وہم ہے کہ یہ بیماری صرف ان لوگوں کو ہوئی تھی جنہوں نے قدرت اللہ

کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اس واقعے کے بعد نہ صرف چودھری بشیر کا رویہ قدرت اللہ کے بارے میں بدلا بلکہ اور بھی بہت سے لوگ اس کے عقیدت مند ہو گئے۔''

''کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ ''جلدی بیماری'' صرف ان لوگوں کو ہوئی تھی جنہوں نے گستاخی کی؟''

''کہنے سننے میں یہی آیا ہے لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہے تو میری نظر میں تو یہ ایک اتفاق ہی ہوگا۔ آپ ہمارے دیہات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہیں۔ یہاں ایسی باتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے اور سادہ لوح لوگ اپنی عقیدت کے زور میں رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔''

''اس خارش والے واقعے کے بارے میں سنا تو میں نے بھی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی کوئی روحانی ٹچ ہو؟'' گریس نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

''میں نے کہا ہے ناں کہ ہمارے ہاں لوگ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ ایسے ایسے شوشے چھوڑتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔''

''کچھ بھی ہے شونی! تمہیں اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ قدرت اللہ کا یہ اکیلا ہی ''جنونی دیوانہ عقیدت مند'' نہیں ہوگا اور بھی بہت سے ہوں گے۔ یہ جو کچھ آج ہوا ہے تمہارے لئے ایک سنگین وارننگ کی حیثیت رکھتا ہے۔''

شانی ایک لمبی سانس لے کر رہ گئی۔ اس کا جسم ابھی تک ہنگامے کی شدت سے لرز رہا تھا۔ اس کے اردگرد خطرات تو پہلے ہی کم نہیں تھے۔ اب وہ یہ گھیرا مزید تنگ محسوس کرنے لگی تھی۔

اسی دوران میں شانی کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ موبائل اس کے شولڈر بیگ میں رکھا تھا۔ بیگ کی زپ وہ کھلی رکھتی تھی۔ اس نے فون کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ نامعلوم نمبر تھا لیکن پتا نہیں کیوں شانی کو لگا کہ یہ فون کال ریسیو کرنا اس کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنے گا۔ اس کی چھٹی حس کبھی کبھی اسے ایسے ہی واشگاف انداز میں خبردار کیا کرتی تھی۔

بہرحال اس نے بٹن دبا کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نہ صرف غیر متوقع تھی بلکہ اس نے شانی کے خدشات کی تصدیق بھی کر دی۔

یہ ڈی ایس پی ریاض ہٹلر کی آواز تھی۔ ''ہیلو بی بی جان! کیسی ہو؟ تمہارا خادم ڈی ایس پی ریاض بول رہا ہوں۔''

''آ..... آپ.....؟ تت..... تم؟'' وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

''ہاں ہاں..... آپ بھی اور تم بھی۔ ڈی ایس پی ریاض۔''

''تمہیں..... کیسے معلوم ہوا میرا نمبر؟''

ریاض نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔ ''بی بی جان! ہمارا تو کام ہی ''معلوم'' کرنا ہے۔ یہ تو صرف نمبر ہے۔ تمہارے اس خادم کو اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔ بتاؤں گا تو تیرے بڑوں کی دھوتی ڈھیلی ہو جائے گی۔''

''کس لیے فون کیا ہے؟'' شانی گریس سے دور ہٹ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''پولیس کسی وقت کسی کو بھی فون کر سکتی ہے لیکن..... فی الوقت میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ وہ تیرا یار رستم پھر سے وڈے ڈیرے میں پہنچ گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کتے کے جتھم کو ضرور کسی پیر فقیر کی بددعا لگی ہے۔ اچھا بھلا ڈیرے سے نکل گیا تھا، اب پھر گندی موت مرنے وہاں چلا گیا ہے۔''

''میں فون بند کر رہی ہوں۔'' شانی غصے سے بولی۔

''بند کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ پچھتانا پڑے گا تجھے اور تیرے پچھلوں کو۔''

ڈپٹی کے لہجے میں موجود دھمکی نے شانی کو لرزا دیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''اگر تم نے بات کرنی ہے تو اپنی زبان درست کرو۔''

''میری زبان تو پیدائش سے پہلے ہی ایسی تھی، اب کیا ٹھیک ہو گی لیکن اگر تم اپنے یار کو تھوڑی سی چمک دمک دکھاتیں تو اسے ٹھیک کر سکتی تھیں۔ وہ وڈے ڈیرے کی اوکھلی میں اپنا سر پھنسانے سے باز رہ سکتا تھا۔ اچھی بھلی کرارہی، خستہ لڑکی ہو تم۔ اس بے وقوف کو دو چار جھپیاں ڈالتیں، دو چار راتیں اس کے ساتھ سونے کا وعدہ کرنا تھا..... ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی بڑی بے وقوفی کرنے سے باز آ جاتا۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو اس کنجر کے بی کی لاش ہی آنی ہے ڈیرے سے اور دیکھنا ایسی ایسی جگہ گولی لگی ہو گی اسے کہ غسل دینے والا بھی شرمائے گا۔''

شانی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا تھا، اس نے فون بند کر دیا۔

دو چار منٹ بعد دوبارہ بیل ہوئی۔ اس مرتبہ نمبر دوسرا تھا۔ شانی نے کال ریسیو کی لیکن اس مرتبہ بھی ریاض کی منحوس آواز ہی کانوں میں پڑی۔ ''دیکھو فون بند نہ کرنا۔ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' ریاض کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ وہ سنجیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

''جو کہنا ہے جلدی کہو۔'' شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''بی بی جان..... دراصل حاجی حیات اور کچھ دوسرے افسر مجھ سے ناراض ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے جو ہر آباد میں تجھے تین متیوں والی دھمکی کیوں دی۔''

''تین متیوں والی؟'' شانی کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''اوئے اتنی جلدی بھول گئی ہے چھوٹی چودھرانی۔''

ریاض کے لہجے میں زہرناک طنز تھا۔ ''میں وہی بات کر رہا ہوں..... تین جنازوں والی۔''

شانی کا جسم سنسنا گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ ڈپٹی ریاض نے کس طرح سے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں دکھائی تھیں اور کہا تھا کہ اس نے پولیس کے ساتھ تعاون نہ کیا تو اس کے عزیزوں میں سے تین کے جنازے اگلے کچھ دنوں میں ضرور اٹھائے جائیں گے۔ یہ دھمکی جب بھی شانی کے ذہن میں آتی تھی، اس کی رگوں میں خون سنسنا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہوتا تھا کہ فی زمانہ پولیس کے کچھ افسران کتنے بااختیار اور بے لگام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی جیبوں میں قتل کرنے کا لائسنس لیے پھرتے ہیں۔ پولیس مقابلے کے نام پر کسی بھی شخص کی جان لے لینا ان کے لیے چنداں دشوار نہیں ہوتا اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ آج تک ایسے پولیس اہلکاروں میں سے کتنوں کا سنجیدگی سے ٹرائل ہوا ہے اور وہ اپنی قرار واقعی سزا تک پہنچے ہیں؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو ڈپٹی ریاض؟'' شانی نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میں اس جنازوں والی بات کے لئے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''یا تم ہوش میں نہیں ہو..... یا میرے کان ٹھیک سے نہیں سن رہے ہیں ڈپٹی صاحب۔''

''تمہارے دونوں اندازے غلط ہیں۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔'' ڈپٹی ریاض کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اس لہجے کے پیچھے کیا چھپا ہے، یہ جاننا کم از کم شانی کے لئے تو ممکن نہیں تھا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''ڈپٹی صاحب، آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ معافیاں مانگنا تو عوام کا کام ہے۔ آپ تو پولیس والے ہو اور ''پولیس والے'' بھی معمولی نہیں۔''

''دیکھو بی بی جان! طنز نہ کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ میں واقعی تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

شانی خاموش رہی۔ ڈپٹی ریاض نے ایک بار پھر اصرار سے کہا تو وہ رکھائی سے بولی۔

www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے، میں نے معاف کیا۔''

''نہیں نہیں بی بی جان..... ایسے نہیں۔ میں خود آنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنا شرمندہ ہوتا دکھانا چاہتا ہوں۔ ہاتھ جوڑنا چاہتا ہوں تمہارے سامنے۔''

''میرے لئے یہ کرنا مشکل ہے۔''

''لیکن میرے لئے نہیں۔ تم جہاں کہو گی، میں آجاؤں گا بلکہ میں اس کام میں زیادہ دیر بھی نہیں کرنا چاہتا اور بات یہ ہے کہ میرے ساتھ ملنے سے تمہارا بہت زیادہ فائدہ بھی ہوگا۔ قسم سے خوش ہو جاؤ گی تم۔''

شانی کو جھرجھری سی آگئی۔ ریاض کا لہجہ اسے ہمیشہ ایسے ہی لرزا دیتا تھا۔ اسے حاجی حیات خان کی بات یاد آگئی۔ انہوں نے مہتم بستی میں بھی شانی سے بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ ریاض ہنٹر کے ساتھ جو بھی بات چیت ہو اس سے انہیں آگاہ کیا جائے اور اپنے طور پر کوئی فیصلہ بھی نہ کیا جائے۔ شانی کو یہ ہرگز منظور نہیں تھا کہ حاجی حیات یا سب انسپکٹر اختر کے علم میں لائے بغیر ریاض ہنٹر سے ملاقات کرے۔

اس نے عذر تراشتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری بشیر میری طرف آرہے ہیں۔ میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتی..... سوری۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل فون بند کر دیا۔

اس کے جسم میں خفیف سی کپکپی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ریاض کی باتوں سے کسی نئے ہنگامے کی بُو آئی تھی۔

اگلے روز دوپہر سے ذرا قبل شانی لاہور سے گوجرانوالہ اور وہاں سے جوہر آباد جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ مُنے سے جدا ہونا اس کے لئے ہمیشہ کی طرح ایک تکلیف دہ تجربہ رہا۔ روانگی سے پہلے گریس کے ساتھ شانی کی طویل گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ گریس اور اس کا شوہر اسٹیفن جلد ہی شانی کے پیچھے آنے والے تھے۔ ان کا پروگرام نارپور پہنچنے کا تھا۔ نارپور کی حویلی تو جل چکی تھی لیکن حویلی کا جو بہت سا اسباب بچ گیا تھا، اس میں بڑے چوہدری مہر جی کا ذاتی سامان بھی موجود تھا۔ اس سامان میں سپ گندل گولیوں وغیرہ کی شکل میں موجود تھی۔ گریس اور اسٹیفن کو توقع تھی کہ مہر جی کے ذاتی سامان اور ذاتی ملازموں سے انہیں نایاب پودے کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہو سکیں گی۔''

شانی نے پوچھا۔ ''گریس! کیا آپ کے شوہر اس دور دراز دیہاتی بستی تک جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے؟''

وہ مسکرائی۔ ''مطلوبہ پودے کے کھوج کے لئے تو انہیں زمین کی ساتویں تہہ تک بھی

پہنچنا پڑے تو ضرور پہنچیں گے لیکن سچ پوچھو تو میری دلچسپی اب اس پودے سے زیادہ تم میں ہوگئی ہے۔ میں تمہارے آس پاس رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے حالات پر نظر رکھنا چاہتی ہوں اور تمہارے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں جو میں نے دل میں سوچ رکھا ہے۔''

وقت رخصت بشیر نے شانی سے مزید کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی نگاہیں ایک نہایت کرخت اور شکی مزاج شوہر کی نگاہیں تھیں۔ یہ نگاہیں شانی کو بہ زبان خاموشی وارننگ دے رہی تھیں۔ ایک بار پھر معاف کر رہا ہوں لیکن اگلی بار نہیں کروں گا۔

شانی ہوٹل میں پہنچی۔ وہاں سے عارف کو لیا اور بذریعہ بس گوجرانوالہ روانہ ہوگئی۔ شانی کے منع کرنے کے باوجود چوہدری نے دو مسلح گارڈز بھی شانی کے ہمراہ کر دیئے تھے۔ ان گارڈز کو جوہر آباد تک شانی اور عارف کے ساتھ رہنا تھا۔ گوجرانوالہ تک کا سفر خاموشی اور خیریت سے طے ہوا۔ راستے میں عارف نے تازہ اخبار شانی کو دکھایا۔ اس میں وادی سون میں پولیس ایکشن کے حوالے سے خبر موجود تھی۔ یہ خبر بھی ڈپٹی ریاض کی اطلاع کی تصدیق کرتی تھی۔ خبر کے مطابق رستم مبینہ طور پر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس وڈے ڈیرے پہنچ چکا تھا۔ نامہ نگار نے لکھا تھا۔ ''رستم کی واپسی بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی ہے۔ اس نے نظر وال کے مقام پر بڑی بے خوفی سے ایک پولیس اہلکار جبار عرف جبرو کو قتل کیا۔ جبرو نامی یہ اہلکار چند روز پہلے رستم کے ہی ایک حملے میں زخمی ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر دستی بم کے آہنی ذرات لگے تھے۔ اس کا چہرہ بینڈیج میں چھپا ہوا تھا۔ رستم نے چالاکی کا ثبوت دیا اور مقتول جبرو کا لباس پہن کر اس کی بینڈیج میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور پولیس کیمپ سے وڈے ڈیرے پر جا پہنچا۔ رستم کی شناخت اس کے چھوڑے ہوئے فنگر پرنٹس سے ہوئی ہے۔ اس حوالے سے مزید اطلاعات آرہی ہیں۔''

عارف نے کہا۔ ''شانی! تمہیں بتایا تھا ناں، رستم وہاں ضرور پہنچے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ کاش ہم اسے روک سکتے۔''

''نہیں عارف! اس نے نہیں رکنا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے کیا ہوا وعدہ اسے واپس کھینچ رہا تھا۔'' شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

عارف نے اخباری خبر کی ذیلی سطور پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور غم ناک اطلاع ہے شانی بہن!''

''کیا؟'' شانی لرز گئی۔

''رستم کا ساتھی گوہر ارا راستے میں مارا گیا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''اوہ خدایا، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' شانی نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

بس سے اُترنے کے بعد انہوں نے ایک ٹیکسی کار پکڑی اور سفر کے اگلے مرحلے کے لئے تیار ہوئے۔ عارف اور شانی دونوں کو بھوک لگی تھی..... خاص طور سے عارف نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کھانا پارسل کرانے کے لئے ایک قریبی ریسٹورنٹ کی طرف چلا گیا۔ شانی ٹیکسی کار میں ہی بیٹھی تھی۔ گارڈز باہر جا کر کھڑے ہو گئے۔ موبائل کی بیل ہوئی۔ شانی نے کال ریسیو کی۔ آواز سن کر وہ پھر کانپ گئی۔ ریاض ہٹلر بول رہا تھا۔ اس مرتبہ اس نے کسی دوسرے نمبر سے کال کی تھی۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ شانی کال ریسیو نہیں کرے گی۔ ''دیکھو فون بند نہ کرنا، ورنہ تمہیں بُری طرح پچھتانا پڑے گا۔'' ریاض نے کہا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''کہا تو ہے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں..... تین جنازوں والی بات کے سلسلے میں۔''

اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔

''میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ اب تم مجھے معاف کرو۔'' شانی جھلا کر بولی۔

''دل سے کہہ رہی ہو یا اوپر اوپر سے۔''

''دل سے..... دل کی گہرائی سے۔''

''کاش تم سامنے ہوتیں۔ مولا کی قسم تمہارے پاؤں کو ہاتھ لگاتا۔ تمہارے سامنے کان پکڑتا، مرغا بن جاتا اور اقرار کرتا کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ اب بھی تم یہی سمجھو بی بی جان..... کہ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کروں گا۔ کیا تم میری بات پر یقین کر رہی ہو؟''

''ہاں..... کر رہی ہوں۔'' ریاض کا لہجہ شانی کو سراسیمہ کر رہا تھا۔

''میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ پیشگی معافی مانگ لیا کرتا ہوں۔'' ریاض نے اطلاع دی۔

''کک..... کیا مطلب؟''

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی..... پھر ایک ایسی آواز سنائی دی، جیسے بکرا ذبح کیا جا رہا ہو۔ کوئی دردناک آواز میں چیخا۔ ''مجھے بچا لو..... خدا کے واسطے بچا لو۔ میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔''

شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ آواز اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ جمشید کی آواز

www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ وہی خوبرو نوجوان جو جوہر آباد کے قبرستان میں ہونے والی لڑائی کے بعد پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ وہ خالو اعجاز کا سالا اور خالہ فیروزہ کا بھائی تھا۔ اس کی نوبیاہتا بیوی فرحانہ والی کی گرفتاری کے بعد سے دن رات تڑپ رہی تھی۔ حقیر کے تھانے میں ڈپٹی ریاض نے اسے الٹا لٹکایا تھا اور اس پر تشدد کیا تھا۔ آج وہ شاید پھر تشدد کے شکنجے میں تھا۔

''تم جمشید ہو ناں؟'' شانی کراہی۔

''ہاں بہن! یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میری جان لے لیں گے۔ انہوں نے پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔''

''کہاں ہو تم؟''

وہ روتے ہوئے بولا۔ ''یہ مجھے ایک بند ٹرک میں بٹھا کر ویران جگہ پر لے آئے ہیں۔ ایک اور حوالاتی بھی ہے ان کے ساتھ۔ یہ مجھے ٹرک سے اُتار کر بھگائیں گے اور پیچھے سے گولی مار دیں گے۔ خدا کے لئے شانی بہن یہاں آ کر مجھے بچا لو۔ تم ہی بچا سکتی ہو۔''

اتنے میں کسی نے ریسیور جمشید کے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ ڈپٹی ریاض ہی تھا۔ اس مرتبہ اس کی آواز بے حد سفاک تھی۔ ''مجھے پتا ہے، تمہارا دھیان سیدھا حاجی حیات کی طرف جا رہا ہوگا۔ اسے مدد کے لئے بلانے کا کیڑا دماغ میں حرکت کر رہا ہوگا لیکن پیاری بی بی جان..... ہاتھ باندھ کر درخواست کرتا ہوں۔ یہ حرکت نہ کرنا۔ جیسے ہی تم یہ حرکت کرو گی مجھے فوراً سے پہلے پتہ چل جائے گا۔ بعد میں جو کچھ ہوگا وہ تو ہوگا ہی لیکن اس سے پہلے اس چھوکرے کی بتی بجھ جائے گی۔''

''یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو ڈپٹی ریاض۔ ابھی..... تو تم معافی مانگ رہے تھے۔''

''میں نے تین جنازوں والی بات کے لئے تم سے معافی مانگی اور تم نے معاف کر دیا۔ اب یہ تین خون تو مجھے معاف ہی ہیں۔ بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔''

''کیا مطلب..... تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو؟''

''قتل کرنا نہیں چاہتا، اسی لئے تو تمہیں اس کی آواز سنا رہا ہوں لیکن اگر تم یہاں نہیں آؤ گی یا اپنے خصم حاجی حیات کو بتانے کی کوشش کرو گی تو پھر پہلا جنازہ تو تیار ہو چکا لیکن اگر تم یہاں آ جاؤ گی تو یہ بچ جائے گا اور تم پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی، یہ میرا وعدہ ہے۔''

''مم..... میں نہیں آ سکتی۔'' شانی ہکلائی۔

''تم آ سکتی ہو۔ چوہدری بشیر سے کوئی بہانہ بنا لو۔ عاشقی معشوقی کرنے والوں کے پاس تو ایک سو ایک بہانے ہر وقت تیار پڑے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کوٹھی سے نکل آؤ گی تو

گوجرانوالہ پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔"

شانی کو اندازہ ہوا کہ ڈپٹی ریاض ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ چوہدری بشیر کی کوٹھی سے بول رہی ہے۔ یہ ایک بہتر صورتِ حال تھی۔ شانی نے کہا۔ "میں یہاں سے نہیں نکل سکتی۔ چوہدری صاحب اجازت نہیں دیں گے۔"

"اوئے! اس نے ابھی تیرا گھونگلا تو اٹھایا نہیں اور تُو نے اجازتیں پہلے ہی مانگنا شروع کر دی ہیں اس سے۔ اتنا چوڑ نہ کرا سے، شادی کے بعد تنگ کرے گا تجھے۔"

"فضول باتیں نہ کرو تم۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ پر حملہ ہوا ہے۔ ایک بندہ چاقو لے کر یہاں کوٹھی میں گھس آیا تھا۔ مجھے مارنے کی کوشش کی ہے اس نے۔ چوہدری صاحب مجھے کبھی باہر جانے کی اجازت نہیں دے گے۔ تم فون پر بتاؤ تو کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"بات فون پر بتانے والی ہوتی تو اتنا لمبا چوڑا بکھیڑا کیوں پالتا۔ تمہیں بہ قلم خود آنا پڑے گا مسماۃ شہناز عرف شانی۔ ورنہ اس چھوکرے کی بتی گل ہو جائے گی۔"

"میں نہیں آ سکتی۔" شانی جھلا کر بولی۔

"میں اسے مار رہا ہوں۔" ڈپٹی کا لہجہ ایک دم خوفناک ہو گیا۔ وہ نشے میں چُور لگ رہا تھا۔

"تمہارا کام صرف ملزم کو پکڑنا ہے۔ اسے سزا کورٹ دے سکتی ہے۔"

"واہ وا..... کیا بات ہے۔ کیا ڈائیلاگ ہے۔ نو سو چوہے کھانے والی گھابن بلی مجھے قانون سکھا رہی ہے۔ صدقے جاؤں تیرے اگلے پچھلوں پر۔ چل تُو بھی کیا یاد کرے گی۔ تجھے بتا دیتا ہوں کہ سچی اور جھوٹی دھمکی میں کیا فرق ہوتا ہے۔" ڈپٹی ریاض کے ڈکار لینے کی گندی سی آواز فون پر ابھری پھر اس نے اپنے کسی ماتحت کو مخاطب کر کے کہا۔ "اوئے رحمت..... چل ذرا اس چھوکرے کے لئے زحمت بن جا۔ وہ میرا دوسرا پستول نکال کر لے آ بیگ میں سے۔"

پس منظر میں جمشید کے رونے کی آواز آئی۔ وہ التجا لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دو دیہات کے درمیان ہونے والی لڑائی کا ایک کردار آج کس موڑ پر کھڑا تھا۔ وہ لڑائی میں بڑے جوش سے لڑا تھا۔ اس کی بیوی فرخندہ نے للکارے مار مار کر اپنے شوہر کی ہمت بندھائی تھی پھر جب جمشید کو ہتھکڑی لگی تھی، اس وقت بھی فرخندہ نے اسے شاباشی کی نظروں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں کو محسوس کر کے جمشید کا سینہ فخر سے کچھ اور بھی پھول گیا تھا لیکن اب یہ کہانی چلتے چلتے دو تین مہینوں میں ہی ایسے موڑ پر پہنچ گئی تھی کہ فرخندہ اور جمشید دونوں رو رہے تھے اور ان کے

لواحقین بھی سراپا فریاد بنے ہوئے تھے اور یہ صرف ایک جمشید کی کہانی نہیں تھی۔ اس لڑائی کے بعد ڈپٹی ریاض کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے درجنوں افراد تھانے کچہریوں کے چکر میں "قابلِ رحم" ہو گئے تھے۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ نہ ہی وہ یہ جان پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اسے ڈپٹی ریاض کے جنونی لہجے سے خوف تو آ رہا تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی انتہائی اقدام اٹھائے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ دل کو پھاڑ کر سوکھڑے کرنے والا تھا۔ پہلے گرجنے برسنے کی چند آوازیں سنائی دیں۔ پھر کوئی چلایا..... یقیناً یہ جمشید ہی تھا۔ اس کی آواز پہلے قریب سے آئی پھر دور ہوتی چلی گئی۔ شاید وہ بھاگا تھا۔ تب اوپر تلے دو گولیاں چلیں اور سناٹا چھا گیا۔

شانی سکتہ زدہ تھی۔ چند سیکنڈ بعد (قریباً تیس سیکنڈ بعد) ڈپٹی ریاضی کی وحشی آواز فون پر ابھری۔ "دیکھو، میں نے وعدے پر عمل کیا ہے۔ یہ پہلا جنازہ اسی خاص پسٹل سے تیار کیا ہے جو میں نے تمہیں دکھایا تھا۔ یہ پسٹل تیرے ہی تین رشتے داروں کے لئے علیحدہ رکھا ہوا ہے۔"

شانی کا سکتہ ٹوٹا۔ اس کا حلق لکڑی کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل بولی۔

"تم..... جھوٹ بول رہے ہو..... مجھے ڈرا رہے ہو۔ جمشید زندہ ہے۔"

"کھوپڑی میں موری ہو جائے اور اس میں سے بھیجا باہر نکل آئے..... تو بہت کم بے شرم ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہتے ہیں۔"

"خدا کے لئے..... خدا کے لئے ڈپٹی ریاض! مجھے بتاؤ وہ زندہ ہے ناں؟" ٹیکسی کار سے باہر کھڑے دونوں گارڈز شانی کو بے حد پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

دوسری طرف سفاک خاموشی تھی۔ بس کسی کے رونے کی مدھم آواز آتی رہی۔ شانی نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ آواز جمشید کی ہی ہو..... وہ ایک بار پھر کراہی۔ "تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ مجھے بتاؤ ناں..... تم نے کچھ نہیں کیا ناں..... وہ زندہ ہے؟"

"تمہیں میری گتی زبان پر یقین کہاں آئے گا بی بی جان۔ لے میں تیرے ہی جاننے والے سے تصدیق کرا دیتا ہوں۔"

تب ڈپٹی ریاض دھاڑ کر بولا۔ "ادھر آ جا چاچا، اپنی بھتیجی کو بتا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

چند سیکنڈ بعد جو آواز شانی کے کانوں تک پہنچی وہ جگر پاش تھی۔ شانی اس آواز کو بھی فوراً پہچان گئی۔ یہ اس کے تایا معصوم کی آواز تھی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

''شانی، اس ظالم نے مار دیا ہے جمشید کو۔ وہ سامنے جھاڑیوں میں اس کی لاش پڑی ہے۔'' تب ایک دم یوں لگا کہ تایا معصوم ڈی ایس پی پر جھپٹ پڑے ہیں۔ دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ تایا معصوم کی چلاتی ہوئی آواز فون کے ریسیور سے گزر کر شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''مجھے بھی مار ڈال..... میری بھی جان لے لے۔ ایک گولی مار دے میرے کلیجے میں بھی۔''

''تیری خواہش بھی ضرور پوری کروں گا بڈھے۔ اگر تیری یہ حرام زادی بھتیجی نہ مانی تو ابھی تیرے ہاتھ میں بھی ''اوپر'' جانے والی بس کا ٹکٹ تھماؤں گا۔''

یوں لگا کہ ڈپٹی ریاض تایا معصوم کو کھینچتا ہوا فون سیٹ کے قریب لایا ہے..... پھر وہ ماؤتھ پیس میں گرجا۔ ''اگلا جنازہ تیرے تایا معصوم کا ہوگا۔ میں جانتا ہوں ایسے ٹھرکی بڈھے نوسو چوہے کھا کے بھی معصوم کے معصوم ہی رہتے ہیں۔''

شانی چلائی۔ ''نہیں..... میرے تایا کو کچھ نہیں کہنا۔ یہ بے قصور ہیں، یہ بے گناہ ہیں۔ کیا کیا ہے انہوں نے؟ کیوں مارو گے تم انہیں؟''

''تیرے اس تایا معصوم نے تیرے خالو اعجاز اور دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ پولیس پارٹی پر حملہ کیا۔ جمشید کو چھڑانے کی کوشش کی۔ باقی تین بندے تو فرار ہو گئے لیکن یہ تیرا تایا معصوم اور جمشید پولیس فائرنگ سے ہلاک ہو گئے۔ پچ پچ..... ایسے بڈھے بھی جن کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہیں پنگے لینے سے باز نہیں آتے۔'' ڈپٹی ریاض نے تاسف کا اظہار کیا۔

شانی کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈپٹی ریاض ایک گھڑی گھڑائی کہانی شانی کو سنا رہا ہے۔ یہ بڑی گھسی پٹی کہانی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ پولیس اور سرکاری وکیل اس کہانی کو ہر عدالت میں سچ ثابت کر کے دکھا سکتے ہیں۔

ڈپٹی ریاض کی سفاک آواز شانی کے کانوں میں گونجی۔ ''دیکھو بی بی جان! میں اپنی بات دہراؤں گا نہیں۔ اگر تم واقعی لاہور میں بشیرے کی کوٹھی میں ہو تو ایک گھنٹے کے اندر گوجرانوالہ پہنچ سکتی ہو۔ میں تمہیں دو گھنٹے دیتا ہوں لیکن دو گھنٹے سے زیادہ تمہارا انتظار نہیں کر سکتا۔ تمہیں دو گھنٹے کے اندر میرے پاس پہنچنا ہے ہر صورت..... ہاں، میں یہ وعدہ کرتا ہوں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب مجھے تمہارا جواب ہاں یا ناں میں چاہیے۔ تم آ رہی ہو یا نہیں؟''

''خدا کے لئے ڈپٹی! تایا کو کچھ نہیں کہنا۔''

''میرے سوال کا جواب دو۔ آ رہی ہو یا نہیں؟''

''مم..... میں کیسے آؤں..... میں نے.....''

''اوئے رحمت علی پسٹل لاؤ۔'' ڈپٹی ریاض نے شانی کی بات بے رحمی سے قطع کی۔

شانی سرتاپا کانپ گئی۔ اس نے اپنے خشک گلے سے بہ مشکل آواز نکالی۔ ''مجھے..... سوچنے دو۔''

''مجھے جواب دو۔ آ رہی ہو یا نہیں؟'' ڈپٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

شانی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو کر ٹیکسی کی سیٹ پر ہی گر جائے گی لیکن اگر وہ گر جاتی تو شاید تایا معصوم کی لاش بھی گر جاتی۔ جمشید کی لاش کے پاس ہی کہیں وہ بھی جھاڑیوں میں اوندھے منہ گرتے اور ختم ہو جاتے۔

''مم..... میں آ رہی ہوں۔ مجھے کہاں پہنچنا ہے؟'' وہ کراہی۔

''گڈ گرل۔'' ڈپٹی نے کہا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا، اپنے دماغ میں حاجی حیات والا کیڑا نہ رینگنے دینا۔ اگر تُو نے حاجی یا اس کے کسی کزن سے کوئی کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تو میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو لیکن میں نے تیرے گھر سے دو اور جنازے ضرور بہ ضرور نکال دینے ہیں۔''

''نہیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ جمشید کی خونچکاں لاش شانی کے تصور میں تھی اور اس کے ساتھ ہی نوید ہاتھا فرخندہ اور خالہ فیروزہ کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ لوگ نہ جانے کہاں تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کی آنکھیں اپنے جس پیارے کی راہ پر لگی ہیں وہ ایک خوفناک پولیس افسر کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازہار چکا ہے۔

ڈپٹی ریاض نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سمعاۃ شانی! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم بشیرے کی کوٹھی میں ہو یا کہیں اور..... مجھے لگتا ہے جیسے تم کوٹھی کے اندر سے نہیں بول رہی ہو؟''

شانی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''میں کوٹھی میں نہیں ہوں۔ میں گوجرانوالہ بائی پاس کے قریب ایک ٹیکسی کار میں ہوں۔ مجھے بتاؤ، مجھے کہاں پہنچنا ہے؟''

''پکی بات ہے کہ بشیرے نے تمہارے ساتھ دو تین کرائے کے مسلح ٹٹو بھی بھیجے ہوں گے، بھیجے ہیں ناں؟''

''دو گارڈز ہیں۔'' شانی نے اعتراف کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

''اور وہ ماں کا لیڈر.....کیسوہ؟''

''ہاں.....وہ بھی ہے۔''

''اس وقت کہاں ہے وہ؟''

''بازار سے اپنے اور گارڈز کے لئے کھانا لینے گیا ہے۔''

''ویری گڈ۔ اس کے آنے سے پہلے تم نکل آؤ۔ کرائے کے ٹٹوؤں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جلدی کرو شاباش۔ جتنی جلدی پہنچو گی، اتنی جلدی تمہیں فارغ کروں گا۔ یہاں سے کوئی بھی رکشہ وغیرہ پکڑ لو۔ سیدھی نہر کے پاس جی ٹی روڈ پر آجاؤ۔ میں تمہیں دوبارہ کال کر کے صحیح لوکیشن بتاتا ہوں اور ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑ کر درخواست ہے۔ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لانا۔''

پس منظر میں تایا معصوم کے بولنے اور کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ''ٹھیک ہے، میں آرہی ہوں۔'' شانی کراہی۔

اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ اگر ان لمحوں میں اس نے ڈپٹی کی بات مان نہ لی تو جمشید کی طرح تایا معصوم کی جان بھی چلی جائے گی اور اس کے بعد تیسرا نمبر پتا نہیں کس کا ہوگا۔

وہ ٹیکسی کار میں سے نکلی۔ عارف کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ گارڈز کے لئے گوجرانوالہ کے مشہور تکے لانے کے لئے تھوڑا آگے چلا گیا تھا شاید۔

چوہدری بشیر کے ایک گارڈ نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔ ''میڈم جی خیریت تو ہے؟''

''ہاں خیریت ہے۔'' شانی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کہیں جانا ہے؟''

ایک لمحے کے لئے شانی کے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دے کہ وہ ڈپٹی ریاض کی طرف جارہی ہے لیکن پھر تایا معصوم کا خون میں نہایا ہوا جسم اس کی آنکھوں کے سامنے گھوما اور وہ بولی۔ ''تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ عارف کو بھی یہیں روکنا۔''

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک رکشا کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ گارڈ بے چین ہو کر بولا۔ ''میڈم! ہم میں سے کسی کو ساتھ لے جائیں۔''

شانی نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا اور رکشا میں گھس گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو خود بخود لڑھکتے جارہے تھے۔ جمشید کا مُردہ چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے ڈپٹی ریاض کی سفاکی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج پہلی بار وہ اس سفاکی کو اصل

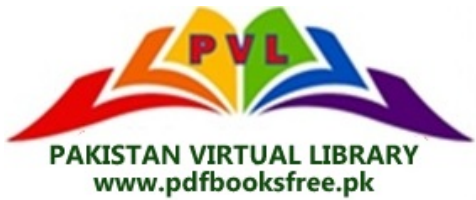
روپ میں دیکھ رہی تھی۔

اسے عارف کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ رستم نے وادی سون میں پولیس کے گھیرے سے نکلتے ہوئے ڈپٹی ریاض کے پیٹ میں لات مار کر اسے نشیب میں گرا دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے ڈپٹی ریاض بالکل آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ ہینڈ گرینیڈ والے واقعے نے اس کی آتش فشانی میں اضافہ کیا تھا اور اب وہ نہایت سفاکانہ طریقے سے شانی کو اپنے پاس بلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس کے منہ سے آواز کے بجائے شانی کو شعلے نکلتے محسوس ہوئے تھے۔ پتا نہیں اس کے ارادے کیا تھے؟ شانی نے رکشا والے کو نہر کے پل کی طرف چلنے کا کہا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے جسم و جاں میں طوفان برپا تھے۔

☆======☆======☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk



حوالدار اجمل خان اور رستم دوڑتے ہوئے وڈے ڈیرے تک پہنچے تھے۔ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر ایک جگہ رستم ایک چٹان کے پیچھے رک گیا تھا۔ اس نے اپنا ٹارچ والا ہاتھ بلند کر کے ٹارچ کو مخصوص انداز میں جلایا بجھایا تھا۔ دو قفے وقفے سے اس نے اپنا یہ عمل تین بار دہرایا اور پھر سامنے سے ایک للکارتی ہوئی پُر جوش آواز رستم کے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ جسنے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو فائرنگ روکنے کا حکم دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹارچ کا اشارہ دیکھ لیا گیا ہے۔

اور پھر رستم اور اجمل خان وڈے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں چھپے کے آس پاس مشعلوں کی روشنی تھی۔ رستم کو اپنے درجنوں ساتھی نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح اور مرنے مارنے پر تیار نظر آتے تھے۔ کچھ افراد نے رستم اور اجمل خان کی طرف رائفلیں تان لیں۔ سب سے پہلے حسنا گھبراتی ہی رستم کے سامنے پہنچا۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''رستم۔'' رستم نے جواب دیا اور اپنے چہرے سے پٹی کھولنا شروع کر دی۔

ایک دم رائفلیں جھک گئیں۔ خستہ حال مدقوق چہروں پر روشنی سی نظر آنے لگی۔ رستم نے تیزی سے اپنی پٹی کے بل کھولے اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ رستم کی صورت دیکھتے ہی چند افراد نے ہوائی فائرنگ کر کے خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی درجنوں افراد نے ہوائی فائرنگ کی اور پُر جوش نعرے لگانے لگے۔ ایک لہر سی تھی جس نے اردگرد موجود ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اجمل خان بھی حیرت سے رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جس بندے کے ساتھ گولیوں کی بارش میں بھاگتا ہوا یہاں پہنچا ہے وہ رستم ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور رستم کے گلے سے لگ کر اس کا کشادہ شانہ چوما۔ اس کی آنکھوں میں رستم کو

آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ ابھی تک رستم کو اس شخص کی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ خود کو قدرت اللہ کا پُر جوش عقیدت مند بتا رہا تھا اور رستم کو کچا چبانا چاہتا تھا لیکن اب وہ رستم کے گلے سے لگا ہوا تھا۔ اب خبر نہیں تھی کہ وہ جھوٹ تھا یا یہ جھوٹ ہے۔ اجمل خان کا پستول ابھی تک رستم کے پاس ہی تھا۔

رستم نے دیکھا سرنگ نمبر ایک کے دہانے کے پاس بہت سے بیگ وغیرہ رکھے تھے اور ڈیرے پر موجود قریباً چالیس گھوڑے اور کچھ خچر وغیرہ ایک جگہ بندھے تھے۔ رستم نے خود کو جسنے کی ولولہ انگیز گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''فرید کہاں ہے؟''

''ابھی فائرنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں تھا۔'' کالھیا نے جواب دیا۔

رستم کے چاروں طرف اب مشعلیں بھڑک رہی تھیں۔ لوگ سرنگوں کے اندر سے نکل نکل کر احاطے میں جمع ہو رہے تھے۔ رستم ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا چھپے کے پہلے کمرے میں پہنچا۔ دل سے ایک ہوک اٹھی۔ یہاں وہ مہناز اور اس کے بچے ٹیپو کو دیکھا کرتا تھا۔ اس سامنے والے کمرے میں بیٹھ کر وہ کھانا کھاتا تھا۔ ننھا ٹیپو، کھانے کے دوران میں باورچی خانے اور کمرے کے درمیان چکراتا رہتا تھا۔ مہناز گھونگھٹ کی اوٹ سے پوچھتی تھی۔ ''رستم بھائی! کوئی اور چیز تو نہیں چاہیے۔''

لیکن آج یہ آواز نہیں تھی۔ مہناز نہیں تھی، اس کا بچہ نہیں تھا اور خود لالہ فرید بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم کو برآمدے میں لمبے تڑنگے جسم والی حنیفاں نظر آئی۔ وہ ایک گٹھڑی میں کچھ کپڑے وغیرہ رکھ رہی تھی۔

رستم کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا۔ رستم نے پوچھا۔ ''یہ کیا باندھ رہی ہو؟''

''سامان ہے بھاجی! لالے کا اور مرنے والی کا اور بچے کا بھی۔'' حنیفاں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔ ''ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں ناں۔''

رستم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یقیناً اس احاطے میں پڑے ہوئے بیگ تھیلے اور گھوڑے خچر وغیرہ بھی اسی روانگی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

''لالہ کہاں ہے؟'' رستم نے تیزی سے پوچھا۔

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ''قبروں کی طرف گئے ہیں۔''

رستم حنیفاں کو وہیں چھوڑ کر ڈیرے کے مختصر قبرستان کی طرف لپک گیا۔ ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ اس نے تیزی سے طے کیا۔ قبرستان میں پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ قبرستان اب مختصر نہیں رہا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ اس کا رقبہ تقریباً دوگنا ہوگیا تھا۔ کم وبیش بیس نئی قبریں نظر آرہی تھیں اور ان میں سے دو قبریں بھرجائی مہناز اور ٹیپو کی تھیں۔ ایک جگہ کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ یہاں ہندوؤں کے انداز میں کسی مُردے کی چتا جلائی گئی ہے۔ وڈے ڈیرے پر سندھ سے تعلق رکھنے والا ایک ہندو بھی موجود تھا۔ اگر یہ واقعی چتا تھی تو پھر اسی ہندو لکھی رام کی ہوسکتی تھی۔ بیری کے ایک درخت کے دوشاخے میں ایک مشعل اُڑس دی گئی تھی۔ اس مشعل کی سرخ روشنی قریباً دس مربع میٹر جگہ کو روشن کررہی تھی۔ رستم کو اس روشنی میں فرید تنہا بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کی بیوی اور بچے کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔ ماں بیٹا اسی طرح پہلو بہ پہلو لیٹے تھے جیسے زندگی میں لیٹتے ہوں گے۔ فرید نے رستم کا سایہ اپنے پہلو میں دیکھا لیکن گھوم کر رستم پر نگاہ نہیں ڈالی۔ ''یہ فائرنگ کیوں ہورہی تھی؟'' اس نے رستم پر نگاہ ڈالے بغیر پوچھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا کوئی ساتھی اسے واپس بلانے کے لئے آیا ہے۔

رستم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ فائرنگ اس لئے ہورہی تھی کہ ایک دوست کو اپنے دوست سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا۔''

رستم کی آواز سن کر فرید تیزی سے پلٹا۔ اس کی آنکھیں رورو کر سوجی ہوئی تھیں۔ رستم کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر غم کا گہرا سایہ دکھائی دیا۔ ''اوئے میرے یار! تُو نے یہ کیا کیا؟ تُو کیوں یہاں آگیا؟''

''میں اس لئے یہاں آگیا کہ میں آجانے کے لئے گیا تھا۔''

''لیکن..... اب آنے کا کون سا وقت تھا رستم! یہ تُو نے اچھا نہیں کیا یار۔'' لالے فرید کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ آگے بڑھا اور رستم کے گلے سے لگ گیا۔ دونوں دوست کتنی ہی دیر ایک دوسرے کی بانہوں میں کھڑے رہے۔ فرید کے سینے میں آنسوؤں کی ہلچل تھی مگر اس کی ''برداشت'' کا تقاضا تھا کہ غم زدہ آواز ہونٹوں کے حصار سے باہر نہ نکلے۔ رستم نے فرید کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پُرسا دینے والے انداز میں بولا۔ ''حوصلہ کرو فرید۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں قبرستان سے واپس ڈیرے کی طرف جارہے تھے۔ رستم نے چتا کے آثار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے فرید؟''

فرید نے تصدیق کی کہ ڈیرے کا اکلوتا ہندو لکھی رام مرگیا ہے لیکن اس کی موت پولیس کی گولی سے نہیں، بیماری سے ہوئی تھی۔ وہ سات آٹھ دن پہلے مرا تھا..... ڈیرے کے طول و عرض میں مشعلیں چکرا رہی تھیں اور ہلچل نظر آتی تھی۔ احاطے سے تقریباً سو میٹر پہلے ہی رستم اور فرید درختوں کے ایک جھنڈ میں رک گئے۔ رستم نے کہا۔ ''فرید! یہ کہاں جانے کی تیاری

ہورہی ہے؟''

فرید نے کہا۔ ''پانڈو درے کی طرف!''

''کیوں؟''

''نظام کا پیغام آیا ہے۔ اس کے مخبروں نے بتایا ہے کہ پانڈو کی طرف سے پولیس والوں کا گھیرا بہت کمزور ہے۔ نفری نہ ہونے کے برابر ہے۔ نظام کا کہنا ہے کہ ہم کوشش کریں تو وہاں سے پولیس کا گھیراؤ توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے باہر کے کچھ لوگ بھی ہماری مدد کرسکتے ہیں۔''

''باہر کے کون لوگ؟''

''سنگوال برادری کے بندے۔'' فرید نے جواب دیا۔ ''تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ مقامی اجرالی پولیس والوں کی مدد کررہے ہیں۔ اجرالیوں اور سنگوالیوں میں پرانی دشمنی چلی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگوالی پولیس کے خلاف بھی ہوگئے ہیں۔ وہ پولیس کا گھیرا توڑنے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ نظام نے بتایا ہے کہ وہ جتھوں کی صورت میں پانڈو درے کے پار جمع ہیں۔ ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ نظام کے مشورے پر عمل کریں۔ ہمارے پاس خوراک اور ایمونیشن ختم ہوتا جارہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس والے گولی چلائے بغیر ہی ہمیں ختم کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

رستم نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''فرید، جہاں تک مجھے اطلاع ملی ہے پانڈو کی طرف سنگوالیوں کا کوئی جتھہ نہیں ہے اور وہاں اتنی زیادہ پولیس کھڑی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

''کیا مطلب؟'' فرید کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

''ہمارے ساتھ چال چلی جارہی ہے فرید..... اور یہ اتنی خطرناک چال ہے کہ اس میں ڈیرے کا کوئی بندہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ نظام پولیس کی حراست میں ہے۔ وہ جو بیان دے رہا ہے پولیس کے کہنے پر دے رہا ہے۔ اس کی جوان بیٹی گوجرانوالہ کے تھانے میں بند ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو رستم؟''

''میں تمہیں سو فیصد ٹھیک اطلاع دے رہا ہوں اور یہی اطلاع دینے کے لئے میں برستی گولیوں میں یہاں تک پہنچا ہوں۔'' فرید بے حد تعجب سے رستم کا چہرہ دیکھتا چلا جارہا تھا۔

''ہاں فرید! شکر کرو کہ میں بروقت پہنچ گیا ہوں..... اصل بات یہ ہے کہ ڈپٹی ریاض

www.pdfbooksfree.pk

اور اس کے ساتھی بارودی سرنگوں سے خوف زدہ ہیں۔ وہ کسی طرح تم لوگوں کو بارودی سرنگوں سے دور ہٹانا چاہتے ہیں۔"

فرید نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ "اس حوالے سے تھوڑا بہت شک تو میرے دماغ میں بھی تھا..... لیکن یہ جو تم نظام والی بات کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ میں نے ابھی چند گھنٹے پہلے اس سے بات کی ہے۔ وہ بڑے عام لہجے میں بول رہا تھا۔"

"میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کہہ رہا فرید..... خود اس سے مل کر آیا ہوں۔ اس کی ساری بپتا سنی ہے میں نے۔"

"پھر اب کیا مشورہ ہے تمہارا؟"

"مشورہ یہی ہے کہ ہم پانڈو کی طرف جائیں گے تو خود کشی کریں گے۔"

دونوں دوستوں نے کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کی۔ پھر یہ طے ہو گیا کہ وڈے ڈیرے سے باہر نہیں نکلا جائے گا۔ رستم کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ دونوں دھیمے قدموں سے ڈیرے پر پہنچے۔

واپس پہنچتے ہی رستم نے نادیہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ دوسری طرف لالہ فرید نے ساتھیوں کو نیا حکم سناتے ہوئے سامان کھولنے اور اپنی پوزیشنوں پر واپس جانے کی ہدایت کی۔ شروع میں اس نئے حکم کو حیرت اور پریشانی کے عالم میں سنا گیا تاہم جلد ہی تمام لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ پروگرام کی اس اچانک تبدیلی کا تعلق رستم کی واپسی سے ہے اور رستم اپنے ساتھ کوئی ایسی اطلاع لایا ہے جو اس الٹ پلٹ کا سبب بنی ہے۔

کچھ سامان خچروں پر لادا جا چکا تھا۔ اسے واپس اُتارا جانے لگا۔ لالہ اس کام کی نگرانی کرنے لگا۔ رستم نے جسے سے پوچھا۔ "نادیہ نظر نہیں آرہی۔ کہاں ہے وہ؟"

"ابھی جب تم قبرستان کی طرف گئے تھے، وہ تمہیں ہی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ وہ تو میں نے ہی جھڑکا ہے کہ جا کر کمرے میں بیٹھ۔ ابھی آجاتا ہے تجھ سے ملنے۔"

"اب کمرے میں ہے؟"

"میرا خیال ہے، وہیں ہو گی۔"

رستم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا تیجھے کی طرف آیا۔ نادیہ کمرے کے دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے رستم کو یوں لگا کہ وہ بھاگ کر آئے گی اور اس سے لپٹ جائے گی۔ یہ پرواہ بھی نہیں کرے گی کہ آس پاس موجود لوگ یہ منظر دیکھ سکتے ہیں لیکن پھر

شاید اس نے خود کو سنبھالا۔ رستم اس کے پاس پہنچا تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ پہلے سے ذرا کمزور دکھائی دیتی تھی۔ رستم کی سخت ہدایت کے مطابق اس نے اپنا ہیجان خیز سراپا ایک موٹی چادر میں چھپا رکھا تھا۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد رستم نادیہ کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ یہاں کسی عطر کی ہلکی خوشبو تھی اور ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی تھی۔

"تمہارے لئے چائے بناؤں؟" نادیہ نے نظریں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"نہیں۔" رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اگر آرام کرنا ہے تو بستر لگا دوں؟"

رستم کا جواب پھر نفی میں تھا۔ نادیہ کی نگاہیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ رستم ان جھکی نگاہوں کی وجہ بخوبی سمجھتا تھا۔ نادیہ کی اس کیفیت کا تعلق اس شب سے تھا جب رستم ڈیرے سے شہر جانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اس شب نادیہ نے اپنے اندرونی اضطراب کا مظاہرہ بہت کھل کر کیا تھا۔ وہ رات کے آخری پہر رستم کے بالکل قریب چلی آئی تھی اور اسے مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی تھی اور جب صبح دم رستم نے رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا تھا تو ایک اور انکشاف ہوا تھا۔ نادیہ کے جسم پر لباس کا ایک تار نہیں تھا۔ اس وقت رستم کا جی چاہا تھا کہ ایک دو ٹھوکریں رسید کر کے نادیہ کے چہرے کا نقشہ تبدیل کر دے تاہم وہ خود پر ضبط کر کے باہر چلا گیا تھا۔

رستم سوچنے لگا کہ اب اتنے دن گزر جانے کے بعد وہ بات چھیڑنی چاہیے یا نہیں۔ اگر اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تو بھی خطرہ تھا کہ نادیہ کی حوصلہ افزائی ہو گی اور آنے والے دنوں میں وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرے گی۔ بات کرنا بھی کچھ زیادہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ایک اَن کہی..... "کہی" بن سکتی تھی اور اسے وجود مل سکتا تھا پھر رستم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

نادیہ کی چادر ذرا سرکی تو رستم کو یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ وہ مختصر لباس میں تھی۔ اس نے مقامی طرز کا گھاگرا پہن رکھا تھا اور چولی اتنی چھوٹی تھی کہ نہ ہونے کے برابر۔ پیٹ عریاں ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ڈرامہ ہے؟" رستم نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہاں تم کسی فلم کی شوٹنگ کر رہی ہو۔ اوپر چادر ہے اور اندر وہی بے شرمی۔"

وہ دبے لہجے میں بولی۔ "میں نے جان کر تو ایسا نہیں کیا رستم! تمہیں پتا ہی ہے میرے

www.pdfbooksfree.pk

پیٹ پر زخم آیا تھا۔"

وہ اس پیشگی فاذکر کر رہی تھی جس نے کچھ روز پہلے جھاڑیوں میں نادیہ کے پیٹ میں دانت گاڑے تھے۔ رستم خاموش رہا۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بھی نادیہ کا ایک بہانہ ہی ہے۔ اس کے پیٹ کا زخم اب تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہلکی سی سرخی باقی تھی۔

ایک طویل رات گزر چکی تھی۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے کو تھا۔ رستم ایک ہنگامہ خیز دن کے آغاز سے پہلے کسی ذرا دیر ستانا چاہتا تھا، وہ کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ کچھ دور یوں کے اندر اب بھی اکا دکا گولی چلتی تھی تاہم مسلسل فائرنگ کا سلسلہ رک گیا تھا۔

"لالٹین بجھا دوں؟" نادیہ نے ہولے سے پوچھا۔

"نہیں رہنے دو۔" رستم بولا۔

"تم نے اپنے بال چھوٹے کرا دیئے ہیں اور رنگ بھی لئے ہیں لیکن لمبے بال تمہیں زیادہ اچھے لگتے تھے۔" نادیہ نے کہا۔

"میں نے تم سے اس بارے میں تبصرہ کرنے کو کہا ہے؟"

وہ کھسیانے انداز میں خاموش ہو گئی۔ رستم کی نگاہ کمرے کے ایک گوشے میں پڑی۔ وہاں چکنی سرخ مٹی سے بنائی گئی چھوٹی چھوٹی مورتیاں پڑی تھیں۔ ان میں پنجھوبار کا رہن من دھنا گیا تھا۔ بیلوں کی جوڑی کے پیچھے چلتا ہوا کسان..... ایک پتھر پر بیٹھ کر چھوٹا حقہ پیتا ہوا دیہاتی..... ایک ننگ دھڑنگ بچہ

"یہ کیا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"تمہارے انتظار کا وقت کاٹتی رہی۔ مجھے مجسمہ سازی اور اداکاری کا شوق ساتھ ساتھ ہی ہوا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے مجسمے بناتی ہوں۔" نادیہ نے کہا۔

رستم کو یاد آیا۔ جب وہ لوگ راولپنڈی میں تھے وہاں بھی نادیہ نے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کچھ مجسمے اپنے گھر میں سجائے تھے۔

اپنے اردگرد کے تمام حالات اور مسائل کو وقتی طور پر فراموش کر کے رستم کچھ دیر اونگھتا رہا پھر سو گیا۔ وہ بارہ آنکھ کھلی تو پنجھوباری نیلے موسم بہار کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ نادیہ اسی طرح خاموشی کے ساتھ رستم کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ غالباً وہ نیند سے لڑتی رہی تھی۔ ڈیرے پر ابھی ناشتے کی تیاری شروع نہیں ہوئی تھی۔ رستم کو بھرجائی مہناز بری طرح یاد آئی۔ وہ بہت سویرے اٹھتی تھی اور خالص گھریلو عورتوں کی طرح اپنے "ڈاکو شوہر" کے لئے اور اس کے قریبی دوستوں کے لئے پیٹ پوجا کا انتظام شروع کر دیتی تھی۔

اب وہ اپنے بچے کو پہلو میں لے کر منوں مٹی کے نیچے سو رہی تھی۔ اس کا پنوالیا، اس [illegible] اور اس کا باورچی خانہ خاموشی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مہناز اور اس کے بچے سے باہر کوئی "انہونی" نہیں ہو سکی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو ایک مفرور ڈکیت کے بیوی بچوں کے ساتھ ہو سکتا تھا۔

رستم کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اسے یاد آیا جب وہ یہاں تھا، ایک دن ننھا ٹیپو ماں کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ وہ گیند سے کھیل رہا تھا۔ گیند بار بار باورچی خانے میں جاتی تھی۔ ایک بار گیند باورچی خانے میں آئی تو مہناز گیند پکڑ کر سیدھی رستم کے پاس لے آئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔ "یہ تم اپنے پاس رکھ لو اور اسے بالکل نہ دینا۔"

رستم نے گیند رکھ لی تھی۔ اگلے روز ٹیپو کو کہیں سے ایک اور گیند مل گئی تھی اور وہ پرانی گیند رستم کے پاس ہی پڑی رہ گئی تھی۔ انسان چلے جاتے ہیں، ان کی نشانیاں رہ جاتی ہیں۔ رستم نے سوچا کل وہ بھی نہیں ہوں گے، ان کی نشانیاں رہ جائیں گی۔ وہ اٹھا اور سامان میں سے ٹیپو کی گیند ڈھونڈنے لگا۔ پتا نہیں اس نے کہاں رکھی تھی۔ وہ سامان کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ایک چھوٹی الماری کے پیچھے سے رستم کو گیند مل گئی۔ رستم نے گیند ہاتھ میں لی اور اسے لگا جیسے وہ کھلونے کو نہیں کھلاڑی کو چھو رہا ہو۔ اچانک اس کی نگاہ الماری کے پیچھے ایک اور شے پر پڑی۔ کچھ اخبار میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔

رستم نے اخبار ہٹا کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبا چکنی مٹی کا مجسمہ تھا بلکہ یہ دو مجسمے تھے جو باہم ملے ہوئے تھے۔

رستم نے گھوم کر نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ فق نظر آیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو اور یہ واقعی ایک سنگین چوری تھی۔ رستم نے ذرا دھیان سے دیکھا تو اسے یقین ہونے لگا کہ یہ خود اس کا اور نادیہ کا مجسمہ ہے۔ رستم اپنے لمبے بالوں، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور اونچی ناک کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا اور نادیہ اپنے قیامت خیز عریاں جسم کی وجہ سے۔ رستم کا بالائی دھڑ بھی عریاں تھا۔ نادیہ کسی پالتو جانور کی طرح رستم کے قدموں میں بیٹھی تھی اور اس کی پنڈلیوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے برہنہ جسم کے خطوط ہیجان انگیز تھے۔ یہ شرم ناک مجسمہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" رستم نے لرزاں لہجے میں کہا۔

"کک..... کچھ نہیں..... بب..... بس ایک Statue ہے۔" وہ ہکلائی۔

"میں تمہیں اندھا نظر آتا ہوں؟" رستم پھنکارا۔

"کیا..... ہوا..... رستم؟"

www.pdfbooksfree.pk

''حرام زادی..... کتیا..... مجھ سے پوچھتی ہو کیا ہوا؟''

رستم نے مجسمہ فرش پر پٹخ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ قریب ہی چھڑی پڑی تھی۔ رستم نے طیش کے عالم میں چھڑی اٹھائی اور نادیہ کے جسم پر بے دریغ ضربیں لگائیں۔

''دفع ہو جا..... نکل جا اس کمرے سے..... میں کہتا ہوں نکل جا'' وہ ساتھ ساتھ دھاڑ رہا تھا۔

تین چار ضربوں کے بعد چھڑی ٹوٹ گئی۔ رستم نے اس کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ابھی نادیہ پر دے مارا۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ بس چھڑی سے بچنے کے لئے اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر گرج کر کہا۔ ''اٹھ جا یہاں سے..... اٹھتی کیوں نہیں؟''

وہ اسی طرح چہرہ گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی رہی۔ رستم کا دل چاہا اسے اسی طرح اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دے۔ اگر اس تحمل کی وجہ سے اس کی ایک دو ہڈیاں بھی ٹوٹتی ہیں تو ٹوٹ جائیں لیکن پھر جیسے ایک دم بی بی رستم کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اپنے بازو پھیلا کر اور اپنے سینے کو دیوار بنا کر۔ ''نہیں رستم..... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' بی بی کی آواز رستم کے تصور میں گونجی۔

یہ آواز کہاں نہیں گونجتی تھی۔ جہاں جہاں رستم کے اندر وحشت ابھرتی تھی، جہاں جہاں وہ اپنی فطرت کا اظہار چاہتا تھا..... یہ آواز اس کا گھیراؤ کر لیتی تھی۔ اب یہ آواز پھر رستم کو وارننگ دے رہی تھی۔ ''نادیہ! مجھے بہت پیاری ہے رستم، اسے دکھ دو گے تو سمجھو مجھے دکھ دو گے۔''

رستم کے تنے ہوئے رگ پٹھے ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے رخ پھیرا اور منہ میں بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے بستر پر چلا گیا۔ چت لیٹ کر اس نے اپنا بازو موڑا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنے سینے میں پھنکارتے ہوئے شعلوں کو تحمل کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ دس پندرہ منٹ اسی طرح لیٹا رہا۔ اس کے اردگرد کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ نادیہ وہیں اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ رستم نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی چھڑی کے دونوں ٹکڑے نادیہ کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں یہ دونوں ٹکڑے اپنے اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھے تھے اور ان پر اپنا داہنا گال رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

نادیہ کی ان اداؤں سے رستم کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر ایک ہجوم رستم کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ کافی لوگ تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ سو مسلح افراد۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ سارے ڈیرے کے افراد ہی نہیں ہیں اردگرد موجود دیگر ایسے لوگ بھی ڈیرے پر جمع ہو گئے ہیں جنہیں قانون نے اپنے کاغذوں میں مجرم ٹھہرا رکھا ہے اور جو پولیس کی گولیوں کا ''نشانہ'' ہیں۔ رستم کی دید نے ڈیرے کے مکینوں میں نیا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ رستم ان کے لئے ایک آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ بے شک یہاں کا سردار لالہ فرید تھا لیکن رستم ان لوگوں کو دیگر حیثیتوں سے محبوب تھا..... وہ پسے ہوئے مظلوم طبقے میں سے اٹھا تھا اور ''انگری مین'' کی طرح خدائی فوجداروں کے خلاف مزاحمت کی علامت بن گیا تھا۔ پولیس کے محکمے میں رستم کے دوست بھی تھے لیکن بے لگام پولیس والوں کے خلاف اس کا رویہ ہمیشہ سے بہت سخت تھا۔ اب تک کئی اہلکاروں کا قتل اس کے کھاتے میں لکھا جا چکا تھا۔

ڈیرے کے مکین اپنا اسلحہ ہوا میں لہرانے اور نعرے لگانے لگے۔ ان کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ آخری گولی اور آخری سانس تک ڈیرے کا دفاع کریں گے۔ شروع میں تو کسی کو گوہرا کا خیال نہیں آیا تھا لیکن اب رستم کے استقبال کی گرم جوشی کم ہوئی تو رستم کے ساتھیوں نے گوہرا کے بارے میں پوچھا۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب خاصا غم زدہ کر دینے والا تھا۔ گوہرا کی موت نے کچھ دیر کے لئے سب کو افسردہ کر دیا۔ وہ رستم سے اس واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ رستم نے سب کچھ بتایا۔ پولیس والوں اور اجرائیلوں کے خلاف ڈیرے کے مکینوں کا غم و غصہ کچھ اور گہرا ہوا۔ کچھ دیر بعد رستم اپنے ساتھیوں لالہ فرید، حسنا گجراتی اور مراد کے ہمراہ میٹنگ والے کمرے میں چلا گیا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ڈیرے کے پُرجوش مکین اہم جگہوں پر ریت کی بوریاں اور درختوں کے تنے رکھ کر اپنا دفاع مضبوط کر رہے تھے۔ ان کے چہرے مدقوق لیکن حوصلے بلند تھے۔ رستم نے لالے فرید سے کہا۔ ''میرے ذہن میں صبح سے ایک بات آ رہی ہے۔ تم اسے تجویز بھی کہہ سکتے ہو۔''

''مجھے یقین ہے، یہ کوئی اچھی تجویز ہی ہو گی۔'' فرید نے کہا۔

''یہ بات پکی ہے کہ پولیس والوں نے اونچائی سے دوربینوں کے ذریعے ہم پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ میں نے ان کے پاس ایک دو بڑی دوربینیں بھی دیکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنا کوئی بھی ارادہ اپنے حریفوں پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ مثلاً آج صبح ہم نے پانڈو کی طرف

www.pdfbooksfree.pk

جانے کا ارادہ ختم کر دیا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ پولیس والوں کو اس تبدیلی کا پتا آسانی سے نہ چلے۔''

''ذرا کھل کر بتاؤ تو پتا چلے۔'' حسنے نے کہا۔

''بہتر ہے کہ ہم کچھ خچروں اور گھوڑوں پر سامان لدا رہنے دیں اور یہ جانور ایسی جگہوں پر کھڑے رہیں جہاں سے پولیس والوں اور اجرالیوں کی نظر ان پر پڑ سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی کر لیتے ہیں لیکن کیا اس سے کوئی خاص فائدہ بھی ہوگا۔'' لالہ فرید نے پوچھا۔

''بالکل ہوگا بلکہ بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔'' رستم نے کہا۔ ''پلسیوں اور اجرالیوں نے ہمارے خلاف جو چال چلی ہے، یہ ہم ان پر ہی الٹ سکتے ہیں۔ ڈپٹی ریاض اپنی زیادہ تر نفری پانڈو کی طرف لے گیا ہے۔ اب ہمارے سامنے والی پوزیشنوں پر بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ کل رات میں نے خود وہ ساری جگہ دیکھی ہے۔ وہاں پر پلسیوں اور اجرالیوں کا گھیراؤ بڑا کمزور ہو گیا ہے۔''

لالے فرید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ رستم کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ اپنی گردن کھجاتے ہوئے بولا۔ ''آج سویرے اس سے ملتی جلتی بات میرے دماغ میں بھی آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''لیکن باہر نکل کر حملہ کریں گے تو ہماری بارودی سرنگوں والا حصار تو خود بخود ختم ہو جائے گا۔'' مراد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس کے لئے ہم ایک طریقہ بنا سکتے ہیں۔'' لالے فرید نے جواب دیا۔ ''سارے لوگ باہر نہ نکلیں صرف تیس چالیس بندوں کی ایک ٹولی باہر نکل کر ہلہ بولے اور اگر ہلہ کامیاب ہو جائے تو پھر باقی لوگ بھی آگے بڑھیں اور باہر نکل آئیں۔ ورنہ سارے واپس ڈیرے پر آ جائیں۔''

''اگر بالفرض ہلہ کامیاب ہو جاتا ہے اور ہم گھیرا توڑ کر نکل بھی جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ پولیس تو علاقے میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔'' مراد کے ایک ساتھی نے کہا۔

''یہ بات ہم کو بھی معلوم ہے بھراجی۔'' حسنے گجراتی نے ذرا غصے سے کہا۔ ''مطلب تو یہ ہے کہ ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ایک ہی جگہ مرنے کی بجائے یہاں سے نکلیں اور پہاڑیوں میں بکھر جائیں۔ یہ پہاڑیاں ہم جیسوں کی بڑی پرانی سجن ہیں۔ یہ ہمیں پلس کی گولیوں سے ضرور بچائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ دس بیس مر جائیں لیکن زیادہ تر بچ جائیں گے، تم دیکھ لینا۔''

لالہ فرید نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دور مخروطی ٹیلوں کو دیکھا۔ قریباً ایک میل کی دوری پر یہ تین چار ٹیلے ساتھ ساتھ واقع تھے۔ سورج کی روشنی میں ٹیلوں کا جھاڑ جھنکاڑ بہت نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ ان ٹیلوں کے آس پاس پولیس اور ان کے مددگاروں کی پوزیشنیں تھیں۔ لالہ فرید نے ایک درمیانی ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب سے خطرناک پوزیشن ہے۔ یہاں MG-08 لگی ہوئی ہے۔ یہ اجرالی سردار غلام کبیر کی گن ہے۔ اس نے گن مین سمیت پولیس والوں کے استعمال میں دی ہوئی ہے۔ اس تعاون کے بدلے اس حرامی نے انتظامیہ سے پورے دو پہاڑوں کا قبضہ حاصل کرنا ہے۔ اس گن کو کسی طرح چپ کروا دیا جائے تو ہمارا یہاں سے نکلنے کا کام روپے میں سے آٹھ آنے آسان ہو جائے گا۔''

فرید کے ساتھی ناصر نے تاسف انگیز لہجے میں کہا۔ ''چند دن پہلے اسی گن سے فائر کر کے بھرجائی اور کاکے کو مارا گیا ہے۔''

رستم نے ایک عجیب تاثر کے ساتھ فرید کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ''تو سمجھو کہ آج رات یہ گن چپ ہو گئی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اندھیرا ہونے دو۔ میں اس گن کی بولتی بند کروں گا۔'' رستم کے لہجے میں شعلوں کی پھنکار تھی۔

''لیکن یہ بہت خطرناک کام ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ میں ساتھ جاؤں گا۔'' فرید نے حتمی انداز میں کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ مریں تو دونوں مریں اور یہاں ڈیرے پر کوئی آگے لگنے والا نہ رہے..... یہ بے وقوفی ہوگی۔ تم مجھے اکیلا جانے دو۔ میرا خیال ہے کہ میں اکیلا یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتا ہوں۔ تم چالیس پچاس بندوں کا ایک جتھا لے کر گن سے ڈیڑھ دو سو میٹر کی دوری پر رہو۔ جیسے ہی تمہیں معلوم ہو کہ گن پولیس والوں کے ہاتھ سے نکل گئی ہے، تم باقی پوزیشنوں پر ہلہ بول دو۔''

''لیکن لالے کو کیسے پتا چلے گا کہ تم نے گن خاموش کرا دی ہے یا اس پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے؟'' مراد نے نکتہ اٹھایا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم اس کے لئے کوئی اشارہ مقرر کر سکتے ہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ یہ ساری کارروائی طریقے سے ہو..... اور کارروائی سے پہلے اس کی بھنک بھی پولیس کو

www.pdfbooksfree.pk

نہ پڑے۔'' رستم نے کہا۔

کچھ دیر تک اس بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ رستم اس کام کے لئے اکیلا جانا چاہتا تھا مگر لالہ اور حسنا اس کے لئے راضی نہیں تھے۔ اچانک رستم کو اجمل خان کا خیال آیا۔ وہ ماہر نشانہ باز تھا اگر اس موقع پر اس سے کوئی کام لیا جاسکتا تھا تو لیا جانا چاہیے تھا۔ ابھی تک رستم، اجمل خان کے حوالے سے الجھن میں تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اجمل درحقیقت کس نیت سے یہاں آیا ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔

چھجے کے کمرے میں ہونے والی یہ میٹنگ برخاست ہوئی تو دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ رستم سیدھا اس حجرے میں پہنچا جہاں اجمل خان کو رکھا گیا تھا۔ فرید کی ہدایت پر حجرے کے باہر ایک سندھی پہرہ دے رہا تھا۔ رستم اندر پہنچا تو اس نے اجمل خان کو کمرے میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ رستم کو دیکھ کر اجمل خان ٹھٹک کر رک گیا۔ ''آپ سے مل کر ام کو بہت خوشی ہوئی رستم صیب! آپ جانتا نہیں ام آپ کا کتنا بڑا عقیدت مند ہے۔ آپ سچ پوچھتا ہے تو ام صرپ آپ کے لئے ہی اتنی دور سے آیا ہے، صرپ آپ کے لئے۔''

''کیوں ایسی کیا بات ہے؟''

''رستم صیب! ام آپ کو کیا بتائے۔ قدرت اللہ ام کو کتنا بُرا لگتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قدرت اللہ اور اس کے چیلے امارے لئے رُوئے زمین کے سب سے خبیث لوگ ہیں۔ امارے دل پر ان لوگوں کا لگایا ہوا ایک بہت بڑا زخم موجود ہے۔''

''کیسا زخم؟'' رستم نے پوچھا۔

''آج سے تین چار سال پہلے قدرت اللہ کے چیلے شاہی نے ام پر بہت بڑا ظلم کیا۔ امارا ایک بہت قیمتی چیز ام سے چھین لیا۔'' اجمل کی آواز بھرا گئی۔

رستم سوالیہ نظروں سے اجمل خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ام کوہاٹ سے اٹھارہ میل آگے روگڑی نام کے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ امارے علاقے کا لوگ بہت سادہ دِل ہے۔ پیروں فقیروں کو ماننے کا رواج تو ہمارے پورے ایریا میں ہی بہت زیادہ ہے مگر امارے دیہات میں یہ کام حد سے زیادہ گزرا ہوا ہے۔ شاید اس کا ایک وجہ تعلیم کا کمی بھی ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ امارے پورے گاؤں میں صرف میں ہوں جس نے دسویں کا امتحان پاس کیا تھا۔''

حوالدار اجمل خان سانس لینے کے لئے رکا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ام جانتا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہوگا، آپ کو مختصر مختصر بتاتا ہوں..... پیر

قدرت اللہ کا ایک چیلا شاہی مہینے میں ایک بار امارے علاقے کا چکر لگایا کرتا تھا۔ علاقے کا لوگ اس سے جھاڑ پھونک کراتا تھا اور تعویذ وغیرہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ ام شہر سے چھٹی پر گاؤں واپس آیا تو امارے گاؤں کے ماسٹر صاحب نے ام کو بتایا کہ شاہی ان کو اچھا بندہ نہیں لگتا۔ وہ مریض مردوں کے مقابلے میں مریض عورتوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ خاص طور پر وہ جوان بیبیوں کو زیادہ ٹائم دیتا ہے۔ وہ ان کو پردے میں علیحدہ بلاتا ہے اور دیر تک ان کو پردے میں رکھتا ہے، جو عورت اس کے سامنے اپنا چہرہ نہ کھولے وہ اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

ام نے ماسٹر صیب سے کہا کہ جو کچھ بھی ہے لیکن ابھی تک اس کے بارے میں کوئی ایسا ویسا بات سنا نہیں گیا۔ ماسٹر صیب نے جواب دیا کہ ابھی تک نہیں سنا گیا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی نہیں سنا جائے گا۔ اس قسم کا لوگ آہستہ آہستہ لوگوں کے دماغوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔

ماسٹر صیب کی بات سننے کے بعد ام دو تین دفعہ خود بھی بیماری کے بہانے شاہی کے پاس گیا، جو کچھ ماسٹر صیب نے بتایا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ شاہی کو جوان عورتوں کے علاج اور ان سے باتیں کرنے میں زیادہ دلچسپی تھا۔ ام کو یہ سب کچھ بُرا لگا۔ ام نے اس بارے شاہی سے بات کیا تو وہ بدبخت ایک دم بھڑک اٹھا۔ ام دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوا۔ اگلے دن شاہی اپنا بستر بوریا گول کر کے امارا گاؤں چھوڑنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس نے کہا کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ شاہی کے جانے کی وجہ کانسٹیبل اجمل ہے تو وہ سب ام پر چڑھ دوڑا۔ ام اس وقت کانسٹیبل تھا اور ہیڈ کانسٹیبل بننے والا تھا۔ لوگوں نے ام کو بُرا بھلا کہا اور مطالبہ کیا کہ ام شاہی سے معافی مانگے۔ ام نے معافی نہیں مانگا لیکن اماری طرپ سے امارے بڑے بھائی کو معافی مانگنا پڑا۔ خود اس کے بعد شاہی نے اپنا کام جاری رکھا..... رستم بھائی! آپ اماری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہا۔''

''نہیں..... لیکن تم ذرا جلدی سے سب کچھ بتا دو۔''

اجمل بولا۔ ''امارے اور قدرت اللہ کے اس چیلے کے درمیان ٹسل پیدا ہوگیا تھا لیکن ام خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ ام اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ جن دنوں ام چھٹی پر شہر سے گاؤں جائے ان دنوں شاہی گاؤں میں موجود نہ ہو۔ چند مہینے بعد کی بات ہے کہ امارے گاؤں میں اوپر تلے دو تین عورتیں کینسر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو پیارا ہوگیا۔ ان کو چھاتی کا کینسر تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ بہت عام بیماری ہے۔ ان موتوں کے بعد علاقے میں خوب وہراس پھیل گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

لوگ اس بیماری سے بہت ڈرنے لگا۔ ان دنوں ایک اور عورت کو یہی تکلیپ ہوا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ وہ عورت شاہی کے جھاڑ پھونک سے ٹھیک ہوگیا یا شاید اس کو کوئی اور تکلیپ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس طرح لوگوں کے ایمان کا امتحان لیتا ہو۔ عورت کے ٹھیک ہونے سے شاہی پر لوگوں کا یقین اور بھی پکا ہوگیا، پھر ایک دن ام چھٹی پر شہر سے گاؤں آیا تو ام نے ایک عجیب بات سنا۔ ام کو مالوم ہوا کو امارے گاؤں کا اچھا بھلا عورتیں بھی سینے کی تکلیپ کا دم کرانے شاہی کے پاس جاتا ہے۔ خوچے اس شاہی نے سیدھے سادے لوگوں میں یہ بات مشہور کردیا تھا کہ بیماری کے حملے سے بچنے کے لئے جوان عورتوں کو دم کرانا چاہیے۔ یہ سن کر امارہ خون کھول گیا کہ لوگ اپنی جوان بچیوں کو لے کر شاہی کے پاس آتے ہیں اور وہ قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ان کو دم کرتا ہے۔ آپ ہماری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔

اجمل بولا۔'' آپ شاید نہ جانتا ہو کہ شاہی قسم کا بہروپیا لوگ سیدھے سادے لوگوں کی مت اسی طرح مارتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا عزت گنوا دیتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں جی..... ایسے لوگ دوسروں کو مسمرائز کردیتے ہیں۔ اب یہ کوئی مامولی بات تو نہیں تھا رستم صیب! لوگ اس داڑھی منڈے چھوکرے کو بابا جی کہتے تھے اور وہ پردے کے پیچھے ان کی بہو بیٹیوں کے جسموں کو ہاتھ لگاتا تھا۔ ام سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ ام سیدھا شاہی کے ٹھکانے پر گیا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ ام نے اسے گریبان سے پکڑا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ امارے سر پر خون سوار تھا۔ لوگوں نے اسے بچالیا ورنہ ام نے اس کا نارئیل توڑ دینا تھا۔'' چھوٹے سے وقفے کے بعد اجمل خان نے بات جاری رکھی۔

''پورے علاقے میں ہلچل مچ گیا۔ کچھ لوگوں نے امارا حمایت کیا لیکن زیادہ نے ام کو ہی قصوروار ٹھہرایا۔ شاید اس کا ایک وجہ یہ بھی تھا کہ ام پولیس والا تھا۔ پولیس والا اچھا ہو یا بُرا، لوگ اس کو غصہ کی نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ علاقے کے ایس ایچ او مردان خان کی بہن بھی شاہی اور قدرت اللہ کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ ام کو امارہ نوکری جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ دوسری طرف اس حرامی شاہی نے صاپ کہہ دیا کہ اگر ام اور امارہ فیملی اس گاؤں میں رہے گا تو وہ کبھی اس گاؤں میں قدم نہیں رکھے گا۔ قدرت اللہ اور شاہی نے لوگوں کا دماغ اتنا خراب کر رکھا تھا کہ..... سارے کا سارا امارے خلاف اکٹھا ہوگیا۔ ماسٹر صیب کو تو بس لعن طعن کیا گیا لیکن ام کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔ امارا رشتہ گاؤں کے ہی ایک کاشت کار نذر گل کی بیٹی سے طے ہو چکا تھا۔ بس دو چار مہینوں تک شادی ہونے والا تھا..... نذر گل نے بھی

ام کو رشتہ دینے سے صاف انکار کردیا۔ ام کو اپنے والد والدہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اپنا باپ دادا کا گاؤں روگڑی چھوڑنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی منگیتر کو بھی۔ اس کی شادی پر ام بہت رویا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ ام کو اپنی مٹی اور اپنا گاؤں چھوڑنے کا ہے۔ قدرت اللہ اور شاہی نے امارے اپنوں کو امارے لئے غیر بنایا اور ام کو بے وطن کیا۔ ام اس دکھ کو کبھی بھولے گا اور نہ قدرت اللہ سے انتقام لینے کو۔''

رستم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔''تمہاری کہانی دل کو لگتی ہے اور پتا نہیں یہ تم جیسے کتنے اور لوگوں کی کہانی بھی ہے لیکن راستے میں تم نے کچھ اور باتیں بتائی تھیں۔ تم نے مجھے اور فرید کو اپنا دشمن بتایا تھا اور بڑی نفرت دکھائی تھی۔''

''خوچے! وہ سب یہاں تک پہنچنے کے لئے تھا۔ ام نے اخبار میں سارا خبریں اچھی طرح پڑھا تھا۔ ام کو سب مالوم ہے کہ وہاں ملتان میں کیا ہوا اور یہاں وڈے ڈیرے پر کیا ہورہا ہے۔ آپ نے ملتان میں قدرت اللہ کے آستانے میں گھس کر جو کچھ کیا اس نے امارا سیروں خون بڑھا دیا۔ قسم پیدا کرنے والے کا، ام کو یہی لگا کہ آپ امارا کام کررہا ہے اور آپ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ امارے..... امارے اپنے دل کا آواز ہے۔ ملتان میں آپ نے قدرت اللہ کو پتہ نہیں کیوں چھوڑ دیا۔ اِم کو اس کا رنج ہے لیکن آپ نے اس کو جو سزا دیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس سزا کی وجہ سے امارا کلیجہ پچاس فیصد تو ضرور ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ وہ بہروپن ڈاکٹر صدف قدرت اللہ کا سب سے لاڈلا بی بی تھا۔ اس کا موت ان ہزاروں عورتوں کے دکھ کے سامنے کچھ بھی نہیں جن کی زندگی قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کی وجہ سے برباد ہوا۔ ام آپ کا پرستار تو پہلے بھی تھا لیکن ملتان والے ماملے کے بعد تو ام نے اپنے دل میں پکا پکا پسلہ کرلیا کہ ام سے جس طرح بھی ہوسکا آپ کی مدد کرے گا۔ ام کو اپنے پیٹی بھائیوں سے مالوم ہوا تھا کہ سون کے علاقے میں وڈے ڈیرے پر آپ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف ایک بڑا کارروائی ہونے والا ہے۔ ام نے آپ کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا۔ آگے کا کہانی ذرا لمبا ہے، بس آپ مختصر یہ سمجھ لیں کہ ام کو ہاٹ میں ایس ایس پی اشفاق زمانی صیب سے ملا اور انہیں بتایا کہ ام رستم اور لالہ فرید کے خلاف سون میں ہونے والی لڑائی میں حصہ لینے کا شدید خواہش مند ہے۔ زمانی صیب کو پتہ ہے کہ ام زبردست قسم کا نشانہ باز ہے۔ یہاں وڈے ڈیرے کے آس پاس پولیس کو دو چار اچھے نشانے بازوں کی ضرورت تھا۔ امارہ کام بن گیا اور ام زمانی صیب کی مدد سے یہاں پہنچ گیا۔''

رستم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ اس کی آنکھیں، اجمل کی آنکھوں میں پیوست

www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔ ''رستم بھائی! آپ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں کہ کیا تم واقعی دوست ہو؟''

اجمل خان کے چہرے پر عجیب سی سرخی پھیل گئی۔ وہ گہری نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا، پھر ہولے سے بولا۔ ''ام آپ کو اوفے دے سکتا ہے۔''

''یہ اوفے کیا ہوتا ہے؟''

''ایک طرح کا امتحان۔ امارے قبیلے میں یہ بڑا پرانا رواج ہے۔ جب کسی کو اپنی وپاداری کا یقین دلانا ہو تو ام خود کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ ام چھ خانے والے پستول میں تین گولیاں ڈالتا ہے اور چرخی کو گھماتا ہے پھر ام میں سے جس کو امتحان دینا مقصود ہو وہ پستول کا نال اپنی پیشانی پر رکھ کر ایک فائر کرتا ہے، اگر وہ بچ جائے تو سچا ہوتا ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتا ہے تو آپ کے سر کا قسم، ام ابھی اور اسی وقت آپ کو اوفے دے سکتا ہے۔'' اجمل خان کا لہجہ بے حد جذباتی تھا۔

رستم نے ایک لمحے کی خاموشی اختیار کیا۔ اس خاموشی سے اجمل خان نے نہ جانے کیا مطلب نکالا، اس نے اپنا پستول نکالنے کے لئے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پستول وہاں نہیں تھا۔ وہ تو رستم پہلے ہی اس سے لے چکا تھا۔ بہرحال اجمل خان کا انداز اتنا فطری اور بے ساختہ تھا کہ رستم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چند لمحے تک اجمل خان کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے اجمل کا پسٹل نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''لیکن یہ امتحان ۔ینے کے لئے نہیں ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

رستم کے دوستانہ لب و لہجے کو محسوس کر کے اجمل خان کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔ وہ ایک بار پہلے بھی رستم سے بغل گیر ہو چکا تھا۔ اب اٹھا اور دوبارہ بغل گیر ہوا، پھر بے ساختہ اس نے رستم کا رخسار چوم لیا اور اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پسٹل کو اپنے بائیں ہاتھ میں بڑی مضبوطی سے تھام کر وہ جوش سے بولا۔ ''رستم بھائی! ام سچ کہتا ہے بیر قدرت اللہ کو ڈنڈا مار کر آپ امارا آئیڈیل بن چکا ہے۔ ام آپ کے لئے جان قربان کر سکتا ہے۔ آپ ام سے جو کہے گا ام کر کے دکھائے گا.....''

رستم نے ہولے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اپنا ارمان نکالنے کے لئے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''ام سمجھا نہیں رستم بھائی۔''

''شاید تم نے یہ نہ سوچا ہو کہ ڈیرے پر پہنچنے کے بعد تم اتنی جلدی ایکشن میں نظر آؤ گے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ امارے لئے کوئی مارا ماری کا کام ہے؟'' اجمل خان کے لہجے میں جنگجو پٹھان کا روایتی جوش کروٹیں لینے لگا۔

''ایسا ہی سمجھ لو اور کام بھی میرے اندازے کے مطابق تمہاری طبیعت کے عین مطابق ہی ہوگا یعنی نشانہ لے کر گولی چلانے والا۔ قریباً سوفٹ کے فاصلے سے گولی چلانا ہوگی۔''

''پیدا کرنے والے کا قسم، ام آپ کے اندازے سے بڑھ کر کام کرے گا۔'' اجمل خان نے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھلایا۔

وہ رستم سے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے دونوں میں برسوں کی جان پہچان ہو۔ اس کے لہجے میں خلوص کی فراوانی تھی۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں مدتوں کے شناسا لگتے ہیں۔

رات نو بجے تک سارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ پولیس اور اجرالیوں کے گھیرے میں آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو افراد جن میں تین عورتیں بھی تھیں، زندگی کے لئے ایک بھرپور کوشش کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ رستم کے مشورے پر آج دوپہر ہی فرید نے خچروں اور گھوڑوں پر کچھ سامان وغیرہ لدوا دیا تھا۔ اپنی دیگر مصروفیات سے بھی انہوں نے محاصرہ کرنے والوں پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ جلد ہی یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس تاثر کے قائم ہونے سے یہ فائدہ تھا کہ ڈپٹی ریاض کو قتلِ عام کے لئے پانڈو درے پر ہوشیار اور چوکس رہنا تھا۔ اس کی زیادہ تر نفری بھی پانڈو کی طرف ہی موجود رہنا تھی۔

پروگرام کے مطابق لالہ فرید کی قیادت میں چالیس افراد کا ایک جتھا تاریکی میں بڑی احتیاط سے پیش قدمی کرتا ہوا قبرستان سے آگے نکل جانا تھا اور اس ڈھلوان تک پہنچ جانا تھا جو قبرستان کے نواح سے شروع ہو کر قریباً نصف میل دور پولیس کی پوزیشنوں تک پہنچتی تھی۔ رستم اور اجمل خان چالیس افراد کے جتھے سے قریباً 300 میٹر آگے تھے۔ ان کے پاس ایک سیون ایم ایم رائفل کے علاوہ دو پسٹل تھے، اس کے علاوہ ایک فٹ لمبے پھل کا تیز دھار چھرا رستم کی قمیص کے نیچے ایک چرمی تھیلی میں لگا ہوا تھا۔

رات کے تاریک سناٹے میں رستم اور اجمل خان خودرو گھاس اور جھاڑیوں میں بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے پولیس کی پوزیشنوں کے قریب پہنچ گئے۔ آسمان پر تیرنے والی آوارہ بدلیاں ان کی بھرپور مدد کر رہی تھیں۔ چاند کی روشنی ان دبیز بدلیوں کے پیچھے اوجھل تھیں۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک جگہ پہنچ کر رستم نے سرگوشی کی۔ ''اب ہمیں لیٹ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ دھیان رہے کسی طرح کی آواز پیدا نہ ہو۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ام آپ کے ساتھ ہے لیکن امارا ٹریننگ پولیس والا ہے۔''

''تم پولیس پوسٹ کے باہر رہو گے جب تک میں نہ کہوں اندر نہیں آؤ گے اور نہ ہی گولی چلاؤ گے۔''

اجمل خان نے اطاعت مندی سے سر ہلایا۔

دونوں پیٹ کے بل لیٹ گئے اور نہایت کھردری زمین پر کہنیوں کے بل کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

پولیس کی پوزیشن کے عین عقب میں ایک سرچ لائٹ موجود تھی۔ قریباً پانچ منٹ کے وقفے سے یہ لائٹ روشن ہوتی تھی۔ دائیں بائیں تھوڑی سی حرکت کرتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ پولیس کی پوزیشن سے قریباً 100 فٹ پیچھے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں رک کر رستم نے سرچ لائٹ کے روشن ہونے اور بجھنے کا انتظار کیا اور جب یہ عمل مکمل ہوگیا تو وہ دونوں ایک بار پھر زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ رستم کو قوی امید تھی کہ اگلی بار سرچ لائٹ روشن ہونے سے پہلے وہ پوزیشن تک پہنچ جائیں گے۔

اگلے چار منٹ چار برسوں کے برابر تھے۔ ان دونوں کی کہنیاں اور گھٹنے وغیرہ چھل گئے تھے۔ ذرا سی آہٹ ان پر MG-08 کا مہلک دہانہ کھول سکتی تھی۔ انہیں پوسٹ سے باتیں کرنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پوسٹ میں موجود کسی شخص نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ موت اس کے کتنے قریب ہے۔

رستم نے رائفل اجمل خان کو تھمادی اور قمیص کے نیچے سے لمبا چھرا نکال لیا۔

اجمل خان نے رستم کے کان میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے رستم صیب! اس پوسٹ پر کم از کم دو تین بندہ موجود ہے اگر آپ گولی چلائے بغیران پر قابو پانے کی کوشش کرے گا تو آپ کے لئے مشکل ہوگا۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' رستم کا لہجہ خشک تھا۔ ''میرے اشارہ کرنے سے پہلے تم یہاں سے آگے نہیں بڑھو گے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اجمل خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ یا خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط اور جنگجو شخص تھا۔

رستم اس کا شانہ تھپک کر آگے بڑھا۔ اس کی حرکات میں شکاری جانور کی سی تیزی اور

چوکسی تھی۔ چھرا اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ ریت کی بوریوں کے پیچھے کینوس کا خیمہ سا تھا۔ اس خیمے سے ابھرنے والی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں دو یا تین افراد تاش کھیل رہے تھے۔ ایک شخص کی آواز ابھری۔ ''اوئے باگڑ و! ذرا دھیان سے دیکھ۔ یہ تیری ماں کا خصم نہلا ہے کہ دہلا ہے.....''

دوسری آواز نے ٹھیٹ پنجابی میں کہا۔ ''یہ دہلا ہے اور یہ میری ماں کا خصم نہیں..... یہ میں خود ہوں اور ابھی تیری دُکی اور تکی کو اپنے نیچے دبانے والا ہوں۔''

جواب میں پہلا شخص بڑبڑایا اور بیٹھی ہوئی آواز والا شخص بُری طرح کھانسنے لگا۔ رستم سانس روک کر آگے کی طرف کھسکتا جارہا تھا۔ یہ بڑے سائز کی گن بہترین جگہ پر ماؤنٹ کی گئی تھی۔ اس بلند جگہ سے دائیں اور بائیں دور تک ہدف کو نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ یہ سوچ کر رستم کے سینے میں شعلے کچھ اور بھڑک اٹھے کہ اسی گن سے فائر کر کے چند روز پہلے ایک ماں اور اس کے بچے کو بے دردی سے ہلاک کیا گیا ہے۔

رستم سانپ کی طرح رینگتا ہوا بوریوں کے پیچھے خیمے کے سامنے پہنچا۔ ایک مہین درز میں سے اس نے اندر جھانکا۔ اندر صرف دو افراد تھے۔ دونوں ہٹے کٹے اور خطرناک صورتوں والے تھے۔ وہ دونوں اجرالی تھے۔ ایک پولیس والے کی وردی تو خیمے میں لٹکی ہوئی تھی لیکن وہ خود وہاں موجود نہیں تھا۔

رستم نے اپنا ٹارگٹ مقرر کرلیا۔ اب وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ سرچ لائٹ کسی بھی وقت پھر سے آن ہوسکتی تھی۔ رستم برق رفتاری سے خیمے میں داخل ہوا۔ ہوا میں جست لگاتے ہوئے وہ اس اجرالی پر گرا جس نے صرف شلوار اور بنیان پہن رکھی تھی۔ رستم کا ایک فٹ لمبا چھرا اجرالی کے سینے میں دل کے مقام پر لگا۔ چھرے کے ہڈی اور گوشت کے ٹکرانے کا احساس رستم کے ہاتھ کے لئے تسلی بخش تھا۔ رستم کا دوسرا ہاتھ اجرالی کے ہونٹوں پر جم کر رہ گیا۔ مضروب اجرالی کی آنکھوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا تھا۔ وہ بُری طرح پھڑکا لیکن رستم کی گرفت ناقابلِ شکست تھی۔ عین انہی لمحوں میں رستم کی ٹانگوں نے دوسرے اجرالی کی گردن بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لی تھی۔ اس دوسرے اجرالی کے ہاتھ سے تاش کے پتے نکل کر ہوا میں بلند ہوگئے تھے۔ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جس طرح رستم نے چاہا تھا لیکن ایک چیز رستم کی مرضی کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ رستم کا خیال تھا کہ وہ دوسرے اجرالی کی گردن بہ آسانی اپنی ٹانگوں کے مخصوص دباؤ سے توڑ ڈالے گا لیکن عملی طور پر ایسا ہوا نہیں۔ وہ شخص توقع سے زیادہ سخت جان نکلا تھا۔ اس کا منہ پورا کھلا ہوا تھا۔ وہ چلانے کی کوشش کررہا تھا۔ تاہم

www.pdfbooksfree.pk

آواز اس کے منہ سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ بس خرخر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شخص اپنی تمام تر جسمانی قوت صرف کرتے ہوئے داہنی طرف جھکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رستم نے دیکھا وہاں ایک رائفل کی تیز دھار سنگین پڑی تھی۔ غالباً وہ شخص چاہ رہا تھا کہ سنگین تک اس کا ہاتھ پہنچ جائے اور وہ رستم کی ٹانگوں کے شکنجے پر کوئی کاری ضرب لگا سکے۔ رستم تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے اجرالی کو سنگین سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھرا دوسرے اجرالی کے دل میں ترازو ہو چکا تھا مگر ابھی رستم اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگر وہ اس پر سے گرفت ختم کر کے دوسرے اجرالی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ اسے پندرہ بیس سیکنڈ مزید درکار تھے۔ یہی پندرہ بیس سیکنڈ اس اجرالی کے لئے بھی قیمتی تھے جو اپنا ہاتھ سنگین تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔ وہ ایک ایک انچ سنگین کی طرف سرک رہا تھا۔ جب رستم نے محسوس کیا کہ پندرہ بیس سیکنڈ کی اس دوڑ میں وہ ہار جائے گا تو اس نے اپنا ہاتھ چھرے کے دستے پر سے ہٹا کر مضروب اجرالی کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے ایک وحشیانہ جھٹکا دیا اور اس کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی۔ ان لمحوں میں دوسرے اجرالی کا ہاتھ تقریباً سنگین تک پہنچ چکا تھا۔ رستم نے یک لخت اس کی گردن اپنی ٹانگوں کی قینچی سے آزاد کر دی۔ وہ اوندھے منہ سنگین کے اوپر گرا۔ اپنے پیٹ کے نیچے سے سنگین تلاش کرنے کے لئے اس نے دیوانہ وار اپنا ہاتھ چلایا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ رستم مقتول اجرالی کو چھوڑ کر عقاب کی طرح اجرالی پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلا سکتا، رستم نے چھرا عقب سے اس کی گردن میں گھونپ دیا۔ وار میں اتنی طاقت تھی کہ چھرے کی نوک ٹھوڑی کے پاس سے باہر نکل آئی۔ اجرالی کا توانا جسم رستم کے نیچے بُری طرح پھڑکا، تھرایا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن سے ابلنے والا خون تاش کے پتوں کو رنگین کر رہا تھا اور انہیں رنگین کرنے کے بعد لکڑی کے اس چوکور باکس پر گر رہا تھا جس میں جرمن ساختہ Mg-08 کے اندر چلنے والی گولیوں کی طویل بیلٹ تہہ در تہہ رکھی تھی۔

رستم کی کارروائی کا پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے اردگرد کی سن گن لی اور احتیاط کے ساتھ خیمے سے نکل آیا۔ طے شدہ تفصیل کے مطابق اس نے نشیب میں یکے بعد دیگرے دو کنکر پھینکے۔ ذرا دیر بعد تاریکی سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ وہ جھک کر چلتا ہوا آیا اور رستم کے ساتھ خیمے میں داخل ہو گیا۔ یہ اجمل خان خان۔ خیمے میں اجرالیوں کی دو لاشیں دیکھ کر اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''رائفل تیار ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''ایک دم تیار جناب۔'' اس نے جوش سے رائفل کو تھپکی دی۔

رستم اسے لے کر خیمے کے پردے کے پاس آیا۔ اسے ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ رستم نے ڈوری کھول کر باہر تاریکی میں دیکھنے کا راستہ بنایا۔

''وہ سامنے روشنی نظر آ رہی ہے؟'' رستم نے سرگوشی کی۔

''بالکل نظر آ رہا ہے جناب۔ امارہ خیال ہے کہ یہ بھی کوئی چھولداری ہے۔ خواس کے اندر کوئی بندہ بھی حرکت کرتا نظر آ رہا ہے۔''

''اس بندے کو اُڑانا ہے اور پہلے ہی فائر میں۔ دوسری گولی چلنے سے پہلے اس خبیث نے غائب ہو جانا ہے۔''

''ان شاء اللہ دوسری گولی کا نوبت نہیں آئے گا۔'' اجمل کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔

''بس ٹھیک سے فائر کرو۔ اس بندے کے گرنے کے ساتھ ہی میں اپنے پسٹل سے دو ہوائی فائر کروں گا۔'' (دو ہوائی فائر لالہ فرید اور اس کے جتھے کے لئے حملے کا اشارہ تھے)

''اوکے رستم بھائی۔'' اجمل خان نے کہا۔ رائفل اپنے کندھے سے لگائی۔ سانس روکا۔ انگلی لبلبی پر رکھی۔ آنکھ بھیچی۔ یہ ایک پروفیشنل کھلاڑی کا شاندار سٹائل تھا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ رستم نے پوسٹ پر نظر آنے والے ہیولے کو صاف طور پر لڑکھڑاتے دیکھا۔ مزید احتیاط کے طور پر اجمل نے فوراً ہی دوسرا فائر بھی کیا۔ ہیولا اچھلا اور اوجھل ہو گیا۔

اب یہ لالہ فرید کو مطلع کرنے کا وقت تھا۔ رستم نے اپنا کولٹ پسٹل برآمد کیا اور ایک مخصوص وقفے کے ساتھ اوپر تلے دو فائر کئے۔ یہ لالے فرید کے لئے طوفانی پیش قدمی کا اشارہ تھا۔

MG-08 ایسی جگہ پر نصب تھی کہ یہ صرف سامنے اور دائیں بائیں ہی فائر کر سکتی تھی۔ عقب میں اپنی ہی پوزیشنوں کو نشانہ بنانا اس گن کے لئے ممکن نہیں تھا۔ رستم اور اجمل نے یہ خیمہ چھوڑا اور درختوں کے قریبی جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ خیمے سے نکلتے ہوئے رستم اجرالیوں کی ایک ٹیلی سکوپ بھی اٹھا لایا تھا۔ اس ٹیلی سکوپ سے اس نے نیچے تاریکی میں کسی حرکت کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ اس کے کان ہر گھڑی لالہ فرید کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑا قیمتی وقت تھا..... اگر تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی تو سارا پلان چوپٹ ہو سکتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

اب تک چار فائر ہو چکے تھے۔ اس فائرنگ نے قرب و جوار میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ ٹیلوں میں تین سرچ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور تیزی سے چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ سنتریوں اور اجرالی پہرے داروں کی ملی جلی آوازیں فضا میں ہیجان خیز ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

''ہاں جی..... آپ کے ساتھی نظر آئے؟'' اجمل خان نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں..... تم مشین گن پر نظر رکھو اگر کوئی گن کی طرف آنے کی کوشش کرے تو گولی مار دو۔''

''آپ بے فکر رہو رستم صیب۔ امارہ گولی دونوں آنکھوں کے درمیان لینڈ کرے گا۔'' اجمل خان نے رائفل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کا رخ کچھ دیر پہلے فتح کئے جانے والے مورچے کی طرف تھا۔

رستم کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ لالہ فرید تاخیر کر رہا تھا۔ اس نے تھوڑا سا آگے جا کر دوربین پھر آنکھوں سے لگائی۔ ''کدھر مر گئے ہو؟'' وہ بڑبڑایا۔

اجمل بھی رستم کے قریب آن کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے رستم بھائی! وہ لوگ نہیں آ رہا۔ جب ام چلے تھے اس وقت تو وہ ایک دم تیار تھا۔'' رستم کی طرح اجمل خان کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ رستم کوئی جواب دیتا، دو ٹارچوں کے روشن دائرے دکھائی دیئے۔ دو یا تین افراد دوڑتے ہوئے MG-08 کی طرف آ رہے تھے۔

''فائر کرو۔'' رستم نے حتمی لہجے میں کہا۔

اجمل خان نے بے دریغ گولی چلائی۔ ایک شخص زخمی ہو کر نشیب میں گرا اور اس کی بلند کراہ رستم اور اجمل کے کانوں تک پہنچی۔ ٹارچ کا ایک روشن دائرہ غائب ہو گیا، دوسرا تیزی سے پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

نشیب میں ابھی تک فرید اور اس کے ساتھیوں کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ''ام کو لگتا ہے جی کوئی گڑبڑی ہو گیا ہے۔'' اجمل کی آواز میں پہلی بار پریشانی کے آثار محسوس ہوئے۔

ابھی یہ مشکل اس کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اوپر تلے دو گولیاں اجمل خان اور رستم کے درمیان خلا میں سے گزر گئیں۔

دونوں نے خود کو ایک ساتھ نیچے گرا لیا۔ یہ ٹارگٹ فائرنگ نہیں تھی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ پولیس والے اور اجرالی بدحواس ہو کر چاروں طرف گولیاں چلا رہے ہیں۔ دھماکوں کے

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ہر طرف شعلے لپکنے لگے۔

انہوں نے تقریباً ایک منٹ تک مزید انتظار کیا پھر انہیں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر تک مزید یہاں رکے تو کسی آوارہ گولی کا نشانہ بنیں گے یا پکڑے جائیں گے۔ زمین پر اوندھے لیٹے لیٹے رستم نے اجمل خان کا کندھا دبایا اور وہ دونوں واپس ڈیرے کی طرف بڑھے..... پہلے انہوں نے ڈھلوان پر کرالنگ کی پھر رکوع کے انداز میں جھک کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ بارودی سرنگوں والے ایریا میں پہنچ کر رستم آگے ہو گیا اور مقرر کردہ نشانیوں کے مطابق آگے بڑھنے لگا۔

رستم کے ذہن میں اُن گنت اندیشے کلبلا رہے تھے۔ وہ اور اجمل خان لالے فرید سے قریباً آدھ پون گھنٹہ پہلے وڈے ڈیرے پر سے نکل آئے تھے، اس کے بعد نہ جانے وڈے ڈیرے پر کیا ہوا ہوا تھا؟ سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا تھا۔ اب تو یوں لگ رہا تھا کہ شاید فرید اور اس کا جتھا ڈیرے سے روانہ ہی نہیں ہو سکے ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکے.....؟ اس سے آگے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

رستم اور اجمل خان وڈے ڈیرے پر پہنچے تو یہاں کچھ اور ہی منظر دکھائی دیا۔ ہر طرف افراتفری نظر آ رہی تھی۔ اس افراتفری کی ایک وجہ تو پولیس کی طرف سے دور مار رائفلوں کے ذریعے ہونے والی فائرنگ تھی مگر دوسری اور زیادہ اہم وجہ کچھ اور تھی۔ رستم کو سرنگ نمبر دو کے سامنے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ چار پانچ افراد ایک شخص کو چارپائی پر ڈالے جھپکے کی طرف سے نمودار ہوئے اور تقریباً بھاگتے ہوئے دو نمبر سرنگ میں داخل ہو گئے۔ وہ اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ لگتا تھا کہ مریض ابھی چارپائی سے نیچے گر جائے گا۔ تب رستم نے حسنے کے ایک قریبی ساتھی فرہاد کو دیکھا۔ اس نے ایک پتھر کے ساتھ بیٹھ کر دو دفعہ زور سے قے کی پھر تیورا کر پتھر سے ٹیک لگا لی۔ یوں لگا کہ وہ بے ہوش ہونے والا ہے۔ دو افراد لپکے اور اسے بھی سہارا دے کر سرنگ کے اندر لے گئے۔ یہی سرنگ تھی جس کے اندر ڈاکٹر ناصر نے اپنا کلینک قائم کر رکھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' رستم نے ایک شخص کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''کسی نے زہر دے دیا ہے جی..... سب لوگ مر رہے ہیں۔ بُری حالت ہے۔'' اس شخص نے رستم کو پہچان کر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا اور ایک طرف لپک گیا۔

رستم نے قریب سے گزرتے ہوئے مراد گروپ کے حفیظ سے پوچھا۔ ''لالہ اور حسنا کہاں ہیں؟''

حفیظ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ''حسنا صاحب تو شاید ختم ہو گئے ہیں۔ لالہ بھی بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔''

''اور مراد؟''

''مراد جی وہ بھی بے ہوش ہیں۔ ان کو خون کی الٹی ہوئی ہے۔''

رستم کی آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاڑیاں اُڑنے لگیں۔ سب کچھ نگاہوں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے سب سے پہلا خیال دُپٹی ریاض کا ہی آیا اگرچہ یہ اس کی سازش تھی تو پھر ابھی تھوڑی دیر میں ڈیرے پر حملے کی کوشش بھی ہو سکتی تھی..... لیکن اگر یہ سب کچھ کسی اور وجہ سے ہوا تھا تو پھر ضرورت اس امر کی تھی کہ ڈیرے کی صورتِ حال کا علم ڈیرے سے باہر کسی کو نہ ہو۔

رستم نے ڈیرے سے باہر جانے والے دونوں راستوں پر اپنے اعتماد کے بندے مقرر کئے اور پھر پریشان حال لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا وہ سرنگ کے اندر گھسا۔ اس کے سینے میں دل مشینی رفتار سے چل رہا تھا۔ کیا وہ ابھی تھوڑی دیر میں حسنے اور فرید کے مرے ہوئے چہرے دیکھے گا؟ ان لوگوں کے چہرے جو ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اس کے ساتھ موجود تھے اور ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ جن کی آنکھیں روشن تھیں اور جن کے سینے عالم جوش میں فولاد دکھائی دے رہے تھے۔

رستم پندرہ بیس میٹر تک سرنگ کے اندر گیا تو اسے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے دیکھا مشعلوں کی روشنی میں کئی افراد گلے لگ کر آہ و زاری کر رہے تھے۔

''فرید..... فرید..... حسنے۔'' رستم نے پکار کر کہا اور ہجوم کو چیرتے ہوئے ڈاکٹر ناصر کے دوا خانے کی طرف بڑھا۔

یہ دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ لالہ فرید ایک چارپائی پر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ وہ اپنے منہ پر لگے ہوئے گیس ماسک کو غنودگی کی حالت میں ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ناصر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کلینک کے اندر اور باہر بہت سے مریض پڑے تھے۔ چار پانچ چارپائیوں پر تھے، باقی بے ہوش یا نیم بے ہوشی کی حالت میں فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی حسنا گروپ کے ایک شخص نے دم توڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں، منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ دو افراد اس کی لاش سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مار رہے تھے۔

''ناصر کدھر ہے.....؟'' رستم نے ایک سندھی نوجوان کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''وہ اُدھر ہے سائیں! حسنا صاحب کو ٹیکہ لگا رہا ہے۔'' نوجوان نے ایک گیس لیمپ

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رستم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا گیس لیمپ تک پہنچا۔ حسنا زمین پر ہی لیٹا تھا، وہ مکمل بے ہوش تھا۔ ناصر کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے حسنے کو نس کا انجکشن لگا رہا تھا۔ ناصر کی ہدایت پر ایک شخص حسنے کے چوڑے چکلے سینے پر اپنے دونوں ہاتھوں سے بار بار دباؤ ڈال کر اس کے دل کو متحرک رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسنے کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ اس کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم نے حبس پیدا کر رہا تھا۔

رستم گرجا۔ ''پیچھے ہٹو..... پیچھے ہٹو..... ہوا آنے دو۔''

اس نے کھینچ کھینچ کر حسنے کے ساتھیوں کو پیچھے ہٹایا پھر اپنی چادر کے پلو سے اسے ہوا دینے لگا۔ حسنے کی حالت مخدوش تھی۔

☆======☆==-=-=☆

وہ رات رستم کی زندگی کی پریشان کن راتوں میں سے ایک تھی۔ حسنے گجراتی سمیت لالہ فرید اور مراد وغیرہ کی زندگی بھی بچ گئی مگر تین افراد زہر خورانی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ جو کچھ رستم کو معلوم ہوا اس سے پتا چلا کہ ڈیرے پر کارروائی سے پہلے آخری وقت میں پی جانے والی چائے کے سبب یہ المیہ رُونما ہوا۔ یہ چائے جو دراصل دودھ پتی تھی، ایک بڑے دیگچے میں حنیفاں نامی عورت نے تیار کی تھی۔ رستم اور اجمل خان کو بھی یہ چائے پی کر ہی ڈیرے سے روانہ ہونا تھا لیکن چونکہ چائے بننے میں تھوڑی سی تاخیر تھی اس لئے وہ پہلے نکل گئے۔

بعد ازاں لالہ فرید اور اس کے ان پینتیس چالیس ساتھیوں نے یہ چائے پی جو اس کے ساتھ مسلح ہو کر اوپر جا رہے تھے۔ چائے پینے کے بعد دس منٹ کے اندر اندر کچھ افراد کا دل گھبرانے لگا اور انہیں قے شروع ہو گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے صورتِ حال بگڑتی چلی گئی۔ اب لمبی تڑنگی زور آور عورت حنیفاں ڈیرے سے غائب تھی اور اسے اردگرد کے ٹیلوں میں ڈھونڈا جا رہا تھا۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ رستم دو نمبر سرنگ کے دہانے پر موجود تھا۔ اس کے اردگرد تمتمائے چہروں والے مسلح افراد کا ہجوم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر ناصر نے سرنگ سے باہر آ کر رستم کو لالے فرید اور حسنے وغیرہ کی طرف سے تسلی دی گئی۔ مراد بھی اب ٹھیک تھا اور سو رہا تھا۔ لالے فرید کے بعد رستم ڈیرے کے مکینوں کے لئے سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ سب کے سب موجودہ صورتِ حال میں رستم کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ رستم اور اجمل نے اپنی جان پر کھیل کر اپنا کام مکمل کیا تھا اور خطرناک مشین گن MG-08 پر کنٹرول

www.pdfbooksfree.pk

حاصل کرلیا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ بہرحال اب سب لوگوں نے پھر کمر کس لی تھی۔

ان کے سینوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو سسک سسک کر مرنے کے بجائے ''مارو یا مرجاؤ'' پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پورا زور لگا کر پولیس اور اجرالیوں کا گھیراؤ توڑ دیا جائے پھر جس کے جدھر سینگ سمائیں وہ اُدھر بھاگ نکلے۔ وہ رستم کے اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار نظر آتے تھے۔

رستم اور اجمل کی ڈیرے پر واپسی سے پہلے ہی کچھ افراد حنیفاں کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ رستم نے بھی یہاں پہنچنے کے بعد چار گھڑسواروں کو اس تلاش پر مامور کیا تھا۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی تھی کہ حنیفاں نامی یہ عورت کسی سازش کا حصہ بنی ہے۔

رستم کی کلائی کی گھڑی رات کے آخری پہر تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ جب شمال کی جانب سے کچھ شور سنائی دیا۔ ایک گھڑسوار اپنے ہانپتے ہوئے گھوڑے کے ساتھ موقع پر پہنچا۔ اس نے رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''رستم صاحب! حنیفاں پکڑی گئی ہے۔ شاہ، رنجی اور سجاول وغیرہ اسے یہاں لا رہے ہیں۔''

''کہاں تھی وہ؟'' رستم نے پوچھا۔

''کھائی کے پار کیکروں میں چھپی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے سجاول نے ہی اسے دیکھا۔ اس نے سجاول کے ساتھ مارامارمی کی۔ پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا لیکن پھر شاہ اور رنجی وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ تینوں نے مل کر بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اسے۔''

ذرا دیر بعد ٹارچوں کی روشنی دکھائی دی۔ حنیفاں کو پکڑ کر لایا جارہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی مضبوط رسّی سے باندھے گئے تھے۔ رسّی کا سرا رنجی نامی شخص کے ہاتھ میں تھا اور وہ حنیفاں کو جھٹکوں سے کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ شاہ اور سجاول وغیرہ حنیفاں کے عقب میں تھے۔ سجاول نے اپنے زخمی سر پر صافہ باندھ رکھا تھا۔ خون سے اس کا چہرہ رنگین ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گھوڑے کو ہانکنے والی مضبوط چھڑی تھی۔ یہ چھڑی وہ گاہے بگاہے بے رحمی سے حنیفاں کی کمر پر رسید کرتا تھا اور وہ تکلیف سے چلا اٹھتی تھی۔ حنیفاں کی حالت بھی دیدنی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ بس پھٹی ہوئی قمیص کی چند دھجیاں تھیں جو اس کے گلے میں جھول رہی تھیں۔ وہ درمیانی عمر کی تھی مگر بہت لمبی تڑنگی اور مضبوط تھی۔ وہ کئی قتل کرنے کے بعد اشتہاری ہوئی تھی اور وڈے ڈیرے پر ان ڈکیتوں اور مفروروں کے درمیان پہنچی تھی لیکن آج جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ بہت المناک تھا۔ ہنسے مگر اتی اور مراد

وغیرہ کے ساتھی غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ سجاول نے عقب سے حنیفاں کو لات رسید کی۔ وہ لڑھکتی ہوئی رستم کے قدموں میں آن گری۔ اس کا ناک منہ پھٹ گیا تھا اور جسم کے مختلف حصوں سے خون رس رہا تھا۔ لگتا تھا کہ طویل مزاحمت اور واویلے کے بعد وہ نڈھال ہوگئی ہے۔ اب وہ بس جسم پر لگنے والی ہر ضرب کے بعد ہولے سے چلاتی تھی اور چپ ہو جاتی تھی۔

رستم نے اس کے عریاں جسم سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔ ''تُو نے کیوں کیا ایسا؟ کیوں اتنا بڑا قہر توڑا ہم سب پر؟''

وہ خاموش رہی اور کراہتی رہی۔

رستم نے اس کے گرد آلود بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''بولتی کیوں نہیں؟ کیوں کیا تُو نے ایسا اور کون کون ہے تیرے ساتھ؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس کی بیٹھی ہوئی آواز میں خوف، تکلیف اور طیش یکجا تھے۔

''تُو نے کچھ نہیں کیا اور تُو ڈر کر بھاگی بھی اور وہاں کیکروں میں چھپی بھی۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے۔

یکا یک دو افراد نے بے حد طیش کے عالم میں حنیفاں کے ہاتھوں کو باندھنے والی رسّی نما رسّے کا دوسرا سرا ہوا میں اچھالا اور ایک شاخ پر سے گزار دیا۔ اس سے پہلے کہ رستم ان کو روک سکتا تین چار افراد نے رسّے کو زور سے کھینچا، حنیفاں کرب سے چیختی ہوئی فضا میں بلند ہوگئی۔ اب وہ جنگلی بیری کی ایک شاخ سے جھول رہی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں اس کے لٹکنے کا منظر لرزہ خیز تھا۔ اس کا عریاں جسم ہزیمت، اذیت اور آفت زدگی کی تصویر نظر آتا تھا۔

''یہ ایسے نہیں بکے گی..... بڑی کڑک ہے حرام زادی۔'' ایک شخص نے کہا۔ ''سجاول اور رنجی نے اسے بے دریغ لکڑیوں سے پیٹنا شروع کردیا۔

اس سے پہلے کہ رستم اپنے ساتھیوں کو ایسا کرنے سے روکتا اور حنیفاں کی زبان کھلوانے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرتا، ایک طرف سے کتوں کا شور اور مشتعل افراد کے للکارے گونجے۔ چھ عدد خوفناک گرے ہاؤنڈ کتے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی آہنی زنجیریں رکھوالوں کے ہاتھوں میں تھیں، ایک ایک رکھوالے نے دو دو کتوں کو سنبھال رکھا تھا۔ یہ بھوکے کتے اپنے شکار پر جھپٹنے اور چیر پھاڑ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

رستم سمجھ گیا کہ یہ لوگ کیا چاہ رہے ہیں؟ یہ لوگ اپنے طور پر ہی حنیفاں کو سزائے موت دینے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ مقامی طور پر اس سزا کے لئے ''نیان'' کا لفظ استعمال کیا جاتا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔کوئی شخص جب اپنے قبیلے، برادری یا گروہ سے غداری کرتا ہے تو بدترین سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔اس غداری کے نتیجے میں اگر کوئی موت واقع ہو جائے تو پھر ''نیان'' کی سزا جاری ہو جاتی تھی۔اگر حنیفاں نے غداری کی تھی تو پھر یہ غداری نیان کی سزا تک پہنچتی تھی کیونکہ اس کے نتیجے میں ایک نہیں تین موتیں ہو چکی تھیں اور ابھی تین چار افراد ایسے تھے جن کی حالت مخدوش تھی۔

نیان کی سزا کے مطابق مجرم کو برہنہ کر کے درخت سے الٹا یا سیدھا لٹکا دیا جاتا تھا اور اس پر بھوکے کُتے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔کئی جگہوں پر یوں بھی ہوتا تھا کہ مجرم کو ویرانے میں لٹکایا جاتا تھا اور اس کے جسم پر تیز دھار آلے سے کٹ لگا دیئے جاتے تھے۔رات کو جنگلی جانور خون کی بُو سونگھتے آتے تھے اور بدنصیب شخص کو چیر پھاڑ جاتے تھے۔

بپھرے ہوئے افراد دیوانہ وار حنیفاں کی طرف بڑھے۔''مار ڈالو کتیا کو.....ٹکڑے کر دو۔'' وہ دھاڑے۔

رستم ان کے سامنے آ گیا۔''یہ کیا بے وقوفی ہے؟ تم لوگ یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟''

ایک شخص چلایا۔''اس فیصلے کے لئے کسی عدالت کی ضرورت نہیں ہے جناب! سب کچھ سامنے ہے۔یہ کتیا پولیس کی ٹاؤٹ ہے۔اس نے ہمارے ساتھیوں کی جانیں لی ہیں۔ ہم بھی یہاں کے قانون کے مطابق اس کی جان لیں گے۔نادر کاکا کے بنائے ہوئے اصول سب کے لئے برابر کے ہیں۔کیا آپ ان اصولوں کو نہیں مانتے؟''

''میں مانتا ہوں اور اس کو سزا بھی ضرور ملے گی لیکن جوش میں بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو۔ہمیں پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے یہ سب کچھ کس کے کہنے پر کیا اور اس کے ساتھ اور کون ہے؟''

بپھرے ہوئے افراد کے دماغ ذرا ٹھکانے پر آئے۔یوں لگا کہ وہ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔کُتے جو حنیفاں کے بالکل نزدیک پہنچ گئے تھے کھینچ کر پیچھے ہٹا لئے گئے۔

حنیفاں کی آنکھیں بند تھیں۔وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔بھڑکتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں اُس کا چہرہ پسینے اور لہو سے تر بتر تھا۔اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ایسے نظر آتا تھا کہ اس کے دونوں کندھے اکھڑ گئے ہیں۔

ایکا ایکی رستم چونک گیا۔ایک عورت چادر میں لپٹی ہوئی تیزی سے رستم کی طرف آئی۔ مہناز کی موت کے بعد ڈیرے پر کل تین عورتیں رہ گئی تھیں۔ان میں سے ایک تو سامنے بیری

سے لگی ہوئی تھی۔باقی دو نادیہ اور شاہدہ (حسنے کی بیوی) تھیں۔یہ ان دونوں میں سے کون ہو سکتی تھیں۔وہ قریب آئی تو رستم نے پہچان لیا۔وہ شاہدہ تھی۔وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

اس نے رستم کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔''بھائی جی! مجھ کو تساں سے ایک بڑی ضروری گل کرنی ہے۔آپ حنیفاں کو کچھ نہ کہیں۔یہ بے قصور ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں تساں کو سب کچھ بتاتی ہوں جی۔تساں ایک منٹ کے لئے میرے ساتھ آؤ۔'' شاہدہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

رستم نے حنیفاں کو اُتارنے کا حکم تو نہیں دیا۔تاہم شاہ اور سجاول وغیرہ کو اسے پیٹنے سے منع کر دیا۔وہ لرزتی کانپتی شاہدہ کے ساتھ ایک قریبی حجرے میں چلا گیا۔یہاں چربی کے تیل کا بڑا چراغ جل رہا تھا۔پورے کمرے میں چربی کی سڑاند تھی۔

حسنے کی بیوی شاہدہ نے روتے ہوئے کہا۔''مینڈے بس میں نہیں کہ میں یہ ظلم ہوتے ہوئے دیکھوں۔حنیفاں بے قصور ہے بھائی جی۔میں تساں کو بالکل سچ بتا رہی ہوں۔''

''تو پھر کون قصوروار ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

شاہدہ خاموش رہی۔اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے تھے اور ہچکی سی بندھ گئی تھی۔

''تم چپ کیوں ہو؟'' رستم کا لہجہ تیز تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک خود پر ضبط کرتی رہی پھر سسک کر بولی۔''تساں کو بہت دکھ ہوگا بھائی جی۔تساں کو بتاتے ہوئے مینڈا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔''

''تم میری پرواہ نہ کرو۔اگر واقعی تمہیں سچ کا پتا ہے تو بتاؤ۔نہیں بتاؤ گی تو حنیفاں کی جان چلی جائے گی۔''

شاہدہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر سسک کر بولی۔''تساں.....کی گروالی.....نادیہ۔''

رستم سناٹے میں رہ گیا۔اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟''

وہ ہچکی لے کر کراہی۔''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھائی جی.....میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔نادیہ نے چائے کے دودھ میں کچھ ملایا تھا۔یہ کام اس نے شام سے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔میں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ وہ مکر گئی کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔پھر میں نے سوچا کہ شاید مجھے ہی وہم ہوا ہے، وہ کوئی غلط کام کیسے کر سکتی ہے۔اللہ کی مار ہو مینڈی عقل پر۔مجھ

www.pdfbooksfree.pk

میں عقل مت ہوتی تو اسی وقت پرچول (چھان بین) کر لیتی۔'' شاہدہ اپنا چہرہ چادر میں چھپا کر زار زار رونے لگی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس نے واقعی کچھ ملایا تھا؟''

''میں برآمدے میں تھی۔ میں نے دیکھا، نادیہ جلدی سے باورچی خانے میں گئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا..... پھر اس کا ہاتھ اپنی چادر میں سے نکلا اور اس نے دودھ میں کچھ ڈالا۔ مجھے تو شک پڑتا ہے جی کہ یہ سب کچھ عظمت کا ہی کیا دھرا ہے۔ نادیہ اب بھی اس سے ملتی ہے۔ اس کے کہے پر چلتی ہے۔ اللہ کی مار ہو اس خبیث پر..... کتے کی موت مرے حرام زادہ۔'' شاہدہ نے اوڑھنی پھیلا کر عظمت کو بددعا دی۔

عظمت..... پیر قدرت اللہ کا وہی چیلا تھا جسے رستم نے ایک دن نادیہ کے ساتھ نا گفتہ حالت میں پکڑا تھا۔ وہ نادیہ کو عریاں کر کے اس کی پشت پر گھندوئی سے کوئی ''جادوئی'' عبارت تحریر کر رہا تھا۔ بعد ازاں اس کی تحویل سے فحش تصویریں، شراب اور سفلی عمل کی بہت سی اشیاء برآمد ہوئی تھیں۔ رستم نے عظمت کو مارکوٹ کر سرنگ نمبر دو کی کوٹھڑی میں ڈلوا دیا تھا۔ اس کے بعد رستم کو وادی سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ وہ قدرت اللہ کے اس بدبخت چیلے پر نگاہ نہیں رکھ سکا تھا اور اب..... حسنے کی بیوی شاہدہ بتا رہی تھی کہ نادیہ اب بھی اسی شعبدہ باز کے ''ٹرانس'' میں ہے اور اس سے ملتی ہے۔

رستم کا دماغ چکرا گیا۔ اس توہم پرستی نے نہ جانے کس کس کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اب نادیہ کوئی اَن پڑھ، جاہل، گنوار نہیں تھی۔ ایک معروف اداکارہ رہی تھی۔ اس نے دنیا دیکھی ہوئی تھی۔ کبھی ایسی فلسفیانہ باتیں کرتی تھی کہ عالم فاضل کیا کرتے ہوں گے لیکن اس کا دماغ جس ڈگر پر چل پڑا تھا بس اسی پر چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک گمراہ کن عقیدے پر کاربند ہوئی تھی اور اب پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

شاہدہ نے جو کچھ بتایا تھا اگر سچ تھا تو پھر نادیہ ایک خوفناک صورتِ حال کا شکار ہونے والی تھی اور اس کی ذمے دار صرف اور صرف وہ خود تھی۔

رستم نے شاہدہ سے کہا۔ ''اب تک تم نے یہ بات کس کس کو بتائی ہے؟''

''میں نے کسی کو نہیں بتائی لیکن مجھے لگتا ہے کہ کاٹھیا کو بھی شک پڑ گیا ہے۔ جب چائے پینے کے بعد سب کو الٹیاں آنا شروع ہوئیں تو میں نے جا کر نادیہ کو جھنجھوڑ دیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ مینڈے کو لگتا ہے کہ اس وقت ہماری کچھ باتیں کاٹھیا نے بھی سنیں۔''

''تمہاری باتوں کے جواب میں نادیہ نے کیا کہا ہے؟''

''وہ کچھ بولتی نہیں۔ بس روتی جا رہی ہے۔'' شاہدہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا۔

رستم نے شاہدہ کو تاکید کی کہ ابھی وہ یہ ساری بات اپنے تک رکھے پھر وہ تیزی سے واپس آیا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں شاہ اور سجاول وغیرہ کو حکم دیا کہ وہ نیم بے ہوش لڑاکا حنیفاں کو شاخ سے نیچے اتار لیں۔

رستم کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے شاہ اور سجاول وغیرہ نے برہنہ حنیفاں کو نیچے اتارا۔ وہ زمین پر پڑھے سی گئی۔ ایک شخص نے اس کے بدن پر چادر ڈالی۔

گرے ہاؤنڈ گئے اب کافی پیچھے ہٹا لئے گئے تھے لیکن وہ اب بھی شور مچا رہے تھے اور لپک لپک کر زخمی حنیفاں کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مشعلوں کا تیل جلنے کی بُو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ نسیم سحر کی پاکیزگی اس بُو سے یوں داغدار تھی جیسے کسی شریف زادی کے چہرے پر کسی غنڈے کی سانسوں کی باس پھیل رہی ہو۔ اس خون، اس بُو اور اس دھواں دھواں ماحول سے بہت اوپر نیم روشن آسمان پر پرندوں کی ڈاریں گزر رہی تھیں۔ ہر غم فکر سے آزاد، ہر آفت سے بے خبر۔

کاٹھیا اور شاہ وغیرہ کو حنیفاں کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر رستم لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی طرف گیا۔ وہی کمرہ جس میں پچھلے تقریباً تین مہینے سے وہ خوبرو نادیہ کے ساتھ بظاہر شوہر کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نادیہ وہیں پر ہوگی۔ نادیہ سے رستم کو کچھ لینا دینا نہیں تھا لیکن کچھ بھی تھا، بی بی نے اسے ایک سہیلی کی حیثیت دی تھی اور رستم سے اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ یہ بظاہر معمولی تعلق رستم کے لئے بہت گہرا تھا۔ رستم کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ شاہدہ کی کہی ہوئی بات غلط نکلے۔ نادیہ نے وہ سب کچھ نہ کیا ہو جس کے لئے وہ بدترین سزا کی مستحق ٹھہر سکتی ہے۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا، نادیہ وہاں نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی نکل کر گئی ہے۔ رستم نے وہ چھڑی دیکھی جس سے اس نے کل نادیہ کو پیٹا تھا۔ چھڑی ٹوٹ گئی تھی لیکن اب وہ چھڑی مرمت شدہ حالت میں رستم کے سامان کے پاس پڑی تھی۔ یقیناً اس کی مرمت نادیہ نے ہی کی ہوگی۔ چھڑی کے دونوں ٹکڑے قلم کی شکل میں ٹوٹے تھے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ان پر سوت کی ڈوری بڑی مضبوطی اور محنت سے باندھ دی گئی تھی۔

رستم نے چھڑی اٹھا کر دیکھی پھر ایک طرف پھینک دی۔ وہ نادیہ کو آواز دیتا چھجے کے تینوں کمروں میں گھوما۔ آخر وہ درختوں کی طرف آیا۔ وہ اسے درختوں میں نظر آ گئی۔ وہ ایک

www.pdfbooksfree.pk

پتھر پر بیٹھی تھی۔ سر گھٹنوں میں گھسا رکھا تھا۔ اس کے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ اس کی کمر اور کندھوں کی جنبش ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔

کچھ کہے سنے بغیر رستم نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر کمرے میں لے آیا۔ رو رو کر نادیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

رستم نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ''دیکھ نادیہ! میں تجھ سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں اور یہ سچ سننے کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ کروں گا..... کیونکہ یہ میری ذمے داری ہے۔ میں بڑی ہمدردی سے تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولنا۔ مجھے بتا، میرے جانے کے بعد کیا ہوا ہے یہاں؟''

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ رستم کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مان جائے گی لیکن جب وہ بولی تو یہ توقع غلط ثابت ہوگئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہاں رستم! یہ جو کچھ ہوا ہے، مجھ سے ہوا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے پردہ آ گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں گناہ گار ہوں۔ مجھے قتل کر دو۔ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو مجھے۔''

رستم سناٹے میں رہ گیا۔ نادیہ کے اقبالی بیان کے بعد اس کے بے گناہ ہونے کی ہر امید دم توڑ گئی تھی، جو کچھ شاہدہ نے بتایا تھا وہی کچھ نادیہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی۔ غصے سے مغلوب ہو کر رستم نے ایک زوردار تھپڑ نادیہ کو رسید کیا۔ اس کے بال اچھل کر اس کے چہرے پر بکھر گئے اور وہ تھرا کر رہ گئی۔ ''کیوں یہ ظلم کیا تم نے؟ کس کے کہنے پر کیا؟'' رستم کی آواز میں بے پناہ دکھ اور غضب یکجا ہو گئے۔

وہ کچھ دیر شدید تذبذب میں رہی پھر کراہ کر بولی۔ ''اُس کے کہنے پر؟''

''کون اُس، وہی حرامی..... کتے کا بچہ عظمت؟'' رستم پھنکارا۔

نادیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

رستم کے لئے اپنے طیش پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے نادیہ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ کراہنے لگی۔ رستم نے ایک جھٹکے سے اس کا تر بتر چہرہ اوپر اٹھایا۔ ''تُو جانتی ہے تُو نے کتنا بڑا قہر توڑا ہے۔ تین بندوں کی جان گئی ہے۔ ان تین موتوں کی وجہ سے یہاں جو کچھ ہونا ہے اس کا نظارہ بھی تُو جلد ہی کر لے گی۔ یہ لوگ کُتے کی موت ماریں گے تجھے۔ بوٹی بوٹی علیحدہ کر دیں گے تیری۔ اس سے اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لے یا گولی مار لے خود کو۔'' رستم کے لہجے میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آیا تھا۔

وہ بس تھر تھر کانپتی جا رہی تھی، اس کا سر گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے

اندر سے ہی کہا۔ ''عظمت نے مجھ سے کہا تھا کہ اس دوا سے بس ہلکی سی بے ہوشی ہو گی۔ اس نے نہیں بتایا تھا کہ یہ اتنی تیز دوا ہے۔''

''دوا ہے؟'' رستم نے چیخ کر کہا۔ ''وہ زہر تھا زہر..... اس نے تین بندوں کی جان لی ہے اور ابھی ایک دو اور بھی مر جائیں گے۔''

وہ اٹھ کر نہایت بے قراری سے کمرے کے مختصر خلا میں ٹہلنے لگا۔ وہ گٹھڑی بنی اس کے سامنے دری پر بیٹھی رہی۔ سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا لیکن یہ سپیدہ سحر رستم کو سیاہ ترین راتوں سے بڑھ کر تاریک لگ رہا تھا۔ احاطے کی طرف لوگوں کا شور تھا۔ گاہے بگاہے رونے کی اکا دکا آوازیں بھی آتی تھیں۔ یقیناً یہ مرنے والوں کا ماتم تھا۔ گرے ہاؤنڈ کتوں کی آوازیں اب قبرستان کی طرف سے آ رہی تھیں۔ دو تین منٹ کی چہل قدمی کے بعد رستم اپنے بے پناہ کرب اور اضطراب پر کسی حد تک قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ وہ خود کو سنبھالتا ہوا نادیہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی تم نے اس مشٹنڈے عامل سے رابطہ کیوں کیا؟'' رستم نے ہر ہر لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

''میں نے بڑی کوشش کی مگر خود کو اس سے دور نہ رکھ سکی۔ اس کی باتوں میں پتا نہیں کیا جادو ہے۔ میں ایک بار پھر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ میرا دماغ بند ہو گیا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔''

''کہاں ملتی رہی ہو اس سے؟''

''جہاں تم نے اسے بند کرایا تھا..... سرنگ میں۔''

''کیا پھر اس سے عمل کرانے کے لئے اس کے سامنے ننگی ہو کر بیٹھی تھی؟''

''نن..... نہیں۔ اس کے بعد ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مم..... میں بس دو تین بار ملی ہوں۔ وہ کوٹھڑی کے اندر ہوتا تھا، میں سلاخوں والی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس سے بات کرتی تھی۔'' بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر اچانک ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''اس کی باتیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ کیسے جان لیتا ہے میرے بارے میں۔ وہ مجھے ایسی باتیں بتاتا ہے جو میرے سوا کسی اور کو پتا ہی نہیں ہیں۔ میں بے بس ہو جاتی ہوں۔''

''اب تمہیں اور زیادہ بے بس نہیں ہونا پڑے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ساری مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔'' رستم کا زہرناک لہجہ دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے اندرونی اضطراب کو بس میں کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر

www.pdfbooksfree.pk

سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ شاندار چائے جوتم نے لالہ اور اس کے ساتھیوں کو پلائی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اب ذرا گلے ہاتھ مجھے یہ بھی بتا دو کہ اُس حرامی نے تمہیں اس کام کے لئے تیار کیسے کیا؟''

''اس کی باتوں نے میرے دماغ پر اثر کر دیا تھا..... وہ بار بار یہی بات کہہ رہا تھا کہ..... کہ.....'' وہ خاموش ہوگئی۔

رستم نے چند سیکنڈ انتظار کیا پھر اس کے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر بولا۔ ''فلموں کی طرح رک رک کر ڈائیلاگ نہ مارو۔ جو بکواس شروع کی ہے اسے پورا کرو۔''

وہ ہکلا کر بولی۔ ''عظمت کہتا تھا کہ جو چالیس لوگ تمہارے ساتھ پولیس کا گھیراؤ توڑنے کے لئے جا رہے ہیں ان میں سے..... بس دو بندے زندہ بچیں گے..... اور تم ان دو میں سے نہیں ہو گے۔''

''بہت خوب۔'' رستم نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بچانے کے لئے ان سب کو زہر کھلا دیا اور ساتھ میں مجھے بھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں تمہاری وہ محبت بھری چائے پینے سے بچ گیا۔ نہیں تو میں بھی زندگی و موت کے درمیان لٹکا ہوتا۔'' رستم کا لہجہ زہرناک تھا۔

وہ منمنائی۔ ''اس نے کہا تھا کہ میں کسی بھی طرح تم سب کو روک لوں۔ اگر میں نہ روکوں گی تو بہت بڑا گناہ کروں گی۔ اس نے کنویں کی مثال دی تھی..... اس نے کہا تھا کہ چالیس اندھے ایک کنویں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اس میں گر کر مرنے والے ہیں۔ وہ کنویں کو نہیں دیکھ سکتے لیکن تم دیکھ رہی ہو۔ انہیں کسی طرح بھی روکنا تمہارا فرض بنتا ہے۔ اس نے مجھے اپنی باتوں میں اس طرح الجھایا کہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہوگیا۔ مجھے لگا، کل رات کے بعد میں کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھ سکوں گی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی رستم۔ میں نے وہی کچھ کیا جو عظمت مجھ سے کہہ رہا تھا۔''

روتے روتے نادیہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''رستم! مجھے معاف کر دو۔ معاف نہیں کر سکتے تو جو بھی چاہے سزا دے دو لیکن مجھ سے منہ نہ موڑنا۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

رستم تڑخ کر بولا۔ ''بات میرے معاف کرنے یا سزا دینے کی نہیں۔ تمہاری وجہ سے تین ساتھیوں کی جان گئی ہے۔ ان کا خون تمہاری اور عظمت کی گردن پر ہے۔ لوگ بپھرے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ اب یہاں میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔'' رستم نے بے حد مایوسی کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا سینہ جل اٹھا۔ اسے لگا

جیسے بی بی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس کا حسین چہرہ، اس کی سمندر جیسی گہری آنکھیں اور اس کا باوقار سراپا رستم کے سامنے موجود ہے۔ وہ اس ساری صورتِ حال کو دیکھ رہی ہے۔ رستم سے کہہ رہی ہے۔ میں نے نادیہ تمہیں سونپی تھی۔ اسے سنبھالنا اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں بی بی سے بولا۔ ''میں کیسے پورا کروں یہ فرض؟ کیا اس نے فرض پورا کرنے کی کوئی گنجائش رہنے دی ہے بی بی؟''

نادیہ کا سر بدستور گھٹنوں میں تھا۔ اس کی بھاری چوٹی کے نیچے سے اس کی کمر کا بالائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں جلد پر پرانی خراشیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ اس گھنڈوئی کی ڈالی ہوئی گہرئیں لکیریں تھیں جو عظمت کے نامعلوم ''عمل'' کا حصہ تھیں۔ گردن سے ذرا نیچے گھنڈوئی کی نوک سے ''بگانن گوری'' لکھا گیا تھا اور اب بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ اسی طرح کے بے معنی الفاظ نادیہ کی ساری پشت اور پنڈلیوں پر بھی تھے۔ یہ الفاظ رستم نے خود دیکھے تھے..... رانی ماتا..... رات کا راجا..... اماوس کا تارا..... کالی قبر..... اس کے علاوہ مختلف ہندسے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ نادیہ اس خبیث عامل کے ہاتھوں یہ تکلیف سہتی رہی تھی اور اس کی تفریحِ طبع کا سامان بنتی رہی تھی۔ یہ شیطان عامل پتا نہیں اس سے آگے بھی کہاں تک چلا جاتا؟ اگر کچھ دن پہلے رستم اسے کھوہ میں سے پکڑ نہ لیتا۔ رستم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''دیکھ..... میں نے تجھے کتنا منع کیا تھا..... کتنا سمجھایا تھا مگر تم جیسی عورتوں کے دماغ جب ایک رخ پر چل پڑتے ہیں تو پھر رکتے نہیں ہیں۔ وہ عقیدے کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر اندھی گھوڑیوں کی طرح بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ سب کچھ لٹا کر بھی ان کو ہوش نہیں آتا۔ تمہاری جیسیوں کی عقل کا ماتم کرنے کے سوا بندہ اور کیا کر سکتا ہے۔''

''میں انجان نہیں ہوں رستم..... ہم..... میں جانتی ہوں.....''

''اسی بات کا تو زیادہ دکھ ہے کہ تم انجان نہیں ہو۔ پڑھی لکھی شہری ہوتے ہوئے بھی تم نے وہی کچھ کیا ہے جو کسی دور دراز علاقے کی رہنے والی گنوار زنانی کرتی۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں..... شیطان عاملوں اور پیروں نے گھروں کے گھر برباد کئے ہیں اور ان لوگوں کا ہتھیار تم جیسی ڈھیٹ بے غیرت عورتیں ہیں۔ اپنے کسی نہ کسی لالچ یا تمنا کو روگ بنا کر وہ ان عاملوں کی جھولی میں گرتی ہیں اور سب کچھ برباد کر لیتی ہیں۔''

''جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا رستم..... لیکن خدا کے لئے میری نیت پر شک نہ کرنا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے لئے، شانی جی کے لئے میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی

www.pdfbooksfree.pk

تھی..... تمہارے بغیر..... تمہارے بغیر زندگی کا خیال کرنا بھی میرے لئے محال ہے۔ میرا سب کچھ تم ہو رستم..... تم..... مجھے لے کر یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ رستم۔ میں تمہاری کنیز ہونے کا حق ادا کردوں گی۔''

وہ تڑپ کر رستم کے پاؤں میں گر پڑی۔ اپنا سر اس کے پاؤں پر پٹخنے لگی۔ اپنے تر بتر رخسار اس کے پیروں کے بالائی حصے پر رگڑنے لگی۔ لمبے بال اس کی چوٹی میں سے نکل گئے تھے اور رستم کے قدموں کو ڈھانپ رہے تھے۔ اس کا لباس جسم پر بے ترتیب ہوگیا تھا اور مضحکہ خیز لگ رہا تھا لیکن اسے اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ رستم نے سوچا اگر کوئی اچانک اندر آگیا اور اس نے نادیہ کو اس عجیب وغریب حالت میں دیکھا تو کیا سوچے گا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں نادیہ کی ہیجانی گرفت سے چھڑائے اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ اسی طرح اپنے گھٹنے اپنے جسم کے نیچے دبائے اوندھے منہ دری پر پڑی رہی۔

رستم جب احاطے میں پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ بیشتر لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس سانحے کی اصل ذمہ دار نادیہ ہے..... معمیا کے ذریعے یہ بات آؤٹ ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گئی تھی۔ شروع شروع کے دنوں میں خوبرو نادیہ کو یہاں بہت سی حریص نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن بعد میں جب وہ رستم کی ''بیوی'' بن گئی تھی تو اسے چھوٹی بھرجائی کہا جانے لگا تھا اور مہنار کی طرح بھرجائی کا پروٹوکول ہی دیا جانے لگا تھا لیکن آج لوگ یہ سن رہے تھے کہ اس چھوٹی بھرجائی نے ایک نازک ترین موقع پر انہیں سنگین دھوکا دیا ہے اور درجنوں افراد کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے..... کیوں..... کیسے..... کس وجہ سے؟ اس طرح کے اَن گنت سوال ڈیرے کے مکینوں کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ رستم کو یوں لگا کہ سارے کے سارے قریباً ڈیڑھ سو افراد کی سوالیہ نظریں رستم پر لگی ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کی دلی خواہش یقیناً یہ رہی ہوگی کہ چھوٹی بھرجائی اس الزام سے بچ جائے۔ انہوں نے جو کچھ سنا وہ غلط ہو۔

سب سے پہلے شاہ اور سجاول ہی آگے آئے۔ سجاول نے دبے لہجے میں کہا۔ ''رستم صاحب، لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا حفیظاں واقعی بے قصور ہے؟''

رستم خاموش رہا۔

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''وہ کہتی ہے، میں بے قصور ہوں۔ میں اس لئے چھپ گئی تھی کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔''

ایک تیسرا شخص احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ بے قصور ہے تو پھر کون ہے مجرم..... کس نے یہ جانیں لی ہیں؟''

سجاول نے کچھ دیر تک رستم کے بولنے کا انتظار کیا پھر دبے لہجے میں وہ بولا۔ ''رستم صاحب! کچھ لوگ چھوٹی بھرجائی کا نام لے رہے ہیں۔ کیا آپ نے چھوٹی بھرجائی سے بات کی ہے؟''

''ہاں، میں نے کی ہے۔ اس کی بات سے پتا چلتا ہے کہ یہ سب عظمت کا کیا دھرا ہے۔ اس نے دوا کے نام پر نادیہ کو دھوکے سے زہر دیا۔ نادیہ نے اسے بے ہوشی کی دوا سمجھ کر دودھ میں ملا دیا۔''

سجاول کا سر جھک گیا۔ اس کے تاثرات سے محسوس ہوا کہ وہ رستم کی بات سے مکمل اتفاق نہیں کر رہا۔

شاہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی جی..... اس حرامی عظمت کے بارے میں ہم سب کو پتا چل چکا ہے کہ وہ پیر قدرت اللہ اور پولیس کا ناؤٹ ہے۔ اس کے باوجود چھوٹی بھرجائی اس سے ملنے گئی۔ یہ تو آنکھوں سے دیکھ کر بھی سانپ کا منہ چومنے والی بات ہے۔''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کاٹھیا سے کہا۔ ''عظمت کو لے کر آؤ یہاں..... میں نے اس سے.....''

ابھی رستم کی بات منہ میں ہی تھی کہ ایک شخص تیزی سے آگے آیا اور رستم کی بات کاٹ کر بولا۔ ''اُس حرامی نے یہاں آکر کیا کرنا ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے چنے دن کی طرح سب کے سامنے ہے۔'' یہ شخص مراد تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ڈاکٹر ناصر کی لگائی ہوئی پٹر غلائی ابھی تک اس کے بازو پر موجود تھی۔

رستم نے کہا۔ ''کیا سب کے سامنے ہے؟''

''یہی کہ یہ قتل تمہاری ایکٹرس بیوی نے کئے ہیں اور اس سازش میں پیر قدرت اللہ کا وہ حرامی چیلا بھی شامل تھا۔'' مراد نے تڑخ کر کہا۔

''دیکھو، ابھی یہ صرف ایک الزام ہے، اس کو ثابت ہونے دو پھر میں وہی کروں گا.....''

رستم کا یہ فقرہ بھی ادھورہ رہ گیا۔ سرنگ کی طرف سے ایک بندے کی دردناک چیخ وپکار ابھری۔ وہ اپنا سر پیٹ رہا تھا اور زمین پر لیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیگر افراد اسے سنبھال رہے

www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ یقیناً ڈاکٹر ناصر کے کلینک میں ایک اور شخص زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

مراد نے بڑے طنز سے کہا۔ ''یہ لو..... ایک اور ثبوت پیش ہو گیا ہے، تمہاری خدمت میں.....''

مراد کے کچھ ساتھی اشتعال میں نعرہ زنی کرنے لگے۔ ایک شخص آگے آیا اور اپنی AK57 گن فضا میں لہرا کر بولا۔ ''خون کا بدلہ خون ہے۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں ہوگی۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں ہونے دیں گے۔''

''ہاں کسی سے رعایت نہیں ہونے دیں گے۔'' مراد گروپ کے بہت سے لوگ ایک ساتھ بولے۔

دیکھتے ہی دیکھتے فضا سنگین ہوگئی۔ مراد گروپ کے لوگ اشتعال سے بے قابو ہونے لگے۔ وہ ہجوم کو چیر کر آگے آگئے اور رستم کے عین سامنے کھڑے ہو کر نعرہ زنی کرنے لگے۔ مراد، رستم کے برابر آن کھڑا ہوا اور پکار کر بولا۔ ''آفتاب کا بھائی بھی مرگیا ہے۔ ہمارے مرنے والوں کی گنتی تین ہوگئی ہے۔ ہمیں ان تین موتوں کا حساب چاہیے اگر ہمارے ساتھ انصاف نہ ہوا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ہمیں انصاف چاہیے۔''

''انصاف چاہیے۔'' بہت سی آوازوں نے بیک زبان کہا۔

کچھ پھرے ہوئے لوگوں نے دیوانہ وار پیچھے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی شاید وہ نادیہ کو گھسیٹ کر یہاں لانا چاہتے تھے۔ اس موقع پر فرید اور رستم کے قریبی ساتھی ان کے راستے کی دیوار بن گئے اور انہیں دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔

مراد نے ایک گرج کے ساتھ رستم کو مخاطب کیا۔ ''لالے کے بعد تم سردار ہو لیکن اگر تم انصاف کرنے میں ڈنڈی مارو گے تو پھر ہم خود فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

کاٹھیا چند دیگر افراد کے ساتھ عظمت کو کال کوٹھڑی میں سے لینے کے لئے گیا تھا۔ رستم نے گھوم کر دیکھا تو وہ واپس آرہا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا چہرہ قدرے زرد اور پسینے میں نہایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ رستم کا ماتھا ٹھنکا۔ عظمت اس کے ساتھ نہیں تھا۔ کاٹھیا تقریباً دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ رستم کے پاس آیا اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ''رستم بھائی! عظمت نے زہر کھالیا ہے۔ وہ کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ اس کی حالت ایک دم خراب ہے۔''

ایکا ایکی سراسیمگی میں اضافہ ہوگیا۔ ہر چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ رستم اور سجاول، رجی، شاہ وغیرہ دوڑتے ہوئے سرنگ کے اندر پہنچے۔ کوٹھڑیوں کے پاس کئی افراد جمع تھے۔ رستم نے

دیکھا کوٹھڑی کے فرش پر قدرت اللہ کا چیلا لمبا لیٹا تھا..... ڈاکٹر ناصر اور دیگر دو افراد اسے طبی امداد دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ عظمت کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ چند روز پہلے تک عظمت کے لمبے بال تھے لیکن جب وہ کھوہ میں نادیہ کے ساتھ پکڑا گیا تھا اور اس کے تکیے کے غلاف میں سے فحش تصویریں وغیرہ نکلی تھیں، سجاول اور شاہ نے دلاور کے ساتھ مل کر عظمت کا سر مونڈ دیا تھا۔ اب بھی وہ مونڈے ہوئے سر کے ساتھ ہی فرش پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھ کی گیڈ پر کھبی بھنبھنا رہی تھی۔

رستم کو دیکھ کر ناصر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ یہ بچے گا۔''

''کوشش کرو یار۔ یہ مرگیا تو بہت کچھ پردے میں رہ جائے گا۔''

''اس کا معدہ واش ہو سکتا تو شاید امید پیدا ہو جاتی لیکن.....''

رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے غلیظ صورت بدبودار چیلے کے گلے سے گھنگرو کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ موت کی گھنٹی تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے آخری کوشش کے طور پر آکسیجن گیس کا سلنڈر منگوایا لیکن سلنڈر کے آتے آتے عظمت کے سانس پورے ہوگئے۔ اس کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ وہ جو صرف نام کا عظمت تھا، ذلت کی گہرائی میں گرنے کے بعد اپنے انجام اور پوچھ تاچھ سے بچنے کے لئے حرام موت مرگیا۔

ڈاکٹر ناصر نے رستم کو اخبار کی پڑیا میں رکھا ہوا ایک سفید رنگ کا پاؤڈر دکھایا۔ ''یہ وہ زہر ہے۔ خاصا طاقت ور اور زود اثر ہے۔''

''کہاں سے ملا؟''

ڈاکٹر ناصر نے کہا۔ ''اس کی جیب میں سے..... ایسی ہی ایک اور پڑیا چھت کی درز میں بھی رکھی ہے لیکن اس میں تھوڑا سا پاؤڈر ہے۔ باقی اس نے شاید چھوٹی بھر جائی کو دے دیا ہوگا.....'' ڈاکٹر ناصر نے چھت کی ایک درز میں سے چھوٹا سا لمبوترا پتھر ہٹایا۔ پیچھے اخبار ہی کے کاغذ سے بنی ہوئی دوسری پڑیا بھی موجود تھی۔ یہیں پر دو انگوٹھیاں اور دو طلائی جھمکے رکھے ہوئے بھی نظر آئے۔

ڈاکٹر ناصر نے ہولے سے کہا۔ ''یہ چھوٹی بھر جائی کے زیور ہیں۔''

رستم نے بھی پہچان لیا۔ یہ نادیہ کی چیزیں تھیں۔ دونوں انگوٹھیاں تو وہی تھیں جو اس سے پہلے بھی نادیہ نے عظمت کو جھاڑ پھونک کے معاوضے میں دی تھیں۔ رستم نے یہ واپس حاصل کی تھیں لیکن اب یہ پھر نادیہ کے ذریعے عظمت کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ مزید اضافے کے طور پر ساتھ میں جھمکے بھی تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یہ پولیس کے ٹاؤٹ اور پیر قدرت اللہ کے چیلے کا کمرہ تھا اور نادیہ بار بار منع کرنے کے باوجود یہاں آتی رہی تھی۔ اپنی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اب ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ رستم کی نگاہ سامنے دیوار پر پڑی۔ کسی دل جلے نے کوٹھڑی کی دیوار پر مار کر سے لکھ رکھا تھا۔ ''یہاں جھوٹے پیر کا چیچہ اور پولیس کا کتا بندھا ہوا ہے۔''

کوٹھڑی سے باہر مار کر سے عظمت کی برہنہ تصویر بنائی گئی تھی۔ نیچے لکھا تھا۔ ''حرامی جاسوس 007۔''

رستم نے سجاول سے پوچھا۔ ''پہرے دار کدھر ہے؟''

لمبا تڑنگا پہرے دار انور خان ایک طرف سے روتا ہوا برآمد ہوا اور رستم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ رستم نے دوٹوک انداز میں اس سے پوچھا۔ ''کیا چھوٹی بھرجائی یہاں عظمت سے ملنے آئی تھی؟''

اس نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔ ''دو تین بار آئی تھیں جی..... لیکن وہ کوٹھڑی کے اندر نہیں گئی تھیں۔ باہر ہی رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بارے میں کسی کو پتا نہ چلے۔ وہ آپ کی بی بی صاحبہ ہیں جی۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں..... وہ میرے لئے ماں بہن ہیں جی۔''

''عظمت اور چھوٹی بھرجائی کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟''

''میں دور جا کر کھڑا ہو جاتا تھا جی۔ ہاں دیکھتا ضرور رہتا تھا کہیں یہ خبیث سلاخوں کے اندر سے ہی بھرجائی جی کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔'' انور خان نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''کبھی کوئی بات سنی تم نے؟'' رستم نے پوچھا۔

''جب..... بس ایک بار چند لفظ میرے کانوں میں پڑے تھے جی۔''

''کیا لفظ سنے تھے؟''

انور خان کے چہرے پر جھجک نمودار ہوئی۔ اس نے بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ بدل کر بولا۔ ''آپ ذرا علیحدہ آئیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

''نہیں..... جو بات بھی ہے سب کے سامنے کہہ دو۔'' رستم کے چہرے پر بلا کی سختی تھی۔

انور خان ذرا توقف سے گویا ہوا۔ ''جب بھرجائی جی پہلی بار عظمت سے ملنے آئیں،

رات دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میری سگریٹ کی ڈبی کوٹھڑی کے پاس رہ گئی تھی۔ میں ڈبی اور لائٹر اٹھانے کے لئے آیا۔ اس وقت بھرجائی جی کہہ رہی تھیں..... وہ کہہ رہی تھیں..... اپنی عزت آبرو کے سوا میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ بس میرے دل کی مراد پوری کر دو۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔ جو بھی کہو گے۔ عظمت گم صم نظر آتا تھا۔ جیسے ناراض ہو۔ بھرجائی جی کا لہجہ منت والا تھا..... میں نے بس یہی چند لفظ سنے تھے۔''

دوپہر تک وڈے ڈیرے کی صورتِ حال کیا سے کیا ہو گئی۔ ایک طوفان سا برپا ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ اشتعال مراد گروپ میں تھا۔ وہ اب علی الاعلان نادیہ کے لئے ''نیان'' کی سزا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حسنا گروپ کے دس بیس افراد بھی ان کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نادر کاکا کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل ہو۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ مجرم کون ہے؟ دیکھا جائے کہ جرم کیا ہے؟ جو سزا حفیاں کے لئے تجویز کی جانے والی تھی اب وہی سزا نادیہ کے لئے ہونی چاہیے۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اس واقعے کے دو ہی بڑے مجرم تھے۔ چیلا عظمت اور رستم کی بیوی نادیہ۔ عظمت نے خودکشی کر لی تھی، نادیہ کے لئے نیان سے کم کوئی سزا قابلِ قبول نہیں تھی۔

مراد گروپ کے زیادہ جوشیلے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نادیہ براہِ راست سازش کا حصہ بنی ہے۔ اس نے پولیس سے اپنے اور رستم کے لئے رعایت حاصل کرنے کے لئے عظمت کا ساتھ دیا اور وڈے ڈیرے کے اہم ترین لوگوں کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی۔

جو لوگ زیادہ جوشیلے نہیں تھے اور جو سارے معاملے کو معروضی انداز سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے نزدیک بھی نادیہ قابلِ معافی نہیں تھی۔ ان کا مؤقف تھا کہ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ عظمت ایک بدمعاش عامل اور پولیس کا ٹاؤٹ ہے، نادیہ چوری چھپے اس سے کیوں ملی اور اس کی آلہ کار بنی۔ یہ لوگ نادیہ کو زیادہ سے زیادہ رعایت یہ دے رہے تھے کہ اس کو نیان کی سزا نہ دی جائے لیکن قتل کا بدلہ قتل وہ بھی کہہ رہے تھے۔

اسی دوران میں ایک اور بات سامنے آئی اور یہ نادیہ کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ناصر، سجاول اور حسنا گروپ کا رجی دیگر تین سرکردہ افراد کے ساتھ اندر رستم کے پاس آئے۔ ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ کوئی اور سنگین معاملہ لے کر آئے ہیں۔

وہ کچھ دیر تک رستم کے سامنے چپ کھڑے رہے پھر ڈاکٹر ناصر نے ہمت کر کے کہا۔ ''رستم بھائی! آپ کو لکھی رام کی موت کا پتا چلا ہوگا۔ پچھلے ہفتے اس کی موت اچانک ہوئی تھی۔ وہ بھی تقریباً اسی حالت میں مرا تھا جس میں آج رات چار بندے مرے ہیں۔ میرا خیال ہے

www.pdfbooksfree.pk

کہ لکھی رام کو بھی زہر دے کر مارا گیا ہے اور یہ وہی زہر ہے جس نے آج ہمارے سامنے چار لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''مجھے اور سجاول اور رنجی وغیرہ کو یہ شک ہو رہا ہے کہ.....شاید لکھی رام کو بھی..... میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں آپ؟''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ اسے بھی نادیہ نے مارا ہے؟''

ناصر نے کہا۔ ''کبھی کبھی واقعات کی کڑیاں اپنے آپ جڑنے لگتی ہیں رستم بھائی۔'' پھر وہ ادریس نامی ایک ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جس رات لکھی رام مرا، اسی شام ادریس نے چھوٹی بھرجائی کو لکھی رام کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ لکھی رام پیتل کی گڑوی میں بکری کا دودھ لے کر آ رہا تھا۔ راستے میں اس نے نادیہ کو دیکھا جو گھاس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ لکھی رام نے بھی اس تلاش میں اس کا ساتھ دیا اور دو چار منٹ چھوٹی بھرجائی سے باتیں کیں۔ قریباً پانچ گھنٹے بعد لکھی رام کی طبیعت بگڑی۔ اسے خون کی الٹیاں ہوئیں اور وہ دو ڈھائی گھنٹے میں سورگ باشی ہو گیا۔''

''لیکن لکھی رام سے نادیہ کو کیا بیر ہو سکتا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اس کا تو پتا نہیں جی لیکن وہ حرامی عظمت لکھی رام سے بیر رکھتا تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے۔ لکھی رام خود بھی جھاڑ پھونک کر لیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے ہمالیہ کی چوٹیوں پر بہت سخت چلے کاٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے طور پر عظمت کو فراڈیا اور نوسر باز قرار دیتا تھا۔ دوسری طرف عظمت بھی یہی کہتا تھا۔ ڈیڑھ دو مہینے پہلے قبرستان کی طرف ان دونوں میں باقاعدہ مار کٹائی بھی ہوئی تھی۔ لکھی رام نے عظمت کے منہ پر ٹکر مار کر اس کے کئی دانت ہلا دیئے تھے۔''

رنجی نے کہا۔ ''رستم صاحب! آپ نے جس طرح پہلی بات کی تصدیق کی ہے، اسی طرح اس دوسری بات کی تصدیق بھی اپنی گھر والی سے کر لیں۔ آپ جو بھی نتیجہ نکالیں گے وہ ہم سب کو منظور ہوگا۔'' رستم کی پریشانی دگنی ہو گئی۔

ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد رستم ایک بار پھر نادیہ کے پاس پہنچا۔ وہ غنودگی کی حالت میں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھی اعصاب کو پُرسکون کرنے والی دوا کھاتی تھی۔ آج شاید اس نے یہ دوا زیادہ مقدار میں کھائی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور زبان لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

رستم کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور اپنا ہوش رُبا سراپا حسب ہدایت ایک موٹی

اوڑھنی میں چھپا لیا۔ اس کی آنکھیں اور پلکیں آنسوؤں کے شدید بہاؤ کے سبب ورم زدہ تھیں۔

وہ قابلِ رحم حالت میں تھی لیکن جب رستم اس کے کرتوتوں کی طرف دیکھتا تھا تو رحم کا جذبہ ذہن کے کسی گوشے میں سمٹ جاتا تھا۔ اس عورت نے صرف جسمانی ملاپ کو ہی محبت کی معراج سمجھا تھا۔ اس نے رستم کو اپنے غیر معمولی جسم کی دلکشی سے تسخیر کرنا چاہا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر انتہا تک جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ رستم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''لکھی رام کے ساتھ کیا کیا تُو نے؟''

یہ سوال نادیہ کے سر پر بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا اور ہونٹ مرتعش ہو گئے۔ وہ کچھ دیر تک رستم کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر آنسوؤں کا ایک نیا ریلا اس کی پلکوں کے نیچے اُمڈ آیا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بولی۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا..... کچھ نہیں کیا۔ جو ہوتا رہا اپنے آپ ہوتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

''میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ لکھی رام کے ساتھ کیا کیا تُو نے؟''

اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ وہ چہرہ چھپا کر پہلو کے بل گاؤ تکیے پر گر گئی۔ ''میں نے تم سے کہا تو ہے کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں دیوانی ہو گئی ہوں۔ تمہاری محبت نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ ابھی پتا نہیں کیا کچھ ہونا ہے میرے ہاتھوں سے۔ اس سے پہلے تم مجھے ختم کر دو۔''

رستم کے سینے میں ایک اور چرکا لگا۔ بہ الفاظ دیگر نادیہ اپنے اس دوسرے جرم کا بھی اعتراف کر رہی تھی۔ کبھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پستول نکال کر واقعی اس کو شوٹ کر دے۔ کبھی اس کے لئے ترس کے جذبات ذہن پر غالب آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ رستم کو یہ یقین کرنا بھی بے حد مشکل ہو رہا تھا کہ نادیہ جولڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ بہرحال ایک فنکارہ بھی ہے، کسی جیتے جاگتے انسان کو موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

رستم لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے نادیہ سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا۔ وہ کچھ دیر شدید تذبذب کا شکار رہی، پھر اشکوں کے سیلاب میں ڈوبتے ابھرتے اس نے مبہم کچھ رستم کے گوش گزار کر دیا۔ اس کی باتوں سے رستم کو جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب یہ تھا۔

لکھی رام کی موت کی ذمے دار بھی بالواسطہ طور پر نادیہ ہی تھی۔ عظمت نادیہ کی ہر دکھتی رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نادیہ کے اندر رستم سے جسمانی ملاپ کی خواہش اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ وہ اس کے لئے ہر انتہا تک جانے کو تیار ہے۔ وہ ایک شیطان

www.pdfbooksfree.pk

عامل کی حیثیت سے نادیہ کے جذبات سے کھیلتا رہا۔ اس نے نادیہ کو بتایا کہ اپنے بدن کو اپنے محبوب کے لئے پُرکشش اور ضروری بنانے کے لئے اسے ایک خاص الخاص عمل سے گزرنا ہوگا۔ نادیہ عظمت کی باتوں پر اندھا اعتماد کررہی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ بعض اوقات نادیہ کو اس کی ذات کے بارے میں ایسی باتیں بتا جاتا تھا جو نادیہ کے سوا کسی اور کو معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ درحقیقت اس کی یہی ''خاص صلاحیت'' نادیہ کو عظمت کا بے دام کا غلام بنا چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ عظمت کے ذلیل ہوکر کال کوٹھڑی میں جانے کے بعد بھی نادیہ اس کے پیچھے پڑی رہی تھی..... اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہی تھی۔

اپنی مقناطیسی باتوں کے ذریعے عظمت نے نادیہ کو یہ باور کروادیا کہ اگر وہ کسی ہندو مُردے کی چتا کی راکھ سے اپنے جسم پر عمل کرائے تو اس کا محبوب جہاں کہیں بھی ہے، کھچ کر اس کی جانب آئے گا اور دیوانوں کی طرح اس سے وصل کی خواہش کرے گا۔

نادیہ پچھلے چند ماہ میں بتدریج ایسی سٹیج پر آچکی تھی کہ رستم سے جسمانی ملاپ کی خواہش اس کے لئے ہر شے سے مقدم ہوچکی تھی۔ یہ خواہش اس کے دل و دماغ میں جنون کا رنگ اختیار کرگئی تھی۔ ہاں، یہ وہی اسٹیج تھی جہاں اچھے بھلے سمجھ دار تعلیم یافتہ لوگ بھی فارغ العقل ہوجاتے ہیں۔ جہاں آنکھوں کے سامنے ایک پردہ سا تن جاتا ہے اور وہی نظر آتا ہے جو دیوانہ دل دکھاتا ہے۔ اس ساری صورتِ حال کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ عظمت نے نادیہ کو لکھی رام کے لئے زہر دیا۔ پچھلے ہفتہ نادیہ پروگرام کے مطابق اس راستے میں کھڑی ہوگئی جہاں سے شام کے وقت لکھی رام کو دودھ لے کر نکلنا تھا۔ لکھی رام نے نادیہ کے گھونگھٹ کے باوجود پہچان لیا کہ یہ چھوٹی بھرجائی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''بھرجائی جی! یہاں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟''

نادیہ نے کہا۔ ''ابھی میرے کان سے چھوٹا جھمکا نکل کر یہاں گر گیا ہے۔''

لکھی رام جھمکا ڈھونڈنے میں نادیہ کی مدد کرنے لگا۔ اس نے دودھ والی گڑوی پاس ہی رکھ دی تھی۔ نادیہ نے موقع دیکھا اور اپنی اوڑھنی میں سے زہر کی پڑیا نکال کر گڑوی میں الٹ دی۔ اس کے بعد سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے عظمت اور نادیہ چاہتے تھے۔ اگلے روز سہ پہر کو لکھی رام کی چتا جل گئی۔ رات کے اندھیرے میں نادیہ نے چتا میں سے چند مٹھیاں راکھ اکٹھی کی۔ اسے بھیڑ کے دودھ میں ملایا۔ اس میں کچھ دیگر اناپ شناپ ڈالا اور عین آدھی رات کے وقت کمرہ بند کرکے اسے اپنے جسم پر ملا۔

یہ ساری باتیں نادیہ سے معلوم کرنے کے بعد رستم ایک طویل دکھ بھری، طیش آمیز سانس لے کر کمرے سے نکل آیا۔ ''میری بات سنو رستم..... میری بات سنو۔'' نادیہ کہتی رہ

گئی۔

رستم نے کچھ نہیں سنا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب کہنے سننے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ شام کے فوراً بعد پولیس کی پوزیشنوں سے زوردار فائرنگ شروع ہوگئی۔ وڈے ڈیرے پر موجود افراد اپنی پوزیشنوں سے اس فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ ویرانہ گونج اٹھا اور ہر طرف شعلے سے لپکتے دکھائی دیئے۔ بہرحال اس فائرنگ سے صاف ظاہر تھا کہ یہ غصے کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ پولیس کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس فائرنگ کی آڑ میں وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دوسری طرف ڈیرے والے بھی علم رکھتے تھے کہ ان کی یہ فائرنگ پولیس اور اجرالیوں کے حصار کو توڑ نہیں سکتی۔

پندرہ بیس منٹ جاری رہنے کے بعد فائرنگ ختم ہوگئی۔ اس فائرنگ میں وڈے ڈیرے کے مکینوں میں سے کوئی شخص زخمی یا ہلاک نہیں ہوا۔ فائرنگ ختم ہونے کے بعد رستم سرنگ نمبر دو میں پہنچا، لالہ فرید، حسنا گجراتی وغیرہ کی عیادت کی۔ ان دونوں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ حسنا ڈاکٹر ناصر کے دیئے ہوئے ٹرنکولائزر کے باعث نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا اور گاہے بگاہے بڑبڑانے لگتا تھا۔ تاہم دیگر افراد میں سے ایک دو کی حالت اب بھی خطرے کے نشان سے قریب تھی۔

رستم واپس احاطے میں پہنچا تو مشعلوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں بہت سے لوگ درختوں تلے جمع تھے۔ ان میں مراد گروپ کے لوگ زیادہ پُرجوش نظر آرہے تھے۔ ان سب کی تیز چبھتی نظریں رستم کے چہرے پر لگی تھیں۔ یہ سوالیہ نظریں جلد از جلد رستم کا فیصلہ سننا چاہ رہی تھیں۔ بظاہر یہ لوگ پُرسکون تھے لیکن رستم جانتا تھا کہ ان کے سکون کے پیچھے ایک خوفناک طوفان موجود ہے۔ رستم کی زبان سے نکلا ہوا ایک غلط لفظ اس طوفان کو راہ دے سکتا تھا۔ اس کے بعد یہاں ایسا خون خرابا شروع ہوسکتا تھا جس کا انجام مکمل اور فوری تباہی تھا۔ اس نازک ترین موقع پر وڈے ڈیرے کے مکین آپس کا نفاق برداشت کرنے کے متحمل ہرگز نہیں تھے۔

ایک قائم مقام سردار کی حیثیت سے رستم کے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داری آن پڑی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسے یہ ذمے داری کس طرح نبھانی ہے۔

مراد گروپ کے ایک شخص نے مجمع میں سے باہر نکل کر کہا۔ ''رستم بھائی! ہم سب سمجھتے ہیں کہ اس عورت کے لیے اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ بات بھی اب کھل گئی ہے کہ ہمارے ساتھی لکھی رام کی جان بھی اسی نے لی تھی۔ اس عورت کے لئے کم از کم سزا نیان ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ سزا آج رات ہی اسے دی جائے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''ہاں آج رات ہی دی جائے۔'' کئی لوگوں نے بیک زبان کہا۔

''لاؤ اس حرام زادی کو باہر اور کپڑے اُتار کر الٹا لٹکاؤ اس بیری کے ساتھ۔ یہ عورت نہیں اپنے ہی لوگوں کا خون پینے والی ڈائن ہے۔ کوئی بدروح گھسی ہے اس کے اندر۔''

''ہاں ہاں لاؤ.....اس کو باہر۔'' مجمع میں سے کئی آوازیں آئیں۔

لوگوں کا غم وغصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

رستم نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو پُرسکون رہنے کی ہدایت کی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''اس بات میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ وڈے ڈیرے کے اصول سب کے لئے ایک جیسے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے، میں نے اس کے بارے میں چھان بین کی ہے.....مجرم کو سزا ضرور ملنی چاہیے اور ملے گی۔''

مراد آگے بڑھا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ ''رستم بھائی! تم کھل کر بات کرو۔ فلم ایکٹرس نادیہ مجرم ثابت ہو چکی ہے۔ وہ اپنی زبان سے بھی اقرار کر چکی ہے۔ اسے ابھی یہاں لایا جائے اور نیان کی سزا دی جائے۔''

اس موقع پر فرید کا قریبی ساتھی مشتاق آگے آیا۔ اس نے کہا۔ ''میں آپ کو لالہ فرید کا پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ لالہ نے کہا ہے کہ تینوں گروپوں میں سے تین تین بندے لے کر بند کمرے میں مشورہ کیا جائے۔ یہ بندے جو بھی فیصلہ کریں گے اس کے مطابق مجرمہ کو سزا دی جائے۔ ایک بار جو بھی فیصلہ ہو جائے اس پر بعد میں کوئی اعتراض نہ کرے۔''

مجمع میں سے کئی دبی دبی آوازیں ابھریں۔ مراد گروپ کے چند افراد نے احتجاجی انداز میں اپنے ہتھیار ہوا میں لہرائے۔ بہرحال دیگر افراد اس احتجاج میں شامل نہیں ہوئے۔ دو چار منٹ کی بحث وتمحیص کے بعد تو افراد کی ایک کمیٹی بن گئی اور بند کمرے میں چلی گئی۔

مرنے والوں میں سے دو افراد کی لاشیں ابھی تک دفنائے جانے کے لئے چارپائیوں پر رکھی تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں ہجوم نے ان کی آخری رسوم ادا کی تھیں تاہم ابھی تک انہیں سپرد خاک نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ ان کی قاتلہ کی سزا کا فیصلہ ہونے تک انہیں دفنایا نہیں جائے گا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد بند کمرے کا دروازہ کھلا اور مشورہ کرنے والے افراد باہر آئے۔ ان میں سب سے معمر شخص مشتاق آہوجہ تھا۔ مشتاق نے درجنوں ہتھیار بند لوگوں کے درمیان کھڑا ہو کر فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ مجرمہ کو سزائے موت دینے کا فیصلہ حتمی ہے اور اس پر عمل درآمد بھی آج رات ہی کر دیا جائے گا لیکن دیگر باتوں اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مجرمہ کو

نیان کی سزا نہیں دی جائے گی۔

مراد گروپ کا ایک شخص بھڑک کر بولا۔ ''اس عورت نے بار بار منع کرنے کے باوجود ایک غدار سے رابطے رکھے، بار بار اس سے ملتی رہی۔ اس نے وڈے ڈیرے کو ملیامیٹ کرانے کی سازش میں حصہ لیا۔ اگر نیان کی سزا اس کو نہیں دی جا سکتی تو پھر یہ کن لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔''

مشتاق آہوجہ نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس شخص کے منہ پر مارا اور خاموش رہنے کا حکم دیا۔

ایک لمحے کے لئے لگا کہ چنگاری بھڑک اٹھے گی لیکن پھر طوفان ٹل گیا۔ مشتاق آہوجہ کی عمر اس شخص سے دوگنا تھی جسے تھپڑ مارا گیا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ دیگر لوگ بھی خاموش رہے۔ پورے مجمع کو ایک گھمبیر اور کسی حد تک سوگوار خاموشی نے ڈھانپ لیا۔ مشتاق آہوجہ نے رستم کا کندھا دبایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر قریبی کمرے میں آ گیا۔ سجاول، کاٹھیا اور شاہ وغیرہ بھی ساتھ تھے۔

مشتاق عمر میں کافی بڑا ہونے کے باوجود رستم کو رستم بھائی ہی کہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''رستم بھائی! میں جانتا ہوں اس سزا کے فیصلے تک پہنچنے کے لئے تمہیں دل پر بہت بھاری پتھر رکھنا پڑا ہے لیکن اس نازک موقع پر یہ فیصلہ جتنا ضروری تھا، وہ بھی تم ہم سب سے زیادہ جانتے ہو۔ ہم سب دل کی گہرائی سے تمہارے احسان مند ہیں کہ تم نے وڈے ڈیرے کے لوگوں کو آپس میں مار ماری سے بچا لیا ہے۔ اب میری تم سے منت ہے کہ اس کام کو جلد سے جلد نمٹا دیا جائے۔

''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔'' رستم کی آواز گھمبیر تھی۔

''یہ کس طرح کرنا ہوگا؟'' مشتاق آہوجہ نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

''میں خود کروں گا۔'' رستم نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''ان دونوں میتوں کو دفنانے کے بعد۔''

☆======☆======☆

www.pdfbooksfree.pk



وہ بڑی عجیب رات تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا لیکن اس میں خزاں کی گھٹن اور مایوسی شامل ہوگئی تھی۔ مرنے والے آخری دو افراد کو بھی ڈیرے کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جا چکا تھا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ ڈیرے کے جو افراد حفاظتی ڈیوٹی پر تھے، وہ اپنی اپنی پوزیشنوں پر جا چکے تھے، باقی آرام کرنے کے لئے سرنگوں میں چلے گئے تھے۔

دور پہاڑیوں پر دو طویل روشن لکیریں بار بار حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ پولیس والوں کی سرچ لائٹس تھیں۔ کل رات والے واقعے کے بعد یہ سرچ لائٹس زیادہ ''چوکس'' ہوگئی تھیں۔ اب وقفے وقفے سے روشن ہونے کی بجائے یہ مسلسل روشن تھیں۔ آج سہ پہر کے وقت دو تین بار ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ دوسری طرف ڈیرے کے مکین بھی اپنی پوزیشنوں پر بالکل ہوشیار تھے۔ ان کے پاس دوربین اور بڑے سائز کی ٹارچیں تھیں۔ ان ٹارچوں کی مدد سے وہ گاہے بگاہے اپنے اطراف کا جائزہ لے لیتے تھے۔ تاہم ڈیرے کا سب سے بڑا دفاع دو ہزار بارودی سرنگیں تھیں۔ ایک طرح سے یہ دو ہزار پہرے دار تھے جو رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی سے اپنی اپنی جگہوں پر دبکے ہوئے تھے اور ایک طویل عرصے سے اپنا ''فرض'' ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔

رستم بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ نادیہ اعصاب کو پُرسکون کرنے والی دوا کی بھاری ڈوز کے زیر اثر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ غنودگی میں تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی اس کے چہرے کی ایک سائیڈ کو روشن کر رہی تھی۔ اس ویرانے کے کٹھن حالات میں رہنے کے باوجود یہ چہرہ جاذب نظر تھا۔

نیم تاریکی میں رستم کا پاؤں سٹیل کے جگ سے ٹکرایا۔ آواز سن کر نادیہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے پچھلا ڈیڑھ گھنٹہ تقریباً سو

کر گزارہ ہے۔

رستم کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھی اور حسب معمول اپنی موٹی اوڑھنی سے جسم کو ڈھانپ لیا۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم؟'' میں آوازیں دیتی رہ گئی۔''

رستم اسے کیسے بتاتا کہ وہ اس کی موت کے فیصلے پر مہر لگانے گیا تھا۔

رستم اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک عجیب کیفیت کے تحت نادیہ نے رستم کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''مجھے معاف کر دو رستم! میں نے جو کچھ کیا..... تمہاری محبت میں لاچار ہو کر کیا..... کچھ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔''

''میرے معاف کرنے سے کیا ہوگا؟''

''بس، تم معاف کر دو۔ دوسرے سزا دینا چاہیں تو دے لیں..... لیکن تم معاف کر دو گے تو وہ بھی کر دیں گے۔ مم..... میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ میں نے جو کچھ کیا عظمت کی باتوں میں آ کر کیا۔ پتا نہیں اس نے کیا جادو کر دیا تھا مجھ پر۔''

''اس کی جادوگری اسے لے ڈوبی ہے اور تمہیں بھی.....'' آخری الفاظ رستم نے بہت دھیمے لہجے میں کہے تھے۔ نادیہ شاید سن نہیں سکی۔

''ہاں۔ مجھے پتہ چلا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے یا کسی نے مارا ہے اسے؟''

''نہیں، اس نے خودکشی کی ہے۔'' رستم کا لہجہ بے جان تھا۔

''رستم! مجھے پتا نہیں کہ یہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے..... پر اگر تم میرے ساتھ ہو تو مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں ہر دکھ سہہ سکتی ہوں۔ ابھی جب میں اونگھ رہی تھی پتا ہے میرے دل میں کیا خیال آ رہا تھا؟ میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ تم مجھے یہاں سے نکال کر لے گئے ہو۔ تم نے مجھے اپنے سامنے گھوڑے پر بٹھایا ہے اور اپنی بندوق لہرا کر سب کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کسی میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ تم کو روک سکے یا تم سے کچھ پوچھ سکے۔ پھر ہم دونوں وزیر آباد جا پہنچے ہیں اور وہاں سے لاہور..... لاہور میں شانی جی بھی موجود ہیں۔ وہ ایک بہن کی طرح مجھے گلے سے لگاتی ہیں، میرا منہ سر چومتی ہیں۔ ہم تینوں اکٹھے لاہور میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مزے کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے کبھی ایسا ہوا، کسی نے دیکھا نہ سنا۔ میں اور شانی جی تمہارا پیار برابر بانٹ رہی ہیں اور کوئی جلا نہیں ہے، کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے۔ بلکہ شانی جی کی خواہش ہے کہ مجھے تمہارا پیار میرے حصے سے زیادہ ملے۔ اسی طرح میری تمنا ہے کہ شانی جی کو زیادہ پیار ملے۔ ایک ہی چار دیواری

www.pdfbooksfree.pk

میں ایک ہی چھت تلے ہم دونوں تمہارے ساتھ بہت خوش ہیں.....''

وہ چند ساعت کے لئے رکی اور اپنی سرخی مائل آنکھوں سے رستم کو دیکھ کر بولی۔ ''رستم ناراض نہ ہونا۔ یہ تو بس جاگتی آنکھوں کا خواب تھا..... ورنہ..... میں تو شانی جی کے ساتھ کوئی برابر کی تقسیم نہیں چاہتی۔ مجھے تو تم دونوں کی جوتیوں میں بیٹھنا بھی گوارا ہے۔ ایک پتھر کی طرح تم دونوں کے در پر پڑی رہوں گی اگر کبھی دل چاہے تو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھ لینا۔ ورنہ کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔''

''تم قلم کی عورت ہو نادیہ اور قلمی باتیں کر رہی ہو۔ درحقیقت تمہاری سوچ میں نقص ہے اور اسی نقص نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔ تمہارے نزدیک تمہارا جسم ہی تمہاری کُل کائنات تھا۔ تمہارا خیال تھا کہ اس ہوش ربا جسم کی ایک جنبش سے تم سنگ دل سے سنگ دل مرد کو موم کر سکتی ہو۔ جب میری طرف سے تمہارے اس جسم کو نظر انداز کیا گیا تو تم نے اسے اپنی ضد بنا لیا۔ تم نے مجھے اپنے جسم سے ہروانے کی ہر کوشش کی اور ہر کوشش کی ناکامی کے بعد تمہاری ضد اور پکی ہوتی گئی۔''

''تم کیسی باتیں کر رہے ہو رستم۔ تمہاری یہی باتیں میرا دل خون کر دیتی ہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہا۔ جب تم نے دیکھا کہ میں تمہیں بی بی جی کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتا تو تم نے پینترا بدل لیا۔ تم نے بادشاہ ملکہ اور کنیز والی بات شروع کر دی۔ تم نے بی بی کو تسلیم تو کر لیا لیکن خود پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ تمہارے دل کے کسی چور خانے میں یہ امید موجود تھی کہ تم کسی دن اپنے جسم کی چکا چوند سے مجھے اندھا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی، پھر ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ملکہ اور کنیز والی کہانی میں سے ملکہ ویسے ہی نکل جائے.....''

ایک دم نادیہ کی آنکھوں سے تازہ آنسو امڈ آئے۔ ''ایسی باتیں نہ کرو رستم! تم تو میرے اپنے ہو۔ تم تو میرے دل کی حالت کو سمجھو۔ ایسی باتیں کر کے تم میرے دل سے ہر امید کھرچ دو گے۔ سارے سپنے چکنا چُور کر دو گے۔''

رستم نے دل میں سوچا، تم سپنوں کی بات کر رہی ہو، تمہاری تو زندگی ہی چکنا چُور ہو چکی ہے۔ ایک دم رستم کی سوچ کا دھارا بدل گیا۔ اسے روتی سسکتی، نادیہ پر ترس آیا اور پہلی بار اتنی شدت سے آیا کہ وہ اندر تک سنسنا اٹھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ نادیہ سے نہیں، سزائے موت کے ایک قیدی سے بات کر رہا ہے۔ ایسا قیدی جس کی اپیل اعلیٰ عدالت سے خارج ہو چکی ہو۔ نظر ثانی اور رحم کی اپیلیں بھی مسترد ہو چکی ہیں۔ اب بلیک وارنٹ اس کے ہاتھ میں ہے

اور وہ جلاد کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑا ہے۔

صبح دم پھانسی پانے والا شخص چاہے کتنا بھی بُرا ہو، آخری رات میں اس سے درگزر اور ہمدردی کا سلوک ہی کیا جاتا ہے۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو رستم؟''

''نہیں کچھ نہیں۔'' رستم نے نفی میں سر ہلایا اور بے دم سا گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔

وہ عجیب جذباتی انداز میں رستم کے جوتے اُتارنے لگی۔ اس سے پہلے اس کی ایسی حرکت پر رستم کو غصہ آ جاتا تھا لیکن آج اس نے کچھ نہیں کہا۔

زندگی اور موت کے بارے میں رستم کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موت سے پہلے خود پر موت کو سوار کر لینا بے وقوفی ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے اسے زندہ ہی نظر آنا چاہیے۔ جب موت زندگی کو مہلت نہیں دیتی تو زندگی اپنے وقت میں سے موت کو کچھ حصہ کیوں دے۔ دوسری جو بات رستم کو دکھ دیتی تھی، وہ تکلیف سہہ کر مرنا تھا۔ رستم کو اچھی طرح یاد تھا، کسی کو تکلیف دہ موت سے بچانے کے لئے اس نے جو پہلا ''خون'' کیا تھا وہ ایک چیونٹے کا تھا۔ رستم اس وقت بہ مشکل پندرہ برس کا تھا۔ اس کی بہن آپو زاہدہ نے رسوئی سے کیڑے مکوڑے بھگانے کے لئے کیڑے مار دوا ڈالی تھی۔ رات سونے سے پہلے رستم نے رسوئی میں نگاہ دوڑائی۔ لالٹین کی روشنی میں اسے ایک چیونٹا (مکوڑا) نظر آیا۔ زہر اس کے اندر اُتر چکا تھا۔ وہ زمین پر الٹا پڑا تڑپ رہا تھا۔ رستم نے سوچا وہ تو جا کر سو جائے گا لیکن یہ چیونٹا مرنے سے پہلے کئی گھنٹے تڑپا رہے گا۔ اسے چیونٹے کو مار دینا ایک بہت بڑی نیکی محسوس ہوا۔ اس نے چیونٹے پر پاؤں رکھا۔ کرچ کی مہین آواز آئی اور اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ اس کے بعد کے کئی واقعات میں بھی رستم نے چیونٹے کی موت کو مثال بنایا۔ اس نے درجنوں قتل کئے لیکن ہمیشہ Clean Killing کی۔ اپنے جس شکار کو مارنے کا فیصلہ کیا، اسے پھر تڑپایا نہیں۔

آج بھی اسے ایک قتل کرنا تھا اور آج کے قتل میں تو اس کی حساسیت اور بھی عروج پر تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کو مارنے کی ذمے داری اپنے سر لے چکا تھا جو اس کی دیوانی تھی اور اسی دیوانے پن میں کچھ ناقابلِ معافی غلطیاں کر چکی تھی۔ اس کا دل تاسف سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کاش نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

''کیا سوچ رہے ہو رستم؟'' وہ پھر ہولے سے بولی۔

''سوچ رہا ہوں..... جب میں شام کو یہاں آیا تھا تو کمرہ خالی تھا۔ تم یہاں نہیں تھیں۔

www.pdfbooksfree.pk

میں تمہیں ڈھونڈنے کے لئے پچھواڑے میں گیا تھا لیکن ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ شاید تم کہیں بھاگ گئی ہو اور اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اچھا ہی ہوتا۔''

رستم کے لہجے میں اپنے لئے لپک پا کر نادیہ کی آنکھوں میں آنسو مسکرا اٹھے۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر وہ بولی۔ ''اگر تم چاہو تو میں اب بھاگ جاتی ہوں بلکہ ہم دونوں بھاگ جاتے ہیں۔'' پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے وہ بولی۔ ''تمہیں یاد ہے جس شوٹنگ میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی، اس میں کچھ اسی قسم کے سین چل رہے تھے۔ میں اور میرا ہیرو باز سانپیوں کی بستی سے نکل کر بھاگ رہے تھے اور انہوں نے ہمارے پیچھے اپنے بوبلی کتے لگا دیئے تھے..... یاد ہے ناں تمہیں؟''

وہ بولی۔ ''تم بھول گئے ہو گے لیکن مجھے تو..... یاد ہے۔ ایک ایک بات ایک ایک لمحہ۔ شوٹنگ کے دوران میں اصلی غنڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ انہوں نے کتا مار شراب پی رکھی تھی اور بالکل اندھے ہو رہے تھے۔ میرا فلمی ہیرو، ہدایت کار اور دوسرے لوگ اصلی غنڈوں کو اور ان کے اصلی ہتھیاروں کو دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ میں ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک ٹیوب ویل کے کوٹھے میں لے جا کر میرے کپڑے اُتارنا چاہ رہے تھے۔ میں ان کی منتیں کر رہی تھی۔ یہ اصلی کہانی کا ''فلمی سین'' تھا اور پھر تم اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ تم شاید ابھی ابھی نہا کر آئے تھے۔ تمہارے جسم پر صرف ایک تہہ بند تھا۔ تمہارے لمبے بالوں اور داڑھی سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ تم نے اور تمہارے ساتھی نے غنڈوں کو للکارا اور وہاں میں نے زندگی میں پہلی بار ایک زبردست اصلی لڑائی دیکھی۔ تم نے ان لوگوں کو مار بھگایا تھا اور تمہیں پتا ہے اس واقعے کے دو تین گھنٹے بعد ہی مجھے لگا تھا کہ مجھے میرا اصلی ہیرو مل گیا ہے اور میں تمہیں مدت سے جانتی ہوں۔''

''اچھا ہی ہوتا کہ میں اس وقت تمہیں نہ بچاتا۔ کم از کم تمہاری زندگی تو بچ جاتی۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا اور اگر سمجھانا چاہوں تو بھی تم سمجھو گی نہیں۔ شاید سمجھنا تمہاری عادت ہی نہیں ہے۔''

''خود سے دور رہنے کے سوا تم جو بھی سمجھاؤ گے سمجھ جاؤں گی۔'' وہ رستم کے لہجے سے حوصلہ پا کر بولی۔

ایک بار رستم کے جی میں آئی کہ اسے بتا دے کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ پَو پھٹنے سے پہلے پہلے اسے موت کے انجانے سفر پر روانہ ہو جانا ہے لیکن پھر اس نے اپنے

اس خیال کو خود ہی رد کر دیا۔ وہی چیونٹے کی ترس ناک موت والی بات۔ مرنے والے کا اچانک آسان موت مر جانا رستم کو ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔

''لوگ میرے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہیں رستم، مجھے سچ سچ بتاؤ؟''

''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں، صبح پتا چلے گا۔'' رستم کا جواب گول مول تھا۔

''رستم! میں ابھی مرنا نہیں چاہتی، مجھے مرنے سے بچا لینا لیکن میرا وعدہ ہے میری زندگی تمہاری ہی امانت رہے گی۔ جب کہو گے تمہارے قدموں میں نچھاور کر دوں گی۔'' نادیہ نے کہا۔

رستم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''اچھا، اس کے بارے میں سوچیں گے، اب سو جاؤ۔''

''میرے لئے فوری طور پر تو کوئی خطرہ نہیں ہے ناں؟'' نادیہ نے رستم کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' رستم نے کہا۔ غالباً وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر اس پر کوئی الزام لگا بھی تو اس کا فیصلہ ہونے میں شہری عدالتوں کی طرح نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے اور یہ ڈیرہ اس سے بہت پہلے ہی ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

وہ اصل صورت حال سے آگاہ نہیں تھی۔ موت کسی شکاری جانور کی طرح اس شب کی تاریکی میں دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

رستم لیٹ گیا۔ وہ رستم کے موڈ سے شہ پا کر اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں لیٹی۔ اس کا ایک ہاتھ تاریکی میں سرک کر رستم کے بازو پر آ گیا۔ ''تمہیں گرمی نہیں لگتی، موسم کافی بدل گیا ہے۔'' وہ اس کی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے بولی۔

رستم خاموش رہا۔ اس کا نازک ہاتھ رستم کے سینے کے بالوں پر پھسلنے لگا۔ وہ اس کے قریب کھسک آئی اور اس کے بازو سے لگ کر لیٹ گئی۔ اس کی گرم سانسیں رستم کی گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔ رستم، بی بی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خیالوں میں اس سے کہہ رہا تھا۔ ''بی بی! یہ میرے پاس آپ کی امانت تھی۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں نے اس کی حفاظت کی۔ اسے سنبھال کر رکھا۔ ایک حد کے اندر رہتے ہوئے یہ کوشش بھی کی کہ یہ ناخوش نہ ہو لیکن جو یہ چاہتی تھی بی بی، وہ میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ وہ میرے لئے ممکن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بی بی! اب میں کیا کروں؟ یہ اپنی حرکتوں کے سبب اپنی بے وقت موت کو اپنے اوپر لازم کر چکی ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے لیکن یہاں کچھ بھی

www.pdfbooksfree.pk

میرے بس میں نہیں رہا۔ میں جو زیادہ سے زیادہ کرسکا ہوں، وہ یہی ہے کہ اسے ایک نہایت تکلیف دہ موت سے بچا کر آسان موت کی طرف لے آؤں۔ یہاں کے قانون کے مطابق اسے زندہ حالت میں کتوں کی خوراک بنایا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں جو کچھ کرنے جارہا ہوں اس کے لئے میں مجبور ہوں بی بی۔ مجھے معاف کردینا۔''

دور کہیں ایک ہیلی کاپٹر پھڑ پھڑاتا ہوا ٹیلوں پر سے گزر گیا۔ پہرے دار کی تین چار تیز سیٹیاں سنائی دیں، پھر خاموشی چھا گئی۔

نادیہ کا ہاتھ رستم کے سینے پر تھا۔ وہ اس کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ قمیص کے اوپر سے ہی اس نے رستم کا کندھا چوما۔ پھر گردن..... پھر رخسار۔ رستم کی خاموشی سے حوصلہ پا کر اس کا سارا بدن جلنے لگا۔ وہ اپنے اردگرد کے سارے حالات اور ماحول کو بھول کر رستم سے چمٹ گئی۔ وہ اسے چومنے لگی۔ سینے سے، ٹھوڑی سے، ہونٹوں سے..... وہ ساکت اور بے حس لیٹا رہا۔

شاید نادیہ کو توقع نہیں تھی کہ ایک سنگلاخ پتھر میں اس طرح کا گداز نمودار ہوگا۔ وہ رونے لگی۔ اس کے آنسو رستم کے چہرے کو نمکین پانی سے تر کرنے لگے اور اس کے ہونٹ اس نم پانی پر پھسلنے لگے۔ اس کی گھنی زلفوں نے رستم کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔

کتنی ہی دیر اسی طرح گزری۔ تب وہ نہایت جذباتی انداز میں سسکی۔ ''رستم! میں تمہاری ادنیٰ کنیز ہوں۔ اگر مجھے کوئی حکم دینا چاہتے ہو تو دو۔''

''نہیں۔'' رستم نے نرمی سے کہا۔

وہ اس سے لپٹی رہی، اس کے چہرے پر والہانہ انداز میں جھکی رہی۔ رستم بے حرکت لیٹا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا ہاتھ بہت دھیرے سے تکیے کی طرف بڑھا۔ تکیے کے نیچے بھرا ہوا کولٹ پسٹل موجود تھا۔ اس نے پسٹل نکالا اور اسے بڑی آہستگی کے ساتھ تاریکی میں حرکت دیتا ہوا نادیہ کی پشت کی طرف لے گیا..... پھر پسٹل آہستہ آہستہ نادیہ کے سر کی طرف بڑھنے لگا۔ قدرت اللہ کی پھیلائی ہوئی جاہلیت اور توہم پرستی کے نتیجے میں ایک اور جان جانے والی تھی۔

پسٹل بڑی آہستگی سے سرکتا ہوا نادیہ کی نرم ریشمی زلفوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی طرف بڑھنے والی موت سے بے خبر رستم میں مصروف تھی۔ اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ رستم کے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سانسوں کی آمد و رفت بے حد تیز تھی۔ رستم کی انگلی لبلبی پر پہنچ گئی۔ وہ دونوں کمرے میں بچھی دری پر لیٹے تھے۔ لالٹین کی لَو نہ ہونے کے برابر

تھی۔ کمرے میں چونکہ اندھیرا تھا لہٰذا کھڑکی سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بدلیوں سے نمودار ہونے والی مدھم چاندنی گاہے بگاہے قرب و جوار کو نمایاں کردیتی تھی۔ بہار کی اس رات میں جنگلی پھولوں کی مدھم سی مہک بھی شامل تھی۔ ہاں یہ بہار تھی لیکن اس میں خزاں کی تمام تر اداسی اور سوگواری شامل ہوگئی تھی۔

لبلبی پر رستم کی انگلی ساکت ہوگئی..... چند لمحوں کے لئے وہ ٹھہر سا گیا۔ یہ نادیہ کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔ وہ زندگی اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور تھی..... اگر وہ کسی طرح بچ سکتی تو اس ویرانے سے دور لاہور کی جگمگاتی فلمی دنیا میں ایک شاندار مستقبل اس کا نصیب بن سکتا تھا..... لیکن وہ بچتی کیسے؟ اس نے اپنے لئے کوئی راستہ ہی باقی نہیں چھوڑا تھا۔ راستہ تو شاید کسی کے لئے بھی باقی نہیں تھا۔ وڈے ڈیرے کے سارے مکین موت کے ناقابلِ شکست گھیرے میں تھے لیکن یہ لڑکی تو فوری طور پر موت سے گلے مل رہی تھی۔ رستم کو اس کے دشمن بے رحم قاتل گردانتے تھے لیکن آج وہ سرے سے قاتل ہی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے بے قراری سے کھڑکی کی طرف دیکھا جیسے اس صورتِ حال سے نکلنے کے لئے کوئی راہ ڈھونڈنا چاہتا ہو۔

اسے مراد نظر آیا۔ کمرے سے قریباً سو فٹ کے فاصلے پر وہ بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ مدھم چاندنی میں بھی اس کا ہیولا بے حد مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی شاندار AK58 رائفل دور ہی سے دیکھی جاسکتی تھی۔ ٹہلتے ہوئے مراد کی نظریں گاہے بگاہے رستم کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جیسے وہ جلد از جلد فائر کی آواز سننا چاہتا ہو..... وہ فائر جس نے نادیہ کی سزا پر عمل درآمد کا اعلان کرنا تھا۔

پھر رستم کی نگاہ مراد کے عقب میں گئی۔ مراد سے بیس تیس قدم پیچھے اس کے درجنوں ساتھی بھی موجود تھے۔ وہ ایک الاؤ کے قریب بیٹھے تھے۔ وہ سب بھی مراد کی طرح بے قرار تھے۔ گاہے بگاہے ان میں سے کوئی شخص بلند آواز میں بولتا اور اس کی آواز کا غصیلا پن ہوا میں سرایت کرتا محسوس ہوتا تھا۔

رستم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ وڈے ڈیرے میں مراد گروپ کی طاقت اور ان کے اثر و رسوخ سے بخوبی آگاہ تھا۔ درحقیقت ڈیرے کے مکینوں میں سے بہترین ہتھیار اور ساز و سامان مراد گروپ کے لوگوں کے پاس تھا۔ مراد گروپ میں مراد کے علاوہ کم از کم آٹھ دس بندے ایسے تھے جو اپنے اپنے علاقے کے مانے ہوئے دادا اور گینگسٹر تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو سر دھڑ کی بازی لگا کر مشکل سے مشکل صورتِ حال کو اپنے بس میں کرسکتے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

اس موقع پر ان لوگوں کی مخالفت مول لینا اور اپنے ساتھیوں کو بدترین انتشار میں مبتلا کرنا رستم کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا اور پھر یہ امر بھی ایک ٹھوس حقیقت رکھتا تھا کہ نادیہ سے سنگین ترین جرائم سرزد ہوئے تھے۔ نادیہ کو سزا سے بچانے کی کوشش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نادر کا کا کے بنائے ہوئے اصول کے پرخچے اپنے ہاتھوں سے اُڑا دیئے جاتے۔ آج تک یہ ڈیرہ ان ہی اصولوں کے مطابق چلتا تھا اور یہی اصول تھے جس نے تین چار مختلف گروپوں کو اکائی کی شکل دے رکھی تھی۔

نیلوں کے درمیان بے قراری سے ٹہلتا ہوا مراد اس وقت رستم کو بہت بُرا لگا لیکن اس کے ساتھ ہی رستم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یہ امتحان کا وقت ہے اور رستم کو بہ ہر صورت اس امتحان سے گزرنا تھا۔

ایک عجیب جذبے کے تحت رستم نے نیچے لیٹے لیٹے نادیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ جیسے بچے کو انجکشن لگتے وقت گود میں بھینچ لیا جاتا ہے۔ نادیہ کے ہونٹ بے قراری سے رستم کے ہونٹوں سے پیوست ہوئے۔ یہی وقت تھا جب رستم نے لبلبی دبا دی۔ گولی دھماکے سے نکلی اور نادیہ کی کنپٹی میں اُتر گئی۔

☆======☆======☆

وہ صبح..... عجیب اداسی اور سوگواری کے ساتھ طلوع ہوئی۔ دھوپ دھیرے دھیرے پوٹھوہار کے مخروطی ٹیلوں کو روشن کرنے لگی۔ نادیہ کی لاش پچھلے چھ گھنٹے سے کمرے میں ہی پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی سے بہنے والا خون دری کے ایک بڑے حصے کو رنگین کر چکا تھا۔ یہ خون اب صاف کر دیا گیا تھا لیکن نشان تو باقی تھا۔ کمرے کے اندر صرف شاہدہ اور حنیفاں موجود تھیں۔ حنیفاں تو تشدد والے واقعے کے بعد بالکل گم صم بلکہ پتھرائی ہوئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرتی تھی نہ کسی کی طرف دیکھتی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ اب بھی وہ سکتہ زدہ سی نادیہ کی میت کے سرہانے بیٹھی تھی۔ نادیہ کا جسم اسی موٹی اوڑھنی سے ڈھکا ہوا تھا جو وہ رستم کی ہدایت پر ہر وقت اپنے سیماب بدن پر اوڑھے رکھتی تھی۔ نادیہ کے پاؤں کی طرف شاہدہ بیٹھی تھی اور مسلسل سسک رہی تھی۔

رستم دو رایفل نیلے پر خاموش بیٹھا تھا۔ جس پسٹل سے اس نے نادیہ کو ہلاک کیا تھا وہ اب رستم کے ہولسٹر میں تھا اور اسے اپنے پہلو میں کسی انگارے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ جھجھے کے سامنے نادیہ کی تجہیز و تکفین کی بات ہو رہی تھی۔ حسنا گروپ کا ایک شخص بولا۔ ''مراد کا ساتھی ڈار کہہ رہا تھا، ہم جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ یہ عورت کافر نہیں بدروح کا جنازہ ہے.....

اس نے ہمارے پانچ ساتھیوں کا خون پیا ہے۔''

مشتاق آہوجہ گرجا۔ ''کہاں ہے وہ کتا! میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔''

ایک باریش بلوچی آگے بڑھ کر بولا۔ ''سائیں! اس نے جرم کیا تھا..... مُراب اس نے اپنے جرم کی سزا پالی ہے۔ ہمارے پیر و مرشد کہا کرتے تھے کہ جو شخص چاہے مرد ہو یا عورت جب اپنے جرم کے بدلے میں سب سے بڑی سزا پاتا ہے یعنی اپنی زندگی دے دیتا ہے تو پھر وہ پاک ہو جاتا ہے۔ اس کی مٹی پر کوئی بوجھ، کوئی داغ دھبہ باقی نہیں رہتا۔ اس کی مٹی کو پوری عزت کے ساتھ مٹی کے سپرد کرنا چاہیے۔''

''ہاں..... ہم رستم بھائی کی گھر والی کو پوری عزت کے ساتھ دفن کریں گے۔'' مشتاق آہوجہ نے آواز بلند کہا۔ ''مراد کے اس بندے کو شرم آنی چاہیے جس نے ایسی گھٹیا بات کی۔''

''اس کے سر پر جوتے مارنے چاہیے۔'' لالہ کا ایک قریبی ساتھی بھڑک کر بولا۔

''چپ رہو۔'' مشتاق نے پھر ڈانٹا پھر ذرا تحمل سے بولا۔ ''اسی جھگڑے اور نااتفاقی سے بچنے کے لئے اتنی بڑی قربانی دی گئی ہے..... جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور اب بھی آپس کا اتفاق نہ بچا تو لعنت ہے ہم سب پر۔''

کاٹھیا نے بھڑک کر کہا۔ ''اگر وہ لوگ جنازہ نہیں پڑھیں گے تو ہم چپ نہیں رہیں گے۔''

''کیوں نہیں پڑھیں گے جنازہ؟'' مشتاق چمک کر بولا۔ ''خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ وہ صرف ایک بندے کی کہی ہوئی بات ہے۔ مراد نے خود تو ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ میں خود جاتا ہوں اس کے پاس۔''

ابھی مشتاق آہوجہ کی بات منہ میں ہی تھی کہ مراد اور اس کے گروپ کے کئی افراد سروں پر رومال باندھے اور ٹوپیاں سر پر لیے ہجوم کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ وہ یقیناً نادیہ کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لئے آ رہے تھے۔ نادیہ جو خوبصورتی کا مجسمہ تھی۔ جو ''چھوٹی بھرجائی'' کی حیثیت سے کئی ماہ تک اس ڈیرے پر رہی..... جسے چور نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور جس کے بارے میں سرگوشیاں کی جاتی تھیں۔ ہاں وہی عورت جو اپنے جسم کی پکار سے مجبور تھی۔ جس نے اپنے آتشیں ہتھیار کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کیا۔ آخر وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ لاش بن گئی اور اب اسے منوں مٹی کے نیچے دبانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ عورت کو پہیلی کہا جاتا ہے اور کئی پہیلیاں تو اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ انہیں

www.pdfbooksfree.pk

سوچنے والا سٹپٹا کر رہ جاتا ہے۔ دوپہر کے فوراً بعد سینما سکرین کے اس روشن ستارے کو وڈے ڈیرے کے ویران قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ تازہ بننے والی قبروں میں ایک اور قبر کا اضافہ ہوگیا۔ نارپور کے نواح میں ایک شوٹنگ سے شروع ہونے والی کہانی چند رنگین وسنگین موڑ مڑنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ بس ایک کمرے میں نادیہ کے استعمال کا سامان پڑا رہ گیا۔ اس کے شوخ کپڑے، اس کے سنگھار کی اشیاء جو اس نے ڈیرے سے ہی حاصل کی تھیں۔ اس کی موٹی اوڑھنی، اس کی بنائی ہوئی چند مورتیاں اور ایک ٹوٹی ہوئی چھڑی جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے جوڑا تھا۔ کمرے اسی طرح خالی رہ جاتے ہیں۔ جانے والے اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت عازم سفر ہو جاتے ہیں۔

رستم بالکل گم صم تھا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل ہو رہی تھیں۔

اچانک ایک شخص تیزی سے ڈیرے کے احاطے کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ وہ بار بار مڑ کر اپنے عقب میں بھی دیکھ رہا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اپنے قریبی افراد کو بھی ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتا رہا تھا۔ رستم کی نگاہ اس جانب اٹھی تو اسے ڈھلتے سورج کی روشنی میں دو متحرک جسم دکھائی دیئے۔ یہ پولیس کی پوزیشنوں کی طرف سے ڈیرے کی طرف آرہے تھے..... رستم نے شاہ سے دوربین لے کر آنکھوں سے لگائی۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ یہ دو گدھے تھے۔ ان کی پشتوں پر کچھ بندھا ہوا تھا۔ بظاہر یہ انسانی جسم دکھائی دیتے تھے۔

''کیا ہے رستم صاحب؟'' شاہ نے پوچھا۔

''دو گدھے ہیں۔ ان کے اوپر دو بندے بندھے ہوئے ہیں۔ بلکہ شاید دو لاشیں ہیں۔''

''کک..... کہیں یہ اپنے بندے ہی تو نہیں۔ میرا مطلب ہے شاہنواز اور باقر وغیرہ..... پولیس انہیں پکڑ کر لے گئی تھی۔''

اس بارے میں رستم بھی جانتا تھا۔ یہ رستم کے یہاں آنے سے پہلے کی بات تھی۔ یہ لوگ بارودی سرنگوں کے حصار کے پاس سے پولیس کے ہتھے چڑھے تھے۔ یہ کل چار بندے تھے۔ تین کا تعلق حسنا گروپ سے اور ایک کا مراد گروپ سے تھا۔ ان میں سے شریف نامی ایک بندے نے بلندی سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیا تھا تاہم تین کو پولیس والے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں رستم کے ذہن میں آپوں آپ ہی یہ خیال آیا کہ یہ لاشیں ان ہی میں سے دو کی ہیں۔

دونوں گدھے ایک جگہ رک گئے اور گھاس پر منہ مارنے لگے۔ انہیں وڈے ڈیرے کی طرف رواں رکھنے کے لئے پولیس والوں اور اجرالیوں کی پوزیشنوں سے چند فائر کئے گئے۔ دھماکوں کی آواز نے گدھوں کو بدکایا اور وہ گھاس چھوڑ کر بڑی تیزی سے وڈے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگے۔

رستم اب دوربین کے ذریعے بالکل صاف دیکھ سکتا تھا۔ ان گدھوں پر دو برہنہ لاشیں بندھی ہوئی تھیں۔ لاشوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کئی گھنٹے ہیں۔ خون کے دھبے اتنی دور سے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

پندرہ بیس منٹ میں دونوں گدھے اتنے قریب پہنچ گئے کہ دوربین کے بغیر بھی انہیں صاف دیکھا جانے لگا۔ دونوں لاشوں کو سن کی رسیوں کے ذریعے اوندھی حالت میں جانوروں کی پشت سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک لاش کو لمبے بالوں کی وجہ سے دور ہی سے پہچان لیا گیا۔ یہ مراد گروپ کے باقر کی لاش تھی۔

شاہ نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''یہ لاش ہیرے کی ہے جی۔''

رستم جبڑے بھینچے بڑی خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ لاشیں ڈیرے پر پہنچیں تو ہجوم نے انہیں گھیر لیا۔ صرف وہی لوگ دور رہے جو رائفلوں کے ذریعے اپنی پوزیشنوں پر موجود تھے اور وہاں سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔

لاشوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ پولیس تشدد ''تھرڈ ڈگری'' کی منہ بولتی تصویر تھیں۔ دونوں لاشوں پر لباس کا تار تک نہیں تھا۔ دونوں کے پاؤں شدید ضربوں کے سبب سوج کر نیلے ہو چکے تھے۔ ہیرے کے پاؤں کے کئی ناخن بھی کھینچ لئے گئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت چمکیلی مونچھیں مونڈی نہیں گئی تھیں بلکہ بے دردی سے اکھاڑی گئی تھیں۔ ہیرے کی ناک کے نیچے گہرے زخم نظر آرہے تھے۔ دونوں افراد کے نازک اعضا بھی بُری طرح زخمی تھے اور موت سے پہلے اذیت کی ناقابل بیان کہانی کو بیان کر رہے تھے۔

دونوں کو پشت پر گولیاں ماری گئی تھیں۔ اس طرح غالباً یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ دونوں بھاگنے کی کوشش میں ہلاک ہوئے تھے۔ رستم کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ اس کارروائی کا جواب ہے جو رستم اور اجمل خان نے دو دن پہلے کی تھی۔ انہوں نے نہ صرف پولیس والوں کے حصار میں گھس کر دو اجرالیوں کو جان سے مارا تھا بلکہ ان کے مضبوط ترین مورچے پر اپنا قبضہ بھی تقریباً قائم کر لیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر ڈیرے پر زہریلی چائے والا واقعہ نہ ہو جاتا تو پولیس اور اجرالیوں کو تارے نظر آجاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

مراد نے اپنے ساتھی باقر کی لاش پہچانی تو سخت جذباتی ہوگیا۔ لاشوں کو کھول کر چارپائیوں پر ڈالا گیا اور ان کے اوپر چادریں پھیلا دی گئیں۔ دونوں چادریں دیکھتے ہی دیکھتے خون سے رنگین ہوگئیں۔

مراد گرج کر بولا۔ ''ایسی زندگی سے موت اچھی ہے۔ ایک ایک کر کے مرنے کے بجائے اچھا ہے کہ ایک ہی بار سارے مرجائیں یا ان حرامیوں کا گھیرا توڑ کر نکل جائیں۔''

اس نے اپنی جدید آٹومیٹک رائفل ہوا میں بلند کی اور اوپر تلے کئی فائر کیے۔

تقلید میں اس کے درجن بھر ساتھیوں نے بھی رائفلیں آسمان کی طرف بلند کیں اور ٹرائیگر زدبائے۔ ہوائی فائرنگ سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔

مراد کا ساتھی نواز چلایا۔ ''ٹھیک ہے، مارو یا مرجاؤ۔ لڑتے ہوئے مریں گے تو عزت کی موت تو ملے گی..... نہیں تو باقر اور ہیرے کی طرح تڑپ تڑپ کر مرنا ہوگا۔ یہ ڈپٹی ریاض انسان نہیں جانور ہے۔ اس جیسے درندے کے ہاتھ آنے سے تو بہتر ہے کہ لڑ کر اپنی جان دے دیں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' بیس بائیس سالہ ایک مکرانی لڑکے نے تائید کی۔ ''یہ بارودی سرنگیں بھی زیادہ دیر تک پولیس والوں کا رستہ نہیں روک سکیں گی۔ وہ تو اپنے ہیلی کاپٹر کو بھی بار بار ہمارے اوپر سے گزارتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ ایک ہی دفعہ سب ٹوٹ پڑیں..... پھر جو بھی ہو دیکھا جائے۔''

نوجوان کے لہجے میں طیش تو تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈپٹی ریاض کے ہاتھوں گرفتاری کا خوف بھی اس کی آواز میں لہریں لے رہا تھا۔

رستم نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ''فضول بکواس نہ کرو۔ بلہ بولنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ہوش سے کام لینا ہوگا۔ گھیرا توڑنے کی کوشش کریں گے تو وہ ایک ایک کو بھون ڈالیں گے۔ میرے خیال میں اب پولیس والے چاہتے بھی یہی ہیں کہ ہم طیش میں آکر کوئی غلط قدم اٹھائیں اور وہ ہمیں خود کار رائفلوں کی بوچھاڑ پر رکھ لیں۔''

مراد پھنکارا۔ ''تم کہتے ہو کہ بلہ بولنے کا وقت گزر گیا ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ یہ وقت کیوں گزرا۔ ہم سب تو پوری طرح تیار تھے اگر زہر کی وجہ سے سب کو الٹیاں شروع نہ ہوجاتیں تو سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوجانا تھا۔ یہ موقع ہم نے گنوایا ہے اور اس کی وجہ تمہاری ایکسٹریس بیوی ہے۔''

اجمل خان خاموش کھڑا تھا مگر مراد کی گفتگو سن کر مزید خاموش نہ رہ سکا۔ وہ آگے آیا اور

مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ام نے دیکھا ہے کہ تم سب سے زیادہ بولتا ہے اور الٹا بولتا ہے۔ تم کہہ رہا ہے کہ رستم صیب اور اس کی بی بی کی وجہ سے موقع ہاتھ سے نکل گیا لیکن یہ بھی تو سوچو کہ یہ موقع پیدا کس نے کیا تھا۔ رستم صیب نے ہی کیا تھا۔ ام ان کے ساتھ تھا، ام نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اجرالیوں کی پوزیشن پر حملہ کیا اور ان کا سب سے خطرناک گن MG-08 اپنے قبضے میں لیا۔ ام سمجھتا تھا کہ اتنی بہادری والے کام پر تم رستم صیب کا ہاتھ چوموگے لیکن تم الٹا ان کو ہی الزام دے رہے ہو۔''

مراد کا ساتھی نواز پھنکارا۔ ''خان! یہاں تمہاری پیدائش ابھی دو تین دن پہلے ہی ہوئی ہے۔ تم زیادہ ماما بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑاؤ گے تو ایسا جواب دیں گے کہ دُم میں آگ لگ جائے گی۔''

اجمل خان نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ جواب دوں اور اگر دوں تو کتنا سخت دوں۔

رستم نے اجمل خان کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور بڑے گھمبیر انداز میں مراد کے ساتھی کی طرف بڑھا۔ رستم کا خوفناک انداز دیکھ کر وہ شخص گھبرا سا گیا اور بے ساختہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں محسوس ہوا کہ رستم اس پر اپنا پستول تان لے گا اور ہوسکتا ہے کہ گولی بھی داغ دے لیکن پھر اس شخص کے قریب پہنچ کر رستم نے جیسے اپنے بے پناہ طیش کو کنٹرول کیا۔ دھیمے لیکن بے حد سنگین لہجے میں بولا۔ ''جب ہم بات کر رہے ہیں تو تمہیں درمیان میں سؤر کی طرح چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ دفع ہوجاؤ یہاں سے..... دور ہوجاؤ میری نظروں سے۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اردگرد موجود افراد کانپ کر رہ گئے۔ رستم نے مراد کی طرف انگلی اٹھائی اور بدستور اسی لہجے میں گویا ہوا۔ ''میری بات کان کھول کر سن لو مراد اور اپنے ساتھیوں کو بھی سمجھا دو، جب تک لالہ بہار ہے میں سردار ہوں اور میں حکم عدولی برداشت نہیں کروں گا۔ میری بات سن رہے ہو نا، میں حکم عدولی برداشت نہیں کروں گا۔''

مراد کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ رستم کا غیظ وغضب اور اندرونی دکھ جیسے مراد کو مسمرائز کر رہا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر مراد کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''جس طرح مجھ پر ذمے داریاں ہیں..... اس طرح تم سب پر ہیں۔ اس نازک وقت میں اگر کسی نے بھی اپنی ذمے داری سے غفلت کی تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

مراد اور اس کے ساتھی سر جھکا کر سنتے رہے۔ رستم فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''پولیس پانڈو کی طرف سے واپس اپنی پہلی والی پوزیشنوں پر آچکی ہے۔ اب ہم حملہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اپنی اپنی پوزیشنوں پر جاؤ اور پوری طرح چوکس ہوجاؤ..... خاص طور پر مراد تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو چوکس ہونے کی ضرورت ہے۔ تمہارے پاس بہترین ہتھیار ہیں اور تمہیں جو پوزیشنیں دی گئی ہیں وہ بھی سب سے خاص ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں ان پوزیشنوں پر ہم وہ توجہ نہیں دے رہے جو ہمیں دینی چاہیے اگر وہاں ہماری توجہ ہوتی تو شاید شریف کو خودکشی نہ کرنا پڑتی اور ہیرا اور باقر بھی گرفتار نہ ہوتے..... بہرحال جو ہوگیا، اب مجھے اس طرف سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔''

ان لمحوں میں رستم کا لہجہ واقعی ایک بااختیار سردار کا لہجہ تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مراد یہ لہجہ اور یہ باتیں سن کر شاید خاموش نہ رہتا لیکن اس وقت وہ خاموش کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف رستم کی باتیں سن رہا ہے بلکہ ان پر عمل کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ ''نادیہ والی قربانی'' نے رستم کو جیسے چند ہی گھنٹوں میں ایک بااثر سردار کی ساری توانائیاں بخش دی تھیں۔ اس کے ساتھی تو پہلے بھی اپنی جانیں لڑانے کے لئے اس کے ایک اشارے کے منتظر تھے، اب دیگر افراد بھی اس کے حکم کو پوری اہمیت دے رہے تھے۔ وہ شعلہ جوالا نظر آرہا تھا۔

☆======☆======☆

شانی رکشہ پر سوار ہوکر نہر تک پہنچی۔ اس کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ریاض ہٹلر کے خوف نے آسیب کی طرح اس کے اعصاب کو جکڑ رکھا تھا۔ جمشید کی خونچکاں لاش اور تایا معصوم کی بے بسی کا تصور..... گاہے بگاہے اس کے سینے میں نشتر چبھو دیتا تھا۔

وہ ابھی پُل سے کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ اسے پولیس کی دو جیپیں نظر آگئیں۔ ساتھ میں سفید رنگ کی ایک پرائیویٹ ٹویوٹا گاڑی بھی تھی۔ ڈپٹی ریاض کی ہدایت کے مطابق شانی نے رکشہ کچھ فاصلے پر رکوا دیا۔ شانی کرایہ دے کر نیچے اُتری۔ ایک طرف سے دو سفید پوش پولیس والے برآمد ہوئے۔

''آجاؤ میڈم۔'' ایک لمبے تڑنگے شخص نے کہا اور شانی کو ساتھ لے کر جیپوں کی طرف آگیا۔

اگلی جیپ کا رنگدار ''ونڈو گلاس'' نیچے اُترا تو ڈپٹی ریاض کی کرخت صورت شانی کو نظر آئی۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں اور سیاہ ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔

''اندر آجاؤ بی بی جان۔'' وہ بڑے دلار سے بولا۔

''تایا معصوم کہاں ہیں؟ اور تم نے کیا کہنا ہے مجھ سے؟''

''اندر آؤ گی تو بتاؤں گا۔ یہاں سڑک پر کھڑے کھڑے تو ساری کتاب نہیں کھول سکتا۔''

شانی چند لمحے ہچکچاتی رہی پھر ادھ کھلے دروازے سے گزر کر جیپ کے اندر چلی گئی۔ جیپ میں الکحل اور تمباکو کی بُو تھی اور اس سے بھی زیادہ شدید بو..... شاید ڈپٹی ریاض کے گندے جسم اور بوجھل سانسوں کی تھی۔ وہ وردی میں تھا لیکن قمیص کو پتلون کے اندر نہیں ڈالا گیا تھا۔ ٹوپی بھی سر پر نہیں تھی۔ اس کی کانٹے دار شیو ہمیشہ کی طرح بڑھی ہوئی تھی..... ہاں یہی وہ شخص تھا جس کے شر سے ایک خلقت پناہ مانگتی تھی۔

اس نے شانی کو مخمور نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''مجھے پتا تھا..... کچے دھاگے سے بندھی آئے گی سرکار میری۔ بیٹھ جاؤ بی بی جان۔ تسلی سے بیٹھ جاؤ۔''

شانی ایک نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ جمشید کی موت کا غم ایک وزنی پتھر کی طرح اس کے کلیجے کو مسل رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ اپنے برابر والی نشست کی طرف گئی۔ اسے رونے اور سسکنے کی آواز آئی۔ یہ تایا معصوم تھے لیکن ان کے سر پر ایک بڑا کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ سر کو بے قراری سے جنبش دے رہے تھے اور کپڑا اُتارنے کی کوشش کررہے تھے لیکن اس کام کے لئے اپنے ہاتھ استعمال نہیں کررہے تھے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ تایا کے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر باندھ دیئے گئے ہیں۔ وہ تڑپ کر تایا کی طرف جھکی اور کپڑا ان کے سر سے ہٹا دیا۔ تایا کی حالت نے شانی کو ششدر کردیا۔ وہ ننگے سر تھے۔ ان کی عینک کا ایک شیشہ تڑخ چکا تھا۔ بالائی ہونٹ بُری طرح سوجا ہوا تھا اور وہاں سے رِسنے والا خون ان کی سفید داڑھی کو ایک طرف سے رنگین کررہا تھا۔ ان کا گریبان ادھڑا ہوا تھا اور ہاتھ پشت کی طرف ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل کی بیلٹ سے منسلک تھی۔

شانی نے تڑپ کر تایا کو گلے لگالیا۔ دونوں ہچکیوں سے رونے لگے۔ تایا معصوم علی نے روتے روتے کہا۔ ''شانی پتّو نے کیا کیا؟ مرجانے دینا تھا مجھے یہاں۔ اپنی جان عذاب میں نہیں ڈالنی تھی۔ وہ جوان جہان مرگیا۔ میں تو بڈھا ٹھہرا..... میرا کیا تھا۔'' وہ بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔

شانی نے انہیں بانہوں میں لے لیا۔ ''تایا جی! میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

ڈپٹی ریاض کی زہرخند آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ''حوصلہ رکھو بابا۔ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ سب ٹھیک کر لے گی۔ یہ کرسکتی ہے ایسا۔''

اس کے ساتھ ہی ریاض نے شانی کو بے رحمی کے ساتھ بازو سے پکڑ کر تایا معصوم سے دور کر دیا۔ ریاض کے اشارے پر ایک مسلح کانسٹیبل نے موٹی چادر پھر تایا معصوم کے سر پر ڈال دی۔ تایا معصوم اپنے سر کو بے قراری سے حرکت دینے لگے۔ وہ کپڑا ہٹانا چاہ رہے تھے۔ ان کی مزاحمت دیکھتے ہوئے ہٹے کٹے کانسٹیبل نے ہتھکڑی کی زنجیر کو بے دردی سے جھٹکا دیا اور اس طرح کھینچا کہ تایا معصوم سیٹ کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے۔

شانی کی نگاہ جیپ کے فرش پر پڑی اور وہ پوری جان سے لرز گئی۔ یہاں خون کے دھبے تھے اور ایک خون آلود چپل بھی پڑی تھی۔ شانی کے دل نے گواہی دی کہ یہ مرنے والے جمشید کی چپل ہے۔ غالباً شانی کے آنے سے پہلے تک جمشید کی لاش اسی کشادہ جیپ کے فرش پر موجود تھی، اب اسے پیچھے والی گاڑیوں میں سے کسی ایک گاڑی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

''کہاں ہے وہ مجھے اس کا چہرہ تو دکھاؤ۔'' شانی نے روتے ہوئے ریاض کو مخاطب کیا۔

''چہرہ دیکھ کر کیا کرو گی بی بی جان؟ مُردے کا ماتم چھوڑو۔ زندوں کی فکر کرو۔''

اچانک شانی کے شولڈر بیگ میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ شانی متوجہ ہوتی ریاض نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔ سکرین دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کمبوہ کا فون ہے۔ تیرے لئے پریشان ہو رہا ہوگا۔'' اس کے ساتھ ہی ریاض نے کال ریجیکٹ کر دی۔

شانی کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے سگریٹ کا گاڑھا دھواں پھینکا اور بولا۔ ''ابھی کمبوہ کا فون دوبارہ آئے گا۔ اسے اپنی طرف سے مطمئن کر دینا۔ اسے بتاؤ کہ تم اپنی مرضی سے ایک ضروری کام کے لئے آئی ہو۔ ابھی بتا نہیں سکتی ہو کہ کیا کام ہے۔ اس کُتے سے کہو کہ کرائے کے ٹٹوؤں کو چوہدری بشیرے کے پاس واپس بھیج دے اور خود بھی دُم ہلاتا ہوا جوہر آباد پہنچ جائے۔ تم ایک دو دن میں واپس آجاؤ گی۔''

''ایک دو دن؟'' شانی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔ ''تم نے تو کہا تھا..... بس آدھ پون گھنٹے کی بات ہے۔''

''جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔ کوئی چوں چرا نہیں چاہیے ورنہ ابھی پانچ منٹ میں اس ٹھرکی بڈھے کا حشر خراب کر کے مار دوں گا تیری آنکھوں کے سامنے۔'' ریاض سانپ کی طرح پھنکارا اور سیٹ کے نیچے رکھا ہوا پسٹل نکال لیا۔ شانی اس منحوس پسٹل کو بڑی اچھی طرح

جانتی تھی۔ یہ ریاض کے سرکاری پسٹل سے تھوڑا سا بڑا تھا۔ ریاض نے شانی کو اس کا نظارہ جوہر آباد میں جمشید کے گھر کرایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہی وہ پسٹل ہے جس سے وہ شانی کے عزیزوں کے تین جنازے اٹھوائے گا۔ ان میں سے ایک جنازہ وہ قریباً ایک گھنٹہ پہلے اٹھوا چکا تھا۔ شانی نے اپنے موبائل فون پر جمشید کو قتل ہوتے ''سنا'' تھا اور تایا معصوم نے ''دیکھا'' تھا۔

ڈپٹی ریاض نے پسٹل کی نال بے دریغ معصوم علی کی بوڑھی پسلیوں سے لگا دی۔ وہ ایک بار پھر کراہے۔ ''مار دو..... ہاں مار دو۔''

اسی دوران میں موبائل کی بیل پھر ہونے لگی۔ ڈپٹی نے فون شانی کی طرف بڑھا دیا۔ شانی نے دیکھا دوبارہ عارف کمبوہ کی کال تھی۔ شانی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عارف کی بے حد پریشان آواز ابھری۔ ''شانی بہن! کہاں چلی گئی ہو تم؟ کیا ہوا ہے؟ گارڈ محمد دین کہہ رہا ہے کہ تمہیں کوئی فون آیا تھا اور تم روتی ہوئی چلی گئی ہو.....''

شانی نے بے حد کوشش کر کے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنی مرضی سے آئی ہوں۔ فون پر تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن بالکل خیریت سے ہوں۔''

جواب میں عارف نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کے لہجے میں اَن گنت اندیشے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ عارف اس کی بات پر یقین کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بہرحال شانی نے عارف سے وہی کچھ کہا جو ڈپٹی ریاض نے اسے بتایا تھا۔ عارف کے شبہات میں رتی بھر بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے واضح طور پر اس شبہے کا اظہار کیا کہ کہیں وہ گوجرانوالہ پولیس کی تحویل میں تو نہیں ہے۔

شانی نے تردید کی۔ اس سے پہلے کہ عارف مزید سوالات کی بوچھاڑ کرتا..... ڈپٹی ریاض نے اپنا کرخت ہاتھ بڑھا کر موبائل شانی سے لے لیا اور آف کر دیا۔

جیپ نہر کے پُل سے روانہ ہو گئی۔ اس کا رخ ذیرآباد کی طرف تھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' شانی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''تمہیں تھوڑی سی سیر کرانی ہے بی بی جان اور ایک رشتہ بھی دکھانا ہے تمہیں۔ چالیس پینتالیس سال کی عورت ہے لیکن ہڈ بیر کی ٹھیک ہے۔ چل جائے گی تمہارے تائے کے ساتھ۔''

شانی اشک بار سوالیہ نظروں سے ریاض کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور تیرا یہ تایا معصوم تو

www.pdfbooksfree.pk

بس نام کا معصوم ہے۔ اندر سے ایک نمبر کا ٹھرکی ہے۔ ابھی ایک جوان سی عورت بٹھا دو اس حرامی کی گود میں، دو منٹ میں مولا جٹ نہ بن جائے تو میرا نام بدل دینا۔''

''بکواس بند کر کتے..... اللہ کے عذاب سے ڈر..... میری بیٹی کے سامنے..... میری بیٹی کے سامنے۔'' معصوم علی کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ خود کو نشست سے علیحدہ کرنے کی بیجانی کوشش کرنے لگے۔ کانسٹیبل نے انہیں مزید مضبوطی سے جکڑ لیا۔

ریاض نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔ شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہیں کہا تھا ناں کہ اس بڈھے میں بڑا کرنٹ ہے۔ اس کو موقع ملے تو دو تین شادیاں تو اب بھی کھڑ کا سکتا ہے۔ ایسے بڈھوں کے بارے میں ہی کہتے ہیں..... اتوں میاں تسبیح تے وچوں میاں کسبی.....''

ریاض نے چھوٹا سا ایک اور قہقہہ لگایا پھر ہاتھ بڑھا کر ستر سالہ بزرگ کو ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پھنکارا۔ ''تیری بیٹی کے سامنے کیا کر دیا ہے میں نے؟ بول کیا کر دیا ہے.....؟ تیرے اوپر کوئی کنجری چھوڑ دی ہے یا تھپ سے ڈانس کروایا ہے۔ کیا ظلم ہو گیا ہے مجھ سے؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے معصوم علی کی پیٹھ پر ٹھوکر رسید کی۔

اب یہ سب شانی کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر تایا معصوم اور ریاض ہٹلر کے درمیان آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ریاض کا گریبان پکڑا اور جھنجوڑنے لگی۔ ''خدا کا خوف کرو..... خدا کا خوف کرو۔'' وہ چلائی۔ ''تمہیں بھی کسی نے پیدا کیا ہے، تمہارا بھی کوئی باپ ہو گا۔''

ریاض ایک دم غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ شانی کے منہ پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس نے شانی کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اسے نیچے تک ادھیڑ کر رکھ دیا۔ شانی کا بالائی جسم بائیں طرف سے عریاں ہو گیا۔ وہ چلائی اور اس نے اپنی اوڑھنی کو پھیلا کر جلدی سے خود کو ڈھانپا۔

ریاض گرجا۔ ''حرامزادی اکڑ دکھاتی ہے۔ تیرے جیسیوں کو تو تیر کی طرح سیدھا کر دیتا ہوں میں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے شانی پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

شانی کا گریبان پھٹنے اور اس کے چلانے کی آواز یقیناً معصوم علی کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ وہ بھی چلانے لگے اور خود کو بیٹے کے کانسٹیبل کی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ کپڑا بدستور ان کے سر پر تھا اور اسے دوسرے کانسٹیبل نے مضبوطی سے ان کی گردن پر پکڑ رکھا تھا۔

ڈپٹی ریاض کے دائیں ہاتھ میں پسٹل تھا، بائیں ہاتھ سے اس نے شانی کے بالوں کو

جکڑا اور جھنجھوڑ کر بولا۔ ''اکڑ دکھائے گی تو کچھ نہیں بچے گا تیرا..... منی خراب کر دوں گا تیری..... مر سکے گی نہ جی سکے گی۔ چپ بیٹھی رہ، بالکل چپ۔'' اس نے پسٹل کی نال بے رحمی سے شانی کی گردن میں گھسیڑی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل والے ہاتھ سے ایک ضرب معصوم علی کی گردن کے پچھلے حصے پر لگائی۔ وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہے تھے..... لڑھک کر نشست سے گر گئے۔ ڈپٹی ریاض پھنکارا۔ ''او..... رحے! بیٹھ جا اس ٹھرکی بڈھے کے اوپر..... اسے دبا کر رکھ اپنے نیچے۔''

شانی نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ ہٹا کٹا کانسٹیبل ذرا ترس کھائے بغیر سیٹوں کے درمیان پھنسے ہوئے تایا معصوم کے اوپر یوں بیٹھ گیا جیسے کرسی پر بیٹھا جاتا ہے۔ تایا معصوم کے ہونٹوں سے اب گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ بالکل معمولی مزاحمت کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ بے ہوش ہو جائیں گے۔

''خدا کے لئے پیچھے ہٹ جاؤ..... خدا کے لئے۔'' شانی نے ہٹے کٹے کانسٹیبل کو جھنجھوڑ کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شانی نے فریادی نظروں سے ریاض کی طرف دیکھا۔ ''اس کو پیچھے ہٹاؤ..... میں..... کچھ نہیں کہوں گی۔ خاموش بیٹھوں گی، اس کو پیچھے ہٹا دو۔''

''تم تو اور بھی بہت کچھ مانو گی مسماۃ شانی! لیکن اس طرح کی شرطیں مت رکھو۔ اس بڈھے کا دماغ ذرا ٹھیک ہو لینے دو۔''

کانسٹیبل کچھ اور بھی چوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ تایا معصوم کی سانس اب رک رہی تھی اور منہ سے کھیں کھیں کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔ انہوں نے مزاحمت بالکل ترک کر دی تھی۔ ایک ستر سالہ بیمار بوڑھا کہاں تک مزاحمت کر سکتا تھا۔ جیپ تیز رفتاری سے چلتی جا رہی تھی۔

''خدا کے لئے..... فار گاڈ سیک۔'' شانی نے بے ساختہ ڈپٹی ریاض کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔

شانی کے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر دیکھ کر ڈپٹی ریاض زہرناک انداز میں مسکرایا۔ ''اوئے تُو کملی ہو گئی ہے چھوٹی چوہدرانی! ہم تو تم لوگوں کے خادم ہیں۔ تمہارے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے ہم کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ ہماری دال روٹی چلتی ہے اور تُو میرے گوڈوں کو ہتھ لگا رہی ہے۔ توبہ توبہ..... اگر تیرے اس یار رستے کو پتا چل گیا تو وہ تو میری پھٹیاں اکھاڑ کر رکھ دے گا۔ بڑا ''دراچھا'' بندہ ہے وہ اور ہم غریب پلسیوں کا تو خاص طور پر ویری ہے۔ پیچھے کر لے بھئی اپنے ہتھ۔ مجھے اپنی ٹانگیں نہیں چیروانی اس شیر ببرے سے۔'' شانی کو گندی گالیاں دینے کے

www.pdfbooksfree.pk

بعد ریاض کا لہجہ ایک بار پھر بدل گیا تھا اور اب بظاہر نرم لیکن زہریلے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ایک بار تو شانی کا دل چاہا کہ وہ ریاض پر پل پڑے اور اس وقت تک اس کا سیاہی مائل چہرہ نوچتی رہے جب تک ہڈیوں پر گوشت کا ریشہ باقی ہو، اسے یہ بھی اچھی طرح پتا تھا کہ تایا معصوم میں اتنی سکت نہیں ہے کہ ان کے سانسوں کی ڈور تادیر برقرار رہے۔

اس نے سنا تھا کہ تشدد انسان کو مسمرائز کر دیتا ہے جو شخص توہین آمیز انداز میں مخاطب کئے جانے پر تیخ پا ہو جاتا ہے، وہ بھی تشدد میں جکڑے جانے کے بعد ماں بہن کی گالیاں بھی خاموشی سے سن لیتا ہے۔ یہاں اس تیز رفتاری سے چلتی ہوئی جیپ میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے شانی اس بات پر آگ بگولہ ہو گئی تھی کہ ڈپٹی ریاض نے تایا معصوم کو ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا، ایک کانسٹیبل ان کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا اور ریاض انہیں ننگی گالیاں دے رہا تھا لیکن وہ اب خاموش رہنے پر مجبور تھی۔

اس نے ایک بار پھر روتے ہوئے ریاض ہٹلر کی منت کی مگر وہ قصائی بڑی لاپرواہی سے فون کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے کسی ماتحت کو مخاطب کر کے بولا۔ ''ڈی سی کے سگے بھائی کی شادی ہے..... ٹھیک ٹھاک پیسے لے کر آئے گی وہاں سے۔''

ماتحت نے کہا۔ ''لیکن اس کی ماں.....''

''اوئے اس کی ماں کے.....'' ریاض نے ایک غلیظ گالی دی اور پھنکارا۔ ''جو للو پنجو پندرہ بیس ہزار دکھا دیتا ہے اس کے ساتھ بیٹی کو سونے کے لئے بھیج دیتی ہے۔ یہ ڈی سی صاحب کا بھائی ہے، یہاں جاتے ہوئے اسے کیا پیٹ پڑتی ہے۔''

فون کے مائیک سے ماتحت کی آواز آئی۔ ''اس کی ماں کہتی ہے، بچی ٹھیک نہیں ہے..... بخار ہے۔''

''بخار ہے تو نہانے والا کام نہ کرے اور اسے کہتا بھی کون ہے؟ بس دو چار تھپڑ دکھا کر آ جائے۔ ایک گھنٹہ آنے جانے کا..... ایک گھنٹہ ڈانس..... دو گھنٹے میں ڈھائی تین لاکھ روپیہ لے آئے گی اور اس حرامزادی کو موت چاہیے۔''

ماتحت نے کچھ کہا جو شانی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تایا معصوم مسلسل کانسٹیبل کے نیچے کراہ رہے تھے۔ ان کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔

شانی نے روتے روتے کانسٹیبل کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اسے تایا معصوم پر سے ہٹانے کی کمزور کوشش کی۔ کانسٹیبل نے سوالیہ نظروں سے ڈپٹی ریاض کی طرف دیکھا۔ اس نے فون کرتے کرتے آنکھوں سے اشارہ کیا..... جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو..... چلو

ابھی معاف کرو، اس بڈھے کو۔

کانسٹیبل تایا معصوم کے اوپر سے اٹھ گیا۔ ان کے ہاتھ بدستور پشت پر ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے اور ہتھکڑی کی زنجیر کانسٹیبل کی بیلٹ میں تھی۔ دونوں کانسٹیبلوں نے سہارا دے کر تایا معصوم کو اٹھایا اور سیٹ پر بٹھانا چاہا لیکن وہ ایک طرف لڑھک گئے۔ گردن پر تلنے والی بے رحم ضرب نے انہیں نیم جان کر دیا تھا۔ شانی نے تڑپ کر ان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ ان کی سفید داڑھی خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے تھرماس میں سے پانی نکالا اور ان کے چہرے پر چھینٹے مارے۔

اس دوران میں ڈپٹی ریاض نے موبائل پر اپنے ماتحت سے بات ختم کر لی۔ شانی تایا معصوم کے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ ریاض نے شانی کو بازو سے کھینچ کر واپس سیٹ پر بٹھا دیا۔ ''تم چپ کر کے یہاں بیٹھی رہو۔ تایا جی سے زیادہ لولو پو نہ کرو۔ ہم ہیں ان کی خدمت گزاری کے لئے..... کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔''

شانی کو قہرناک نظروں سے دیکھنے کے بعد ڈپٹی ریاض نے نیا سگریٹ سلگایا اور موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیپ جی ٹی روڈ پر اڑی جا رہی تھی۔ سفید کار بھی پیچھے آ رہی تھی مگر دوسری جیپ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق بدنصیب جمشید کی لاش اسی جیپ میں منتقل کی گئی تھی۔ شانی نے آبدیدہ نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ شیشے کی دوسری جانب سورج مغربی افق پر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ قریب سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کے مسافر اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ شانی نے سوچا کسی گاڑی میں میوزک بج رہا ہوگا، کہیں لطیفے بازی ہو رہی ہوگی۔ کسی گاڑی میں لمبا سفر کاٹنے کے لئے مسافروں نے کوئی سیاسی بحث شروع کی ہوگی۔ ان میں سے کسی کو کیا معلوم کہ ان کے پاس سے گزرتی ہوئی پولیس جیپ میں ایک بے بس لڑکی..... خوفناک افسر کے چنگل میں ہے اور وہ دونوں شاید ایک خطرناک ترین ڈکیت کے پاس جا رہے ہیں..... ایک پولیس افسر، ایک لڑکی اور ایک ڈکیت کی کہانی۔

معصوم علی کی حالت میں معمولی سی بہتری نظر آئی۔ شانی میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ بہتری دیکھنے کے لئے تایا معصوم کی طرف بڑھے، وہ جیسے مسمرائز ہو چکی تھی۔ ہاں تشدد مسمرائز کرتا ہے۔ اچانک ریاض کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے سکرین پر نمبر پڑھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر شانی کی طرف دیکھ کر پھنکارا۔ ''تمہاری آواز نہیں نکلنی چاہیے۔''

شانی نے بے ساختہ اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

www.pdfbooksfree.pk

ریاض نے کال ریسیو کی۔ ایک ہی لمحے میں اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ اس کے چہرے سے خشونت جاتی رہی اور لہجے میں نرمی سرایت کر گئی۔ ''حاجی صاحب! کیا حال چال ہے۔ آج اپنے اس خادم کی یاد کیسے آ گئی۔''

حاجی صاحب کا لفظ سن کر شانی چونکی..... کہیں یہ حاجی حیات صاحب تو نہیں..... یہ یقینی بات تھی کہ اس کی اچانک گمشدگی نے عارف کمبوہ کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پریشان کر دیا ہوگا۔ ان میں حاجی حیات بھی شامل ہو سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اس حوالے سے ان کا دھیان ڈپٹی ریاض کی طرف گیا ہو۔ اگلے چند سیکنڈ میں شانی کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ دوسری طرف حاجی حیات ہی تھے۔ ریاض کے موبائل کے سپیکر کی آواز تھوڑی سی بلند تھی لہٰذا ریاض کے علاوہ مخاطب کی آواز بھی جیپ کے اندر سنی جا سکتی تھی۔

دوسری طرف سے حاجی حیات نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''ریاض! ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ رستم والے معاملے سے چھوٹی چوہدرانی شانی کو بالکل الگ رکھیں گے اور پولیس اسے کسی طرح تنگ نہیں کرے گی۔''

''حاجی صاحب! آپ تو بار بار دہرا کر شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں آپ کا نوکر ہوں جی۔ بس جو بات ہمارے درمیان طے ہوگئی سو ہوگئی لیکن..... اب کیا کوئی نیا واقعہ ہوا ہے؟''

''ہاں..... لاہور سے جوہر آباد آتے ہوئے شانی گوجرانوالہ سے غائب ہوگئی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے عارف کمبوہ نے اسے فون کیا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی لگتی تھی..... اس نے درمیان میں ہی فون بند کر دیا ہے۔''

''یہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟'' ریاض نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ وہ بڑی مہارت سے ایکٹنگ کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ ''کہیں، آپ مجھ پر تو کسی طرح کا شک نہیں کر رہے۔''

حاجی حیات نے کہا۔ ''شک تو مجھے تھا..... پر اب تو تم سے بات ہوگئی ہے، لیکن ایک بات اب بھی دماغ میں آ رہی ہے۔ کہیں تمہارے کسی ماتحت نے.....''

''نہیں نہیں..... حاجی صاحب..... آپ تو بادشاہوں والی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ میرا کوئی ماتحت میرے حکم سے باہر نہیں جاتا اور اگر آپ جناب کو مجھ پر شک ہے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟ سوائے اس کے کہ آپ جو بڑی سے بڑی قسم اٹھوائیں وہ اٹھا لوں۔'' ریاض کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔

''میں نے قسم اٹھوانے والی بات کی ہے؟'' حاجی حیات نے بھی قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ کے اس نوکر کے دل کو یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے جی کہ بی بی سا... ے ساتھ کچھ بھی ہوا..... گردن میری ہی آپ کے پاؤں کے نیچے آنی ہے۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں تم سے بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنے مخبروں سے رابطہ کر کے دیکھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے ایفی ڈینسی دکھائی ہو۔''

ریاض کے کرخت چہرے پر ایک دم خون کی یورش ہوئی۔ یوں لگا جیسے وہ حاجی حیات کو کوئی سخت جواب دے دے گا لیکن پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''آپ پیر قدرت کو کیوں نہیں دیکھتے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل چوہدری بشیرے کی لاہور والی کوٹھی میں پیر قدرت کے ایک بندے نے بی بی پر چاقو سے حملہ کیا ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے اس کی۔ کیا پتا پیر جی کا کوئی جوشیلا مرید پھر کام دکھانے کی کوشش کر جائے؟ بی بی جی کو بھی اس طرح خواہ مخواہ خطرے مول نہیں لینے چاہیے ناں۔''

اس نے کیا کیا ہے؟''

''جہاں پیر قدرت کی بیوی قتل ہوئی ہے وہاں بی بی خود موجود تھی۔''

''تم ملتان کی بات کر رہے ہو..... پر تم بھول رہے ہو کہ بی بی کے وہاں جانے سے معاملہ بگڑا نہیں تھا بلکہ کچھ سنبھل گیا تھا۔ اس بات کا اقرار خود قدرت اللہ کے چیلے بھی کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر بی بی وہاں نہ آتی تو اور زیادہ خون خرابہ ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ قدرت اللہ بھی اپنے ''ایند'' کو پہنچ گیا ہوتا۔''

''یہ تو میں اور آپ کہہ رہے ہیں ناں جی۔ لوگ تو اپنے ڈھنگ سے دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ بی بی ہی رستے کو ملتان والے آستانے پر لے کر گئی تھی۔ بعد میں لوگوں کے سامنے سچا ہونے کے لئے اس نے رستے کا رستہ روکا۔ بہرحال جی ہمیں کیا..... ہمیں تو تفتیش کرنی ہے اور عدالت کو بندے دینے ہیں۔ عدالت جانے اور اس کا کام۔''

''میں تم سے کب کہہ رہا ہوں کہ تم عدالت لگاؤ۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ذرا اپنے طور پر بی بی کے بارے میں معلوم کرو۔''

حاجی حیات کی گفتگو میں ایک بار بھی معصوم علی کا نام نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی تک ان کی گمشدگی سے بے خبر تھے۔ اسی طرح جمشید کے ''پولیس مقابلے'' کی خبر بھی ان تک نہیں پہنچی تھی۔

ریاض کے ماتحتوں کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ غالباً وہ حاجی حیات کے

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ اپنے ڈپٹی کی دروغ گوئی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے قدرے رو کھے انداز میں حاجی حیات سے یہ کہتے ہوئے بات ختم کردی کہ اگر اسے بی بی کے بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع ملی تو وہ فوراً آگاہ کرے گا۔

اس ساری گفتگو کے دوران میں معصوم علی نیم بے ہوش سے پڑے رہے۔ دونوں گاڑیاں جہلم میں داخل ہوئیں تو شام گہری ہو چکی تھی۔ اپنی قمیص کا پھٹا ہوا گریبان شانی نے مسلسل تھام رکھا تھا۔ ایک جگہ گاڑی روک کر ڈپٹی ریاض اور اس کے عملے نے کولڈ ڈرنکس لیں۔ اسی دوران میں ایک ہیڈ کانسٹیبل قریبی جنرل سٹور سے تین سیفٹی پن لے آیا۔ شانی نے ان سیفٹی پن کے ذریعے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو عارضی طور پر جوڑا۔

شانی کے تایا معصوم اب ہوش میں آچکے تھے۔ تاہم ڈپٹی ریاض نے انہیں بڑے درشت الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ بزرگی یا بڑی عمر کے حوالے سے انہیں کوئی رعایت نہیں ملے گی۔ اگر وہ خاموشی سے چپ چاپ بیٹھے نہیں رہیں گے تو تایا بھتیجی دونوں سخت مصیبت میں پھنسیں گے۔ شانی کی چھٹی حس اسے ایک خاص خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک بار پھر پوٹھوہار کے سفر پر ہے۔ اسے معلوم تھا کہ رستم دوبارہ سون میں پہنچ چکا ہے اور وڈے ڈیرے کو پولیس نے سخت ترین گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ بالآخر ڈپٹی ریاض وہی کر رہا ہے جس کی اس سے توقع تھی۔ وہ شانی کے ذریعے رستم کو بے بس کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ ڈپٹی ریاض کو ایسا کرنے دے گی؟ کیا وہ یہ برداشت کر سکے گی کہ اس کی وجہ سے رستم اور اس کے ساتھی بدترین موت کا شکار ہو جائیں؟ کیا اس سے ہزار درجے بہتر نہیں ہوگا کہ وہ موقع دیکھ کر ریاض اور اس کے ہرکاروں پر ٹوٹ پڑے؟ خود مر جائے اور ان کو مار دے..... لیکن تایا معصوم.....؟ ایک بار پھر یہ سوال شدت سے اس کے ذہن میں ابھرا۔ کیا تایا معصوم کو بھی اس کے ساتھ ہی مرنا پڑے گا؟ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ تو خود کر سکتی تھی لیکن تایا کی زندگی کا فیصلہ وہ کیسے کر سکتی تھی پھر اسے مُنے کا خیال آیا.....

اپنے ان پیاروں کا خیال آیا جن کے چہرے دیکھے اسے زمانہ گزر گیا تھا۔ اسے رنگ والی کا خیال آیا وہاں کی گلیوں اور کھلیانوں کا، وہاں کے کنوؤں اور درختوں کا۔ رنگ والی کی شامیں اور دوپہریں اور چاندنی راتیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئیں۔ وہ ساری سکھیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آئیں جن کے ساتھ اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ان چہروں اور ان گلی کوچوں کو شاید اب کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ وہ وہی کیفیت محسوس کر رہی تھی جو کسی خونخوار 'فش ایگل' کے پنجوں میں جکڑی ہوئی مچھلی کرتی ہوگی جب اسے چیر پھاڑ کے

لئے گھونسلے کی طرف لے جایا جاتا ہوگا۔

وہ ایک نیم پختہ سڑک پر ٹیلوں کے درمیان رواں دواں تھے جب ڈپٹی ریاض کے موبائل کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا مختار نامی ماتحت تھا۔ ریاض اسے مختارے کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔

''ہاں مختارے کیا رپورٹ ہے؟''

''جناب دوپہر بارہ بجے کے قریب وائرلیس آئی تھی۔ آپ کے آرڈر پر عمل ہوا ہے جی۔''

''پار کر دیا ہے دونوں کو؟''

''بالکل جی۔ انہیں گدھوں کے اوپر باندھ کر گدھے ڈیرے کی طرف ہانک دیئے گئے تھے۔''

''پھر کوئی ری ایکشن ہوا ہے؟''

''بارہ ایک بجے تک تو نہیں ہوا تھا جی۔ انسپکٹر صاحب نے کہا تھا کہ اگر کوئی حرکت نظر آئی تو وہ اطلاع دیں گے۔''

''حرامزادے..... ہیجڑے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ان کی ماں بہن کی مٹی پلید کرو گے تو بھی سامنے نہیں آئیں گے۔ انہیں پتا ہے ''مائینز'' کی حد سے آگے نکلیں گے تو گئے کی موت مریں گے۔''

''اب کیا حکم ہے جناب؟''

''تم تسلی رکھو۔ میں ان ہیجڑوں کے لئے طاقت کا ایک خاص ٹیکہ لے کر آ رہا ہوں۔ خاص طور پر اس بڑے ہیجڑے کے لئے۔''

''انسپکٹر صاحب کے لئے کوئی آرڈر ہو تو بتا دیں۔''

''اگر رابطہ ہو تو اسے چوکس رہنے کا کہو۔ میرا خیال ہے کہ میں آج سویرے تک بیس کیمپ پر پہنچ جاؤں گا۔''

ریاض ہٹلر نے اپنے ماتحت کو چند ہدایات دینے کے بعد فون بند کر دیا اور تیز نظروں سے شانی کو گھورنے لگا۔ تاہم اس کی نگاہیں صرف شانی پر تھیں۔ دماغ کہیں بہت دور پہنچا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ریاض نے ڈھکے چھپے انداز میں ٹیکے اور ہیجڑے کا ذکر کیا تھا۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بدزبان نے بڑے ہیجڑے کا لفظ رستم کے لئے استعمال کیا ہے جب طیش کے عالم میں اس کی پلید زبان حرکت کرتی تھی تو ہر حد کو پار کر جاتی تھی۔ وہ ایک دم جنونی

www.pdfbooksfree.pk

نظر آنے لگتا تھا۔ صورتِ حال اب واضح ہو رہی تھی اور شانی کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ وڈے ڈیرے پر گشت و خون ہو رہا تھا۔ ریاض ہٹلر شاید رستم اور اس کے ساتھیوں کو طیش دلانے کی بہیمانہ کوششیں کر رہا تھا۔ اس کے ماتحت نے لاشوں کو گدھوں پر باندھ کر وڈے ڈیرے کی طرف روانہ کرنے کی بات کی تھی اور ایسا ریاض کے حکم پر ہی کیا گیا تھا۔

اس سفر کے دوران میں ریاض کو گاہے بگاہے فون موصول ہوتے رہے۔ ان فون کالز سے ریاض کی بے پناہ طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پولیس افسر نہیں کسی بہت بڑی ریاست کا مطلق العنان حکمران ہے۔ اس کی رعایا اس کے بے پناہ غیظ و غضب سے سہمی رہتی ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

ایک بڑے سیاسی خانوادے کے زمیندار نے بتایا کہ اس نے دیسی گھی کے تین کنستر ریاض کے سالے کے گھر پہنچا دیئے ہیں۔ جواب میں ریاض نے ناک بھوں چڑھائی اور اسے بتایا کہ اسے گھی کی ضرورت نہیں..... ہاں بڑی نہر کے پاس والی دوا ایکڑ زمین کا سودا اگر وہ کرا دے تو پھر بات ہے۔ زمیندار نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں بادشاہو! آپ کے اس کام کے پیچھے بھی لگا ہوا ہوں۔''

ایک صحافی نے خوشامدانہ انداز میں اپنے کسی عزیز کی رہائی کی سفارش کی۔ جواب میں ریاض ہٹلر نے اسے تلخ ترش سنائیں اور کہا کہ وہ جس انگریزی اخبار میں بیس ہزار ماہوار کی نوکری کرتا ہے، اس کے مالک ایڈیٹر کو اس کے (ریاض) سامنے پتلون گیلی ہونے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

پھر بازار حسن کی ایک بڑی نائیکہ نے ریاض سے دس پندرہ منٹ گفتگو کی۔ نائیکہ کو لاہور کے بازار حسن میں اپنے ایک مخالف گروپ سے واداگیری کی شکایت تھی۔ اس مخالف گروپ کی پشت پناہی ایک تماش بین صوبائی وزیر کر رہا تھا۔ جیپ میں سفر کرتے کرتے ریاض ہٹلر نے ڈائریکٹ ایک بڑی سیاسی جماعت کے چیئرمین کو فون کیا اور صاف لفظوں میں اس سے کہا۔ ''اپنے کُتے کو پٹا ڈال کر رکھو۔''

''ورنہ کیا ہوگا؟'' سیاسی جماعت کے سربراہ نے کہا۔

''اس حرام زادے کے جسم سے ہر وہ شے کاٹ کر پھینک دوں گا جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔'' ریاض نے ترت جواب دیا۔ ''اور یاد رکھو لندن میں علاج کرانے کے لئے جس جس کتیا کے ساتھ تم لیٹتے ہو ان کے نام پتے بھی مجھے معلوم ہیں۔''

پہلے سیاسی لیڈر کی بولتی بند ہوئی پھر اس کا لب و لہجہ تبدیل ہوا اور وہ مفاہمت کی باتیں کرنے لگا۔

شانی نے اس بارے میں سنا تھا اور اب اسے خود بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض ہٹلر ڈی ایس پی ہونے کے باوجود ایس پی سے کہیں زیادہ پاور رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی بہت مضبوط ہاتھ تھا۔ یہ ہاتھ اسے اس کے عہدے سے کہیں زیادہ اتھارٹی فراہم کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ شانی نے ایک اور بات نوٹ کی تھی۔ بازار حسن کی نائیکائیں، دلال اور رقاصائیں وغیرہ ریاض ہٹلر سے خاص الخاص تعلق رکھتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے سارے مسائل اور باہمی جھگڑے نمٹانے کے لئے یہ لوگ ریاض ہٹلر سے رجوع کرتے ہیں۔ ریاض ان لوگوں کے ساتھ بھی بے حد بدتمیزی سے پیش آتا تھا اور انہیں ''اعلیٰ پائے'' کی گالیوں سے نوازتا تھا۔ یہ گالیاں سن کر شانی کے کان دکھنے لگے تھے۔ شانی کو فون پر ہونے والے مکالموں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ڈپٹی ریاض کے طوائفوں سے تعلقات ہوں۔

جوں جوں وہ لوگ شہری آبادی سے دور آ رہے تھے، موبائل کے سگنل کمزور پڑتے جا رہے تھے پھر وہ یکسر ختم ہو گئے۔ کم از کم اس حوالے سے تو شانی کو سکون محسوس ہوا کہ وہ فون پر ڈپٹی ریاض کی بدزبانی سننے سے محفوظ ہو گئی ہے۔ تایا معصوم اب ہوش میں تھے مگر بالکل خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی نقاہت اب انہیں بولنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ان کے ہاتھ بدستور ہتھکڑی میں تھے۔

اچانک وہ منمنائے۔ شانی نے ان کی بات سننے کے لئے اپنا کان ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ''میں نے نماز پڑھنی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ کیسے پڑھیں گے؟'' شانی سسکی۔

''میرے ہاتھ کھلوا دو۔ میں تیمم کروں گا۔''

''تایا نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔'' شانی نے ڈپٹی ریاض سے کہا۔

''کڑکی میں پھنس کر تو ہر کسی کو نماز یاد آ جاتی ہے۔'' ریاض نے تمسخر کیا۔

''یہ ساٹھ سال سے پانچ وقت کے نمازی ہیں اور صرف نمازی نہیں مسجد میں امامت کرتے ہیں۔''

''سارے امام ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ پچھلے ہفتے ہم نے گوجرانوالہ سے ایک امام پکڑا ہے، وہ دس سال سے اسمگلنگ کا کیریئر چلا رہا تھا۔ لندن بھیجنے کے بہانے لوگوں سے پیسے بھی بٹورتا تھا۔''

www.pdfbooksfree.pk

''خدا کے لئے میرے تایا کے ہاتھ کھول دو۔ یہ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے۔ یہ تو اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔''

ریاض نے چکن برگر کا ایک بڑا سا نوالہ لے کر بیئر کا گھونٹ بھرا اور کانسٹیبل سے کہا۔ ''کھول دو بڈھے کو۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔''

کانسٹیبل نے جیب سے چابی نکالی اور تایا معصوم کی ہتھکڑی کھول دی۔

انہوں نے کراہتے ہوتے تیمم کیا اور پھر نشست کے اوپر پہلو کے بل لیٹے لیٹے ہی اشاروں سے نماز پڑھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ شانی کو محسوس ہوا کہ گردن پر لگنے والی شدید ضرب کے اثر سے تایا ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔

دونوں گاڑیاں قریباً بارہ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد کچے راستے پر آ گئیں۔ پوٹھوہاری ٹیلوں کے درمیان یہ سخت ناہموار راستہ انہیں بتدریج وادی سون کی طرف لے جا رہا تھا۔ ڈپٹی ریاض کے کارندوں نے جہلم سے کچھ فاسٹ فوڈ لیا تھا۔ یہ کم از کم پانچ ہزار کا کھانا ہوگا اور شانی کے اندازے کے مطابق ریسٹورنٹ والے نے اس کی قیمت نہیں لی تھی۔ آدھا کھانا پچھلی جیپ میں پہنچا دیا گیا تھا..... آدھا اس جیپ میں تھا۔ یہ جیپ میں موجود افراد کی ضرورت سے تقریباً دوگنا تھا۔ ظاہر تھا کہ آگے جا کر اس کھانے کو ٹیلوں میں ہی پھینکا جانا تھا۔

ڈپٹی ریاض نے اپنے مخصوص واہیات انداز میں شانی اور تایا کو بھی کھانے کی دعوت دی لیکن دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔

مدھم چاندنی میں دشوار گزار راستوں پر دونوں گاڑیوں کا سفر جاری رہا۔ جیپ میں مرہم پٹی کا معمولی سامان موجود تھا۔ شانی نے جب دیکھا کہ تایا نماز سے فارغ ہو گئے ہیں تو وہ ریاض سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اگر تم کہو تو میں تایا کے ہونٹ پر دوا لگا دوں؟''

وہ سفاکی سے مسکرایا۔ ''اتنے چھوٹے چھوٹے زخموں پر دوا لگاؤ گی تو پھر ہر وقت دوائیں ہی لگاتی رہو گی۔ ابھی چھری تلے سانس لو..... جب دوائیں لگانے کا وقت آئے گا تو تمہیں روکوں گا نہیں۔''

شانی سسک کر بولی۔ ''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تمہارا کیا بگاڑا ہے ہم نے؟ تمہاری لڑائی رستم اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ ہمارا اس لڑائی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

ریاض پھنکارا۔ ''ذرا اپنے اس پاٹے (پھٹے) ہوئے گریبان کے اندر جھانکو اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہی بات کہو کہ تمہارا رستے اور اس کے جیسے مرنے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''مم..... میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ تم کچھ بھی سمجھ نہیں رہے ہو اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، یہ بھی بالکل غلط ہے۔ آخر ہم نے.....''

شانی کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ آواز اس کے گلے میں پھنس سی گئی۔ ڈپٹی کا خوف آسیب کی طرح اس کے اعصاب کو جکڑ رہا تھا۔

ڈپٹی ریاض اور اس کے مسکراتے چہروں والے ماتحتوں کی نظریں مسلسل شانی پر لگی تھیں۔ وہ جیسے اس کی بے بسی اور خوف سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے تمسخر آمیز غصے میں کہا۔ ''چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اچھے بھلے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ بڑھا کر اپنی بدبودار انگلیوں سے شانی کے ہونٹوں کو مسل دیا۔ سگریٹ کی بُو شانی کے اندر تک چلی گئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جو لیکچر تم مجھے پلانا چاہتی ہو..... وہ میں نے پہلے بھی بڑی دفعہ پیا ہوا ہے۔ چلو تم ایک دفعہ اور پلا دو۔ کہہ دو وہ ساری باتیں جو تمہارے اندر اچھالے مار رہی ہیں۔ کہہ دو کہ پولیس عوام کی خدمت گار ہے۔ اسے خدمت گار بننا چاہیے کیونکہ اسے عوام کے خون پسینے کی کمائی سے تنخواہیں ملتی ہیں اور پولیس کا کام تو صرف ملزموں کو پکڑنا ہے۔ پولیس والوں کو چاہیے کہ وہ تھانوں میں ملزموں کو پوری پوری عزت دیں، ان کے آرام کا خیال رکھیں اور ان کو چرغے شرغے کھلائیں کیونکہ وہ مجرم نہیں ہوتے..... ملزم ہوتے ہیں۔ وہ گناہ گار تب ہوتے ہیں جب عدالت میں مجرم ثابت ہوتے ہیں اور اگر وہ مجرم ثابت ہو بھی جائیں تو بھی انہیں سزا دینا پولیس کا نہیں عدالت کا کام ہوتا ہے..... کہہ دو..... کہہ دو یہ ساری باتیں.....'' ریاض نے دانت پیسے۔

شاید وہ شانی پر مزید برستا لیکن اس سے پہلے ہی جیپ میں رکھا ہوا طاقت ور وائرلیس سیٹ جواب تک خاموش پڑا تھا جاگ گیا۔ پہلے اس پر بیپ بیپ کی آواز سے سگنل موصول ہوئے پھر ایک بھرائی ہوئی آواز انک انک کر سنائی دینے لگی۔ غالباً اب جیپ ایسے علاقے میں پہنچ گئی تھی کہ پولیس کے بیس کیمپ سے مواصلاتی رابطہ بذریعہ وائرلیس ہوتا۔

ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھی وائرلیس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پانچ دس منٹ تک وائرلیس سیٹ سے شوں شاں اور کھڑ کھڑ کی آوازیں آتی رہیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔ شاید ٹیلوں کے کسی بلند سلسلے کی وجہ سے لہریں انٹرسیپٹ ہو رہی تھیں۔

تایا معصوم کے بالائی ہونٹ کا زخم قریباً دو انچ لمبا تھا۔ جیپ کے مسلسل جھٹکوں کی وجہ سے یہ زخم پھر کھل گیا تھا اور خون قطروں کی صورت میں رس رہا تھا۔ جس کی وجہ سے نشست بھی خون آلود ہو رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے ایک بار پھر ڈپٹی ریاض کی توجہ تایا معصوم کے زخم کی طرف دلائی۔ وہ درشت انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے اس بڈھے کے لئے تیری متا تڑپ تڑپ جا رہی ہے۔ چل پہلے سیٹ پر سے یہ گند صاف کر جو اس نے مار رکھا ہے..... پھر پٹی کر لے اس کی۔''

شانی نے روئی کے ایک بڑے ٹکڑے سے خون آلود سیٹ صاف کی۔ روئی کے دو بڑے ٹکڑوں سے اس نے وہ خون بھی جزوی طور پر صاف کر دیا جو فرش پر دو تین لوتھڑوں کی شکل میں تھا۔ یہ بدنصیب جمشید کا خون تھا اور پچھلے بارہ چودہ گھنٹے کے سفر میں اس خون کی دید شانی کو مسلسل تکلیف دیتی رہی تھی۔ حیرت کی بات تھی اسی خون کی موجودگی میں ریاض اور اس کے ساتھی اہلکاروں نے چکن برگر بھی کھائے تھے اور بروسٹ مرغیوں کی ٹانگیں بھی ادھیڑی تھیں۔ آج کی اس اندوہناک شب میں وہ غیر معمولی حد تک بے حس لوگوں کے ہمراہ سفر کر رہی تھی۔

اس نے تایا کے زخم کو دھیان سے دیکھا۔ غالباً جب انہیں اٹھا کر جیپ میں پھینکا گیا تھا تو انہیں جیپ ہی کی کسی دھاتی شے سے یہ کٹ لگا تھا۔ بلاشبہ اس کٹ کی سٹچنگ کی ضرورت تھی لیکن یہ سہولت اس ویرانے میں کہاں میسر تھی۔ شانی نے اینٹی بائیوٹک پاؤڈر چھڑک کر خون کا رساؤ بند کیا پھر اوپر جالی دار پٹی اور کاٹن رکھ کر میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ وہ یہی کچھ کر سکتی تھی۔ اس کارروائی کے دوران جیپ ڈرائیور نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ جیپ دو چار منٹ کے لئے روک لی۔ جتنی دیر شانی تایا کی مرہم پٹی کرتی رہی، ان کی آنکھیں بند رہیں اور ہونٹ مسلسل لرزتے رہے۔

جیپ ایک بار پھر روانہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وائرلیس سیٹ ایک بار پھر جاگ گیا، اس دفعہ بھرائی ہوئی آواز کافی واضح تھی۔

شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی انسپکٹر ہے جو وڈے ڈیرے پر ہونے والے آپریشن میں شامل ہے اور جس کے بارے میں موبائل فون پر ایک دوسرے ماتحت مختار نے ریاض کو اطلاعات دی تھیں۔ انسپکٹر کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ وہ بولا۔ ''جناب! ایک گڑبڑ ہو گئی ہے یہاں۔''

''کیا نیا سیاپا ڈالا ہے؟'' ڈپٹی ریاض نے کہا۔

''وہ لوگ..... وہ لوگ جاوے کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔''

''دُر لعنت ہے تم پر..... کبھی کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔''

''سر! بالکل پتا نہیں چلا اور میرے خیال میں اس میں جاوے کی بھی غلطی ہے۔ میرے

اور دوسروں کے منع کرتے کرتے وہ آگے نکل گیا تھا۔ لگتا ہے کہ وہاں پاس ہی رستم کے ساتھی چھپے ہوئے تھے۔ وہ ایک دم نکلے انہوں نے حوالدار قدیر پر فائر کیا اور جاوے کو گن پوائنٹ پر ساتھ لے گئے۔''

''ایک بار پھر لعنت ہو تم سب پر۔'' ریاض چنگھاڑا۔ ''میں نے بار بار تم سے کہا اس کی تھی کہ گن کے سامنے والی چھوٹی کھائی سے آگے نہیں جانا..... کی تھی ناں کہ نہیں؟''

''جج..... جی سر۔''

''اور وہ حرامی قدیر مر گیا ہے کہ زندہ ہے؟''

''اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ نیچے ڈھلوان میں گر گیا تھا، وہاں سے بھاگ کر واپس آیا ہے۔''

''چلو اس کے واپس آنے کی بہت بہت مبارک ہو۔ اپنے ساتھیوں میں کوئی مٹھائی وغیرہ بانٹو۔ ڈھول شول بجاؤ۔ میں بھی ابھی آ کر اس جشن میں شریک ہوتا ہوں۔''

''بس..... سر بس غلطی ہو گئی۔'' اسی دوران میں ایک اور بھاری بھرکم آواز وائرلیس سیٹ پر ابھری۔ ''جناب میں تساں دا خادم ولایت ماشکی بول رہیا ہوں..... جو کچھ ہوا ہے اس پر ہم سارے بڑے شرمندہ ہیں جی۔ مینڈے ساتھی بڑے غصے میں ہیں۔ اساں کو لگتا ہے کہ ابھی وہ لوک جاوا صیب کو لے کر زیادہ دور نہیں گئے اگر تساں کا حکم ہو تو ہم ان کے پیچھے جائیں۔''

شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی پولیس کا معاون اجرالی بول رہا ہے۔

ریاض نے بدستور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ضرور ضرور..... پیچھے جاؤ اور دس پندرہ بندے ساتھ لے کر جاؤ۔ جہاں سے وہ لوگ جاوے کو لے کر گئے ہیں، وہاں سے آگے بارودی سرنگیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان سرنگوں پر چڑھ کے ذرا ڈانس شانس کرو گے تو تمہاری ٹانگیں ہوا میں اُڑتی نظر آئیں گی۔ بڑا اچھا سین ہو گا۔''

اجرالی ڈر کر چپ ہو گیا۔

انسپکٹر قاسم نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''اب..... آپ کا کیا حکم ہے سر؟''

''میرا حکم چل سکے تو میں تمہیں تمہاری ماں کی کوکھ میں واپس بھیج دوں۔'' ڈپٹی نے زہرناک لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔

اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے اور سیاہی مائل چہرہ کچھ اور بھی تمتما گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سگریٹ کے لمبے کش لے کر اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر

www.pdfbooksfree.pk

شانی کی آنکھوں میں نگاہیں گاڑ کر بولا۔ ''دیکھ رہی ہو ناں اپنے یار خصم کے کارنامے۔ اب سر یا لال کر کے اس کے اندر گاڑ دوں تو شکایت نہ کرنا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے رستم اور اس کے ساتھیوں کو نایاب ترین گالیاں دینا شروع کر دیں۔

شانی جان گئی تھی کہ اس وحشی کے سامنے زبان کھولنا اپنی مصیبت میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔ وہ جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر بھی تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا سب انسپکٹر اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''لگتا ہے جناب کہ یہ لالہ اور رستما اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے دو لاشیں پارسل کی ہیں۔ یہ جاوا صاحب کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میرا تو خون کھول رہا ہے جناب۔ آپ جو سخت سے سخت ڈیوٹی مجھے دیں، میں کرنے کے لئے سو فیصد تیار ہوں۔''

سب انسپکٹر کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پکڑے جانے والے جاوا نامی شخص سے سب انسپکٹر کا قریبی تعلق تھا۔

دو دیگر اہلکاروں نے بھی نیم گنجے سب انسپکٹر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ان کی باتوں سے شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جواد عرف جاوا نامی بندہ اپنے ساتھیوں میں کافی مقبول ہے۔ وہ کوئی پہلوان نما شخص تھا اور دو چار بندوں کے لئے اس پر خالی ہاتھ قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق اس شخص کا عہدہ انسپکٹر کے لگ بھگ تھا۔ نیم گنجا سب انسپکٹر اسے جاوا صاحب کہہ کر بلا رہا تھا جب کہ جیپ میں موجود ایک سادہ پوش انسپکٹر اسے صرف جاوا کہہ رہا تھا۔

ایک ہیلی کاپٹر پھڑ پھڑاتا ہوا ان کے سروں پر سے گزرا۔ ڈپٹی ریاض کھڑکی کا شیشہ اُتار کر ہیلی کاپٹر کا رخ دیکھنے لگا۔ دیگر اہلکار بھی تاریک آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈپٹی ریاض نے ایک گونج دار ڈکار نی پھر دو منٹ کے لئے جیپ رکوا کر اس نے جھاڑیوں میں کھڑے کھڑے پیشاب کیا۔ دو تین اہلکار بھی جھاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہوئے۔ تایا معصوم نے غنودگی کی کیفیت میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''شانی پتر! عزت و آبرو سے وڈی کوئی چیز نہیں۔ کوئی بُرا وقت آیا تو ہنس کر جان دے دینا۔''

شانی نے جھک کر اپنا سر ان کے سر سے لگایا اور سسکی۔ ''آپ بے فکر رہیں تایا۔''

تایا معصوم چند سیکنڈ خاموش رہے پھر ہولے سے بولے۔ ''رستم کی وجہ سے تیری زندگی تباہ ہوگئی دھی رانی۔''

www.pdfbooksfree.pk

''نہیں تایا نہیں۔'' شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو خود میری وجہ سے آگ میں کودا ہے۔''

تایا ایک لمبی سانس لے کر رہ گئے۔ انہوں نے جیسے ایک دم ہی بحث کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اپنا زخمی ہاتھ انہوں نے ہولے سے شانی کے سر پر رکھا۔ ''شانی پتر! ان لوگوں نے اب مجھے زندہ نہیں چھوڑنا۔ دل میں ایک ہی پریشانی ہے۔ میری میت خراب نہ ہو۔''

''کچھ نہیں ہوگا تایا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شانی نے سسک کر کہا اور ان کی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔''

شانی کا دل چاہا کہ اپنے زخمی تایا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اور اُڑا کر کہیں دور بہت دور لے جائے۔

اسی دوران میں ریاض دندناتا ہوا واپس آ گیا۔ ''اوئے! یہ کیا کھچڑی پک رہی ہے..... تایا بھتیجی میں؟''

نیم گنجے سب انسپکٹر نے شانی کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ تایا معصوم سے دور ہٹ کر بیٹھے پھر ریاض کی شہ پا کر اس نے شانی کو باقاعدہ بازو سے کھینچ کر معصوم علی سے دور ہٹا دیا۔

ریاض نے اپنی بالوں بھری کلائی موڑ کر دستی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے! اچھو! اپنی اس ماں کی سپیڈ ذرا تیز کر۔''

ڈرائیور اچھو نے اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ جیپ جو پہلے ہی ناہموار راستے پر بُری طرح اچھل رہی تھی اب مزید اچھلنے لگی۔ شانی پچھلے دس گھنٹوں سے مسلسل جھٹکے کھا رہی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا لیکن وہ کم از کم زخمی تو نہیں تھی۔ تایا معصوم زخمی تھے۔ خاص طور سے گردن کی چوٹ انہیں بہت اذیت دے رہی تھی۔ تایا کی اذیت کے خیال نے شانی کو اپنی اذیت بھلا دی۔

شانی کے سر پر بے رحم آسمان تھا اور نیچے سنگلاخ زمین۔ آسمان اور زمین کا درمیانی قلابہ وادی سون کی پُراندیش تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ طاقتور جیپ اس تاریکی کا سینہ چیرتی اچھلتی کودتی ایک خطرناک منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شانی نے اپنی کلائی کی سلور کلر کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوئیاں رات تین بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔

☆======☆======☆

رستم نے لالٹین کی لَو تھوڑی سی اونچی کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ جو تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ڈیرے کے اس کمرے میں رستم کے علاوہ شاہ، کاظیا

اور آہوجہ وغیرہ موجود تھے۔ مراد اور اس کے دو ساتھی بھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ قریباً ساڑھے چھ فٹ کا ایک نہایت ہٹا کٹا مضبوط شخص سامنے لوہے کی ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اسے باندھنے کے لئے سن کی وہی رسیاں استعمال کی گئی تھیں جن سے باقر اور ہیرا کی لاشیں گدھوں کی پشت پر بندھ کر ڈیرے پر پہنچی تھیں۔

یہ ہٹا کٹا شخص سیالکوٹ، پسرور اور گوجرانوالہ کا نامی گرامی بدمعاش جاوا تھا۔ شروع میں یہ دیہاتی زبردست قسم کا لٹھ باز اور کلہاڑی باز تھا۔ بعد میں وہ لاہور آیا اور پولیس میں بھرتی ہونے کی کوشش کی۔ اسے ٹریفک پولیس میں کانسٹیبل کی نوکری مل گئی۔ اپنے اونچے قد کی وجہ سے وہ چوک میں کھڑا ایک جن کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس کو خوف آمیز دلچسپی سے دیکھتے ہوئے گزرتے تھے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ مال روڈ کے چوک میں کھڑے ایک سارجنٹ نے دیر سے آنے پر اسے سخت سُست کہا اور گالی دے دی۔ جاوا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سارجنٹ پر پل پڑا۔ سینکڑوں لوگوں نے کانسٹیبل کے ہاتھوں سارجنٹ کی پٹائی کا یادگار تماشا دیکھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جواد عرف جاوا کی پٹی اُتر گئی بلکہ اسے ایک سال کی قید بھی بھگتنا پڑی۔ ایک سال کی قید سے وہی کچھ ہوا جو اکثر ہوتا ہے۔ جاوا جو کچا پکا بدمعاش تھا، پورا بدمعاش بن کر جیل سے نکلا۔ اس نے سیالکوٹ اور اردگرد کے علاقے میں تڑتھلی مچا دی۔ درجنوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑے اور بے شمار وارداتیں کیں۔ اس کی وارداتوں کا نشانہ زیادہ تر دیہاتی علاقے ہی تھے۔ اسے ''جاوا سپاہی'' اور ''جاوا ہڈی توڑ'' جیسے خطاب بھی دیئے جاتے تھے۔ لاٹھی اور چھری والی لاٹھی چلانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

پھر ایک روز غیر متوقع طور پر یوں ہوا کہ جاوے کو دوبارہ پولیس میں بھرتی کرلیا گیا۔ اس مرتبہ وہ نہ صرف کرائم پولیس میں گیا بلکہ نہ جانے کس طرح ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہوا۔ شاید مقامی بدمعاشوں سے نمٹنے کے لئے سیالکوٹ پولیس کو کسی بدمعاش کی ضرورت تھی۔ یوں دادی گیری کی کوالیفیکشن جاوے کے کام آگئی۔ پولیس میں آنے کے بعد بھی جاوا بدمعاش کا بدمعاش ہی رہا۔ وہ ڈپٹی ریاض کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا اور سفاکی میں خوب نام کما چکا تھا۔

جاوے کو قریباً ایک گھنٹا پہلے مراد اور اس کے چار ساتھیوں نے پکڑا تھا۔ جاوا بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پوزیشنوں سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ ایک اور بندہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ عین ممکن تھا کہ جاوے اور اس کے ساتھی کو تھوڑا سا وقت مزید مل جاتا تو وہ اپنی اگلی

پوزیشن سے مزید ڈیڑھ دو سو میٹر آگے پوزیشن بنا لیتے۔ اس موقع پر مراد نے واقعی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے کارروائی کر کے جاوے کو بھاپ لیا۔ اس کا ساتھی زخمی حالت میں فرار ہوگیا۔

جاوے کو پکڑ کر مراد نے ایک اہم کامیابی حاصل کی تھی اور اس طرح کسی حد تک رستم کے سامنے اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے تک جاوا زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ اب اسے مضبوط آہنی کرسی کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ رستم، مراد اور آہوجہ اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ جواب میں وہ سب کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کے قریباً سوا فٹ لمبے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

مراد نے کسی پروفیشنل باکسر کے انداز میں ایک بھرپور مکا جاوے کی چوڑی چکلی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ جاوے کی کرسی الٹتے الٹتے بچی۔ مراد نے اس کے گھنگریالے بال مضبوطی سے اپنی مٹھی میں جکڑے اور بے رحم جھٹکا دے کر پھنکارا۔ ''بکواس کرے گا یا گردن تڑوائے گا۔ بول ٹوٹل کتنی گنیں ہیں سامنے والی پوزیشنوں پر؟''

''تجھ کو بتایا تو ہے کہ میں نے کبھی گنی نہیں اور گنی ہوتیں تو بھی تمہیں نہ بتاتا۔'' جاوا خون تھوک کر بولا۔ اس کی آواز بھاری اور لہجہ دیہاتی تھا۔

''اچھا یہ بتا دے وہ بوہلی کتا ریاض کہاں ہے؟'' مراد نے پوچھا۔

''ریاض صاحب سے تمہارے ملنے کی تمنا بڑی جلدی پوری ہوگی اور بڑی چنگی طرح پوری ہوگی۔ اب جیادہ دیر انتجار نہیں کرنا پڑے گا۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

مراد نے ایک بار پھر اس کی ٹھوڑی پر مکہ رسید کیا۔ اس مرتبہ مکے میں زیادہ طاقت تھی۔ جاوا کرسی سمیت الٹ گیا۔ اس کے گرنے سے ایک بڑی لالٹین چکنا چور ہوگئی اور جاوے کی ٹانگیں کھڑی ہوگئیں۔ تین افراد نے مل کر اس گرانڈیل کو بہ مشکل سیدھا کیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون اس کی ٹھوڑی سے ٹپکنے لگا تھا۔

وہ وحشت آمیز انداز میں بولا۔ ''باندھ کر مار رہے ہو۔ اکیلے سے اکیلا آؤ اگر بیو کے ہو تو۔''

مراد کے سارے رگ پٹھے تن گئے تھے۔ اس نے اپنی قمیص اُتار کر پھینک دی۔ اس کا کسرتی جسم مشعلوں کی روشنی میں دمکنے لگا۔ وہ رستم کی طرف دیکھ کر پکارا۔ ''کھلوا دو اس حرامزادے کو۔ میں اس کو ''اکیلے سے اکیلے'' کا مزہ چکھاتا ہوں۔''

www.pdfbooksfree.pk

مراد کی اس آفر کے ساتھ ہی جاوے کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ صورت سے ہی نہایت خطرناک لڑاکا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر لڑائی بھڑائی سے آنے والے زخموں کے کئی نشانات تھے۔ سامنے کا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ مراد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اگر اپنے پیو کا نام پتا جانتے ہو تو اپنی بات پر قائم رہنا۔ دو دو ہتھ کر لو میرے ساتھ..... اگر جت گئے تو جو کہو گے وہ مانوں گا اور اگر ہار گئے تو پھر.....؟“

”پھر چھوڑ دیں گے تمہیں۔“ مراد سینہ تان کر بولا۔

”مجبور ہے۔ کھولو میری رسیاں۔“

ایک ساتھ ہی بہت سے لوگ بولنے لگے۔ مقابلے کی بات سن کر ارد گرد موجود لوگ بھی دروازے کے سامنے جمع ہو گئے۔ مراد کے چند قریبی ساتھی للکار کر بولے۔ ”ٹھیک ہے کھولو اس بدمعاش کو۔“

رستم نے ہاتھ اٹھا کر مجمع کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ موجودہ حالات میں اس قسم کے خونی تماشے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا تاہم اس کے پچانوے فیصد ساتھیوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ یہ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ خود مراد کے چہرے پر بھی بے پناہ جوش تھا۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر با کسر تھا اور اس کے کئے کی دھوم تھی۔ چند ماہ پہلے جب نادیہ کے سلسلے میں تنازعہ ہوا تھا تو مراد اور رستم الجھ پڑے تھے۔ گو رستم نے مراد کی طبیعت صاف کر دی تھی لیکن مراد کے ایک دو مکے اسے جھیلنے پڑے تھے۔ ان کا وزن اور شاک ابھی تک رستم کو یاد تھا۔

جونہی رستم نے نیم رضامندی ظاہر کی، لوگ ایک وسیع دائرے کی صورت میں کھلی جگہ پر جمع ہونے لگے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا لیکن لگتا تھا کہ دن کا وقت ہے۔ ہر شخص پوری طرح بیدار تھا۔ کچھ بڑی مشعلیں مخصوص مقامات پر گاڑ دی گئیں اور کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ رات آخری پہر کی ہوا میں مشعلوں کے شعلے دھیرے دھیرے پھڑک رہے تھے۔

جونہی جاوے کے گرد لپٹی ہوئی سن کی رسیاں کھولی گئیں، وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سفید شلوار اور بنیان میں تھا۔ اس کی قمیص کھینچا تانی کے دوران میں پھٹ کر اس کے جسم سے جدا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سے بہتا ہوا خون اپنی قمیص کی دھجیوں سے صاف کیا۔ اس کی قامت متناسب کن تھی۔ رسیوں کی مضبوط بندش نے اس کے بازوؤں اور سینے پر گہری سرخ دھاریاں ڈال دی تھیں۔

وہ پھنکار کر بولا۔ ”مزہ تو تب ہے کہ اس لڑائی میں جو مر جائے وہ ہار جائے..... جو زندہ رہے وہ جت جائے۔“

یہ جاوے کا دوسرا خوفناک چیلنج تھا۔ ایسا چیلنج وہی کرتا ہے جسے اپنی بے پناہ صلاحیت پر بھروسا ہوتا ہے۔ مراد ایک سیکنڈ کے لئے متذبذب نظر آیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ تن گیا۔ وہ دھاڑا۔ ”ٹھیک ہے..... جو ہار گیا وہ مر گیا۔“

”چٹلی طرح سوچ لے چن مکھناں..... جندگی دوبارہ نہیں ملتی۔“ جاوے نے مراد پر نفسیاتی دباؤ ڈالا۔

”تُو بھی سوچ لے، جتنا بڑا جثہ ہوتا ہے جان بھی اتنی ہی پھنس پھنس کر نکلتی ہے۔“

”اپنے چمچوں کڑچھوں کو سمجھا لے اچھی طرح یہ نہ ہو کہ تُو مرنے لگے تو ان کی ممتا جاگ جائے اور وہ بیچ میں کود (کود) پڑیں۔“

”اس معاملے میں تُو بے فکر رہ۔“ مراد نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”ہمارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔“

جاوے نے ارد گرد موجود ہجوم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ لوگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر پہلے اپنے دو ساتھیوں کی حسرت ناک لاشیں دیکھی تھیں جنہیں گدھوں پر باندھ کر یہاں بھیجا گیا تھا۔ اب وہ سب جاوے کو بھی ایک کٹی پھٹی لاش کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جاوے نے رستم کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”ہتھیار کون سا ہوگا؟“ اس کا مطلب تھا کہ لڑائی میں کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے گا۔

رستم نے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”ہتھیار کوئی نہیں ہوگا۔ ہم خالی ہاتھ لڑیں گے اور میں خالی ہاتھوں سے ہی تیری کھوپڑی توڑوں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی..... یہ جندگی موت کی لڑائی ہے۔ یہ خالی ہتھ نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں خالی ہاتھ ہوگی اور حرامزادے میرا وعدہ ہے تجھے مرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔“ مراد نے اپنی کلائیوں کو وارم اپ کرتے ہوئے کہا۔

جاوا مسکرایا تو اس کے ٹوٹے ہوئے دانت کا خلا نمایاں ہو گیا۔ ”میں اتنا کھوتا نہیں ہوں جتنا تُو سمجھتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ مراد کا لہجہ کڑا تھا۔

”تُو کراچی کا مانا ہوا بوکسر (باکسر) ہے۔ میں پیشاب کرتا ہوں تیری بوکسری پر۔ یہ لڑائی ہتھیار کے ساتھ ہوگی۔ تیرا جو دل چاہے، وہ ہتھیار چن لے۔ میں تیار ہوں۔“

مراد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی اصل طاقت اس کی شاندار مکے بازی میں تھی لیکن جاوا توقع سے زیادہ عیار تھا۔ وہ اس لڑائی کے لئے ہتھیاروں کی طرف جا رہا تھا۔ مراد نے سوالیہ

www.pdfbooksfree.pk

نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔

رستم نے پوچھا۔ ''تُو کون سا ہتھیار چاہتا ہے؟''

جاوے کا سفاک چہرہ کچھ اور سفاک ہو گیا۔ ''لوہے کی شاموں والی لاٹھی میری پسند کا ہتھیار ہے لیکن میں اس حرامی مراد ے کی طرح ڈرپوک نہیں ہوں کہ اسے اپنی پسند کی طرف کھینچوں۔ تم کوئی سا ہتھیار بھی مشورے سے طے کر لو۔''

مراد کی آنکھوں میں شعلے رقص کر گئے۔ وہ گرجا۔ ''ٹھیک ہے۔ لاٹھی، کلہاڑی، برچھا..... جو دل چاہے لے آؤ میں تیار ہوں۔'' اس نے اپنی پتلون کے پائنچے اُڑ سے اور جوگر اُتار کر دور پھینک دیئے۔ مجمع میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

رستم نے گہری نظروں سے مراد کو دیکھا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا..... مراد جوش میں آ کر غلطی کر رہا ہے۔ کسی بھی ہتھیار کے ساتھ یہ خطرناک دیو مراد پر بھاری رہے گا۔ رستم کے تصور کی نگاہ نے اسے پتھریلی زمین پر پڑی ہوئی مراد کی لاش دکھائی دی۔ اس کی نیلی جین خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس کے سرہانے دیو ہیکل جاوا ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر بڑھکیں مار رہا تھا۔

رستم کا سینہ جل اٹھا۔ اگلے چند لمحوں میں اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر پر کسا ہوا رومال اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر یہ لڑائی ہتھیار کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر اس کے ساتھ میں لڑوں گا۔''

ہجوم پر سناٹا چھا گیا۔ مراد نے احتجاجی انداز میں رستم سے کچھ کہنا چاہا لیکن رستم اس کے بولنے سے پہلے بول پڑا۔ ''تم چپ رہو مراد..... یہ میرا فیصلہ ہے۔''

''لیکن اس نے.....''

رستم نے مراد کی بات تیزی سے کاٹی۔ ''دیکھ مراد! میں نے تجھ سے کیا کہا تھا۔ لالے کے بعد یہاں میں سردار ہوں۔ میرا کہا ماننا پڑے گا۔''

''تو اب تم لڑو گے؟'' جاوے نے رستم کو مخاطب کیا۔

''کیوں؟ تمہیں کیوں اعتراض ہے۔ ابھی تم نے خود ہی کہا ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک آ جائے۔''

''ہاں..... تم ہی آ جاؤ۔ مجھے تمہاری ٹانگیں چیر کر جیادہ خوشی ہوگی۔'' جاوے کے چہرے پر نظر آنے والی ہیجانی کیفیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے چٹانی

سینے کو زور سے کوٹا اور نفرت سے زمین پر تھوکا۔

آہوجہ، کاٹھیا اور شاہ وغیرہ آگے آئے۔ شاہ نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''رستم بھائی! ہم آپ کو اس خطرے میں نہیں پڑنے دیں گے۔ ہم کیا مر گئے ہیں سارے۔''

''تمہاری ہمدردی اپنی جگہ ہے لیکن میں نے جو کہا ہے وہی کروں گا۔ اسے میرا حکم سمجھو۔'' رستم کا لہجہ بے لچک تھا۔

شاہ سرگوشی میں بولا۔ ''اللہ نہ کرے..... آپ کو کچھ ہوا تو ہم کیا کریں گے۔ لالہ اور حسنا بھائی تو پہلے ہی بستر پر ہیں۔''

''اگر ان کے بغیر کام چل رہا ہے تو میرے بغیر بھی چل جائے گا۔ ویسے بھی تم بے فکر رہو۔ اس شہدے سے زیر ہونے والا نہیں ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے..... ابھی تھوڑی دیر میں تم اس حرامی کو زمین چاٹتا دیکھو گے۔''

رستم اپنی آستین اُڑستا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے درجنوں ساتھیوں نے پُرجوش نعرے بلند کئے۔ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنے ساتھیوں کی کٹی پھٹی لاشیں دیکھی تھیں اب وہ جاوے کی لاش دیکھنا چاہ رہے تھے۔

جاوے نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر میں تمہیں جیت لوں تو یہ لوگ میرے ٹکڑے نہیں کر دیں گے؟''

''میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ اس لڑائی میں نہ کوئی دخل دے گا اور نہ تمہاری جیت کے بعد کوئی تمہیں نقصان پہنچائے گا۔''

''اگر میں جیت گیا تو کیا یہ لوگ مجھے واپس جانے دیں گے؟''

رستم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''یہ بندہ اس لڑائی کو زندگی اور موت کی لڑائی بنا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لڑائی ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہوگی اگر یہ میری موت پر ختم ہو تو پھر اس بندے کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ جیسا اور جس حالت میں بھی ہو اسے یارودی سرنگوں سے آگے ٹیلوں کی طرف نکال دیا جائے۔''

سب خاموش رہے۔ رستم نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔ ''میں تم سب کی طرف سے ضمانت دے رہا ہوں۔ کیا تم میری ضمانت کو جھوٹا ثابت کرو گے؟''

آہوجہ نے ہمت کر کے کہا۔ ''ٹھیک ہے رستم بھائی۔ ہم تمہارے سامنے چوں بھی نہیں کر سکتے۔ تم ہمیں پہاڑ سے کودنے کو کہو گے تو ہم کود جائیں گے لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں..... نادر کاکا کہا کرتا تھا لیکن کے آگے بہانے شروع ہوتے

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔'' رستم نے تیزی سے آہوجہ کی بات کاٹی۔

''ٹھیک ہے رستم بھائی۔ ہم وہی کریں گے جو تم کہتے ہو۔'' آہوجہ نے مری مری آواز میں کہا۔

جاوا میدان کے درمیان کھڑا تھا اور سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''تم نے سنا یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ اور یہ پولیس والے نہیں وڈے ڈیرے کے ڈاکو ہیں۔ زبان کے لئے جان دے دیتے ہیں۔ اگر تم نے مجھے جیت لیا تو وہی ہوگا جو یہ کہہ رہے ہیں۔''

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ دلوں میں دھڑکن نقارے کی طرح گونج رہی تھی اور سانسوں کی لے بہت تیز تھی۔ اس خیال سے جاوے کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی کہ وہ زندہ رہنے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک بھرپور کوشش کرسکتا ہے۔

رستم کے اشارے پر ہجوم نے دائرے کو کچھ اور وسیع کردیا۔ اس نے اپنی گھڑی اُتار کر آہوجہ کو تھمائی اور جوتے اُتار کر قمیص کی آستینیں اُڑس لیں۔

''کون سا ہتھیار چاہتے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''کہا تو ہے..... مجھے لوہے کی شاموں والی لاٹھی پسند ہے لیکن اس کے علاوہ بھی جو تم چاہو مجھے منظور ہے۔''

''لوہے کی شاموں یا کوکوں والی لاٹھی تو شاید یہاں نہ ہو مگر کلہاڑی ہر سائز کی مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے مجھے تمہیں لمبے دستے والی کلہاڑی سے مار کر بھی خوشی ہوگی۔'' وہ بے پناہ اعتماد سے بولا۔

یہی وہ اعتماد تھا جو مدمقابل کو لرزہ بہ اندام کردیتا ہے لیکن اس کے مدمقابل بھی کوئی عام شخص نہیں تھا۔ وہ بے شمار سورماؤں کو زمین چٹا چکا تھا۔ وہ خالی ہاتھوں سے بھی بندے کو یوں آناً فاناً قتل کرسکتا تھا جیسے آتشیں ہتھیار سے کیا جاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں عقاب کی تیزی اور حرکات میں زخمی چیتے کی سی پھرتی تھی۔ وہ مدمقابل کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی اس کا ارادہ بھانپ لیتا تھا اور اس کی توقع سے پہلے وار کردیتا تھا۔ وہ نام ہی کا نہیں کام کا بھی رستم تھا۔ بظاہر دیکھنے میں وہ دھیما اور ٹھہرا ہوا تھا لیکن جب کسی سے نبرد آزمائی کا مرحلہ آتا تھا تو اس کے جسم میں بجلیاں چمکتی تھیں اور وہ سرتاپا آگ بن جاتا تھا۔

رستم نے کاٹھیا وغیرہ کو حکم دیا اور پانچ منٹ میں لمبے دستے کی چار پانچ کلہاڑیاں موقع

پر پہنچ گئیں۔ ان کے دستے چھ سات فٹ لمبے تھے۔ دو کلہاڑیوں کے پھل اور دستے باقی کلہاڑیوں سے زیادہ موٹے اور وزنی تھے۔ ان کی تیز دھاریں مشعلوں کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

کلہاڑیاں میدان میں ایک پتھر پر رکھ دی گئیں۔ رستم نے جاوے کو دعوت دی۔ ''چن لو اپنے لئے کلہاڑی۔''

جاوے نے اپنے لئے موٹے دستے اور وزنی پھل والی کلہاڑی چنی۔ بڑے ماہرانہ انداز میں اس کے بلیڈ پر اپنی انگلیاں پھیریں اور دستے کو اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر دیکھا پھر اس نے کلہاڑی کو چابکدستی سے اپنے اردگرد گھمایا اور مطمئن نظر آنے لگا۔

رستم نے جاوے کی تقلید نہیں کی اور نسبتاً ہلکے پھل والی کلہاڑی لی۔ لٹھ بازی میں رستم کو بھی ملکا حاصل تھا۔ کلہاڑی بازی اور لٹھ بازی کی بنیادی تکنیک میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ قدموں کا استعمال، اپنے گرد دفاعی حصار قائم کرنا، اپنے سر کو ہدف بننے سے بچانا اور مدمقابل کے سر کو ہدف بنانا، یہ اصول کلہاڑی اور لاٹھی کے استعمال کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

ایک ڈھولچی کہیں سے ڈھول لے آیا تھا۔ وہ میدان کے ایک گوشے میں کھڑا ہوگیا۔ اس نہایت سنگین لڑائی کا فیصلہ زندگی یا موت پر ہونا تھا لہٰذا منصف وغیرہ کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ (اس کے بجائے شاید ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو دیکھ سکے کہ ایک حریف اپنی جان کی بازی ہار گیا ہے) پھر بھی روایتی طور پر ایک منصف سر پر پگڑی لپیٹ کر اکھاڑا نما میدان کے درمیان آگیا۔ ایک طرف رستم اور دوسری طرف جاوا ہاتھوں میں مہلک کلہاڑیاں لئے کھڑے تھے۔ حاضرین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ چہرے اندرونی غضب سے تمتما رہے تھے۔

بھاری بھرکم ڈھول پر چوٹ پڑی۔ عمر رسیدہ منصف نے ہاتھ لہرایا اور درمیان سے ہٹ گیا۔ دو نہایت مہلک لڑاکے ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ یہ خوفناک پھل کی کلہاڑیاں تھیں۔ دونوں میں سے کسی کا داؤ چل جاتا تو ایک ہی ضرب ''کافی'' ثابت ہوسکتی تھی۔ یعنی اس بات کا امکان موجود تھا کہ یہ سنسنی خیز لڑائی بس چند سیکنڈ میں ہی ختم ہوجائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ دونوں محتاط انداز میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہولے ہولے اپنی جگہ بدلتے رہے اور ایک دوجے کے ارادے کو بھانپتے رہے۔

پھر پہلا وار جاوے نے ہی کیا تھا۔ ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ وہ حملہ آور ہوا۔ رستم نے اس کا وار اپنی کلہاڑی پر روکنے کے بجائے پیچھے ہٹ کر بچایا۔ دوسرا وار بھی ایسے ہی خالی دیا۔ تیسرا وار اس نے اپنی کلہاڑی کے دستے پر لیا اور جاوے کے پیٹ میں ٹانگ رسید کرکے

www.pdfbooksfree.pk

اسے دور تک لڑھکانے پر مجبور کر دیا۔

رستم کے ساتھیوں نے خوش ہو کر للکارے بلند کئے۔ ڈھولچی کے ڈھول کی تھاپ بلند ہوگئی۔ قرب و جوار اس آواز سے تھراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تماشائیوں کی آنکھوں میں جوش و خروش کے ساتھ عجیب طرح کا خوف بھی موجود تھا۔ وہ جانتے تھے یہ عام لڑائی نہیں ہے۔ ان کے سامنے موجود دونوں جیتے جاگتے انسانوں میں سے ایک کو بہرصورت ان کی آنکھوں کے سامنے مرنا تھا۔ لاش میں تبدیل ہونا تھا۔ یہ واقعہ کسی آتشیں ہتھیار کی گولی سے رُونما ہوتا تو اور بات تھی مگر یہاں تو تیز دھار کلہاڑیاں ٹکرا رہی تھیں۔ تماشائی جانتے تھے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے موت کم ہی واقع ہوتی ہے۔ کاری ضرب کھانے والا پہلے گرتا ہے پھر اس پر پے در پے وار کیے جاتے ہیں۔ گوشت اور ہڈیوں میں دھنسی ہوئی کلہاڑی اکھاڑی جاتی ہے، پھر دھنسائی جاتی ہے پھر اکھاڑی جاتی ہے۔ یہ لرزہ خیز منظر ہوتا ہے اور یہ منظر یہاں دکھائی دینے والا تھا۔

وہ سب پُرجوش تھے اور خوف زدہ بھی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ وہ اسے ہونے سے روک نہیں سکے تھے۔ جاوے نے مراد کو چیلنج کیا تھا پھر جاوا اور رستم خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے تھے اور اب خونی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ تماشائیوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن میں یہ سب دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ذکیت قاتل ہونے کے باوجود وہ ان مناظر سے اپنی نگاہ مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ موقع سے ہٹ گئے تھے یا دائرے میں کھڑے لوگوں کے پیچھے جا بیٹھے تھے۔

دائرے کے اندر موت اور زندگی کا کھیل جاری تھا۔ اپنے پیٹ پر رستم کی زوردار ٹانگ سہنے کے بعد جاوا آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کی کلہاڑی برق کی طرح تڑپنے لگی، وہ جھپٹ جھپٹ کر رستم پر حملہ آور ہوا اور ہر جھپٹ کے ساتھ اس نے خاص انداز میں چنگھاڑ بلند کی۔ رستم نے اس کے زیادہ تر وار اپنے کلہاڑی پر روکنے کے بجائے اپنے جسم کو کلہاڑی کی زد میں آنے سے ہٹا کر بچائے۔ اس کی عقابی نگاہ حملہ آور کلہاڑی کے پھل پر تھی اور وہ اپنے جسم کو اس قاتل پھل سے دور رکھے ہوئے تھا۔ ایک دو مرتبہ جاوے کی کلہاڑی کا پھل سنگلاخ پتھروں سے ٹکرایا اور چنگاریاں سی پیدا ہوئیں۔ گاہے بگاہے رستم نے بھی جاوے پر وار کیا لیکن زیادہ تر وار جاوے نے کئے۔ اگلے دو تین منٹ میں جاوے کی کلہاڑی کا پھل تین بار رستم کے جسم سے چھوا۔ پہلی بار کندھے پر کٹ لگا۔ دوسری بار ران پر ہلکی سی چوٹ آئی۔ تیسری مرتبہ کلہاڑی الٹے رخ سے رستم کے پیٹ میں لگی۔

www.pdfbooksfree.pk

جاوے کے ہاتھ میں وزنی کلہاڑی تھی۔ تین چار منٹ کی مارا ماری میں اس کے بازو تھک گئے۔ وار میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی۔ ایک ایسے ہی وار کے خالی ہونے کے بعد جب جاوا اپنی کلہاڑی کو سنبھال رہا تھا۔ رستم نے پوری طاقت سے ایک بھالا وار کیا۔ تماشائیوں نے بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ کلہاڑی جاوے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ قریباً پندرہ فٹ دور پتھریلی زمین پر گری۔ تماشائیوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا۔ جاوے نے تڑپ کر اپنی گری ہوئی کلہاڑی کی طرف جانا چاہا مگر رستم نے اس کا راستہ روک لیا۔

جاوے کو صرف اعزاز کے طور پر انسپکٹر کا عہدہ دیا گیا تھا ورنہ اس میں انسپکٹروں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ صرف ایک بدمعاش تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اسے ایک گرانڈیل بدمعاش ظاہر کرتا تھا۔ فنِ حرب میں ماہر، ایک خونخوار بدمعاش۔

جاوے کے چہرے پر رنگ سا لہرایا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور رستم کا وار بچانے کے لئے تیار ہو گیا۔ رستم کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ جاوے اور اس کی کلہاڑی کے درمیان سے ہٹ گیا۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا عندیہ تھا کہ جاوا اپنی گری ہوئی کلہاڑی پھر اٹھا سکتا ہے۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔

جاوے نے چند سیکنڈ سوچا پھر اپنی گری ہوئی کلہاڑی کے بجائے ان کلہاڑیوں کی طرف بڑھا جو ادھیڑ عمر منصف نے ایک طرف چٹائی پر رکھ دی تھیں۔

''میں دوسری کلہاڑی لوں گا۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

منصف نے سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔

''اسے لینے دو۔'' رستم نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ جاوے نے نسبتاً پتلے پھل کی ہلکی کلہاڑی اٹھائی۔ شاید یہ بات اس کے دماغ میں آئی کہ وزنی کلہاڑی نے اسے تھکا دیا ہے۔ اب وہ رستم کی ہلکی کلہاڑی کا مقابلہ ہلکی کلہاڑی سے کرنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ پلٹا تو یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اب رستم کے ہاتھ میں وزنی کلہاڑی نظر آ رہی تھی۔ (یہ جاوے کی گری ہوئی کلہاڑی ہی تھی) جواد عرف جاوا کلہاڑی اٹھا چکا تھا۔ اب اسے اس بات میں سخت محسوس ہوئی کہ رستم کے کلہاڑی بدلنے پر وہ پھر کلہاڑی بدل لے۔

رستم کے کندھے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، دوسری طرف جاوے کے منہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس بہتے ہوئے خون نے اس کی ٹھوڑی کو رنگین کر کے چہرے کو مزید خوفناک بنا دیا تھا۔ منصف درمیان سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں کلہاڑیاں سونت کر پھر ایک

دوجے کے مقابل آئے۔ ایک دوسرے کو نگاہوں میں تولا۔ ڈیرے کے مکین رستم کی برتری کا اندازہ لگا چکے تھے۔ وہ اپنے سردار کی کامیابی کو واضح طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا جوش وخروش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ رات کے اس آخری پہر ویران ٹیلوں میں زندگی اور موت کی جنگ دیکھنے کے لئے جیسے آسمان پر چمکنے والے ستارے بھی پلکیں جھپکنا بھول گئے تھے۔ ڈھول کی دھما دھم، مشعلوں کے بھڑکتے شعلے، تماشائیوں کے ہاتھوں میں لہراتے ہتھیار یہ سب کچھ مل کر ماحول کو کچھ اور بھی سنسنی خیز بنا رہا تھا۔

لڑائی ایک بار پھر شروع ہوئی۔ اس مرتبہ رستم کے پاس وزنی کلہاڑی تھی۔ اب وہ جاوے کی ضربوں سے بچنے کے بجائے اپنی ضربوں کو اپنی کلہاڑی پر لے رہا تھا۔ اس کی وزنی کلہاڑی آسانی سے ان ضربوں کو جھیلنے لگی۔ یوں رستم کی جسمانی مشقت بھی کم ہو گئی۔ گو اس نے بروقت وار کر کے ایک مرتبہ جاوے کی کلہاڑی اس کے ہاتھوں سے نکال دی تھی، اس کے باوجود وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جاوا ایک نہایت خطرناک اور مشاق حریف ہے۔ اس پر کاری ضرب لگانے کے لئے بے حد مہارت اور صبر کی ضرورت تھی۔ لڑائی کے اس دوسرے مرحلے میں رستم نے جواد عرف جاوے پر کئی تند و تیز وار کئے مگر وہ ہر بار دفاع کرنے میں کامیاب رہا۔

تین چار منٹ بعد جاوا ذرا تھکا ہوا محسوس ہوا تو رستم نے یک دم اس پر چڑھائی کر دی۔ رستم کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ جاوے کے قدم جمے نہ رہ سکے۔ وہ وار روکتا اور لڑکھڑاتا ہوا تماشائیوں کے اوپر گرا۔ اب تماشائیوں کے گھائل ہونے کا خطرہ تھا۔ رستم نے تو اپنا ہاتھ روک لیا لیکن جاوے نے نہیں روکا۔ گرتے گرتے اس نے دونوں ہاتھوں سے وحشیانہ انداز میں کلہاڑی گھمائی۔ رستم نے جھک کر اپنا سر بچایا۔ کلہاڑی ایک بیٹھے ہوئے شخص کی پشت پر لگی اور پہلو کی طرف سے اس کا شکم چیر گئی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس شخص کا پہلو خون سے رنگین ہو گیا اور انتڑیاں باہر لٹک گئیں۔

کچھ لوگوں نے زخمی کو پکڑا اور کچھ مشتعل ہو کر جاوے پر ٹوٹ پڑے۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ اس کی تکلہ بوٹی کر ڈالیں گے لیکن پھر رستم کے علاوہ آہوجہ، رنجی اور منصف وغیرہ آڑے آئے اور جاوے کو بچایا۔ رستم نے آہوجہ کے ہولسٹر سے پستول نکالا اور اوپر تلے کئی فائر کئے ''خبردار..... پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی آگے نہ آئے۔''

رستم کی للکار نے جادو کا اثر کیا۔ مشتعل افراد نے نہ صرف جاوے کو چھوڑ دیا بلکہ کافی

پیچھے بھی ہٹ گئے۔ کچھ لوگ زخمی تماشائی کو لے کر دو نمبر کھوندر کی طرف دوڑ گئے۔

منصف نے جاوے کے ہاتھ سے کلہاڑی لے لی اور اسے پیچھے ہٹا کر ایک پتھر پر ٹھا دیا۔ رستم کے ہاتھ سے بھی کلہاڑی لے لی گئی۔ مقابلہ وقتی طور پر روک دیا گیا۔ تاہم تماشائیوں نے اپنا گھیرا بنائے رکھا اور ڈھولچی جوش وخروش سے ڈھول بجاتا رہا۔ مدمقابل پر رستم کی واضح برتری تھی اور اس برتری نے تماشائیوں کے چہروں پر چمک پیدا کر دی تھی۔ ان میں حسنا اور لالہ گروپ کے علاوہ مراد گروپ کے لوگ بھی شامل تھے۔

آہوجہ، کاٹھیا اور رنجی وغیرہ رستم کو چھجے کے کمرے میں لے آئے۔ آہوجہ نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے ''مرجانے دینا تھا اس حرامزادے کو۔''

''یہ وعدہ خلافی ہوتی جو بات طے ہوئی ہے اس کے مطابق چلیں گے۔'' رستم نے کہا۔

''تو پھر جب اس کی کلہاڑی ہاتھ سے چھوٹی تھی اس وقت مار دینا تھا۔ وہ تو اصول کے مطابق تھا۔'' آہوجہ نے کہا۔

''تمہیں کون کہتا ہے کہ اسے مارنا ہے..... اسے زندہ رکھنا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اسے مارنا بے وقوفی ہوگی۔ اسے صرف ہرانا ہے۔ اس نے اقرار کیا ہے کہ اگر وہ ہار گیا تو جو ہم کہیں گے وہ کرے گا اور جو پوچھیں گے بتائے گا۔''

''ایسے کتوں کی زبان کا کیا اعتبار رستم صیب۔'' کاٹھیا نے کہا۔

''مجھے امید ہے کہ اس کی اکڑ ٹوٹ گئی تو ہمارے ساتھ تعاون کرے گا اور اگر نہیں کرے گا تو پھر کروانے کے طریقے ہیں ہمارے پاس۔''

کمرے سے باہر ادھیڑ عمر منصف اعلان کر رہا تھا۔ ''مقابلہ تھوڑی دیر کے لئے روکا گیا ہے، آپ حوصلہ رکھیں۔ ابھی سب کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔ آپ لوگ اپنا گھیرا کھلا کر لیں اور اپنی جگہ سے آگے نہ آئیں۔ ابھی جو نقصان ہوا ہے وہ تم لوگوں کی ہلڑبازی کی وجہ سے ہوا ہے۔''

چند لوگوں نے تماشائیوں کو پیچھے ہٹایا اور اکھاڑے کے اردگرد بٹھانا شروع کر دیا۔ کچھ مسلح افراد تماشائیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے تاکہ وہ آگے نہ آ سکیں۔ شاہ نے ایک بڑی پٹی اپنی چادر میں سے پھاڑی اور رستم کے کندھے سے پہنے والا خون روکنے میں مصروف ہو گیا۔

دو افراد جاوے کی مرہم پٹی کے لئے آگے بڑھے لیکن اس نے غصیلے انداز میں ان کی پیشکش ٹھکرا دی اور نفرت سے بار بار زمین پر تھوکتا رہا۔ ماحول میں تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ

www.pdfbooksfree.pk

لوگوں کا اب بھی یہی خیال تھا کہ اس مقابلے میں رستم کو جادو کے سامنے آ کر خواہ مخواہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔

☆======☆======☆

ڈپٹی ریاض، شانی اور معصوم علی کو لے کر پولیس کے بیس کیمپ میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے آگے کا سفر گاڑی کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کم از کم چھ گھنٹے تک دشوار گزار راستوں پر پیدل چلیں۔

ڈپٹی ریاض جیپ سے اُترا تو چاروں طرف پولیس والوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''ان دونوں کو اندر لاؤ۔'' خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک خیمے کی طرف چلا گیا۔ پولیس والے اس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

''دونوں'' سے ڈپٹی کی مراد شانی اور تایا معصوم تھے۔ شانی نیچے اُتر آئی۔ تایا معصوم کے لئے ایک اسٹریچر لایا گیا۔ شانی تایا کے اسٹریچر کے ساتھ ایک خیمے میں پہنچی۔ خیمے میں کیروسین کا لیمپ روشن تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا بلب بھی روشن تھا۔ یہ برقی روشنی جنریٹر کی مرہونِ منت تھی۔ خیمے میں دو لیڈی پولیس اہلکار موجود تھیں۔ ان کی آنکھوں میں رتجگے کے آثار تھے۔ غالباً ڈپٹی ریاض کی آمد کے سبب انہوں نے رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارا تھا۔ اپنی اس شب بیداری کا سبب وہ شانی کو سمجھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لئے کدورت کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک لیڈی اہلکار وہی تھی جو چار پانچ روز پہلے سپیرن کے روپ میں گھوم رہی تھی۔ اس کے ساتھ مرد اہلکار سپیروں کے روپ میں تھے پھر مرد تو رستم کے ہاتھوں کام آئے تھے اور یہ بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

''بی بی کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ گی۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' لیڈی سب انسپکٹر نے شانی کو دعوت دی۔

شانی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے چٹائی پر دوزانو بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ تایا کے سر پر رکھ دیئے۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہے تھے۔

''کوئی درد کی دوا ہوگی تمہارے پاس؟'' شانی نے ایک اہلکار سے پوچھا۔

وہ بے باکی سے بولی۔ ''ہم پولیس والیاں ہیں..... ہمارے پاس تو صرف درد ہی ہوتا ہے لیکن تم تو خاص بندی ہو۔ تمہارے لئے درد کی دوا بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

وہ ایک کونے میں گئی۔ یہاں اوپر تلے دو اٹیچی کیس دھرے تھے۔ اس نے اوپر والا

اٹیچی کیس کھولا اور اس کی پاکٹ میں سے اسپرین کی گولیاں نکال کر شانی کو تھما دیں۔

شانی نے پانی مانگا۔ ایک کولر میں سے پانی نکال کر اسے دیا گیا۔ شانی نے کسی نہ کسی طرح تایا کو دو گولیاں پانی میں گھول کر پلا دیں۔ اس نے ان کے شدید زخمی ہونٹ کی پٹی درست کی۔ اپنے پلو کو گیلا کر کے ان کا چہرہ صاف کیا۔ ان کے سر پر ہولے ہولے مساج کرنے لگی۔ تایا کی تکلیف نے اسے اپنی ساری پریشانی اور تکلیف بھلا ڈالی تھی۔

''یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟'' شانی نے لیڈی سب انسپکٹر سے پوچھا۔

وہ زہریلے انداز میں بولی۔ ''یہاں وڈے ڈاکٹر صاحب تو وہی ہیں جن کے ساتھ تم آئی ہو۔ ہر طرح کا علاج معالجہ وہی کریں گے۔'' اس کا اشارہ ڈپٹی ریاض کی طرف تھا۔ اسٹریچر کی بیلٹس نے تایا معصوم کو اسٹریچر کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ شانی نے یہ بیلٹس کھولنی چاہیں لیکن لیڈی سب انسپکٹر نے روک دیا۔

یہ پولیس کیمپ قریباً ایک ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ شانی کو آٹھ دس خیموں کی روشنیاں تو یہاں سے بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ وائرلیس کا ایک بہت بڑا انٹینا بھی نیلے کے اوپر نظر آ رہا تھا۔ بُو گیر کتوں کا شور رات کا سناٹا چیر کر کانوں میں زہر گھول رہا تھا۔ ایک بڑی سرچ لائٹ کا روشن دائرہ دھیرے دھیرے حرکت کرتا ہوا ٹیلوں کے اوپر سے گزرا تو شانی کو مسلح پہرے دار اور چند گھوڑے دکھائی دیئے۔

شانی کے ذہن میں کھلبلی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بدترین وقت قریب آ رہا ہے۔ اسے اور تایا معصوم کو پکڑ کر اس ویرانے میں لانے کا مقصد بہت واضح تھا۔ ڈپٹی ریاض ہر وہ بُرے سے بُرا ہتھکنڈا استعمال کر رہا تھا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ ان ٹیلوں میں اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ رستم تھا اور وہ رستم کو اپنے بس میں کرنے کے لئے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ شانی کو یہاں گھسیٹ لایا تھا۔

شانی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کیا تم ڈپٹی ریاض کو اس بات کی اجازت دو گی کہ وہ رستم اور اس کے ساتھیوں کی تباہی کے لئے تمہیں استعمال کرے؟

اس کا حتمی اور فوری جواب نفی میں تھا۔ ایسا کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ اب وہ ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ریاض اور اس کے ساتھی بذریعہ وائرلیس سیٹ رستم سے براہِ راست رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ ریاض شانی کو رستم سے بات کرنے پر مجبور کرتا یا پھر شانی اور تایا معصوم کو اس طرح اذیت کے شکنجے میں جکڑتا کہ ان کی آہ و بکا رستم کے کانوں تک پہنچتی اور وہ سب کچھ بھول بھال کر ریاض کے قدموں

www.pdfbooksfree.pk

میں آن گرتا۔

شانی نے سوچا اگر ریاض نے خود یا لیڈی اہلکاروں کے ذریعے اسے اذیت پہنچائی اور اس اذیت رسانی کے ذریعے رستم کو تابع بنانے کی کوشش کی تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے تہیہ کیا کہ وہ خود کو رستم اور اس کے ساتھیوں کے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دے گی اگر وہ زنجیر ہے تو اپنے ہاتھوں سے خود کو مار ڈالے گی۔ وہ جہاں تک تحمل سے کام لے سکتی تھی اس نے لے لیا تھا اور جہاں تک برداشت کر سکتی تھی وہاں تک برداشت بھی کر لیا تھا۔ اب وہ ریاض ہنٹر کے ہاتھوں مزید تکلیف اٹھانے سے بہتر سمجھتی تھی کہ مزاحمت کا حق ادا کرتے ہوئے خود کو ختم کر لے۔

تایا نیم وا نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔ میری بات یاد ہے ناں دھی رانی۔ تُو رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ہے۔ تُو سو پنڈوں (دیہات) کے ماتھے کا جھومر ہے۔ تُو پنجابی مٹیار کی آن بان ہے۔ آج وقت نے تجھے ایک سخت ترین دوراہے پر کھڑا کیا ہے..... اب گردن جھکنی نہیں چاہیے..... کٹ جانی چاہیے۔ شانی نے نگاہوں نگاہوں میں نیم جان تایا معصوم سے کہا۔ ایسا ہی ہوگا تایا..... اس پولیس والے کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوگی۔

ایک دم خیمے سے باہر افراتفری کے آثار نظر آئے۔ دو باوردی اہلکاروں نے ایک آرام دہ کرسی لا کر خیمے میں رکھ دی۔ دوسرا تپائی لے آیا۔ باہر کھڑے پہرے دار اٹینشن ہو گئے۔ ڈپٹی ریاض لمبے ڈگ بھرتا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اس کے پیچھے تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ میں وہی آٹھ دس کلو وزنی وائرلیس سیٹ تھا جو اس سے پہلے جیپ میں رکھا تھا اور جس پر ریاض مسلسل بات چیت کرتا رہا تھا۔ وائرلیس کا ریسیور ریاض کے کان سے لگا تھا اور وہ باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر ریاض کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل وزنی وائرلیس سیٹ اٹھائے اس کے پہلو میں مؤدب کھڑا رہا۔ وائرلیس سیٹ میں سے شور کے ساتھ ساتھ کسی شخص کی نسبتاً باریک آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جی ہاں..... بڑی مشکل سے سیٹ تک پہنچا ہوں جی۔ شاید دو تین منٹ سے زیادہ بات نہ کر سکوں۔“

وائرلیس سیٹ میں سے ڈھول پیٹنے کی مدھم آواز بھی آ رہی تھی۔ ڈپٹی ریاض نے پوچھا۔ ”یہاں ڈھول بج رہا ہے کیا؟ اوور۔“

”جی سر، ڈھول بج رہا ہے اور معاملہ بڑا گڑبڑ ہے۔ اوور۔“

www.pdfbooksfree.pk

”کیا کہنا چاہتے ہو؟ اوور۔“

”جاوا صاحب اور رستم میں مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ در..... دراصل [illegible] کی بات خود جاوا صاحب نے ہی کی تھی۔ پہلے مراد گروپ کے مراد اور جاوا صاحب میں دو دو باتیں ہونے تھے لیکن جب جاوا صاحب نے خالی ہاتھ لڑنے کے بجائے کسی ہتھیار کے ساتھ لڑنے کا کہا تو رستم خود آگے آ گیا۔ دونوں میں پانچ چھ منٹ تک ٹھیک ٹھاک لڑائی ہوئی ہے۔ دونوں کو زخم آئے ہیں۔ پر..... رستم کا پلہ بھاری لگ رہا ہے جی۔ مجھے ڈر ہے کہ..... میرا مطلب ہے کہ..... اللہ نہ کرے جاوا صاحب کی جان چلی جائے..... اوور۔“

ڈپٹی ریاض کے چہرے پر تشویش کی لکیریں پھیل گئیں۔ اس نے ہونٹوں میں بدبدا کر کسی کو غائبانہ گالی دی پھر اطلاع دینے والے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کیا وہ دونوں اب بھی لڑ رہے ہیں؟ اوور۔“

”نہیں جی..... لڑائی وقتی طور پر رکی ہوئی ہے۔ دراصل جاوا صاحب کی کلہاڑی سے لالہ گروپ کا ایک بندہ زخمی ہو گیا ہے۔ افراتفری پھیل گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لڑائی روک دی گئی ہے۔ کچھ بندے کہہ رہے ہیں کہ آدھ پون گھنٹہ اور انتظار کر لیا جائے، ابھی صبح ہو جائے گی۔ باقی مقابلہ دن کی روشنی میں ہو۔ اوور۔“

”جاوا زیادہ زخمی تو نہیں ہے؟ اوور۔“

”منہ کے دو زخم زیادہ گہرے ہیں جی..... ان زخموں کی وجہ سے وہ نڈھال نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس لڑائی میں رستم کو گرا سکیں گے لیکن اگر فرض کریں انہوں نے رستم کو گرا دیا تو پھر ان لوگوں نے گارنٹی دی ہے کہ وہ جاوا صاحب کو چھوڑ دیں گے۔ اوور۔“

ریاض ایک بار پھر زہریلے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں وائرلیس سیٹ پر گونج دار نعرے سنائی دیئے۔

”یہ کیا ہے؟“ ریاض نے پوچھا۔

”کچھ نہیں سر، رستم کے ساتھی نعرے لگا رہے ہیں اور اسلحہ لہرا رہے ہیں۔ رستم کی وجہ سے ان لوگوں میں نیا جوش بھر گیا ہے جی۔ فی الوقت تو تینوں گروپ بالکل یک جان نظر آ رہے ہیں۔ ہر بندہ سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار نظر آتا ہے۔ اوور۔“

ریاض نے دانت پیسے۔ ”کوئی بات نہیں۔ ان کی دُم میں نمدہ فٹ کرنے کا انتظام کر لیا ہے میں نے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اپنی جگہ چوکس رہو اور جیسے جیسے موقع ملے مجھے ان حرامیوں کے بارے میں خبر دیتے رہو۔ اوور اینڈ آل۔“

بات ختم کر کے ڈپٹی ریاض اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے ریسیور واپس ہیڈ کانسٹیبل کو تھمایا اور شانی سے کوئی بات کئے بغیر لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی پتھریلی زمین پر بوٹوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ پولیس اہلکار اس کے آگے پیچھے بھاگتے نظر آئے۔

تایا معصوم شدید نقاہت کے عالم میں سو گئے تھے یا شاید وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھے۔ ڈپٹی کے جانے کے بعد دونوں لیڈی اہلکار کونے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور شانی کو خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگیں۔ شانی کے کانوں میں وائرلیس سیٹ پر ہونے والی گفتگو کی بازگشت تھی۔ اس میں رستم کا ذکر ہوا تھا اور جہاں کہیں جب کبھی رستم کا ذکر ہوتا تھا..... شانی کے جسم میں آپوں آپ برقی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ یکا یک اس کے دل کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی ہو۔ یہ عجیب ناتا تھا۔ یہ ناقابل فہم تعلق تھا۔ وہ بدترین حالات سے گزر رہی تھی اور دیکھ رہی تھی کہ اس کے اردگرد سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ رستم کو دیکھنا چاہتی تھی، اس کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وڈے ڈیرے پر رستم نے نادیہ سے شادی کر لی ہے..... کوئی خلا سا ضرور پیدا ہو گیا تھا لیکن وہ رستم کو اور اس کی چاہ کو یکسر دل سے نکال نہیں سکی تھی۔ یہ چاہ کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی اور شاید اس کو آخری سانس تک موجود رہنا تھا۔

اس نے تصور کی نگاہ سے وڈے ڈیرے کے قیامت خیز حالات کو دیکھا اور محسوس کیا۔ اس کے دل سے رستم اور نادیہ دونوں کے لئے دعائے خیر نکلی اور بے اختیار اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اچانک دو لمبے تڑنگے باوردی پولیس والے تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے شانی کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو ڈپٹی صاحب بلا رہے ہیں۔“

شانی کی رگوں میں سرد لہر دوڑ گئی۔ شاید بدترین وقت آ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی لیڈی سب انسپکٹر تمکنت سے بولی۔ ”تم نے سنا نہیں..... ڈپٹی صاحب بلا رہے ہیں۔“

شانی نے تایا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں تایا کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

”تیرے تایا کے لئے بڑے تیماردار ہیں یہاں..... تُو اٹھنے والی بات کر۔“ سب انسپکٹر گرجی۔

شانی نے اٹھنے میں تذبذب کا مظاہرہ کیا تو دونوں لیڈی اہلکار اٹھیں اور شانی کو

بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”چل شاباش..... خواہ مخواہ اڑیل گھوڑی نہ بن۔“ لیڈی سب انسپکٹر نے کہا۔

شانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ تایا معصوم شور سن کر جاگ گئے اور صورت حال دیکھ کر کسمسانے لگے۔ اسٹریچر کی بیلٹس نے انہیں اسٹریچر سے پیوست کر رکھا تھا اگر ان کے جسم میں اٹھنے کی توانائی پیدا ہو بھی جاتی تو بھی وہ اٹھ نہیں سکتے تھے۔

تایا کے اضطراب نے شانی کو بے حال کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں اشک تھے اور وہ کچھ کہہ رہے تھے لیکن آواز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اگر ان کا بس چلتا تو وہ اٹھ کر شانی کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتے اور آخری سانس تک خود سے جدا نہ کرتے۔ تایا کی بے بسی و بے قراری دیکھ کر شانی نے مزاحمت ترک کر دی۔ وہ انہیں مزید اذیت دینا نہیں چاہتی تھی۔ ایک نظر تایا پر ڈال کر وہ پولیس والوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اب سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا۔ پہاڑیاں اور ٹیلے دھیرے دھیرے تاریکی کی چادر سے باہر آ رہے تھے۔ مشرقی افق سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ اس افق کے پس منظر میں بیری، بکائن، جنگلی انجیر اور توت کے درخت تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ فضا کو مترنم کر رہی تھی۔ سسی کا ایک جوڑا صبح کی تازہ ہوا میں پرواز کرتا ہوا شانی کی نگاہوں کے عین سامنے سے گزرا۔ یہ سارے خوبصورت مناظر تھے لیکن خوب صورتی کو محسوس کرنے کے لئے دل میں قرار ہونا ضروری ہوتا ہے، یہاں تو سینے کے اندر قیامت مچی ہوئی تھی۔ شانی کو فقط آگ، خون اور زخم نظر آ رہے تھے۔

شانی کو دو جیپوں کے قریب لگے ہوئے ایک نسبتاً بڑے خیمے میں لے جایا گیا۔ یہاں ڈپٹی ریاض ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ لیڈی اہلکاروں نے شانی کو ریاض کے عین سامنے ایک دوسری کرسی پر بٹھا دیا اور اس کے دونوں پہلوؤں میں تن کر کھڑی ہو گئیں۔ سامنے لوہے کی تپائی پر مرد و زن کی عریاں تصویروں والا بدنام زمانہ رسالہ پڑے ہوئے پڑا تھا۔ ریاض نے ایک اے ایس آئی سے کہا۔ ”اوئے! یہ تم نے کیا گند بکھیرا ہوا ہے میز پر۔ ہٹاؤ اسے یہاں سے۔ دیکھتے نہیں رنگ والی کی شرماں والی چھوٹی چوہدرانی آئی ہے۔“

اے ایس آئی نے رسالہ گول کر کے ہاتھ میں لے لیا اور باہر چلا گیا۔ قریب ہی کچھ آہنی زنجیریں پڑی تھیں۔ ان کے ساتھ چمڑے کا ایک ٹکڑا (جس کے ساتھ ”دستی“ بھی تھی) موجود تھا۔ ناخن کھینچنے والا پلاس، ہتھوڑا، چھنی، دو آہنی شکنجے اور اس طرح کی دوسری اشیاء بھی

www.pdfbooksfree.pk

ایسی جگہ رکھی گئی تھیں کہ شانی کی نظران پر پڑ سکے۔ شانی جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اسے توڑنے کا نفسیاتی حربہ ہے۔

اس نے گہری سانس لی اور آنے والے حالات کے لئے تیار ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی مصیبت کا آغاز سوال جواب سے ہوگا لیکن یہاں تو جیسے سب کچھ پہلے سے طے تھا۔

ڈپٹی ریاض نے ہٹی کٹی اہلکاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو..... خاطر تواضع شروع کرو چھوٹی چوہدرانی کی۔''

وہ تو جیسے پہلے سے آتش فشاں بنی ہوئی تھیں۔ لیڈی سب انسپکٹر نے شانی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور نیچے گرانے کی کوشش کی۔ دوسری نے شرم ناک انداز میں شانی کو نوچا۔ اس ''حرکت'' سے شانی کا خوف ایک دم مزاحمت میں بدل گیا۔ اس کی فطری دلیری قوت بن کر اس کے بازوؤں میں سرائیت کرگئی۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ ایک اہلکار کے منہ پر مارا۔ وہ ڈگرا کر ڈپٹی ریاض پر جا گری۔ دوسری اہلکار نے شانی کو عقب سے جکڑا۔ شانی نے پلٹ کر اس پر کٹی کبوتری کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اتنی شدت سے کھینچے کہ وہ کراہتی ہوئی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

ڈپٹی ریاض نے اپنے اوپر گرنے والی اہلکار کے کولہوں پر ایک زوردار چپت لگائی اور گرجا۔ ''اوئے جھانسی دی رانی! پوری پرات بریانی کی کھا جاتی ہو۔ اب پیچھے کی طرف موت کیوں پڑ رہی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہٹی کٹی کانسٹیبل کو شانی کی طرف دھکیل دیا۔

شانی نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ایک کڑاکے دار تھپڑ رسید کیا۔ کچھ دیر کے لئے دونوں لیڈیز اہلکار بے بس دکھائی دیں۔ اسی دوران میں ایک مرد اور ایک لیڈی اہلکار مزید آگئے۔ ان چاروں نے مل کر شانی کو چت لٹا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے جکڑ لئے۔ وہ چاروں بُری طرح ہانپ رہے تھے اور شانی کی سانس بھی دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ شانی کے لمبے ریشمی بالوں نے بکھر کر اس کے چہرے اور سینے کو ڈھانپ لیا تھا۔ ڈپٹی ریاض نے تین فٹ لمبا بید اٹھایا اور شانی کے پاؤں کی طرف کھڑا ہوگیا۔ اچانک اس نے شانی کے ننگے تلوؤں پر ایک زوردار چوٹ کی۔ شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ بلند کراہ نکل گئی، پھر دوسری..... تیسری اور چوتھی ضرب لگی۔ چوتھی ضرب اتنی شدید تھی کہ ضبط کے باوجود شانی چلا اٹھی۔

''بس کردے ریاض..... میں کہتا ہوں بس کردے۔'' ایک آواز شانی کے کانوں میں پڑی اور اس کا دماغ گھوم گیا۔

یہ رستم کی آواز تھی اور رستم یہاں کہاں تھا؟ وہ تو چھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے پر تھا۔ اچانک شانی کے دھندلائے ہوئے ذہن نے کام کیا۔ یہ آواز خیمے کے دائیں گوشے میں رکھے ہوئے وائرلیس سیٹ سے آرہی تھی۔ ایکا ایکی ساری صورتِ حال شانی کی سمجھ میں آگئی۔ ڈپٹی ریاض نے عیاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ شانی کے علم میں لائے بغیر اس نے شانی کی پُراذیت آوازیں رستم تک پہنچا دی تھیں۔ خیمے میں وائرلیس سیٹ موجود تھا اور شانی کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی آن تھا۔

ڈپٹی ریاض کے ماتحتوں نے بڑے سائز کے اس وائرلیس سیٹ کو ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا اور یہ شانی کے منہ سے بس ڈھائی تین فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ ڈپٹی ریاض وائرلیس سیٹ کے بالکل قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سیٹ پر سے کپڑا ہٹایا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ ''یہ بات تو تو بھی اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ ملزم کو زندہ درگور کرنے کے لئے ہمارے پاس بہت سے راستے ہوتے ہیں اور جب ملزم کوئی خوب صورت عورت ہو تو پھر یہ کام اور بھی آسان ہوتا ہے۔''

رستم کی ہیجانی آواز سیٹ پر ابھری۔ ''ریاض! اگر تُو نے بی بی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تیرے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے کرڈالوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں قیمہ بنادوں گا تیرا۔''

''اوئے کس کافر نے ہاتھ لگایا ہے تیری بی بی کو۔ میں نے تو صرف ڈنڈا لگایا ہے اور وہ بھی ہولا ہولا اگر یہ بھی بُرا لگا ہے تو معافی مانگ لیتا ہوں اس جینا لولو سے..... مانگوں معافی؟'' ریاض ہٹلر کے دھیمے لہجے میں زہر کا سمندر تھا۔

شانی چلائی۔ ''رستم! تم اس کی کوئی بات نہ ماننا۔ میری جان جاتی ہے تو جانے دو۔ میں پہلے کون سی زندہ ہوں۔ خدا کے لئے رستم مجھے مرجانے دو۔''

ڈپٹی ریاض ہٹلر کے بے رحم اشارے پر اہلکاروں نے شانی کو اٹھانے کی کوشش کی پھر کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے خیمے سے باہر لے گئے۔ وادن سون کا گرم سورج..... آج جیسے سوا نیزے پر تھا۔

☆======☆======☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

www.pdfbooksfree.pk